اسلام کی دعوتی قوت

حکیم محمود احمد ظفر

Marfat.com

اسلام کی دعوتی قوت

حکیم محمود احمد ظفر

تخلیقات

علی پلازہ، 3- مزنگ روڈ لاہور فون: 7238014

E-mail: takhleeqat@yahoo.com

Web Site: http://www.takhleeqat.com

Marfat.com

91/104565
DATA

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ......: ...... اسلام کی دعوتی قوت

ناشر ......: ...... تخلیقات، لاہور

اہتمام ......: ...... لیاقت علی

سنِ اشاعت ......: ...... ستمبر 2003ء

ٹائٹل ......: ...... آغا نثار

پرنٹرز ......: ...... حاجی حنیف پرنٹرز، لاہور

قیمت ......: ...... -/250 روپے

Marfat.com

انتساب

امام الداعیین

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور ان کی تعلیمات کے مطابق فریضہ دعوت سرانجام دینے والے

ایسے لاتعداد داعیوں

کے نام

جن کی محنت اور اخلاص کی بدولت

آج ہم مسلمان ہیں۔

Marfat.com

فہرست

اسلام کی دعوتی قوت

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
1	تقدیم	10
2	پیش آہنگ	14
3	دعوت اسلام	25
4	دعوت کا مقصد	26
5	چہار گانہ مقاصد	27
6	دعوتی پروگرام	27
7	دعوتی پروگرام کی خصوصیات	29
8	(ا) سادگی	29
9	(۲) جامعیت	30
10	نجاشی کے نام خط اور اس کا رد عمل	40
11	مقوقش شاہ مصر کے نام خط	42
12	بحرین کے بادشاہ کے نام خط	45
13	شاہ یمامہ کے نام خط	46
14	اہل نجران کے نام والا نامہ	47
15	بنو جذامہ کے نام مکتوب گرامی	50

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
16	اعلان نبوت کے بعد دعوتی کام	52
17	سیدنا ابوبکرؓ کا سب سے پہلے ایمان لانا	55
18	دعوتی جدوجہد	58
19	ضماد ازدیؓ کو دعوت اسلام	59
20	سیدنا ابو ذر غفاریؓ کو دعوت اسلام	61
21	عمرو بن عبسہؓ کو دعوت اسلام	62
22	سیدنا حصینؓ کو دعوت اسلام	64
23	سیدنا معاویہ بن حیدہؓ کو دعوت اسلام	66
24	سیدنا عدی بن حاتمؓ کو دعوت اسلام	67
25	سیدنا ذوالجوشن ضبابیؓ کو دعوت اسلام	69
26	سیدنا ابوقحافہؓ کو دعوت اسلام	70

27	سیدنا خالد بن سعید بن العاصؓ کو دعوت اسلام	71
28	سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کو دعوت اسلام	72
29	سیدنا صہیب رومیؓ کو دعوت اسلام	73
30	سیدنا صدیق اکبرؓ کی دعوت	74
31	ابتداء میں دعوت اسلام کو قبول کرنے والے حضرات	76
32	دعوت کی ہمہ گیری	77
33	تین سالوں میں اسلام لانے والے حضرات	79
34	بنو ہاشم میں سے	79
35	بنو مطلب میں سے	79
36	بنو عبد شمس میں سے	79
37	بنو عدی میں سے	79
38	بنو تیم میں سے	80
39	بنو اسد بن عبد العزیٰ میں سے	80
40	بنو زہرہ میں سے	80
41	حلفاء بنو زہرہ میں سے	80
42	بنو عبد الدار میں سے	80
43	بنو جمح میں سے	80

44	بنو سہم میں سے	81
45	حلفاء بنو سہم میں سے	81
46	بنو مخزوم میں سے	81
47	حلفاء بنو مخزوم میں سے	81
48	بنو عامر بن لوی میں سے	81
49	بنو فہر بن مالک میں سے	82
50	پہاڑی دعوت	83
51	پہاڑی دعوت کا اثر	85
52	قریش مکہ کی الجھن	90
53	قریش مکہ کی کاروان اسلام کو روکنے کی ایک اور کوشش	94
54	سیدنا حمزہؓ کا قبول اسلام	98
55	سیدنا عمرؓ کا قبول اسلام	102
56	طفیل بن عمرو دوسیؓ پر دعوت کا اثر	117
57	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حالت میں دعوت اسلام دی	125
58	شعب بنی ہاشم اور دعوت اسلام	128
59	طائف میں دعوت و تبلیغ	131
60	دعوتی جدوجہد میں دوبارہ مصروفیت	136

Marfat.com

61	اہل مدینہ کو دعوت اسلام	137
62	مدینہ میں اسلام کا پھیلاؤ	140
63	معاہدہ حدیبیہ اور دعوت وتبلیغ	147
	سیدنا خالد بن ولید دائرہ اسلام میں	153
64	رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد دعوت اسلام	172
65	عیسائی عربی قبائل کا قبول اسلام	174
66	حیرہ کے عیسائیوں کا معاملہ	176
67	بیت المقدس کے عہد نامہ میں ذمیوں کے حقوق کا تحفظ	177
68	جزیہ	179
69	عیسائی اعلیٰ مناصب پر	183
70	کیا عیسائیوں نے بزور شمشیر عیسائیت ترک کی؟	184
71	عمر بن عبدالعزیزؒ اور دعوت اسلام	190
72	صلیبی جنگیں اور دعوت اسلام	191
73	سلطان صلاح الدین ایوبیؒ اور دعوت اسلام	192
74	افریقہ میں دعوت اسلام کے اثرات	194
75	سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا عہد	198
76	حبشہ میں دعوت اسلام	200
77	اندلس میں دعوت اسلام	202
78	عیسائیوں کے مسلمانوں پر ظلم وستم	209
79	سلطنت عثمانیہ اور دعوت اسلام	214
80	سلطان محمد فاتحؒ	
81	عثمانیہ خلافت کی برکات	216
82	ترکوں کا دعوتی شوق	220
83	تاتاریوں میں دعوت اسلام	228
84	چنگیز خان کے جانشین	231
85	تاتاریوں کا قبول اسلام	238
86	ایران میں دعوت اسلام	241
87	غازان خان کو دعوت اسلام	245
88	چغتائی خاندان میں دعوت اسلام	247
89	توقلق خان اور دعوت اسلام	247
90	آلتون اردو اور دعوت اسلام	251
91	روس میں دعوت اسلام کی ناکامی	254
92	برصغیر پاک و ہند میں دعوت اسلام	257
93	مسلمان حکمران اور اشاعت اسلام	259
94	مسلمانوں کی ہندوپاک میں آمد	260

Marfat.com

95	جنوبی ہند میں دعوت اسلام	271
96	مالابار میں دعوت اسلام	273
97	دکن میں دعوت اسلام	278
98	مسلمان تاجر اور دعوت اسلام	280
99	بنگال میں دعوت اسلام	281
100	اولیائے کرامؒ اور دعوت اسلام	284
101	شیخ اسماعیل لاہوری	284
102	شیخ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش لاہوریؒ	285
103	امام حسن صنعانی لاہوریؒ	286
104	خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ	288
105	خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ	289
106	حضرت فریدالدین گنج شکرؒ	302
107	حضرت شیخ علاء الدین صابرؒ	310
108	حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ	310
109	شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ	324
110	شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ	324
111	سید جلال الدین بخاریؒ	327
112	حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ	328
113	سید راجو قتالؒ	329
114	دعوت اسلام میں صوفیائے کرام کا حصہ	332

115	اکبری فتنہ اور اس کے برگ وبار	334
116	اکبری حکومت کے دو دور	338
117	علمائے دربار	343
118	ملا مبارک اور اس کے فرزند	345
119	دین الٰہی کا اجراء	349
120	دین اکبری	351
121	(۱) آتش پرستی	351
122	(۲) آفتاب پرستی	352
123	(۳) آداب ملاقات	352
124	(۴) سجدۂ تعظیمی	352
125	(۵) گنگا جل	352
126	مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ	355
127	ولادت و تعلیم	356
128	حضرت باقی باللہ کی بیعت اور استفادہ	357
128	سفر لاہور	358
130	جہانگیر کا شیخ مجددؒ کے ساتھ رویہ	359
131	وفات	365
132	تجدید کا مرکزی نقطہ	369
133	کیا حضرت مجددؒ نے تنہا اکبری الحاد کو ختم کیا؟	376
134	تجدید کا طریقہ کار	377

Marfat.com

135	حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ	382
136	تجدیدی کارنامے	387
137	حدیث کی اشاعت وترویج	390
138	حدیث وفقہ کے درمیان تطبیق	392
139	وفات اور جانشین	397
140	دہلی کی تاراجی	402
141	ہندوستان میں عیسائیت کی یلغار	404
142	انگریزوں کی داستان ظلم	418
143	انگریزوں کی لسانی اور تعلیمی پالیسی کے عوامل	425
144	جنگ آزادی کے بعد انگریزی پالیسیاں	434
145	انگریزی زبان کی ترویج	434
146	مسلم اوقاف پر قبضہ	439
147	علماء پر سختی	442
148	دعوت اسلام کے لیے انفرادی کوششیں	451
149	مولوی عبیداللہ	453
150	ہندوستانیوں کے مسلمان ہونے کی ایک وجہ	455
151	اسلامی دعوت کا اختتام	459
152	اسلام کی پھیلتی ہوئی روشنی	475
153	جاپان میں قبول اسلام	475
154	کینیا میں قبول اسلام	476
155	مڈغاسکر اور تنزانیہ میں قبول اسلام	476
156	تھائی لینڈ میں اسلامی بیداری اور قبول اسلام	477
157	جمہوریہ بنین میں قبول اسلام	477
158	برطانوی مفکر کے مارٹن لنجر کا قبول اسلام	478
159	اسرائیل کے یہودی خاندان کا قبول اسلام	479
160	انڈونیشیا میں قبول اسلام	479
161	ڈنمارک میں قبول اسلام	480
162	نیوزی لینڈ میں مسلمان رکن پارلیمنٹ	480
163	ہالینڈ میں اسلام کی روشنی	480
164	بھارت میں قبول اسلام	481
165	روانڈا میں اسلام کی تیز رفتاری	481
166	جنوبی کوریا میں قبول اسلام	484
167	حجاب سے متاثر ہو کر ہندو خاتون کا قبول اسلام	484
168	یورپ اور اسلام	485
169	تبلیغی جماعت	489
170	ایک غلط فہمی کا ازالہ	496
	☆ ☆ ☆	

Marfat.com

تقدیم

از قلم محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی، سابق وفاقی وزیر، مذہبی امور، حکومت پاکستان

اسلام اپنے مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے ایک دین دعوت ہے۔ اسلام کی بقاء اور تسلسل کا تمام تر دارومدار دعوت پر ہے۔ علامہ اقبال نے ایک جگہ پیغام اسلام کو ایک ایسے بہتے دریا سے تشبیہ دی ہے جس کا وجود حرکت مسلسل پر مبنی ہوتا ہے۔ دریا کی موجیں اگر مسلسل چلتے رہنا اور حرکت کرنا چھوڑ دیں تو پھر دریا دریا نہیں رہتا سڑے ہوئے پانی کا ایک نالہ بن کر رہ جاتا ہے۔ دریا کے وجود اور اس کے پانی کی صفائی اور پاکیزگی کی اسی وقت تک ضمانت دی جا سکتی ہے جب تک اس کی موجیں مسلسل آگے بڑھتی رہیں۔

ہستم اگر می روم نہ روم نیستم

یہی کیفیت مسلمانوں کے جسد ملی اور وجود اجتماعی کی ہے۔ جب تک اسلام کی دعوت پھیلتی رہی اور نئی نئی قومیں اور نئے نئے لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہوتے گئے ملت اسلامی ترقی اور عروج کی نئی نئی منزلیں طے کرتی گئی۔ اسلام کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اسلام نے انسانوں کے دلوں اور ان کی روحوں کو پہلے فتح کیا، ملکوں اور علاقوں کی فتح کا نمبر بعد میں آیا۔

قرآن مجید اول سے لے کر آخر تک اصلاً ایک کتاب دعوت اور پیغام دعوت ہے۔ اس نے اپنے قارئین کے قلب و دماغ کے ساتھ ساتھ ان کے رویوں، طور طریقوں عقائد و خیالات اور انفرادی و اجتماعی طرز عمل غرض ان کی ہر چیز کو متاثر کیا۔ اور

Marfat.com

ان تمام چیزوں کو اپیل کیا جن سے افراد اور اقوام کے دل و دماغ میں تبدیلی پیدا کیے جانے کا ذرہ برابر امکان بھی پایا جاتا تھا۔ قرآن مجید کا طرز استدلال، اس کا اسلوب بیان اور انفس و آفاق کے جابجا حوالے ایک ایسے اسلوب دعوت کے غماز ہیں جو اپنی نوعیت اور خصائص میں ایک منفرد شان رکھتا ہے۔

جب تک مبلغین اسلام اور کارکنان دعوت روح قرآن سے سرشار رہے ان کی دعوتی سرگرمیاں مسلسل کامیابی کی منازل طے کرتی چلی گئیں۔ لیکن جب سے قرآن مجید کی دعوت کے بجائے مسلمانوں نے شارحین قرآن اور مفسرین قرآن کی فہم وبصیرت کو دعوت کا موضوع بنایا ہے اس وقت سے ان کی دعوتی سرگرمیوں میں نہ وہ برکت محسوس ہوتی ہے جو صدر اسلام میں محسوس ہوتی تھی اور نہ وہ ثمرات نظر آتے ہیں جنہوں نے اسلامی دعوت کو چار دانگ عالم میں پہنچا دیا تھا۔

قرآن مجید کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز دعوت اور آپ کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ کے جذبہ دعوت نے اس پورے عمل کو نئی نئی جہتوں سے مالا مال کیا۔ تاریخ کا یہ ایک انتہائی اہم اور دلچسپ باب ہے کہ جن جن علاقوں اور جن جن اقوام میں صحابہ کرامؓ کے مبارک ہاتھوں اسلام کی معاشرت تعمیر ہوئی وہاں اسلام کی جڑیں آج بھی اتنی مضبوط اور گہری ہیں کہ کوئی بڑی سے بڑی آندھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتی۔ تاریخ اسلام اس بات کی شاہد ہے کہ بڑے سے بڑا طوفان بھی صحابہ کرامؓ کے لگائے ہوئے اسلام کے اس شجر سایہ دار کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا۔

دعوت اسلام کی تاریخ دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ یہ اہل ایمان کے لیے جرات آموز بھی ہے اور راہ کشا بھی۔ صحابہ کرامؓ اور بعد میں آنے والے مبلغین اسلام کے کارنامے آج بھی وہ جذبہ صادق پیدا کرتے ہیں جس کی داعیان اسلام کو ہر دور میں ضرورت رہی ہے۔ تاریخ دعوت کی اس غیر معمولی تعلیمی، تربیتی اور ترغیبی اہمیت کے باوجود یہ ایک عجیب بات ہے کہ مؤرخین اسلام نے اس پر زیادہ توجہ نہیں فرمائی۔ دعوت اسلام کے اسلوب اور ارتقاء پر مستقل بالذات کتابوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ یہ مواد تاریخ اور تذکرہ کی کتابوں میں بکھرا ہوا ہے۔

Marfat.com

انیسویں صدی کے آخر میں جب مشہور انگریز مستشرق، مؤرخ اور فلسفی سر ٹامس آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام شائع ہوئی تو دنیائے اسلام میں اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور کئی اسلامی زبانوں میں اس کے ترجمے ذوق وشوق سے کیے گئے۔ کچھ آرنلڈ کی اس کتاب کی پیدا کردہ تحریک تھی اور کچھ اہل مغرب کا یہ بے بنیاد اور غیر حقیقی دعویٰ کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ ان دونوں اسباب کی بناء پر بیسویں صدی میں متعدد اہل علم نے اس موضوع پر قلم اٹھایا۔

دعوت کے اسلوب اور تاریخ دعوت پر بیسویں صدی کے مسلمان اہل علم کے قلم سے جتنی کتابیں نکلیں اتنی شاید اسلام کی پہلی ۱۳ صدیوں میں ملا کر بھی نہ لکھی گئی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیاں پیغام اسلام کی زبردست اور غیر معمولی تیز رفتاری کے ساتھ نشر واشاعت کی صدیاں تھیں۔ اس زمانے میں نہ کسی کو یہ اعتراض کرنے کی جسارت ہوئی کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیل رہا ہے اور نہ مسلمان اہل علم کو اس چیز کا جواب دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مزید برآں اسلام کا مزاج خالص عملی ہے نظری نہیں۔ مسلمان اہل علم کی توجہ کا مرکز بیشتر عملی مسائل رہے ہیں۔ خالص نظری مسائل کو اولین توجہ کا مرکز بنانا ایک غیر عربی رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔

لیکن آج تاریخ دعوت، اسلوب دعوت اور ثمرات دعوت کا موضوع محض نظری موضوع نہیں ہے۔ اس وقت اس موضوع کی حیثیت ایک تازہ اور زندہ کلامی مسئلے کی بھی ہے، یہ مسئلہ مسلمانوں کے لیے فوری عملی توجہ کا متقاضی بھی ہے اور مسلمان نوجوانوں کے قلب و دماغ میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں اعتماد پیدا کرنے کے لیے بھی اس موضوع پر قلم اٹھانے اور غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ملک کے نامور محقق، مورخ اور متکلم جناب حکیم محمود احمد ظفر ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس اہم ضرورت کا احساس کیا اور اسلام کی دعوتی قوت کے عنوان سے ایک انتہائی جامع اور مبسوط کتاب تحریر فرمائی جو نہ صرف اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ دعوت کا ایک انتہائی حسین اور مربوط مرقع ہے بلکہ اس سے ان لاتعداد غلط فہمیوں کی تردید بھی ہوتی ہے جو بہت سے مغربی اور مشرقی مصنفین نے دانستہ پھیلا

Marfat.com

دی ہیں۔ فاضل مصنف نے جہاں دورِ صحابہ اور تابعین کو خصوصی تفصیلی بحث کا موضوع بنایا ہے، وہاں برصغیر میں دعوت اسلام کی کوششوں کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ برصغیر کے ضمن میں فاضل مصنف نے اکابر صوفیاء کے ساتھ ساتھ چند ایسی شخصیتوں کی دعوتی مساعی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جن کے کارناموں کو برصغیر نے کم وبیش بھلا ڈالا ہے۔

محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے فوراً بعد اسلام کی دعوت وتبلیغ کے بارے میں مصنف نے انتہائی مستند اور معاصر تاریخی ماخذ کی مدد سے یہ بتایا ہے کہ سندھ میں اور سندھ کے بعد جنوبی اور مغربی ہندوستان میں اشاعت اسلام کیونکر ممکن ہوئی۔ اس ضمن میں مصنف نے مشہور محدث اور مفسر القرآن شیخ اسماعیل لاہوری اور ایک اور نامور محدث اور ماہر لغت امام حسن صغانی لاہوری کا بھی ذکر کیا ہے جو برصغیر کی علمی تاریخ میں بالعموم اور برصغیر میں علم حدیث اور عربی لغت کی تاریخ میں بالخصوص شاید سب سے اونچے مقام کے حامل ہیں۔

بعد کے اہل علم جن میں دو شخصیتوں کو برصغیر کی دینی اور اسلامی زندگی میں انتہائی اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے، یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ان کی دعوتی مساعی کے بارے میں مصنف نے قابل قدر معلومات فراہم کی ہیں۔

کتاب کا اختتام تبلیغی جماعت کے تذکرے سے ہوتا ہے جس کے کام اور پیغام کے اثرات وثمرات آج دنیا کے ہر گوشے میں محسوس کیے جا رہے ہیں۔ یوں یہ کتاب اسلام کی دعوتی قوت کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ایک جامع دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اکیسویں صدی کے اوائل میں لکھی جانے والی یہ کتاب اس صدی میں کارکنان دعوت کے لیے ایک رہنما کتاب ثابت ہوگی، مؤرخین دعوت کے لیے یہ ایک علمی ماخذ کا کام دے گی اور طلباء دعوت کے لیے اس کی حیثیت ایک بنیادی درسی کتاب کی ہوگی، ان شاء اللہ۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس علمی کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور مصنف کے لیے اس کو ذخیرہ آخرت بنائے۔ (آمین)

اسلام آباد ۱۶ ربیع الآخر ۱۴۲۴ھ — ڈاکٹر محمود احمد غازی

Marfat.com

پیش آہنگ

قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں جس قدر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ان کی بعثت کا مقصد صرف یہی رہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، خدائی قانون کی اطاعت اور اپنی نبوت کی اتباع کی دنیا میں رہنے والوں کو دعوت دیں تاکہ اپنے اللہ سے بچھڑا ہوا بندہ جو اپنی پوجا کے لیے ہر روز ایک نیا خدا بنالیتا ہے، سب باطل خداؤں کو چھوڑ کر ایک اللہ رب العزت کے دروازے پر اپنی جبین نیاز جھکائے، لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر قسم کی نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے لہٰذا یہ بارگراں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کندھوں پر ڈال دیا گیا اور ساتھ ہی اس عظیم الشان کام کی کارکردگی کے صلہ میں ''خیرامت'' کا بہترین لقب عطا فرمایا گیا اور اس لقب کی وجہ سے اسے دوسری امتوں پر فضیلت عطا فرمائی گئی۔ چنانچہ فرمایا:

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر و تؤمنون باللہ

یعنی بتایا یہ کہ اے مسلمانو! تم اپنی ذمہ داری کو محسوس کرو۔ تم اس زمین پر توحید کے امانت دار ہو، اللہ کے خلیفہ ہو، الٰہی قانون کے تحفظ اور اس کے نفاذ کے لیے، دنیا کے نظام عدل کو برقرار اور متوازن رکھنے کے لیے اور ظلم وستم کو زمین کے سینہ سے مٹانے کے لیے بھیجے گئے ہو۔ تمہاری زندگی کا مشن ہی یہی ہے کہ حق تعالیٰ کے نائب اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اس دنیا میں اللہ کے دین کی دعوت دو۔ نظام حق کی مشین

Marfat.com

کے ایک ایک پرزے کو درست رکھو اور نظام باطل کا زور نہ چلنے دو۔

آیت کریمہ میں پہلا لفظ "کنتم" علامہ آلوسی کے مطابق دوام پر دلالت کرتا ہے۔ پھر "للناس" کا لفظ لا کر اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم صرف اپنوں ہی میں تبلیغ کو محدود نہ کرو بلکہ بیگانوں تک بھی اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسالت نبویؐ کا پیغام پہنچاؤ۔ دعوت اسلام کو صرف مسجدوں کے اندر رہنے والوں ہی تک نہ رکھو بلکہ مسجدوں میں نہ آنے والوں تک بھی اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاؤ۔ صرف مسلم ممالک ہی میں تم اسلام کا پیغام نہ سناتے پھرو بلکہ یورپ کے کلیساؤں اور افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں بھی تمہاری اذانیں گونجیں۔ نہ صرف زمین پر چلنے والوں ہی کے لیے تمہارے وعظ ہوں بلکہ فضا میں اڑنے والوں اور سمندروں کے سینوں کو چیرنے والے جہازوں میں بیٹھے ہوؤں کے لیے بھی تم داعی الی اللہ بنو۔ غرضیکہ اس کرۂ ارض پر حق تعالیٰ کی ساری مخلوق کو خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی، ہندو ہو یا پارسی، بدھ مت ہو یا جین مت، کمیونزم سے اس کا تعلق ہو یا فاشزم سے، کسی بھی عقیدے، کسی بھی مسلک اور کسی بھی نظریہ خیال کا ماننے والا ہو، ہر ایک تک اللہ کا پیغام جس طریقے سے بھی ہو سکے، پہنچانے کی ذمہ داری امت محمدیہ کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کی یہ دعوت کس طرح دیں؟ اس سلسلہ میں یہ بتایا گیا کہ اسلام کے دو پہلو ہیں (۱) ایجابی پہلو محبت و آشتی اور (۲) سلبی پہلو شدۃ و غلظت۔ اس بات کو زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ (۱) اسلام کی حفاظت اور اشاعت، اور (۲) اسلام کی مدافعت۔ اشاعت اور حفاظت اسلام کے معنی کتب اسلامیہ، مساجد و مقابر اور خانقاہوں کی تعمیر نہیں بلکہ حفاظت کے معنی اپنے نفوس سے اسلام کو زندہ رکھنے کے ہیں یعنی کتابوں کے نقوش ہمارے نفوس میں احوال و کیفیات کی صورت میں جلوہ گر ہو جائیں۔ اس کے اقوال کی حفاظت ہماری زبان سے، اعمال کی حفاظت ہمارے اعضاء و جوارح سے اور عقائد و تصورات کی حفاظت ہمارے قلب و دماغ سے ہونے لگے۔ گویا ہم اسلام کی شیرینی کے لیے پانی ہوں جس میں وہ گھل مل جائے اور ہم اور اسلام دونوں ایک ذات ہو کر اسلام کی ایک چلتی پھرتی زندہ

Marfat.com

تصویر ہو جائیں۔ مسجد میں جائیں تو دیکھنے والے ہمیں اسلام کی زندہ تصویر سمجھیں۔ دفتر میں جائیں تو ہمارے ایک ایک عضو سے اسلام ٹپکے۔ دوکان میں بیٹھیں تو ہر گاہک کو قرون اولیٰ کا زمانہ یاد آ جائے۔ غرضیکہ صورت یہ ہو جائے کہ اگر اسلام کو کوئی دنیا میں دیکھنا چاہے تو ہمیں دیکھ لے۔

صحابہ کرامؓ نے کبھی بھی اس طریقہ سے اسلام کی دعوت و تبلیغ نہیں دی تھی جس طریقہ سے ہم دیتے ہیں۔ وہ خود اسلام کی روشن دلیل بنے اور انہوں نے باوجود اپنی تعداد کی قلت کے ساری دنیا کو اسلام سے روشن کر دیا۔ جہاں ایک صحابی چلا جاتا تھا اس کو دیکھ کر سارا شہر اسلام کا گرویدہ ہو جاتا تھا کیونکہ شمع ایک ہی ہوتی ہے اور روشن اس سے ہزاروں گوشے ہو جاتے ہیں، مگر آج ہم اس کی حفاظت اور دعوت کے لیے اس شان سے کھڑے ہیں کہ ہم ایک جانب ہیں اور اسلام ہمارے اندر نہیں بلکہ باہر دوسری جانب، اور ہم اس کی حفاظت و دعوت کے وسائل و ذرائع پر غور و فکر بھی کر رہے ہیں اور اس کی تلاش میں بھی مصروف و مشغول ہیں، حالانکہ اس کی حفاظت اور دعوت کا وسیلہ ہم خود ہی تھے۔ اب ہمارے اسلام سے الگ کھڑے ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ غیروں کو تو اسلام نظر نہیں آتا اور ہمیں اس کا طریق حفاظت اور ذریعہ دعوت ہاتھ نہیں لگتا یعنی کافر تو اندھیرے میں تھا ہی مسلمان بھی اندھیرے میں ہو گیا، لیکن اگر مسلمان خود اسلام کی روشن شمع ہوتا تو غیروں کو بھی روشن کرتا اور اسلام کی دعوت و حفاظت پر اسے غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔

ان سب باتوں کے باوجود مسلمانوں نے دعوت کے فریضہ کو ہر دور میں ادا کیا۔ اگرچہ مشنریوں کی طرح مسلمانوں کی انجمنیں نہ تھیں جن کے تحت وہ دعوت کا کام کرتے، لیکن پھر بھی ہر مسلمان نے خواہ اس کا تعلق عوام سے ہو یا خواص سے، علماء سے ہو یا جہلاء سے، اشاعت دین اور اسلام کی دعوت کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کی۔ مسیحیت میں ابتداء ہی سے مسیحی کلیسا نے آئین و دستور ہی ایسا بنایا کہ اس کی تبلیغ کے لیے اکثر اوقات سند یافتہ پادری اور رہبان مقرر کیے جاتے جن کا کام عیسائیت کی تبلیغ کرنا ہوتا لیکن اسلام میں ایسی کوئی جماعت نہیں اور نہ ہی کلیسا کی طرح کوئی نظام موجود

Marfat.com

ہے، اس لیے مسلمانوں نے جوش تبلیغ میں جو صورتیں اختیار کی ہیں وہ عیسائیت سے بالکل مختلف ہیں۔ اسلام میں ہر ایک فرد میں تبلیغ و دعوت کی ذمہ داری کا پورا پورا احساس موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اسلامی تعلیمات کی اہمیت کا نقش ایک دفعہ کسی کے دل میں بیٹھ جاتا ہے تو وہ غیر مسلموں کے سامنے اپنے عقائد کی دعوت و تبلیغ کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک ولندیزی مستشرق سنوک ہرخرینہ نے لکھا ہے کہ ''کوئی مسلمان خواہ وہ کیسا ہی دنیا دار کیوں نہ ہو، اسلام کی دعوت و تبلیغ کرنا بہر کیف اس کی فطرت میں داخل ہے۔'' اسی طرح جرمن دانشور من سنگر نے لکھا ہے کہ ''ہر ایک مسلمان طبعاً اپنے مذہب کا مبلغ ہے جو تبلیغی کام کو اپنے صرفے سے جاری رکھتا ہے۔'' یہ اقوال اپنی جگہ پر بالکل درست اور صحیح ہیں کیونکہ بہت کم متقی اور پرہیز گار مسلمان ایسے ملیں گے جو غیر مسلموں کے ساتھ روزانہ میل جول رکھتے ہوں اور اس حکم خداوندی سے ناآشنا اور غافل ہوں:

> ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن۔ (النحل: ۱۲۵)
>
> یعنی اے پیغمبر! آپ لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ دعوت دیں، اور نصیحت کے ساتھ اور ان کے ساتھ بہترین طریقہ کے ساتھ مباحثہ کریں۔

علمائے اسلام کا گروہ ایک ایسا گروہ ہے جنھوں نے اپنا تمام وقت اور اپنی تمام قوتیں اور توانائیاں دعوت و تبلیغ کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ وہ اپنے مواعظ اور درس و تدریس میں اسلام کی دعوت دیتے ہیں، لیکن ان کے دوش بدوش ہمیں مسلمان معاشرے کے ہر طبقہ میں ایسے مردوں اور خواتین کا سراغ بھی ملتا ہے جنھوں نے دعوت اسلام میں بڑی جانفشانی سے کام لیا ہے۔ ان میں بادشاہ سے لے کر ایک معمولی کسان تک ہر درجے کے لوگ شامل ہیں چنانچہ مراکش کے فرمان روا مولائی اسماعیل نے ۱۶۹۸ء میں انگلستان کے شہنشاہ جیمز دوم کو ایک خط میں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ مسلمان تاجروں نے بھی دعوت کے اس کام میں بڑی سرگرمی دکھائی ہے۔ چنانچہ

Marfat.com

انجمن حمایت اسلام، لاہور کے ماہوار رسالہ بابت اکتوبر ۱۸۸۹ء میں ہندوستانی مبلغوں اور داعیوں کی جو فہرست چھپی ہے اس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لوگ ملتے ہیں۔ اس میں ہمیں اسکول ٹیچروں، سرکاری محکموں کے کلرکوں اور تاجروں کے نام بھی ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ اخبار کے ایک ایڈیٹر کا نام بھی ہے۔ ان داعیوں میں اونٹ گاڑیوں کا کام کرنے والے ایک صاحب، ایک جلد ساز اور ایک پرنٹنگ پریس کا ملازم بھی ہے۔ یہ لوگ دن بھر کام کرنے کے بعد اپنے فارغ وقت میں شہروں کے گلی کوچوں میں دین اسلام کی لوگوں کو اپنے وعظ کے ذریعہ دعوت اسلام دیتے تھے اور غیر مسلموں کو مسلمان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اسلام کے ان داعیوں میں صرف مردوں ہی کا نام نہیں ملتا بلکہ عورتوں کی بھی ایک کثیر تعداد ملتی ہے۔ قاہرہ میں ایک عورت سیدہ نفیسہ" گزری ہے جس کا مزار آج بھی قاہرہ کے مشہور و معروف مزاروں میں سے ہے، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے کئی لوگوں کو مسلمان کیا۔ کئی تاتاری شہزادے ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اپنی بیویوں کی ترغیب سے اسلام قبول کیا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں حبشہ کے ملک میں اسلام نے جو ترقی کی ہے وہ بڑی حد تک مسلمان عورتوں کی کوششوں کی رہین منت ہے۔ اور عیسائی سرداروں کی بیویوں نے خاص طور پر اس بارہ میں سعی کی ہے۔ شادی کے موقع پر وہ عیسائیت کا اظہار کرتی تھیں لیکن اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اسلامی طریقہ پر کرتی تھیں اور اپنے مذہب کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی تھیں۔

اس سلسلہ میں مسلمان قیدیوں نے بھی اپنے قید کرنے والوں کو یا اپنے ساتھ قیدیوں کو اپنے دین کی تلقین اور دعوت دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ چنانچہ مشرقی یورپ میں سب سے پہلے اسلام کی اشاعت ایک مسلمان فقیہ کے ذریعہ سے ہوئی جو بازنطینی سلطنت کی قید میں تھے۔ مجدد الف ثانی کو جب شہنشاہ جہانگیر نے گوالیار کے قلعہ میں قید کیا اور آپ قریبا دو برس تک اس کی قید میں رہے۔ اس عرصہ میں آپ نے ہزاروں قیدیوں کو جو ان کے ساتھ محبوس تھے، مسلمان کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جو حضرات جزائر انڈمان بھیجے گئے تھے انہوں نے وہاں بے شمار لوگوں

Marfat.com

کو اپنی دعوت سے حلقہ اسلام میں داخل کیا۔ اور وسطی افریقہ میں ایک دفعہ بلجیئم کی حکومت نے ایک عرب سردار کو سزائے موت دی تھی۔ چنانچہ جب ایک پادری کو اس کی روحانی تسکین کے لیے اس کے پاس بھیجا گیا تو اس سردار نے اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں اس پادری کو اسلام کی دعوت دینے اور اسے مسلمان کرنے کی کوشش میں صرف کیں۔ اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔

ان تمام واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دین کی دعوت اور تبلیغ کا اس قدر شوق اور جذبہ تھا کہ وہ موقع بے موقع ہر وقت اس کی دعوت دینے کے لیے تیار رہتے تھے اور وہ اس شعر کے مصداق تھے ؎

آشنا بیٹھا ہو یا ناآشنا
ہم کو مطلب اپنے قیل و قال سے

اور وہ اپنی اس دعوت میں ایک گونہ روحانی تسکین محسوس کرتے تھے۔

(آدمی کو جب اپنے کام میں کامیابی کی راہیں کھلتی نظر آئیں تو اس کے شوق و ذوق میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ مسلمان داعی جب لوگوں کو اپنے دین کی دعوت دیتے تھے تو ان کو اس میں بڑی جلدی کامیابی حاصل ہوتی تھی۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ان میں سے ایک سب سے بڑی وجہ اسلامی تعلیم کی سادگی ہے۔) لاالٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ یہ دو سادہ سے عقائد ہیں جن کا اقرار ایک نومسلم کے لیے ضروری ہے۔ اس کلمۂ شہادت کے بعد اور کوئی ایسا رمز و کنایہ نہیں ہے جس کی عبارت مشکل اور پیچیدہ ہو۔ یہ اسلامی عقیدہ اس قدر صاف اور سادہ ہے کہ انسان کو اس کے قبول کرنے میں کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔ اس کے سمجھنے میں انسان کو کوئی عقلی مشکلات پیش نہیں آتیں بلکہ معمولی اور ادنیٰ فہم کے لوگ بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس کلمہ کے ساتھ الٰہیات کے پیچیدہ اور دقیق مسائل شامل نہیں جیسا کہ عیسائیوں کے عقیدہ اتھاناسس (Athanasis) جو کہ عیسائی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ میں مرقوم ہے:

”خدا میں تین شخص ہیں: باپ، بیٹا، روح القدس۔ خدا اس پاک تثلیث کا پہلا

Marfat.com

شخص جو بیٹے اور روح القدس کا شروع ہے۔ یہ تینوں شخص آپس میں بالکل برابر ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں، اس لیے تینوں یکساں الٰہی عزت کے لائق ہیں۔ یسوع مسیح سچا خدا اور سچا آدمی بھی ہے اور مقدسہ مریم سچ مچ خدا کی ماں بنی۔ باپ خاص کر قادر مطلق اس لیے نہیں کہلاتا کہ وہ زیادہ قدرت والا ہے بلکہ اس لیے کہ پاک نوشتوں میں قدرت باپ کی، دانائی بیٹے کی اور پاکیزگی روح القدس کی کہلاتی ہے۔'' (مسیحی تعلیم، باب پاک تثلیث ص ۱۹-۲۷، لاہور)

اس ناقابل فہم بلکہ خلاف عقل وخرد اور خلاف فطرت بات کو جب مفکرین نے فکر ونظر کے ترازو میں تولنا شروع کیا تو عیسائی پادریوں نے لوگوں کو تسلی دینے کے لیے یہ کہہ دیا:

''ہم اس بات کو ٹھیک نہیں سمجھتے کیونکہ ایمان کا یہ ایک بھید ہے۔''

(ص ۲۰ حوالہ مذکور)

اسلام کے اس کلمہ میں جو ایک غیر مسلم کو مسلمان بناتا ہے کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ اس کلمہ کے پہلے حصہ میں ایک ایسا عقیدہ بیان کیا گیا ہے جو تمام بنی نوع انسان کے نزدیک ایک بدیہی امر ہے۔ اس کا دوسرا حصہ خدا تعالیٰ اور انسان کے باہمی تعلق کے ایک ایسے نظریے پر مبنی ہے جو پہلے نظریہ کی طرح عام ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے بے شمار نبیوں اور رسولوں کو دنیا میں بھیجا اور ان پر اپنی وحی نازل کی۔ اسلامی عقیدہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کا دارومدار عقل پر ہے اور اس سے اسلام کی اشاعت میں بڑی سہولت اور آسانی پیدا ہوئی ہے۔ اور اس بات میں کوئی شک وشبہ بھی نہیں کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جس کا انداز فکر بنیادی اور حقیقی طور پر عقلی (Rationalistic) ہے۔ چنانچہ یہ تمام پیچیدگیوں سے پاک اور منزہ ہے اور اس کا سمجھنا عوام کے لیے آسان ہے، اس لیے اس میں لوگوں کے دل ودماغ میں راہ پانے کی حیرت انگیز قوت اور صلاحیت موجود ہے۔

جب کوئی نومسلم اسلام کا یہ سیدھا سادہ اور غیر پیچیدہ عقیدہ قبول کر لیتا ہے تو پھر اسے اس دین کے چار عملی فرائض کی دعوت دی جاتی ہے (۱) نماز (۲) زکوٰۃ (۳) رمضان کے روزے اور (۴) بیت اللہ کا حج۔

Marfat.com

پانچوں وقت کی نماز کو لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے اور ان کی عقیدت کو برقرار رکھنے میں بڑا دخل ہے۔ کیونکہ مسلمان کا دین ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور روزانہ پانچ وقت نماز کی صورت میں ایسے سنجیدہ اور موثر طریقے پر ظاہر ہوتا ہے کہ نمازی اور تماشائی (دیکھنے والے) دونوں کے دلوں پر بغیر اثر کیے نہیں رہتا۔ اسکندریہ کا ایک یہودی سعید بن حسن جس نے ۱۲۹۸ء میں اسلام قبول کیا تھا، لکھتا ہے کہ ''جمعہ کی نماز باجماعت کا جو نظارہ میں نے مسجد میں دیکھا تھا، وہ میرے تبدیل مذہب کا فیصلہ کن سبب ثابت ہوا۔ ایک سخت بیماری کے دوران میں میں نے ایک خواب دیکھا جس میں مجھ سے ایک آواز کہہ رہی تھی کہ تم اپنے اسلام کا اعلان کرو۔ اس کے بعد جب میں ایک مسجد میں داخل ہوا اور مسلمانوں کو دیکھا کہ وہ فرشتوں کی طرح صفیں باندھے کھڑے ہیں تو میرے دل سے آواز اٹھی کہ یہی وہ امت ہے جس کی آمد کی انبیاء علیہم السلام نے بشارت دی تھی۔ جب خطیب نمودار ہوا جو ایک سیاہ جبہ میں ملبوس تھا تو میرے دل پر ایک ہیبت چھا گئی۔ جب اس نے اپنے خطبے کو اس آیت کے ساتھ ختم کیا:

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغیٰ یعظکم لعلکم تذکرون۔

تو میں بے حد متاثر ہوا۔ جب نماز شروع ہوئی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا یہ فرشتوں کی صفیں ہیں۔ ان کے رکوع وسجود کے وقت خدا اپنی تجلی دکھا رہا ہے، اور میرے اندر سے ایک آواز مجھ سے کہہ رہی ہے کہ اگر خدا بنی اسرائیل سے اس تمام عرصہ میں دو مرتبہ مخاطب ہوا ہے تو وہ اس امت سے ہر نماز کے وقت مخاطب ہوتا ہے۔ مجھے اپنے دل میں اس بات کا یقین ہو گیا کہ میں تو مسلمان ہونے کے لیے پیدا ہوا تھا۔

زکوٰۃ ادا کرنا دوسرا اسلامی مذہبی فریضہ ہے جو مسلمان کو ہمیشہ یہ بات یاد دلاتا ہے۔ کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں (انما المومنون اخوۃ) اس مذہبی اصول پر اسلامی معاشرے میں مؤثر طریقے پر عمل ہوتا ہے اور اس کی رو سے ایک نومسلم کے ساتھ ہمیشہ شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ایک نومسلم خواہ اس کا تعلق کسی رنگ، نسل اور وطن سے ہو، اسلام قبول کرتے ہی مسلمانوں کی برادری میں شامل ہو جاتا

Marfat.com

ہے، اور اسے ان کے درمیان برابری کا درجہ ملتا ہے۔

اسی طرح رمضان کے روزوں کے بارہ میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ان سے اس خیال کی پوری تردید ہوتی ہے کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو لوگوں کے لیے عیش وعشرت کا سامان فراہم کر کے اپنی طرف کھینچتا ہے جیسا کہ ٹامس کارلائل (Thomas Carlyle) نے کہا ہے کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذہب کوئی آسان مذہب نہیں ہے۔ اس میں روزوں کی سخت پابندی ہے۔ وضو اور غسل کی تاکید ہے۔ پانچ وقت کی نماز ہے اور شراب سے اجتناب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ اسے اپنی آسانی کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی۔"

پانچواں رکن اسلام کا حج ہے۔ اشاعت اسلام کی تاریخ میں اس کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ اس موقع پر مکہ مکرمہ میں دنیا کے تمام ملکوں، قوموں اور زبانوں کے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور وہ اس حرم مقدس میں دعائیں مانگتے ہیں مسلمانوں کو اس بات کا احساس دلانے کے لیے کہ ان کا ایک مشترکہ معاشرہ ہے اور وہ سب اخوت اسلامی کے نہ ٹوٹنے والے رشتہ میں منسلک ہیں۔

مختصر یہ کہ اسلام کا یہ ارکان بھی اس کی اشاعت کے لیے بڑے ممد ومعاون ثابت ہوئے ہیں۔ اسلام کی اشاعت میں جن اسباب کو دخل ہوا ان میں ایک سبب اسلام کی مذہبی رواداری بھی تھا۔ اسلام غیر مسلموں کے لیے مذہبی رواداری کی تلقین و تاکید کرتا ہے اور غیر مذاہب کے ان تمام لوگوں کو مذہبی آزادی دیتا ہے جو اپنی حفاظت کے معاوضہ میں جزیہ ادا کریں۔ رواداری مسلمانوں کی طبیعت کا ایک محکم خاصہ اور مکمل مذہبی آزادی ان کے مذہب کا دستور العمل رہا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی اس رواداری کو دیکھ کر بھی بہت سے غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا تھا جس کے کئی واقعات تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

مسلمانوں کی نیک عادات، تقویٰ اور پرہیزگاری نے بھی اسلام کی اشاعت میں بڑا کام کیا۔ چنانچہ بہت سے عیسائی جن کو مسلمانوں سے ملنے جلنے اور میل ملاپ کا اتفاق ہوا ہے، ان کی پارسائی، پرہیزگاری اور نیک اور پاکیزہ عادات سے بہت متاثر

۳۷۰۱۵

Marfat.com

ہوئے اور بالآخر کئی مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ ڈرومینیکن فرقے کے ایک پادری جس کا نام ریکولدوس تھا۔ اس نے تیرھویں صدی عیسوی میں مشرقی ملکوں کی سیاحت کی تھی۔ وہ مسلمانوں کے بارہ میں لکھتا ہے:

''یہ دیکھ کر ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ مسلمانوں کے مذہب میں کس کمال درجے کی خوبیاں موجود ہیں۔ اب ہم مسلمانوں کی نیک باتوں اور کاموں کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ ایسا کون شخص ہوگا جو غور سے دیکھے اور اس بات پر متعجب نہ ہو کہ مسلمانوں کو تحصیل علم کا کس قدر شوق ہے۔ کس خشوع وخضوع سے وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ محتاجوں کے ساتھ کیسے فیاض ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے نام کی کیسی عظمت کرتے ہیں۔ ان کے آثار مقدسہ کا کس قدر احترام کیا جاتا ہے۔ ان کی باتوں میں کس قدر متانت اور سنجیدگی ہے۔ اجنبی لوگوں کے ساتھ وہ کس قدر نیک سلوک کرتے ہیں۔ اور مسلمان آپس میں کیسی الفت اور محبت رکھتے ہیں۔''

یہ ہیں وہ چند اسباب جن کی وجہ سے اسلام کے داعیوں اور مبلغین کو اشاعت اسلام میں بڑی سہولت میسر آئی۔ دوسرے لفظوں میں خود اسلام ایسی خوبیوں والا دین ہے کہ جو بھی اس کی تعلیمات کو سنتا اور پڑھتا ہے اس کا گرویدہ اور پیروکار ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں ہم نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر قریباً موجودہ دور تک کے اہم واقعات جمع کر دیے ہیں جن میں دعوت اسلامی کی قوت نظر آتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ اسلامی دعوت میں اتنی قوت موجود ہے کہ بڑے سے بڑا غیر مسلم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ہر دور میں داعیوں کی دعوت سے غیر مسلم حضرات متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوتے رہے لیکن افسوس کہ اس زمانہ میں اس قوت کو گلدستہ طاق نسیان بنا دیا گیا اور مختلف ملکوں میں اسلامی سیاسی تحریکوں نے اسلام کو فائدہ تو کچھ نہ پہنچایا بلکہ الٹا نقصان پہنچایا۔ اگر یہ سارے ذرائع جو آج الیکشنوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے استعمال ہو رہے ہیں، اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے استعمال ہوتے تو آج دین کی حالت کچھ اور ہوتی۔

Marfat.com

اس کتاب کی تیاری میں ہم نے اسلامی تواریخ کی کتابوں کے علاوہ بہت سا مواد پروفیسر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام سے بھی لیا ہے۔ جو لوگ یہ الزام دیتے تھے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، اللہ تعالیٰ نے ایک عیسائی کے قلم سے یہ کتاب لکھوا کر صنم خانے سے کعبہ کی پاسبانی کروا دی۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک نہایت کامیاب کتاب ہے۔ اور مصنف نے بڑی محنت سے اس کو مرتب کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر آرنلڈ بھی اسلام سے بڑا متاثر تھا، پھر معلوم نہیں کہ یہ اسلام لانے سے محروم کیسے رہ گیا؟ اس سے اس بات کا بھی پتہ چلا کہ اسلام پسند ہونا نجات کے لیے کافی نہیں بلکہ اسلام پابند ہونا نجات کے لیے ضروری ہے کیونکہ بہت سے مستشرقین اسلام پسند تھے لیکن پھر بھی اسلام کی لازوال دولت سے محروم رہے۔ برناڈ شا یہ تو کہہ گیا کہ آئندہ صدی میں یورپ کا مذہب اسلام ہوگا لیکن خود اسلام کی برکات سے محروم رہا۔

بہرحال ہم نے اس کتاب میں ''اسلام کی دعوتی قوت'' کو دلائل و براہین سے ثابت کرنے کی ایک اجمالی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ قارئین کرام احقر کی اس کوشش کو پسند فرمائیں گے اور اگر انہیں کہیں خامی یا جھول نظر آئے تو احقر کو ضرور مطلع فرمائیں۔ اور اگر کتاب پسند آئے تو اپنی خصوصی دعوات میں یاد رکھیں۔

آخر میں احقر محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب، سابق وفاقی وزیر وزارت مذہبی امور حکومت پاکستان کا نہایت ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کا مقدمہ لکھ کر میری عزت افزائی فرمائی۔

محتاج دعا:

حکیم محمود احمد ظفر

۲۰ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۶ نومبر ۲۰۰۲ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم○

دعوتِ اسلام

حق تعالیٰ شانہ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ، والموعظۃ الحسنۃ، وجادلھم بالتی ھی احسن، ان ربک ھو اعلم بمن ضلّ عن سبیلہ، وھو اعلم بالمھتدین۔ (النحل: ۱۲۵)

آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دیجئے، اور ان کے ساتھ بہترین طریقہ کے ساتھ مباحثہ کیجئے، آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔

اس آیت کریمہ میں دعوت کے اصول بیان فرمائے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو دعوت وتبلیغ کا حکم دیا گیا۔ آیت کو صیغہ امر ''ادع'' سے شروع کیا گیا۔ یہ چونکہ متعدی فعل ہے لہٰذا اس کے لیے ایک فاعل یعنی داعی اور مفعول یعنی مدعو کی ضرورت ہے۔ پھر اس بات کی کہ دعوت کیا دی جائے یعنی کس شی کی طرف دعوت دی جائے جسے مدعوالیہ کہا جاتا ہے۔ لہٰذا صیغہ ''ادع'' سے چار مقام پیدا ہوئے۔

(۱) دعوت (۲) داعی (۳) مدعو اور (۴) مدعوالیہ

جب فعل دعوت ''ادع'' سے ثابت ہے تو داعی اور مدعوالیہ کا ثبوت قدرتی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ کوئی داعی بغیر اپنے مخاطب مدعو کے داعی نہیں کہلا سکتا۔ اور پھر

داعی اور مدعو اور مدعو بغیر اس شیٔ دعوت کردہ کے داعی اور مدعو نہیں ہو سکے۔ اس وجہ سے مندرجہ بالا چاروں مقامات اس صیغہ ادع سے ثابت ہو گئے۔

آیت کا مخاطب سب سے پہلے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس لیے اس دعوت کے داعی اولاً نبی آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور پھر امت کے وہ تمام علمائے دعوت و تبلیغ ہیں جو آپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت چونکہ کسی قوم وملت کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ آپ سارے عالم کے لیے نبی ہیں ''انی رسول اللہ الیکم جمیعاً۔'' اس لیے آپ کی دعوت کو مدعو تمام ملل و اقوام ہوں گی جس کو ''امت دعوت'' کہتے ہیں۔ اطلاق عام مقصود ہوتا ہے تو مفعول کو لفظوں میں ذکر نہیں کرتے۔ اس سے پتہ چلا کہ آیت میں دعوت کا مدعو کوئی خاص فرد یا قوم نہیں بلکہ دنیا کا ہر وہ فرد ہے جس میں دعوت کو سمجھنے کا مادہ موجود ہے۔ لہٰذا تمام ملل واقوام کا مدعو ہونا بھی اس سے معلوم ہو گیا۔ اب رہ گیا وہ پروگرام جس کی طرف دعوت دی جائے تو وہ بھی آیت ذکر ہے یعنی ''سبیل رب۔'' اللہ کا راستہ۔

مختصر یہ کہ یہ چاروں مقامات دعوت، داعی، مدعو اور مدعو الیہ اور پھر ان چاروں کے مصداق اس آیت سے ثابت ہو گئے۔

دعوت کا مقصد:

اب دعوت ''سبیل رب'' داعی ذات پیغمبر اور اس کے نائبین علماء ومشائخ، مدعو تمام دنیا کی ملل واقوام اور اس دعوت کا مقصود ان مدعوین کی اصلاح وہدایت۔ کیونکہ نفس انسانی کی اصلاح دو چیزوں پر ہے علم نافع اور خلق عادل۔ ان دونوں سے صلاح کی منزل مقصود سامنے آ جاتی ہے۔ اسی سے اصلاح کی حقیقت کا پتہ چل گیا کہ دوسروں کو صحیح علم پہنچانا اور اخلاق کی تعدیل کی تربیت دینا یعنی تعلیم وتربیت۔ معلوم ہوا اپنے نفس کی اصلاح کا ذریعہ تو راہ علم واخلاق کا مجاہدہ ہے اور دوسروں کی اصلاح کا ذریعہ دعوت وارشاد اور تبلیغ وموعظت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں

Marfat.com

کہ خود عالم باعمل بن کر دوسروں کو عالم و عامل بنانا تکمیل سعادت ہے۔ اس لیے دعوت کا مقصود ہے مدعوین کی اصلاح و ہدایت اور اس ہدایت و اصلاح کا دارومدار دراصل دعوت کی خوبی، داعی کی قابلیت اور پروگرام کی مقبولیت پر ہے۔ یعنی پروگرام جاذب توجہ ہو جو مدعو کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ دعوت دل آویز طریقہ سے ہو کہ مدعو کو جانے نہ دے، داعی کا کیریکٹر معیاری ہو کہ مدعو پر اثر انداز ہو سکے۔

چہار گانہ مقاصد:

اس آیت سے چار چیزیں اور مقاصد ثابت ہوئے:

۱- دعوتی پروگرام کی خوبی یہ ہو کہ اس میں مدعوین تک پہنچنے کی صلاحیت ہو۔

۲- دعوت کی خوبی یہ ہے کہ وہ مدعو کے مناسب حال ہو۔

۳- داعی کی خوبی یہ ہے کہ اس کا علمی اور اخلاقی معیار بلند ہو۔

۴- مدعو کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قبولیت دعوت کا جذبہ موجزن ہو۔

دعوتی پروگرام:

یہ دعوتی پروگرام جس کی طرف لوگوں کو بلایا جائے مخاطب کے حق میں کوئی طبعی چیز نہ ہو بلکہ ایک القائی شی ہو جسے دعوت اور تبلیغ کے ذریعہ اس میں ڈالا اور اتارا جائے، لیکن اگر وہ چیز مخاطب کی طبیعت میں موجود ہے تو پھر اسے دعوت کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس کی طرف راہ نمائی انسان کی طبیعت خود بخود کرتی ہے خواہ کوئی داعی اور ہادی آئے یا نہ آئے۔ مثلاً کھانا پینا، بولنا چالنا، چلنا پھرنا وغیرہ انسان کے طبیعاتی امور ہیں اور یہ سب امور طبیعت کے تقاضا کے مطابق انسان سے سرزد ہوتے ہیں لہٰذا ان میں کسی ہادی، داعی اور معلم و مبلغ کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح عقلیاتی میں بھی دعوت و تبلیغ کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ عقل ہر انسان میں تھوڑ بہت موجود ہے۔ اسی وجہ سے عقلیات میں ہر شخص کو رائے زنی کا حق موجود ہے اس میں تقلید نہیں ہے۔ اسی طرح محسوسات میں بھی دعوت و تبلیغ کی ضرورت

نہیں۔اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دعوت وتبلیغ صرف ایسے ہی مقاصد کی ہوسکتی ہے جوایک انسان میں دعوت وتبلیغ ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔اور وہ علم شرعی ہے جس کو علم الٰہی بھی کہتے ہیں یعنی وہ علم جو خالق سے منقول ہو کہ انسان تک پہنچا اور اس علم شرعی کے سوا دوسری تمام چیزیں انسان میں دعوت وتبلیغ سے قبل بھی موجود تھیں۔معلوم ہوا کہ دعوتی پروگرام کی اولین خصوصیت علم الشرائع ہے جو من جانب اللہ ہو خلق کی طرف سے نہ ہو۔اور اگر غور کیا جائے تو اس مدعوالیہ دعوتی پروگرام کی یہ خصوصیت اس آیت دعوت ہی سے نکل رہی ہے کیونکہ آیت میں مدعوالیہ کی تعیین ''سبیل رب'' کے الفاظ سے کی گئی ہے اور خدا کا راستہ علم تشریع ہے جو اس کے علوم وکمالات اور اخلاق پر مشتمل ہے۔

جب آیت میں یہ کہا گیا کہ دعوت وتبلیغ ''سبیل رب'' یعنی اللہ کے راستہ کی کرو اور خدا کا راستہ شرعیاتی پروگرام ہے جو علم الٰہی اور اخلاق ربانی پر مشتمل ہے تو اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ غیر خدا کے راستہ کی طرف شرعیاتی دعوت مت دو اور غیر خدا کا راستہ وہ طبیعاتی اور عقلیات پروگرام ہے جو ہر انسان کی طبیعت سے خود بخود ابھرتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ محدثات و بدعات کی تبلیغ و دعوت جائز نہیں کیونکہ وہ ''سبیل رب'' کا پروگرام نہیں بلکہ سبیل خلق یا سبیل نفس ہے۔اس لیے ہر داعی اور مبلغ کو دعوت اور تبلیغ سے قبل اس پر غور کر لینا چاہیے کہ جس مسئلہ کی وہ دعوت دے رہا ہے وہ شرعی بھی ہے یا نہیں؟ اور آیا شریعت کی مستند اور معتبر کتابوں میں اس کا وجود ہے یا نہیں؟ کیونکہ کسی مسئلہ کا صرف زبان زد ہو جانا یا مسلم معاشرہ میں رواج پکڑ جانا یا کسی غیر معتبر کتاب میں طبع ہو جانا اس کے شرعی ہونے کی دلیل نہیں ہے۔جب تک کہ ان ثقات اہل علم کی زبان وقلم سے اس کی تصدیق وتائید اور نقل و روایت نہ ہو جن کا رات دن کا مشغلہ شرعیات کی تعلیم اور شرعی کتب مین غور وتفکر ہے۔چنانچہ ایک داعی اور مبلغ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اصلی اور سادہ دین کی دعوت دے اور خالص وحی کی تبلیغ کرے کیونکہ مکمل وحی آجانے کے بعد اختراع کا کوئی موقع ہی باقی نہیں رہتا کہ بدعات ومحدثات

Marfat.com

کی تبلیغ جائز رکھی جائے بلکہ صرف اتباع کا درجہ باقی رہ جاتا ہے، لہٰذا موضوع اور منکر روایات، اسرائیلیات، من گھڑت قصے کہانیاں جو عموماً پیشہ اور واعظوں کا پیشہ بن گئی ہیں۔ "سبیل رب" کے لفظ سے سب ممنوع قرار پاتی ہیں جن سے ایک داعی کو احتراز کرنا چاہیے وگرنہ اس کی دعوت بجائے مفید ہونے کے مضر اور بجائے امن وسکون قائم کرنے کے فتنہ وفساد کا ذریعہ ثابت ہوگی اور امت مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی۔

مختصر یہ کہ شرعیات کی دعوت وتبلیغ آیت کے منطوق سے ضروری ضروری ثابت ہوئی ہے جب کہ غیر شرعیات اور محدثات و بدعات کی دعوت اسی آیت سے ممنوع قرار پائی۔

دعوتی پروگرام کی خصوصیات:

دعوتی پروگرام کی کچھ خصوصیات ہیں جن میں چند ایک حسب ذیل ہیں:

(۱) سادگی: سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ دعوتی پروگرام میں سادگی ہو، تکلف نہ ہو، کیونکہ "سبیل رب" کی دعوت وتبلیغ میں تو صرف نقل کی ضرورت ہوتی ہے کسی تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ غیر سبیل رب کی دعوت کی بنیاد ہی تکلف پر ہوتی ہے۔ کیونکہ محدثات اور بدعات کو بنانا پڑتا ہے جب کہ سنت بنی بنائی ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک داعی کو مدعو الیہ میں سادگی اختیار کرنی چاہیے اور ہر قسم کے تکلفات سے احتراز کرنا چاہیے۔ جیسے خاص انداز نے بیان کرنا، بیان کرتے وقت خاص ہئیت بنانا الفاظ میں قافیہ اور سجع کی رعایت تکلف سے کرنا وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ایک مقام پر بیان فرمایا:

قل ما اسئلکم علیه من اجرٍ، وما انا من المتکلفین، ان ھو الاّ ذکر للعالمین۔

اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس قرآنی دعوت پر نہ کچھ اجر اور معاوضہ چاہتا ہوں اور نہ میں بناوٹ اور تکلف کرنے والوں میں سے ہوں اس لیے کہ یہ قرآن تو اللہ کا ذکر ہے (اور ذکر میں بناوٹ نہیں ہوتی)

Marfat.com

(۲) جامعیت: دوسری خصوصیت اس عوتی پروگرام کی جامعیت ہے، لہٰذا "سبیل رب" کا وہ پروگرام ساری ملل واقوام پھیلنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، کسی خاص وطن یا قوم کے لیے وہ دعوتی پروگرام نہ ہو۔ اس میں ذاتی طور پر عمومیت ہو کر وہ دوسری ملل واقوام کی طرف منتقل ہو کر اجتماعی دستورالعمل بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ جامعیت صرف اور صرف اسلام کی دعوتی میں ہے۔ یہ نہ عیسائیت میں ہے اور نہ ہی یہودیت میں ہے۔ خود قرآن حکیم میں ہے:

و کل قوم هاد ہر قوم کے لیے ایک ہادی آیا ہے۔

اس سے یہ پتہ چلا کہ ہر ایک ہادی اپنی قوم کی ہدایت کا ذمہ دار تھا۔ اس کا دعوتی پروگرام اپنی قوم کے علاوہ دوسری قوم کے لیے نہ تھا۔ چنانچہ ہر نبی کی دعوت اور تبلیغ اسی قوم کے دائرہ تک محدود تھی جس کے لیے وہ ہادی بن کر آیا تھا۔ یہ عمومیت نہ تو عیسائیت میں ہے اور نہ ہی یہودیت میں۔ اگر زبردستی اسے عالم گیر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو خود اپنوں کی نگاہ میں اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا، لیکن ان مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی تعلیمات اپنی ماہیت اور حقیقت کے لحاظ سے ہمہ گیر اور ساری دنیا کے لیے ہیں۔ یہ کسی قوم، ملت اور وطن کی طرف منسوب نہیں ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب کے قبائل کو دعوت دینے سے فارغ ہوئے تو آپ نے دنیا کے مختلف بادشاہوں کو دین اسلام کے دعوتی خطوط لکھے اور انہیں دین اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ سیدنا مسور بن مخرمہؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے پاس باہر تشریف لائے اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (ان اللہ بعثنی رحمة للناس کافة) اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے، تم میری طرف سے میرا دین تمام انسانوں تک پہنچاؤ۔ اور جیسے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے ان کے سامنے اختلاف کیا تھا تم میرے سامنے ایسا اختلاف نہ کرنا

Marfat.com

کیونکہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو اسی چیز کی دعوت دی تھی جس کی میں تم کو دعوت دینے لگا ہوں یعنی ان کو دعوت دینے کے لیے دور و نزدیک بھیجنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان میں جس کی تشکیل دور کی ہوئی اس کو ناگوار گزرا اور جس کی تشکیل نزدیک کی ہوئی وہ تیار ہو گئے.........

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم آپ کی طرف سے آپ کا دین تمام انسانوں تک پہنچائیں گے ہمیں جہاں چاہیں بھیج دیں۔ (نحن یا رسول الله: نؤدی الیک فابعثنا حیث شئت)

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عبداللہ بن حذافہؓ کو کسریٰ کے پاس بھیجا اور سلیط بن عمروؓ کو یمامہ کے بادشاہ ہوزہ بن علی کے پاس بھیجا اور علاء بن حضرمیؓ کو ہجر کے راجہ منذر بن ساویٰ کے پاس بھیجا اور سیدنا عمرو بن عاصؓ کو عمان کے دو بادشاہوں جیفر اور عباد کے پاس بھیجا، اور وحیہ کلبیؓ کو قیصر کے پاس بھیجا اور عمرو بن امیہ ضمریؓ کو نجاشی کے پاس بھیجا (مجمع الزوائد جلد ۵ ص ۳۰۶) اور حافظ بن حجرؒ نے لکھا ہے کہ اصحاب سیر نے اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ مہجر بن امیہؓ کو حارث بن عبد کلال کے پاس بھیجا اور جریرؓ کو ذی الکلاع کے پاس ارسال فرمایا اور سائبؓ کو مسیلمہ کے پاس بھیجا اور حاطب بن ابی بلتعہؓ کو شاہ مصر مقوقس کے پاس بھیجا۔ (فتح الباری جلد ۸ ص ۸۹)

~~اس روایت سے پتہ چلا کہ~~ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک قوم، ملت یا وطن کے لیے نبی مبعوث نہ ہوئے تھے بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے آپ کو نبی بنا کر بھیجا گیا۔ اور خود قرآن حکیم نے بھی کہا کہ اے پیغمبر یہ کہہ دے ''انی رسول الله الیکم جمیعاً'' کہ میں تم سب کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اس طرح سے اسلام کی یہ دعوت آپؐ سے پہلے کسی نبی نے نہیں دی تھی اور دیتے بھی کیسے؟ کیونکہ وہ تو ایک خاص قوم اور وطن کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ یہ آپؐ ہی تھے جنہوں نے تمام دنیا

Marfat.com

کے بادشاہوں کو دعوت دے کر اسلام کی طرف بلایا، اور دعوت کے جو الفاظ تھے وہ بھی کچھ یوں تھے:

''میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ مسلمان ہو جاؤ سلامتی پا جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ تم کو دگنا اجر عطا فرمائیں گے۔ اور اگر تم نے اسلام سے منہ پھیرا تو پھر یاد رکھو، تمہاری رعایا کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔ اور اے اہل کتاب! آؤ اس کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں، اور ہم اللہ کے علاوہ ایک دوسرے کو خدا نہ بنائیں۔ اگر اہل کتاب اس دعوت سے منہ پھیر لیں تو اے مسلمانو! تم کہہ دو کہ ہم تو یقیناً مسلمان ہیں۔'')

(البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۲۶۶، بخاری مع فتح الباری جلد ۱ ص ۳۱، ۳۵)

آپ کے اس فرمان کے مطابق صحابہ کرامؓ آپ کے خطوط کو مختلف بادشاہوں کے پاس لے گئے کئی حضرات نے آپ کو نبی تسلیم کیا، کئی بادشاہوں نے خاموشی اختیار کی اور کئی ایسے بد بخت بھی تھے جنہوں نے آپ کے نامہ مبارک کو پھاڑ دیا۔ چنانچہ کسریٰ ایران کے پاس جب آپ کا نامہ مبارک سیدنا عبداللہ بن حذافہؓ لے کر گئے تو اس نے غصہ میں آ کر آپ کے اس خط کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ آپ کو جب اس کی اس حرکت کا پتہ چلا تو آپؐ نے فرمایا:

''اس نے میرا خط نہیں پھاڑا بلکہ اپنی سلطنت کو پارہ پارہ کیا ہے۔'' پھر وہی ہوا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلا تھا۔ خط اس نے تکبر کی وجہ سے پھاڑا کیونکہ حکومت اور تکبر دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اس متکبرانہ انداز میں کہا: ''میری رعایا میں سے ایک حقیر غلام اپنا نام مجھ سے پہلے لکھتا ہے اور مجھے اپنے پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔'' (یکتب الیّ بھذا وھو عبدی)

اپنا غلام کہنے کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت

Marfat.com

ہوئی، اس زمانہ میں جزیرہ نما عرب سامراجی طاقتوں کی شکار گاہ بنا ہوا تھا۔ جزیرہ عرب کے شمال میں شام کا علاقہ مکمل طور پر رومی سلطنت کے زیر اقتدار تھا۔ اس کے اوپر روم کے ماتحت امرائے عرب کی حکومت قائم تھی۔ اسی طرح جنوب میں یمن کا علاقہ ایران کے زیر اقتدار تھا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہاں جو ایرانی گورنر مقیم تھا اس کا نام باذان تھا۔ عربوں کے ہاتھوں میں صرف حجاز، تہامہ اور نجد کے علاقے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ چٹیل اور بے آب و گیاہ بیابان تھے جن میں کہیں کہیں کچھ زرخیز ٹکڑے نظر آتے تھے۔ کسریٰ پرویز نے جب آپ کا نامہ مبارک پھاڑا تو اس کا یہی سیاسی پس منظر تھا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک پھاڑنے کے بعد کسریٰ ایران نے ایمن یمن کے گورنر باذان کو لکھا کہ یہ شخص جو حجاز میں نبوت کا مدعی ہے اس کے یہاں دو مضبوط اور توانا آدمی بھیجو تا کہ وہ اسے گرفتار کر کے میرے پاس حاضر کریں۔ باذان نے کسریٰ کے حکم کی تعمیل میں دو آدمیوں کو خط دے کر آپؐ کے پاس روانہ کیا جس میں آپ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپؐ ان دو آدمیوں کے ساتھ کسریٰ کے پاس حاضر ہو جائیں۔ لیکن جب وہ مدینہ طیبہ پہنچے اور آپؐ کے سامنے حاضر ہوئے تو انہوں نے اپنے آنے کی غرض و غایت بیان کی اور آپ کو کسریٰ کے حضور حاضر ہونے کے لیے کہا۔ آپؐ نے ان دونوں کو حکم فرمایا کہ کل ملاقات کریں۔

ادھر یہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف خسرو پرویز کسریٰ ایران کے خاندان کے اندر ایک زبردست بغاوت کا شعلہ بھڑک رہا تھا جس کے نتیجہ میں قیصر شاہ روم کی فوج کے ہاتھوں ایرانی فوج کی پے در پے شکستوں کے بعد اب خسرو پرویز کا بیٹا شیرویہ اپنے باپ کو قتل کر کے بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ یہ منگل کی رات ۱۰ جمادی الاولیٰ کا واقعہ ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا علم بذریعہ وحی ہوا۔ چنانچہ صبح کے وقت جب باذان کے وہ دونوں آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے انہیں اس واقعہ

کے بارہ میں اطلاع دی۔ اُن دونوں نے اس بات کو غلط کہا اور کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا: ''کیا آپ کی یہ بات ہم بادشاہ کو لکھ دیں؟'' آپؐ نے فرمایا: ''ہاں لکھ دو اور اسے یہ بھی لکھ دو کہ میرا دین اور میری حکومت وہاں تک پہنچ کر رہے گی جہاں تک کسریٰ پہنچ چکا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھتے ہوئے اس جگہ جا کر رکے گی جس سے آگے اونٹ اور گھوڑے کے قدم جا ہی نہیں سکتے۔'' آپؐ نے مزید فرمایا: ''اپنے بادشاہ کو یہ بھی کہہ دینا کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو جو کچھ تمہارے زیر اقتدار اور زیر حکومت ہے وہ سب میں تمہیں دے دوں گا۔'' اس کے بعد باذان کے یہ دونوں آدمی باذان کے پاس چلے گئے اور اسے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد باذان کے پاس ایک خط پہنچا کہ شیرویہ نے اپنے باپ کو قتل کر دیا ہے۔ شیرویہ نے اپنے اس خط میں یہ بھی ہدایت کی کہ جس شخص کے بارہ میں میرے والد خسرو پرویز نے تمہیں لکھا تھا کہ اس کو میرے پاس حاضر کرواسے تا حکم ثانی برانگیختہ نہ کرنا۔

اس واقعہ نے باذان کے ساتھیوں پر بہت اثر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب مشرف باسلام ہو گئے اور اپنے اسلام کے بارہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع بھی دی۔ (ملاحظہ ہو زرقانی جلد ۳ ص ۳۴۲، البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۲۶۸-۲۷۲، محاضرات خضری جلد ا ص ۱۴۷، فتح الباری جلد ۸ ص ۱۲۷، طبری جلد ۳ ص ۹۰، الاصابہ جلد ا ص ۱۶۹، ۲۵۹ مجمع الزوائد جلد ۸ ص ۲۸۷)

پھر دنیا نے دیکھا کہ ایران کا وہ بادشاہ جس نے تکبر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب گرامی کو پھاڑ دیا تھا، اس کی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور خود بھی سیدنا عثمان بن عفانؓ کے عہد خلافت میں ایک آسیابان کے ہاتھوں نہایت کس پرسی کی حالت میں قتل ہوا اور اربوں دینار کا مالک کسریٰ موت کے وقت اس کے پاس چار درہم بھی نہ تھے۔

(طبری جلد ۳ ص ۳۴۷، ابن اثیر جلد ۳ ص ۶۱)

یہ انجام آپ کے اس دعوتی خط کا ہوا جو آپ نے کسریٰ ایران کو لکھا اور اس

نے آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے یک قلم انکار کر دیا۔ اسی طرح کا ایک اور خط اس زمانہ کی دوسری سپر پاور اور سب سے مضبوط حکومت کے بادشاہ قیصر روم کو بھیجا۔ اس خط کو لے کر آپ کے مشہور صحابی سیدنا وحیہ کلبیؓ قیصر روم کے پاس گئے۔ قیصر روم اس زمانہ میں فارس روم پر اپنی فتح یابی کا شکر بجا لانے کے لیے حمص سے ایلیا (بیت المقدس) پیدل آیا ہوا تھا کیونکہ فارسیوں نے خسرو پرویز کو قتل کرنے کے بعد رومیوں سے ان کا مقبوضہ علاقوں کی واپسی کی شرط پر صلح کر لی اور وہ صلیب بھی انہیں واپس کر دی جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اس پر سیدنا مسیح علیہ السلام کو صلیب دی گئی تھی۔ قیصر روم نے اس صلیب کو اس کی اصل جگہ پر نصب کرنے اور اللہ تعالیٰ کا اس فتح پر شکر بجا لانے کی غرض سے سنہ ۷ھ مطابق ۶۲۹ء میں بیت المقدس کا سفر کیا۔ سیدنا وحیہ کلبیؓ سنہ ۷ھ ۷ محرم کو بیت المقدس پہنچے اور بصریٰ کے رئیس کے توسط سے قیصر روم کے دربار میں پہنچ کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ اس کو پیش کیا۔ (بخاری جلد ا ص ۴)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم والا نامہ قیصر روم کو پیش کرنے سے قبل سیدنا وحیہ کلبیؓ نے ایک مختصری تقریر کی، فرمایا:

"اے قیصر! جس ہستی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے وہ سب سے بلند و بالا اور اعلیٰ و ارفع ہے لہٰذا میں جو کچھ آپ کے سامنے عرض کروں اس کو نہایت متواضع ہو کر سنیں اور نہایت غور و فکر اور اخلاص سے اس کا جواب دیں۔ اگر آپ اس کو متواضع ہو کر نہ سنیں گے تو اس کو بخوبی سمجھ نہ سکیں گے۔ اور اگر جواب میں اخلاص نہ ہوگا تو وہ جواب درست اور عادلانہ نہ ہوگا۔"

"یہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نماز پڑھا کرتے تھے جس کے لیے سیدنا مسیح علیہ السلام نماز پڑھا کرتے تھے اور جس کے سامنے وہ اپنی جبین نیاز جھکاتے تھے اور جس نے انہیں بطن مادر میں بنایا اور جس ذات نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا میں اس ذات ستودہ صفات کی طرف

Marfat.com

آپ کو بلاتا ہوں۔ پھر اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دعوت دیتا ہوں جس کی سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسیٰ علیہما السلام نے بشارت دی ہے اور آپ کو اس کی بخوبی خبر ہے۔ اگر آپ اس دعوت کو قبول کریں گے تو یہ آپ کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کے لیے بہتر ہوگی اور اگر قبول نہ کریں گے تو آپ کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ ہوگا ورنہ آخرت تو تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے گی اور دنیا میں دوسرے لوگ آپ کے شریک ہوں گے۔ اور اس بات کو بھی بخوبی جان لیجئے کہ اللہ تعالیٰ جو منکرین کو پامال کر دیتا ہے، اپنی نعمتوں کو بدلتا رہتا ہے۔"

قیصر روم سیدنا دحیہ کلبیؓ کی اس تقریر سے بہت متاثر ہوا اور اس نے ان کے ہاتھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ لے کر سر اور آنکھوں پر رکھا اور اسے چوما، پھر اسے کھول کر پڑھا اور کہا: "میں سوچ کر اس کا جواب دوں گا۔"

(روض الانف جلد۲ص ۳۵۵)

قیصر روم نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ عرب کے جو لوگ میرے ملک میں آئے ہوئے ہیں ان کو میرے دربار میں حاضر کرو۔ میں اس نبی کے حالات ان سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اتفاق سے ابوسفیان بن حرب قریش کی ایک جماعت کے ساتھ معاہدۂ حدیبیہ کے تحت عرصہ امن میں تجارت کے لیے ملک شام گئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ بیت المقدس میں قیصر روم کے پاس حاضر ہوئے۔ (بخاری جلد ا ص ۴) ہرقل نے انہیں اپنے دربار میں بلایا۔ یہ حضرات اس وقت غزوہ میں مقیم تھے۔ ان کو ہرقل کے آدمی غزہ سے لے کر آئے۔ دربار میں سلاطین سلطنت بڑے بڑے پادری اور راہب موجود تھے۔ ان سب کی موجودگی میں ہرقل نے ان لوگوں سے ترجمان کے ذریعہ پوچھا؟ کہ تم میں سے اس مدعی نبوت کا حسب ونسب کے لحاظ سے سب سے زیادہ قریبی شخص کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا: "میں ہوں۔" ہرقل نے کہا: "تم میرے قریب

Marfat.com

آ جاؤ۔'' دوسرے ساتھیوں کو ان کے پیچھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ان پیچھے بیٹھنے والوں سے کہا کہ میں اس شخص سے اس مدعی نبوت کے بارہ میں کچھ سوالات کروں گا۔ اگر یہ جھوٹ بولے تو تم لوگ اس کی تکذیب کر دینا۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر مجھ کو جھوٹ بولنے کی بدنامی کا خوف نہ ہوتا تو میں آپ کے بارہ میں یقیناً جھوٹ بولتا۔ بعد ازاں اس نے ان سے مختلف سوالات کیے جن کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے متعدد ابواب میں نقل کیا ہے۔ سوالات تو کئی تھے جن کو ہم یہاں طوالت کی وجہ سے نقل نہیں کر رہے، البتہ سب سے آخری سوال یہ تھا کہ وہ کن کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟ ابو سفیان نے کہا: ''اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے، اور کسی کو اس کی ذات و صفات میں شریک نہ ٹھیرانے کا حکم دیتا ہے۔ بت پرستی سے روکتا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ، سچائی اور پرہیز گاری اور عفت و پاک دامنی وغیرہ کا حکم دیتا ہے۔''

ہرقل نے کہا: ''جو کچھ تم نے بتایا ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ شخص بہت جلد میرے ان دونوں قدموں کی جگہ کا مالک ہوگا۔ میں جانتا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے، لیکن میرا یہ گمان نہ تھا کہ وہ تم لوگوں میں سے ہوگا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ اس کے حضور پہنچ سکوں گا تو اس سے ضرور ملاقات کرتا اور اگر اس کے پاس ہوتا تو اس کے دونوں پاؤں دھوتا۔ پھر ہرقل نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ منگوا کر پڑھا۔ ایک روایت میں ہے کہ جب اس نے اس کا عنوان پڑھا: ''محمد رسول اللہ کی جانب سے روم والے ہرقل کے نام'' جب اتنا خط پڑھا گیا تو ہرقل کا بھتیجا جو اس وقت اس کے پاس کھڑا تھا، زور سے غرایا اور گرجدار آواز میں کہا کہ یہ خط آج ہرگز نہیں پڑھا جائے گا۔ (فنخر ابن اخیہ نخرة وقال: لا یقرأ هذا الیوم) قیصر نے پوچھا: کیوں؟ اس نے کہا: اس لیے کہ ایک تو اس نے خط اپنے نام سے شروع کیا ہے اور دوسرے یہ کہ آپ کو روم والا لکھا ہے، شاہ روم نہیں لکھا۔ قیصر نے کہا: نہیں یہ خط ضرور پڑھنا ہوگا۔ (مجمع الزوائد جلد ۸ ص ۲۳۶) جب خط پڑھا جا چکا تو ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ اس

وقت ہم سب کو باہر نکال دیا گیا۔ باہر آنے کے بعد میں نے کہا: نہایت تعجب کی بات ہے کہ ابو کبشہ کے بیٹے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا معاملہ بہت زور پکڑ گیا ہے۔ اب تو اس سے بنو اصغر یعنی رومیوں کا بادشاہ بھی ڈرتا ہے۔ (تعد امر امر ابن کبشہ انہ یخافہ ملک بنی الاصفر) اس کے بعد مجھے پورا یقین ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین تمام ادیان پر غالب آ کر رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے قبول اسلام کی توفیق عطا فرما دی۔ (بخاری جلد اص ۳۰، ص ۳۸)

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والا نامہ کے ہرقل پر یہ اثر ہوا جس کا مشاہدہ ابوسفیان نے کیا۔ چنانچہ اسی تاثر کے تحت اس نے سفیر نبوت سیدنا دحیہ کلبیؓ کی مال اور پارچہ جات سے تواضع کی، لیکن سیدنا دحیہ کلبیؓ جب وہ تمام تحائف لے کر واپس ہوئے تو قبیلہ جذام کے کچھ لوگوں نے ان پر ڈاکہ ڈال کر سب کچھ چھین لیا۔ سیدنا دحیہؓ مدینہ پہنچنے کے بعد سب سے پہلے بارگاہ رسالت میں پہنچے اور سارا ماجرہ کہہ سنایا۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا زید بن حارثہؓ کی قیادت میں پانچ سو صحابہ کرامؓ پر مشتمل ایک دستہ روانہ فرمایا۔ انہوں نے قبیلہ جذام پر شب خون مار کر ان کی خاصی تعداد کو قتل کر دیا اور ان کے چوپایوں اور عورتوں کو مدینہ لے آئے۔ چوپایوں میں ایک ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں تھیں اور قیدیوں میں ایک سو عورتیں اور بچے تھے۔ بعد میں آپ نے اس قبیلہ کے سردار زید بن رفاعہ کے احتجاج اور فریاد پر ان کا احتجاج قبول فرماتے ہوئے تمام مال غنیمت اور قیدی واپس کر دیئے۔ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۱۲۲)

بخاری کی روایت میں زہری کہتے ہیں کہ ابن ناطور ایلیا کا حاکم اور ہرقل کا دوست اور شام کے عیسائیوں کا بڑا پادری تھا، اس نے بیان کیا کہ ہرقل جب ایلیا آیا ہوا تھا تو ایک روز صبح کے وقت بڑا پریشان اور کبیدہ خاطر تھا۔ اس سے ایک بڑے پادری نے کہا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک معلوم نہیں ہو رہی۔ ابن ناطور کا بیان ہے کہ ہرقل نجومی تھا اور ستاروں کا حساب جانتا تھا۔ پادری کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ستاروں پر غور

کرنے سے مجھے معلوم ہوا کہ ختنہ والے بادشاہ کا دنیا میں ظہور ہو چکا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ کن لوگوں میں ختنہ کا رواج ہے؟ انہوں نے کہا: صرف یہودی ختنہ کرتے ہیں اور یہودیوں کی طرف سے آپ کو پریشان اور کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے میں شاہ غسان کا بھیجا ہوا قاصد آ پہنچا اور اس نے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر دی۔ اس سے ساری خبر کا پتہ چلا کہ ان لوگوں سے یہ کہا کہ جا کر پتہ کرو کہ اس قاصد نے ختنہ کرایا ہوا ہے۔ پھر ہرقل نے اس قاصد سے عربوں کے بارہ میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ عربوں میں ختنے کا رواج ہے۔ اس پر ہرقل نے کہا کہ یہ عرب قوم کے بادشاہ ہیں جن کی بعثت ہو چکی ہے۔ ہرقل وہاں سے حمص چلا گیا۔ ابھی ہرقل حمص پہنچا نہیں تھا کہ رومیہ سے اس کے ایک ساتھی کا خط آ گیا جس میں وہ ہرقل کی رائے سے پورا اتفاق کر رہا تھا کہ واقعی اس نبی کا ظہور ہو چکا ہے جو عرب قوم کا بادشاہ ہو گا۔ ہرقل نے حمص میں اپنے محل کے بڑے ہال میں روم کے بڑے بڑے سرداروں کو اکٹھا کیا۔ پھر اس نے دروازے بند کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ تمام دروازے بند کر دیئے گئے۔ پھر اس نے محل کے ایک جھروکے سے ان کے سامنے آ کر یہ کہا: اے روم کے سردار! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم کو فلاح و بہبود اور ہدایت میسر ہو اور تمہارے پاس تمہارا ملک باقی رہے؟ اگر تم یہ چاہتے ہو تو اس نبی کا اتباع کر لو۔ یہ سنتے ہی وہ سارے سردار بدک کر وحشی گدھوں کی طرح دروازوں تک دوڑے تا کہ باہر نکلیں لیکن دروازے تمام بند تھے۔ ہرقل نے جب ان کا اس طرح بھاگنا دیکھا اور وہ ان کے ایمان قبول کرنے سے ناامید ہو گیا تو اس نے حکم دیا کہ ان سب کو میرے پاس واپس لاؤ۔ چنانچہ وہ واپس لائے گئے۔ اس نے ان سے کہا: ''میں نے تو یہ بات صرف اس لیے کہی تھی تا کہ مجھے پتہ لگ جائے کہ تم اپنے دین پر کتنے پختہ ہو۔ اور مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ تم اپنے دین پر پختہ ہو۔ اس پر وہ سارے ہرقل کے سامنے سجدہ میں گر گئے اور اس سے خوش ہو گئے۔ اور اس کا انجام یہ ہوا (کہ وہ اپنی دنیا بنانے کے لیے) ایمان کی دولت سے یک قلم محروم رہا۔ (رواہ

Marfat.com

البخاری فی مواضع کثیرۃ، واخرجہ بقیۃ الجماعۃ الا ابن ماجہ من طرق عن الزہری، البدایہ والنہایہ جلد۴ص ۲۶۶، دلائل النبوۃ لابی نعیم ص ۱۱۹، سنن کبریٰ بیہقی جلد۹ص ۱۷۸)

قیصر خود تو ایمان سے محروم رہا لیکن وہ چونکہ سمجھتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اس وجہ سے اس نے آپ کے مکتوب گرامی کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ چنانچہ علامہ بدرالدین عینی اور دوسرے محدثین نے لکھا ہے کہ قیصر روم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرامی نامہ کو سونے کی ایک نلکی میں نہایت احترام و اہتمام سے محفوظ کر دیا۔ اور قیصر کے بعد آنے والے تمام رومی بادشاہ اس نامہ مبارک کی تعظیم و تکریم کرتے۔ ایک قیصر روم جس کا نام اذفرنش تھا، جس نے اسپین کے مشہور شہر طلیطلہ اور دیگر علاقوں پر قبضہ کیا، یہ والا نامہ اس کے پاس تھا۔ پھر اس کی ذریت میں یہ کئی سالوں تک محفوظ رہا۔ ان کے بزرگوں نے انہیں یہ وصیت کی تھی کہ "مادام ھذا الکتاب عندنا لایزال الملک فینا" یعنی جب تک یہ نامہ مبارک ہمارے پاس رہے گا حکومت ہم میں باقی رہے گی۔ اس لیے یہ لوگ اس کی بڑی حفاظت کرتے تھے اور اس کا انتہائی احترام کرتے اور کسی عیسائی کو اس پر مطلع نہیں ہونے دیتے تھے۔ (عمدہ القاری، جلد ا ص ۱۱۱)

نجاشی کے نام خط اور اس کا ردعمل:

نجاشی شاہ حبشہ کے نام بھی ایک خط آپؐ نے سیدنا عمرو بن امیہ ضمریؓ کے ہاتھ روانہ فرمایا۔ سیدنا عمرو بن امیہؓ نے نجاشی کو یہ خط دے کر فرمایا: اصحمہ! (نجاشی شاہ حبشہ کا نام) مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ امید ہے کہ آپ میری اس بات کو غور و خوض سے سنیں گے۔ ہمیں آپ پر حسن ظن بھی ہے اور اعتماد بھی۔ ہم نے جب کبھی آپ سے کسی خیر کی امید کی ہمیں وہ خیر آپ سے حاصل ہوئی۔ آپ کا سایۂ امن و عاطفت میں ہمیں کبھی کوئی خوف نہیں ہوا۔ انجیل ہمارے اور آپ کے مابین شاہد عادل ہے جس کی شہادت کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو آپ اس نبی کے حق میں ایسے ہی ثابت ہوں گے جیسے یہود سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں۔ سرکار دو

Marfat.com

عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفیر دوسروں کے پاس بھی بھیجے ہیں لیکن دوسروں کی نسبت آپ سے زیادہ امید ہے۔

سیدنا عمرو بن امیہ ضمریؓ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک جب نجاشی کے حوالے کیا تو نجاشی نے اسے اپنی آنکھوں سے لگایا اور تخت سے اتر کر زمین پر بیٹھ گیا اور سیدنا جعفر بن ابی طالبؓ جو اس وقت حبشہ میں موجود تھے، کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ پھر آپ کے اس والا نامہ کا جواب لکھوایا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم○

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں نجاشی اصحمہ کی طرف سے

اللہ کے نبی! آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام اور اس کی رحمتیں اور برکتیں ہوں۔ اس ایک اللہ کی تعریف کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جس نے مجھے اسلام کی ہدایت اور توفیق مرحمت فرمائی۔

اے اللہ کے رسول! مجھے آپ کا والا نامہ موصول ہوا جس میں آپ نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں ذکر فرمایا۔ سیدنا عیسیٰ اس سے ایک ذرہ برابر بڑھ کر نہ تھے۔ مجھے قسم ہے آسمانوں اور زمین کے پروردگار کی، وہ ویسے ہی ہیں جیسے آپ نے ان کا ذکر فرمایا۔ پھر آپ نے جو کچھ ہماری طرف بھیجا ہے ہم نے اسے جانا اور آپ کے چچازاد بھائی (سیدنا جعفر طیارؓ) اور آپ کے صحابہؓ کی مہمان نوازی کی اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور میں نے آپ سے بیعت کی اور آپ کے چچازاد بھائی سے بیعت کی۔ اور ان کے ہاتھ پر اللہ رب العالمین کے لیے اسلام قبول کیا۔

میں آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے ارھا بن اصحمہ کو بھیج رہا ہوں۔ میں صرف اپنی ذات کا مالک ہوں۔ اگر ارشاد ہو تو خود حاضر خدمت ہونے کو تیار ہوں۔ یا رسول اللہ! میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ بالکل درست اور حق ہے سلام ہو آپ پر اے اللہ کے رسول!

Marfat.com

نجاشی نے اپنے بیٹے ارھا کو ساٹھ آدمیوں کے ساتھ ایک کشتی میں سوار کر کے آپ کی خدمت اقدس میں روانہ کیا لیکن وہ کشتی راستہ میں غرق ہو گئی۔

یہ وہی نجاشی ہے جس کے پاس سنہ ۵ نبوی میں مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے گئے تھے اور اس نے ان کا بڑا اعزاز و احترام کیا تھا۔ اس کا نام اصحمہ تھا۔ یہ سیدنا جعفر بن ابی طالبؓ کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوا تھا اور جب سنہ ۹ ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ جس روز اس کی وفات ہوئی۔ جبرئیل امین علیہ السلام نے آپ کو اس کی اطلاع دی اور آپؐ نے جنازگاہ مدینہ میں اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی کیونکہ اس کی حبشہ میں نماز جنازہ نہیں ہوئی تھی۔

اس کی وفات کے بعد جو دوسرا شخص اس کا جانشین ہو کر تخت پر بیٹھا آپ نے اسے بھی ایک مکتوب ارسال فرمایا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے اسلام قبول کیا یا نہیں۔
(زرقانی جلد ۳ ص ۳۴۶)

نجاشی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دونوں گرامی ناموں کو ہاتھی دانت کی ایک ڈبیا میں بڑے احترام و اہتمام سے رکھا اور کہا: ''حبشہ میں ہر طرح خیریت رہے گی جب تک حضورؐ کے یہ دونوں گرامی نامے اس کے پاس رہیں گے۔'' (طبقات ابن سعد جلد ا ص ۲۵۹) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو طبری جلد ۳ ص ۸۹، زرقانی جلد ۳ ص ۳۴۴-۳۴۵، زاد المعاد جلد ۳ ص ۱۰، ہدایہ الحیاری لابن قیم ص ۳۲، الوثائق السیاسیہ ص ۱۰۴-۱۰۵، تاریخ الخمیس جلد ۲ ص ۳۰-۳۱، طبقات ابن سعد جلد ا ص ۲۵۹- ۲۶۰ البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۸۳)

مقوقش شاہ مصر کے نام خط:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب گرامی مقوقش شاہ مصر و اسکندریہ کے نام بھی روانہ فرمایا جس میں اس کو اسلام کی دعوت دی۔ خط کو سر بمہر کر کے سیدنا حاطب بن ابی بلتعہؓ کو دیا کہ اسے شاہ مصر کے پاس پہنچائیں۔ وہ خط کو لے کر پہلے مصر پہنچے تو

Marfat.com

پتہ چلا کہ بادشاہ اسکندریہ میں ہے۔ جب اسکندریہ پہنچے تو دیکھا کہ وہ ایک جھروکے میں بیٹھا ہوا ہے جو دریا کے کنارے پر ہے۔ بادشاہ کو اطلاع دی گئی۔ اس نے سیدنا حاطبؓ کو جھروکے اندر بلایا۔ انہوں نے اندر پہنچ کر آپ کا والا نامہ دیا۔ بادشاہ نے نہایت عزت واحترام کے ساتھ اس والا نامہ کو پڑھا۔ (زرقانی جلد ۳ ص ۳۴۷)

شاہ مصر کو خط دینے کے بعد سیدنا حاطبؓ نے مقوقس کو بھرے دربار میں فرمایا:

''اس سرزمین میں (یعنی مصر میں) تم سے پہلے ایک شخص گزرا ہے جو اپنے کو ''رب اعلیٰ'' سمجھتا تھا اور کہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اول وآخر کے لیے عبرت بنا دیا۔ پہلے تو اس کے ذریعہ لوگوں سے انتقام لیا۔ پھر خود اس کو انتقام کا نشانہ بنایا، لہٰذا اس سے عبرت پکڑو۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے تم سے عبرت پکڑیں۔''

سیدنا حاطبؓ کا اپنا بیان ہے کہ اس کے بعد شاہ مصر مقوقس نے مجھے شاہی مہمان کے طور پر شاہی مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ ایک روز اس نے تمام عمائدین اور اساطین سلطنت اور زعماء حکومت کو اکٹھا کر کے مجھے بلایا اور کہا کہ میں تم سے کچھ اہم سوالات پوچھنا چاہتا ہوں، ذرا غور وفکر سے جواب دینا۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارہ میں کچھ سوالات کیے اور سیدنا حاطبؓ نے ان کے صاف صاف نہایت معقول جوابات دیئے۔ (زرقانی جلد ۳ ص ۳۴۸، سنن کبریٰ بیہقی جلد ۲ ص ۱۲) جب وہ سیدنا حاطبؓ کے تسلی بخش جوبات سے مطمئن ہو گیا تو مقوقس نے کہا: ''میں نے اس نبی کے بارہ میں بہت غور وفکر کیا تو پتہ چلا کہ وہ پسندیدہ باتوں کا حکم دیتے ہیں اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتے ہیں۔ قابل نفرت چیزوں کا حکم نہیں دیتے اور قابل رغبت باتوں سے روکتے نہیں۔ وہ نہ گمراہ اور جادوگر ہیں اور نہ ہی جھوٹے کاہن بلکہ ان میں نبوت کی علامات پائی جاتی ہیں مثلاً غیب کی خبریں دینا۔ میں اب اس بارہ میں مزید غور کروں گا۔ پھر اس نے آپ کے والا نامہ کو ہاتھی دانت کے ایک ڈبہ میں بند کر کے سربمہر کر کے اپنے خازن کو حکم دیا کہ اسے حفاظت سے رکھے اور ایک کاتب کو بلا کر

Marfat.com

آپ کے والا نامہ کا جواب ان الفاظ میں دیا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم○

محمد بن عبداللہ کے نام مقوقس عظیم قبط کی طرف سے

آپ پر سلام ہو۔ میں نے آپ کا والا نامہ پڑھا اور اس میں ذکر کی گئی تمام باتوں کو سمجھا۔ مجھے معلوم ہے کہ ابھی تک ایک نبی کی آمد باقی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ شام سے مبعوث ہوگا۔ میں نے آپ کے قاصد کا اعزاز و اکرام کیا۔ آپ کی خدمت اقدس میں دو لونڈیاں بھیج رہا ہوں اور سواری کے لیے ایک خچر بھی ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ والسلام

مقوقس نے اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا اور اسلام نہیں لایا۔ اور دونوں لونڈیاں ماریہ قبطیہ اور سیرین قبطیہ تھیں۔ ماریہ آپ کے حرم میں داخل ہوئیں۔ سیدنا ابراہیم بن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھے۔ دوسری لونڈی سیرین سیدنا حسان بن ثابتؓ کو عطا ہوئیں۔ اس خچر کا نام دلدل تھا جو سفید رنگ کا تھا اور سیدنا معاویہؓ کے عہد خلافت تک زندہ رہا۔

واقدی کے حوالہ سے ایک روایت ہے کہ ایک رات مقوقس نے سیدنا حاطب بن ابی بلتعہؓ کو تنہائی میں اپنے پاس بلایا اور سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں چند سوالات کیے۔ جوابات سن کر کہنے لگا کہ ہم ایک نبی کی آمد کے لیے چشم براہ تھے، لیکن میری قوم اس دین کو قبول نہیں کرے گی۔ اگر میں اسلام قبول کرلوں تو مجھے یہاں کا تاج وتخت سے دست بردار ہونا پڑے گا جس کو میں پسند نہیں کرتا۔ سیدنا حاطبؓ جب واپس مدینہ میں آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو تمام واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''ضنَ الخبیث بملکه و لا بقاء لملکه'' یعنی خبیث نے اپنے ملک کے سلسلہ میں بخیلی کی ہے لیکن اس کا ملک اور سلطنت باقی رہے گا۔ چنانچہ سیدنا فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں سیدنا عمرو بن العاصؓ نے مصر اور اسکندریہ کو فتح کرلیا۔ (زرقانی جلد ۳

ص ۳۴۸، روض الانف جلد۲ص ۳۵۵، تاریخ الخمیس جلد۲ص ۳۷-۳۹، الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح لابن تیمیہؒ جلد اص ۹۹، ہدایہ الحیاری ص ۳۳، زاد المعاد جلد۳ص ۶۰ وغیرہ)

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ اس والا نامہ سے قبل مقوقش سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ سے آپ کے حالات معلوم کر چکا تھا۔ وہ مسلمان ہونے سے قبل چند ساتھیوں کے ساتھ اس ملک میں گئے تھے۔ چنانچہ سیدنا مغیرہؓ مقوقش کی باتوں سے ہی متاثر ہو کر واپس مدینہ آ کر مسلمان ہو گئے لیکن خود مقوقش کے مقدر میں اسلام نہیں تھا لہٰذا اسلام کو قبول نہ کیا۔
(الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد اص ۱۰۱-۱۰۳)

علامہ بلازری نے لکھا ہے کہ مقوقش نے حضور علیہ السلام کے اس گرامی نامہ کی نہایت عزت وتوقیر کی اور سیدنا حاطبؓ سے کہا کہ اگر مجھے شاہ روم کا خوف نہ ہوتا تو میں اسلام قبول کر لیتا پھر اس نے دو کنیزیں ماریہ اور سیرین، ایک ہزار مثقال سونا، بیس خلعتیں، ایک سفید خچر آپ کی سواری کے لیے اور ایک یعفور نامی گدھا ہدیہ کے طور پر آپ کو ارسال کیے۔ (انساب الاشراف جلد اص ۴۴۹)

حافظ ابن کثیرؒ نے بھی اس بارہ میں یہی کچھ لکھا ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد۴ص ۲۷۲، الاصابہ جلد اص ۳۰۰ لابن حجر عسقلانیؒ)

بحرین کے بادشاہ کے نام خط:

منذر بن ساویٰ شاہ بحرین کے نام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکتوب گرامی ارسال کیا جس میں اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس خط کو سیدنا علاء بن حضرمیؓ لے کر گئے۔ منذر بن ساویٰ نے اس خط کے جواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا:

''اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کا خط بحرین کے باشندوں کو پڑھ کر سنایا۔ ان میں سے بعض نے اسلام کو محبت اور پاکیزگی کی نگاہ سے دیکھا اور اس کو قبول کر لیا اور بعض نے پسند نہیں کیا۔ اور میری اس سرزمین میں یہود

Marfat.com

اور مجوس بھی آباد ہیں، لہٰذا ان کے بارہ میں اپنا حکم صادر فرمایئے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جو جواب دیا اس کو حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد جلد۲ ص ۶۱-۶۲ پر نقل کیا ہے اور زرقانی نے بھی اپنی کتاب کی جلد۳ ص ۳۵۱ پر وہی خط نقل فرمایا ہے۔ یہ خط ماضی قریب میں دستیاب ہوا۔ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم (فرانس) نے اس کا فوٹو بھی شائع کیا ہے۔

امام سہیلیؒ نے منذر کا جو جواب نقل کیا ہے وہ یہ ہے:

''میں جس دین پر ہوں میں نے اس میں بہت غور وخوض کیا تو اس کو صرف دنیا کے لیے پایا نہ کہ آخرت کے لیے، اور جب آپ کے پیش کردہ دین پر غور وخوض کیا تو اُسے دین ودنیا دونوں کے لیے مفید پایا، لہٰذا اس دین کو قبول کرنے میں مجھے کیا چیز مانع ہے کہ جس کے قبول کرنے میں زندگی کی تمنائیں اور اُمنگیں اور موت کی راحت اور سکون ہو؟ اب تک میں اس شخص کی حالت پر نہایت تعجب کرتا تھا جو اس دین اسلام کو قبول کرے لیکن اب حالت یہ ہوئی ہے کہ اس شخص پر تعجب ہوتا ہے جو اس دین برحق کو رد کرتا ہے۔''

(روض الانف جلد۲ ص ۳۵۶، الجواب الصحیح جلد۱ ص ۱۱۳)

شاہ یمامہ کے نام آپ کا خط:

ایک خط آپ نے یمامہ کے رئیس ہوذہ بن علی کے نام بھی سیدنا سلیط بن عمرو عامریؓ کے ہاتھ روانہ کیا۔ آپ جب یہ خط ہوذہ کے پاس لے کر گئے تو اس نے ان کا بہت احترام کیا اور شاہی مہمان بنایا۔ سیدنا سلیطؓ نے ہوذہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''ہوذہ! تجھ کو بوسیدہ ہڈیوں نے حکمران بنا دیا ہے اور حقیقت میں سردار اور حکمران وہ ہے جو ایمان سے متمتع ہو اور تقویٰ اور پرہیزگاری کو زادِ راہ بنایا ہو۔ میں تجھے ایک بہترین شی کا حکم کرتا ہوں اور شیطان کی عبادت سے منع کرتا ہوں۔ اور اگر تو اس کو قبول کرے گا تو تیری اُمیدیں اور تمنائیں بر

Marfat.com

آئیں گی اور اگر تو انکار کرے گا تو یاد رکھ قیامت کا ہولناک منظر ہمارے اور تمہارے درمیان سے اس حائل پردہ کو اٹھا دے گا۔''

ہوذہ نے سیدنا سلیطؓ سے کہا کہ مجھے کچھ روز مہلت دیں۔ میں آپ کی اس دعوت پر غور وفکر کرلوں۔ چنانچہ چند روز کے غور وفکر کے بعد اس نے آپؐ کے خط کا یہ جواب دیا:

''جس شی کی طرف آپ بلاتے ہیں وہ بہت اچھی اور خوب ہے۔ عرب میرے دبدبہ اور مرتبہ سے خوف زدہ ہیں۔ آپ مجھے کچھ اختیار عنایت فرمائیں۔ میں آپ کا اتباع کروں گا۔''

ہوذہ نے چلتے وقت سفیر رسولؐ سیدنا سلیطؓ کو کچھ ہدیے اور تحفے دیئے اور کچھ ہجر کے بنے ہوئے کپڑے میں دیئے۔ سیدنا سلیطؓ نے واپس جا کر وہ تمام تحائف آپؐ کی خدمت میں پیش کیے اور تمام تفصیلات بھی گوش گذار کیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خط کو پڑھ کر ارشاد فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر وہ زمین کا ایک ٹکڑا بھی مجھ سے طلب کرے تو میں اسے نہ دوں گا۔ وہ خود بھی تباہ ہوگا اور جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے وہ بھی تباہ ہوگا۔''

جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ سے واپس تشریف لائے تو جبرئیل امین نے آپ کو ہوذہ کے مرنے کی خبر دی۔ آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

''سنو! یمامہ میں ایک کذاب ظاہر ہونے والا ہے جو نبوت کا دعویٰ کرے گا اور میرے بعد قتل ہوگا۔'' (زاد المعاد جلد ۳ ص ۶۳، زرقانی جلد ۳ ص ۳۵۵)

اہل نجران کے نام والا نامہ:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کے نام ایک گرامی نامہ ارسال فرمایا جس میں انہیں تحریر فرمایا:

''اللہ کے نبی اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے نجران کے پادری اور اہل نجران کے نام۔ تم سلامتی میں رہو، میں تمہارے سامنے ابراہیم، اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) کے معبود کی تعریف بیان کرتا ہوں۔

Marfat.com

اما بعد: میں تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ بندوں کی عبادت چھوڑ کر اللہ کی عبادت اختیار کرو اور بندوں کی دوستی چھوڑ کر اللہ سے دوستی کا رشتہ استوار کرو۔ اگر تم میری اس دعوت کو نہ مانو تو پھر جزیہ ادا کرو۔ اور اگر جزیہ سے بھی انکار کرتے ہو تو پھر میری طرف سے تمہارے لیے اعلان جنگ ہے۔ والسلام

جب نجران کے پادری کو حضور علیہ السلام کا یہ خط ملا۔ تو ک وہ خط پڑھ کر گھبرا گیا۔ اس نے نجران کے معززین اور وادی کے لوگوں کو اکٹھا کیا تا کہ باہمی مشورہ سے کوئی جواب اس خط کا دیا جائے۔ معززین اور اہل نجران نے مشورہ کے بعد یہ طے کیا ایک وفد مدینہ طیبہ بھیجا جائے اور وہ حالات کی تحقیق کرے۔ وہ لوگ جن میں شرجیل بن وداعہ ہمدانی، عبداللہ بن شرجیل اصبحی اور جبار بن فیض حارثی قابل ذکر ہیں، آپ کی کدمت میں حاضر ہوئے تو کافی بحث مباحثہ کے بعد حضور علیہ السلام کے ساتھ ان کا ایک معاہدہ طے ہوا۔ جو حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم○

"یہ وہ معاہدہ ہے جو اللہ کے نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نجران والوں کے بارہ میں لکھا کہ محمد کا ان کے بارہ میں یہ فیصلہ ہے کہ تمام پھل، سونا اور چاندی اور غلام وغیرہ سب نجران والوں لے پاس رہے گا۔ اور یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے ان پر فضل واحسان ہے، اور اس کے بدلہ میں وہ دو ہزار جوڑے دیا کریں گے۔ ایک ہزار جوڑے رجب میں اور ایک ہزار جوڑے صفر میں۔" محمد رسول اللہ

آپ نے اس میں کچھ اور شرطیں بھی ذکر فرمائیں (اخرجہ البیہقی عن یونس کذافی التفسیر لابن کثیر جلد ا ص ۳۶۹ والبدایہ والنہایہ جلد ۵ ص ۵۵) اس معاہدہ پر سیدنا ابوسفیان بن حربؓ، سیدنا غیلان بن عمروؓ، سیدنا مالک بن عوفؓ، سیدنا اقرع بن حابسؓ اور سیدنا مغیرہ بن شعبہؓ نے بطور گواہ دستخط کیے۔ جب یہ لوگ نجران واپس پہنچے تو پادری

Marfat.com

کے پاس اس کا ماں جایا چچا زاد بھائی موجود تھا جس کا نام بشیر بن معاویہ تھا اور جس کی کنیت ابو علقمہ تھی۔ ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معاہدہ اس پادری کو دیا۔ وہ پادری اور اس کا بھائی علقمہ دونوں سواری پر جا رہے تھے اور پادری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ نامہ پڑھ رہا تھا۔ اتنے میں ابو علقمہ کی ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گری اور بشیر بھی اس کے ساتھ گر گیا۔ اس نے حضور علیہ السلام کی ہلاکت کی بددعا کی۔ اس پر پادری نے کہا: ''اللہ کی قسم! تم نے ایک نبی اور رسول کی ہلاکت کی بددعا کی ہے۔ یہ جملہ سن کر ابو علقمہ بشیر نے کہا کہ اگر وہ واقعی نبی ہے تو پھر میں اللہ کے رسول کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے اپنی اونٹنی کے کجاوے کی کوئی بھی گرہ نہیں کھولوں گا۔ چنانچہ بشیر نے اپنی اونٹنی کا منہ مدینہ کی طرف پھیر دیا۔ پادری نے اس کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے اپنی اونٹنی تیز کر دی۔ چنانچہ ابو علقمہ بشیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ پھر وہ زندگی بھر آپ کی خدمت میں رہا یہاں تک کہ ایک غزوہ میں شہید ہو گیا۔

بہر حال وہ وفد نجران کے علاقہ میں پہنچا۔ پھر یہ وفد ابن ابی شمر زبیدی راہب کے پاس گیا جو کہ اپنے گرجے کے اوپر خلوت خانے میں تھا۔ اس وفد نے اسے بتایا کہ تہامہ میں ایک نبی مبعوث ہوئے ہیں۔ پھر اپنی ساری کارکردگی سنائی۔ اور یہ بھی بتایا کہ پادری کا بھائی ابو علقمہ بشیر بن معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں جا کر حلقہ بگوش اسلام ہو چکا ہے۔ یہ سن کر اس راہب نے کہا: مجھے اس بالا خانے سے نیچے اتارو ورنہ میں اپنے آپ کو نیچے گرا دوں گا۔ چنانچہ لوگوں نے اسے نیچے اتارا اور وہ چند ہدیے اور تحائف لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ چل دیا۔ ان ہدیوں میں وہ چادر بھی تھی جو خلفاء اوڑھا کرتے تھے اور ایک پیالہ اور ایک لاٹھی بھی تھی۔ وہ کافی عرصہ تک حضور علیہ السلام کی خدمت میں ٹھیر کر وحی اور قرآن سنتا رہا لیکن قسمت کے لحاظ سے وہ تہی دست تھا لہٰذا مسلمان نہ ہوا۔ وہ جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے اپنی قوم کی طرف چلا گیا لیکن

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آنا بھی اس کے مقدر میں نہیں تھا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ (البدایہ والنہایہ جلد۵ ص ۵۵)

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
چوں خضر از آب حیواں تشنہ می آرد اسکندر را

بنو جذامہ کے نام مکتوب گرامی:

سیدنا رفاعہ بن زیدؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کو ایک والا نامہ لکھ کر دیا جس میں یہ مضمون تھا۔

"یہ خط لکھ کر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے رفاعہ بن زیدؓ کو دیا ہے۔ میں ان کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی دعوت دینے کے لیے ان کی قوم اور جوان میں شمار ہوتے ہیں، ان کی طرف بھیج رہا ہوں۔ جو ایمان لائے گا وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی جماعت میں داخل ہو جائے گا اور جو ایمان نہیں لائے گا اسے دو ماہ کی مہلت ہے۔"

جب یہ اپنی قوم کے پاس یہ والا نامہ لے کر آئے تو سب ان کی بات مان کر ایمان لے آئے۔ (مجمع الزوائد جلد۵ ص ۳۱۰)

اسی طرح کا ایک دعوتی خط آپؐ نے حارث غسانی حاکم دمشق کے پاس بھیجا لیکن وہ اپنی بدقسمتی سے اسلام نہ لایا۔ (زرقانی جلد۳ ص ۳۵۶، طبقات ابن سعد جلد ا ص ۱۷)

ایک اور خط آپ نے سیدنا عمرو بن العاصؓ کے ہاتھ شاہ عمان جیفر اور اس کے بھائی عبد کے نام روانہ کیا۔ انہوں نے اس خط کو پڑھا اور سیدنا عمرو بن العاصؓ سے بہت سے سوال و جواب کے بعد اسلام کی دعوت کو قبول کرلیا۔

(زاد المعاد جلد۳ ص ۶۲، زرقانی جلد۳ ص ۳۵۳، طبقات ابن سعد جلد ا ص ۶۸، ہدایہ الحیاری ص ۳۴، روض الانف جلد۲ ص ۳۵۶، الاصابہ جلد ا ص ۲۶۲)

آپ نے ان سربراہان مملکت اور قبائل کے نام جو خطوط ارسال فرمائے اور

Marfat.com

ان میں انہیں اسلام کی دعوت دی اس سے دو باتوں کا پتہ چلا

۱- اسلام کی دعوت میں تلوار سے زیادہ طاقت ہے اور مسلمانوں کی تلوار سے علاقے تو فتح ہوئے۔ مملکت کی حدود وثغور میں اضافہ اور وسعت ہوئی لیکن اسلام کی نشر و اشاعت دعوت و تبلیغ سے ہوئی۔ اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے اندرون عرب اور بیرون عرب دعوت و تبلیغ پر زور دیا اور اس میں انہیں اسلام کی نشر و اشاعت میں خاصی کامیابی و کامرانی ہوئی، کیونکہ تلواروں سے علاقے فتح ہوتے ہیں دل فتح نہیں ہوتے اور دلوں کو فتح صرف اور صرف دعوت و تبلیغ کرتی ہے۔ سچ کہا:

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

۲- دوسری چیز یہ ثابت ہوئی کہ اسلام صرف ایک خاص قوم یا خاص خطۂ زمین اور خاص زبان و رنگ والوں کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ہے اور ہر رنگ و نسل اور ہر دین و ملت کا آدمی اس پر ایمان لانے کا مکلف ہے۔

آپ کے خطوط کے جواب میں کچھ بادشاہ اور سربراہان مملکت اور رؤسائے قبائل ایمان لائے اور کچھ نے اسلام کی دعوت کو قبول کرنے سے اعراض کیا۔ جنہوں نے اعراض کیا وہ تباہ و برباد اور تخت و تاراج ہو گئے، اور جنہوں نے قبول کیا وہ تاریخ عالم میں زندہ جاوید ہو گئے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ خواہ کسی نے اسلام کی دعوت کو قبول کیا یا رد لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان خطوط کے بعد اسلام تمام دنیا میں ایک جانی پہچانی دعوت و قوت بن گیا اور ہر شخص اسلام کے بارہ میں غور و فکر کرنے لگا اور اسلام کی دعوت جزیرہ عرب سے نکل کر تمام دنیا میں پھیلنی شروع ہو گئی۔

Marfat.com

اعلانِ نبوت کے بعد دعوتی کام

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چالیس سال کی ہوگئی اور یہی سن کمال ہے اور آپ کے غار حرا میں خلوت نشینی کا تیسرا سال آیا تو حق تعالیٰ شانہ نے چاہا کہ انسانیت پر اس کی رحمت کا فیضان ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت و رسالت سے مشرف فرمایا۔ حافظ ابن حجرؒ نے بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ پہلے چھ ماہ آپ کو سچے اور درست خواب آتے رہے، لہٰذا رویائے صادقہ کے ذریعے نبوت کا آغاز ربیع الاول میں ہوا جو آپ کی ولادت کا مہینہ ہے۔ لیکن حالت بیداری میں آپ پر وحی کا نزول رمضان المبارک میں ہوا۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۲۷)

چنانچہ رمضان المبارک کے مہینے میں ایک روز حسب معمول جب آپ غار حراء میں تشریف فرما تھا کہ دفعتاً ایک وجود اس غار میں نمودار ہوا اور آپ کو سلام کیا۔ (زرقانی جلد ۱ ص ۲۱۱)

یہ رمضان المبارک کی ۲۱ تاریخ کو دوشنبہ کی رات تھی اور اگست کی ۱۰ تاریخ سنہ ۶۱۰ء تھا۔ قمری حساب سے آپ کی عمر اس وقت چالیس سال چھ ماہ بارہ دن تھی جب کہ شمسی حساب سے ۳۹ سال ۳ ماہ اور ۲۲ دن۔ اس نے کہا: اقراء یعنی پڑھیے۔ آپ چونکہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اس لیے عذر پیش کر دیا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس وجود نے، حضورؐ فرماتے ہیں، کہ مجھے پکڑ کر دبایا اور ایسا دبایا کہ میری مشقت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کے بعد چھوڑ دیا اور کہا: اقراء (پڑھیے) میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں

Marfat.com

پڑھ نہیں سکتا۔ اس وجود نے مجھے پھر اسی شدت کے ساتھ دبایا اور پھر چھوڑ دیا اور کہا اقراء۔ میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھ نہیں سکتا۔ اس وجود نے پھر تیسری مرتبہ مجھ کو پکڑا اور اسی شدت کے ساتھ دبایا اور یہ کہا پڑھو:

اقراء باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ وربک الاکرم، الذی علّم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم۔ (۹۶:۱-۵)

آپ اپنے رب کے نام سے پڑھیے جو تمام کائنات کا خالق ہے خصوصاً انسان کا جس کو اس نے خون کے لوتھڑے (جمے ہوئے خون سے) سے پیدا کیا۔ آپ پڑھیے، آپ کا رب بہت ہی کریم ہے جس نے قلم سے علم سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جس کو وہ نہیں جانتا تھا۔

آپ نے ان پانچ آیات کو پڑھا، ذہن میں اتارا، ساتھ ہی جب گراں بار ذمہ داریوں کا احساس اور اپنی درماندگی اور عاجزی کا غیر معمولی شعور ہوا، راہ خدا سے بھٹکی ہوئی مخلوق کو پڑھنے پڑھانے اور سدھارنے کی ذمہ داری اور اس بارہ میں اپنی ناآشنائی اور ناتجربہ کاری اور اس کے ساتھ ہی عاجزی، تو دل دھک دھک کرنے لگا، بدن میں کپکپی اور رعشہ کی کیفیت پیدا ہوگئی جیسے سردی سے آدمی کانپتا ہے۔ فوراً وہاں سے اٹھے اور اسی گھبراہٹ اور کپکپاہٹ کی کیفیت میں سیدھے اپنے دولت کدہ پر تشریف لائے۔ رفیقہ حیات سیدہ خدیجہ سلام اللہ علیہا نے جو یہ کیفیت دیکھی تو پریشان سی ہو گئیں۔ نبوت کے لبوں سے ایک آواز سیدہؓ کے کانوں میں پڑی: "زملونی زملونی" (مجھے کچھ اڑھاؤ، مجھے کچھ اڑھاؤ) سیدہؓ نے بغیر کچھ کہے اسی وقت چادر اڑھا دی۔ کچھ دیر بعد گھبراہٹ اور پریشانی دور ہوئی۔ سیدہؓ نے اس وقت گھبراہٹ کی وجہ اس لیے نہ پوچھی کہ وہ پندرہ سال سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہی تھیں کہ اس سے قبل انھیں ایسی گھبراہٹ کبھی نہیں ہوئی تھی، اس لیے ان کو یقین تھا کہ آپ کو کوئی غیر معمولی واقعہ درپیش ہوا ہے جس سے یہ غیر معمولی گھبراہٹ پیدا ہوئی ہے، لہٰذا پہلے یہ گھبراہٹ اور

Marfat.com

پریشانی دور ہو پھر حقیقت واقعہ کی ٹوہ لگاؤں گی۔

آپ نیند سے بیدار ہوئے اور طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہوا تو سیدہ خدیجہ طاہرہؓ نے بلائیں لیں اور پوچھا: کیا بات ہے؟ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا واقعہ بیان فرمایا اور فرمایا: کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ سیدہؓ نے نہایت غور سے آپ کی بات سنی، پھر وہ آیات بھی سنیں جو جبرئیل آپ کو بتا کر گیا تھا تو وہ آیات کے مفہوم کو سمجھ گئیں۔ سیدہؓ نے نہایت لطیف پیرایہ اور انداز میں آپ کو اطمینان دلایا اور بتایا کہ آپ ہرگز نہ ڈریں۔ آپ یقیناً یہ بوجھ اٹھا سکیں گے جو آپ پر ڈالا جا رہا ہے کیونکہ اب تک زندگی میں آپ کئی بوجھ اٹھاتے رہے ہیں، لہٰذا اگر کوئی گراں بار ذمہ داری آپ پر پڑے گی تو آپ اس کا ضرور تحمل کر سکیں گے۔ بخاری نے جو الفاظ نقل کیے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے:

"بخدا! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام اور نامراد کر دے اور آپ کی مدد نہ کرے کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، تھکے ہارے اور درماندہ انسانوں کو ان کی منزل تک پہنچاتے ہیں اور ایسی خدمات جلیلہ انجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی، ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں، بے ٹھکانہ مسافروں کو اپنا مہمان بناتے ہیں اور حق بجانب امور میں معین و مددگار رہتے ہیں۔"

(بخاری مع فتح الباری جلد ۱ ص ۲۲)

سیدہ خدیجہؓ عداس کے پاس بھی گئیں اور ان سے بھی تحقیق حال کیا۔ (السیرۃ النبویہ لابن کثیر جلد ۱ ص ۴۰۸) پھر آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس بھی لے گئیں۔ انہوں نے کہا: "خدیجہ! اگر تو سچ کہتی ہے تو یقیناً ان کے پاس وہی فرشتہ آیا ہے جو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا کرتا تھا۔ (فتح الباری جلد ۱ ص ۲۵، عمدۃ القاری جلد ۱ ص ۵۲)

ایک روایت میں ہے کہ چلتے وقت ورقہ بن نوفل نے آپ کے سر مبارک کو بوسہ دیا۔ چنانچہ سیدہؓ کے ساتھ آپ گھر تشریف لے آئے۔

Marfat.com

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بخاری مع فتح الباری جلد ۱ ص ۲۳، مسلم حدیث نمبر ۱۶۰، ترمذی حدیث نمبر ۳۶۳۶، ابن ہشام جلد ۲۶۶ ۲، طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۱۹۴، طبری جلد ۲ ص ۲۹۸، صفۃ الصفوۃ جلد ۱ ص ۷۸-۸۰، سیرۃ حلبیہ جلد ۱ ص ۲۳۳، دلائل النبوۃ جلد ۱ ص ۲۹۶)

یہ سب کچھ دیکھ کر سیدہ خدیجہؓ آپ کی نبوت پر ایمان لے آئیں۔ یہ سب سے پہلے آپ پر ایمان لے آئیں۔ سیدہؓ کو ایمان لانے میں مردوں اور عورتوں سب پر سبقت کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ علامہ ابن اثیر نے لکھا ہے:

"اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سیدہ خدیجہؓ پہلے اسلام لائیں۔ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کوئی مرد اور کوئی عورت آپ سے پہلے اسلام نہیں لائیں۔"

(کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۳۷)

ایسا ہی سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۵۹ میں ہے

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن اثیر جلد ۲ ص ۳۷-۲۶۰، اسد الغابہ جلد ۵ ص ۴۳۴، السیر والمغازی لابن اسحاق ص ۱۳۹، ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۵۹-۲۶۰، عیون الاثر جلد ۱ ص ۹۱، سیر اعلام النبلاء ذہبی جلد ۲ ص ۱۱۵، طبری جلد ۲ ص ۳۰۹-۳۱۰، مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۱۹، تاریخ الاسلام ذہبی جلد ۹ ص ۱۲۷)

سیدنا ابوبکرؓ کا سب سے پہلے ایمان لانا:

سیدہ خدیجہؓ تو بغیر کسی دعوت کے صرف آپ پر نزول جبرئیل کا حال سن کر ایمان لے آئیں، لیکن سیدنا ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر سب سے پہلے ایمان لائے۔ چنانچہ امام نخعیؒ فرماتے ہیں کہ

ابوبکر اول من اسلم	ابوبکرؓ سب سے پہلے آپؐ پر ایمان لائے

(صفۃ الصفوۃ جلد ۱ ص ۲۳۷، البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۲۶، طبری جلد ۲ ص ۵۵)

اور سیدنا علیؓ فرماتے ہیں کہ

Marfat.com

اول من اسلم من الرجال ابوبکر الصدیق

مردوں میں سب سے پہلے ابوبکر صدیقؓ ایمان لائے

(البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۲۷، جلد ۷ ص ۲۲۴، تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۳۳)

تفسیر طبری میں ہے کہ

اول من اسلم بعد خدیجة ابوبکر (تفسیر مجمع البیان جلد ۳ ص ۳۳)

سیدہ خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلے اسلام لانے والے ابوبکرؓ تھے۔

تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ جونہی نور نبوت ضوفشاں ہوا ابوبکرؓ نے اس کے اجالے کو عام کرنے کے لیے اپنی ساری توانائیاں پیش کر دیں اور جونہی آپ نے دعوت حق کا اعلان فرمایا، لبیک اللھم لبیک کی صدائیں ابوبکرؓ کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بلند ہونے لگیں، گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ مدت سے اس بات کے انتظار میں تھے کہ جونہی آپ اپنی نبوت کا اعلان فرمائیں میں بلا ادنیٰ تامل آپ کی اس دعوت حق کو قبول کرلوں۔ چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں

مادعوت احداً الیٰ الاسلام الا کانت عندہ کبوة وتردد ونظر الا ابابکر ماعکم عنہ حین ذکرتہ لہ ولا تردد فیہ۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۲۷، عیون الاثر جلد ۱ ص ۱۸۳)

میں نے جس کسی کو بھی اسلام کی دعوت دی تو اس کا پاؤں پھسلا اور تشویش میں مبتلا ہوا اور میری دعوت پر غور وفکر کرنے لگا سوائے ابوبکرؓ کے۔ اس کو جب میں نے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو اس نے نہ تردد کیا اور نہ جھجک کا اظہار کیا۔

سیدہ خدیجہ سلام اللہ علیہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر اسلام قبول نہیں کیا تھا بلکہ آپ کے سامنے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہا السلام کی سورج کی طرف شفاف اور شبنم کی طرح پاکیزہ زندگی تھی جس کو دیکھ کر وہ حلقہ اسلام میں داخل ہوئیں

Marfat.com

لیکن سیدنا ابوبکرؓ سیدہ خدیجہؓ کے کہنے پر مسلمان ہوئے۔ چنانچہ محمد الصادق عرجون نے لکھا ہے کہ علامہ زرقانی نے شرح مواہب اللدنیہ میں لکھا ہے کہ

''سیدنا خدیجہ سلام اللہ علیہا کے ایمان کے فوراً بعد سیدنا ابوبکرؓ مشرف باسلام ہوئے کیونکہ آپ کو یہ توقع تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نبوت کا اعلان فرمانے والے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ کے بارہ میں ورقہ بن نوفل سے بہت کچھ سنا تھا۔ ایک روز حکیم بن حزام کے پاس سیدنا ابوبکرؓ تشریف فرما تھے کہ ان کی لونڈی آئی اور حکیم کو بتایا کہ ان کی پھوپھی خدیجہؓ آج کہہ رہی تھیں کہ ان کے شوہر موسیٰ علیہ السلام کی طرح نبی و مرسل ہیں۔ یہ سنتے ہی ابوبکرؓ چپکے سے وہاں سے چلے آئے اور حضور علیہ السلام کی خدمت میں آ کر اسلام قبول کر لیا۔'' (محمد رسول اللہ جلد ا ص ۵۲۲)

حافظ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک روز سیدنا ابوبکر صدیقؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملنے کے ارادہ سے باہر نکلے کیونکہ آپ زمانۂ جاہلیت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوست تھے۔ جب ابوبکرؓ آپ سے ملے تو عرض کی کہ میں نے آج آپ کو مجلس میں نہیں دیکھا، لوگ آپ کے بارہ میں کچھ ایسی باتیں کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوبکرؓ سے فرمایا: ''میں اللہ کا رسول ہوں اور تجھے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہوں۔'' جونہی آپ نے یہ دعوتی جملہ ختم کیا، روایت کے الفاظ پڑھنے کے قابل ہیں: فلما فرغ کلامه اسلم ابوبکر۔ ''جونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بات سے فارغ ہوئے تو فوراً ابوبکر اسلام لے آئے۔''

پھر ابوبکرؓ صرف اکیلے ایمان نہیں لائے بلکہ آپ کے ساتھ آپ کا پورا خاندان سوائے آپ کے والد ابو قحافہ کے (جو فتح مکہ کے روز ایمان لائے تھے) اور ایک بیٹے عبدالرحمٰن کے باقی سب ایمان لائے۔ چنانچہ ابن ہشام اور دوسرے مورخین نے سابقون بالا یمان کی جو فہرست دی ہے اس میں سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ اور سیدہ عائشہ بنت

ابی بکرؓ کا نام بھی دیا ہے۔ (سیرت ابن ہشام جلد ا ص ۲۵۲، مواہب اللدنیہ جلد ا ص ۴۶)
اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سنہ ا نبوی میں سیدہ عائشہ کی عمر اتنی تھی کہ وہ ایمان لانے کا شعور رکھتی تھیں۔ اس سے ان لوگوں کے دعویٰ کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح کے وقت سیدہ عائشہؓ کی عمر چھ سال تھی۔
(سیدہ عائشہؓ کی عمر کے بارہ میں ملاحظہ ہو ہماری کتاب ''امہات المومنینؓ'')

دعوتی جدوجہد:

جونہی آپ پر وحی کا بارگراں پڑا اور آپ نے اعلان نبوت فرمایا اس کے ساتھ ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتی جدوجہد کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دعوتی جدوجہد کے سلسلہ میں آپ کے ہاں وہی فطری ترتیب نظر آتی ہے جو کسی نئے ماحول میں ایک داعی کو پیش آتی ہیں۔ حالات کا یہ سخت تقاضا تھا کہ اس دعوتی کام کو پوشیدہ طور پر کیا جائے۔

''ایک روز سیدنا علی بن ابی طالبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر تشریف لائے۔ اس وقت آپ اور سیدہ خدیجہ طاہرہ سلام اللہ علیہا نماز پڑھ رہے تھے۔ سیدنا علیؓ نے پوچھا: ''اے محمد! یہ کیا ہے؟'' آپ نے فرمایا: ''اللہ کا دین جس کو اس نے اپنے لیے منتخب فرمایا اور اس کی دعوت وتبلیغ کے لیے اپنے رسول بھیجے۔'' پھر فرمایا: ''میں تجھ کو ایک اللہ کی طرف بلاتا ہوں جو وحدہ لاشریک ہے اور اس کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں اور یہ کہ تم لات وعزیٰ کو ماننا چھوڑ دو۔ سیدنا علی بن ابی طالبؓ نے کہا یہ ایک ایسی بات ہے جس کو اس سے قبل میں نے کبھی نہیں سنا، لہٰذا میں اس کے بارہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک کہ اپنے باپ ابو طالب سے بات نہ کرلوں۔ آپ کو یہ پسند نہ آیا کہ اعلان سے قبل یہ راز منکشف ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا: اے علی! اگر تم اسلام نہیں لاتے تو اس معاملہ کو پوشیدہ رکھو۔ سیدنا علیؓ اس رات آپ کے

Marfat.com

ہاں ہی رکے رہے۔ پھر اللہ نے ان کے دل میں اسلام ڈال دیا۔ (ثم ان اللہ اوقع فی قلب علی الاسلام) اگلے روز صبح وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''اے محمد! کل آپؐ نے مجھ سے کیا فرمایا تھا؟'' آپ نے فرمایا: ''گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور لات و عزیٰ کو نہ مانو۔ اور جن کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنایا جاتا ہے ان سے بیزاری کا اظہار کرو۔ سیدنا علیؓ نے اس بات پر عمل کیا اور اسلام لے آئے۔ اس کے بعد ابو طالب کے ڈر سے آپ کے پاس چھپ چھپ کر آتے رہے اور سیدنا علیؓ نے اپنے اسلام کو چھپائے رکھا اور اس کو ظاہر نہ کیا۔'' (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۲۴)

ضماد ازدی کو دعوت اسلام:

ضماد بن ثعلبہ ازدی زمانہ جاہلیت ہی سے آپ کے دوستوں میں سے تھا۔ یہ جھاڑ پھونک سے لوگوں کا علاج کیا کرتا تھا۔ بعثت کے بعد یہ مکہ آیا تو ایک عجیب منظر دیکھا کہ لڑکوں کا ایک ہجوم آپ کے پیچھے ہے۔ کوئی ان میں سے آپ کو جادوگر کہتا ہے تو کوئی دیوانہ اور مجنون۔ یہ دیکھ کر ضماد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں آسیب اور جنوں کے علاج سے بخوبی واقف و آشنا ہوں، لہٰذا اگر آپ میں آسیب کے کچھ اثرات اور جنوں کی کچھ علامات ہیں تو مجھے علاج کی اجازت مرحمت فرمائیے، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو میرے ہاتھوں سے شفا عطاء فرمائے۔ آپ نے جواب میں ضماد کو کچھ نہیں فرمایا بلکہ یہ چند کلمات اس کے سامنے پڑھے:

الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا، ومن یھدہ اللہ فلامضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ، وانی اشھدان لا الٰہ الا اللہ، وحدہ لا شریک لہ، واشھدأن محمداً عبدہ ورسولہ۔

Marfat.com

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ ہم سب اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اسی سے مدد مانگتے ہیں اور اسی سے مغفرت کے طلب گار ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفسوں کے شر سے، جس کو وہ ہدایت سے نوازے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، اور جس کو وہ گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود برحق نہیں، وہ اپنی ذات میں یکتا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، اور میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول برحق ہیں۔

ضماد ازدی نے جونہی آپ کے منہ سے یہ کلمات سنے جسم پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا اور عرض کیا کہ ان کلمات کو پھر پڑھیے۔ بخدا میں نے بہت سے شعر سنے اور کاہنوں کے بہت سے کلمات منتر سنے لیکن اس جیسا کلام زندگی میں کبھی نہیں سنا۔ یہ کلمات تو فصاحت و بلاغت کی انتہائی گیرائی اور گہرائی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ کہہ کر فوراً کہا: ''اور میں بھی یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا اور یکتا ہے۔ اس کا کوئی ذات و صفات میں شریک نہیں اور میں یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ پھر آپ کے دست مبارک پر اسلام کی بیعت کی اور دولت ایمان سے بہرہ مند ہو کر اپنی قوم کی طرف چلے گئے۔

حافظ ابن حجرؒ نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو بیعت فرما لیا تو ان سے فرمایا کہ یہ بیعت تمہاری قوم کے لیے بھی ہے۔ سیدنا ضمادؓ نے عرض کی: بہت اچھا، میری قوم کے لیے بھی ہے، چنانچہ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر بھیجا جن کا سیدنا ضمادؓ کی قوم پر گذر ہوا۔ تو لشکر کے امیر نے ساتھیوں سے پوچھا: کیا تم نے اس قوم کی کوئی چیز لی ہے؟ ایک آدمی نے کہا: میں نے ان کا ایک لوٹا لیا ہے۔ امیر نے کہا: وہ لوٹا ان کو واپس کر دو کیونکہ یہ ضماد کی قوم ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۳۶، مسند احمد بن حنبل جلد ۱ ص

Marfat.com

۳۰۲، الاصابہ جلد۲ص ۲۱۰، خصائص کبریٰ جلد اص ۱۳۲، دلائل النبوۃ جلد۲ص ۹۰، صفۃ الصفوۃ جلد اص ۶۰۴، دلائل النبوۃ لابی نعیم رقم ۱۸۷، مسلم رقم ۸۶۸، سیرۃ الحلبیہ جلد اص ۳۲۹)

سیدنا ابوذر غفاریؓ کو دعوت اسلام:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوتی سلسلہ مخفی طور پر جاری تھا اور مختلف لوگ پوشیدہ طور پر حلقہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، لیکن پھر بھی قریش مکہ نے ان تمام لوگوں پر زندگی سخت کر دی تھی جو حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ کفار مکہ نے ان پر طرح طرح کے مظالم توڑے اور سختی کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو ان پر نہ آزمایا گیا ہو، حتیٰ کہ اگر باہر سے کوئی شخص آتا اور کلمۂ اسلام پر ایمان لاتا تو وہ اس کو بھی اپنے ظلم وتشدد کا نشانہ بناتے۔ اس سلسلہ میں امام بخاریؒ نے سیدنا ابوذر غفاریؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بیان کیا ہے کہ جب انہیں علم ہوا کہ مکہ میں ایک نبی مبعوث ہوا ہے تو انہوں نے صحیح صورت حال کا پتہ چلانے کے لیے اپنے بھائی کو مکہ بھیجا۔ چنانچہ وہ مکہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کی دعوت سنی اور واپس جا کر اپنے بھائی سیدنا ابو ذر غفاریؓ کو بتایا کہ میں نے انہیں دیکھا ہے وہ اچھے اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں اور ایسی باتیں کرتے ہیں جو شاعری نہیں۔ سیدنا ابوذرؓ کو اپنے بھائی کی باتوں سے تسلی نہ ہوئی۔ انہوں نے فوراً زادراہ تیار کیا اور مختصر سا سامان لے کر مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ چونکہ وہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے نہ تھے اس لیے قیافہ وغیرہ سے آپ کو تلاش کرتے رہے لیکن ناکام رہے۔ سیدنا علیؓ نے انہیں دیکھ لیا۔ پتہ چلا کہ دو تین راتوں سے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تلاش میں سرگرداں ہیں، کیونکہ خود وہ آپ کی صورت سے آشنا نہیں اور قریش سے بوجہ ان کی سختی کے پوچھ نہیں سکتے۔ سیدنا علیؓ ان کے پاس سے گذرے اور پوچھا: کیا آپ کو ابھی تک اس شخص کا ٹھکانہ نہیں ملا؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ سیدنا علیؓ نے آنے کی غرض وغایت پوچھی۔ سیدنا ابوذرؓ نے کہا: اگر وعدہ کرو کہ تم میری رہبری کرو گے تو بتاؤں گا۔ سیدنا علیؓ نے وعدہ کیا۔ سیدنا علیؓ کو آنے کی غرض وغایت

Marfat.com

بتائی اور بتایا کہ میں تین روز سے ان کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ مختصر یہ کہ سیدنا علیؓ نے انہیں آپ کی خدمت اقدس میں پہنچایا۔ انہوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی تعلیمات پوچھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دعوتی پیغام میں وہ سب تعلیمات بیان فرما دیں۔ چنانچہ آپ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوذرؓ کو اسلام کے برملا اظہار سے منع فرمایا اور ہدایت فرمائی کہ فوراً واپس وطن لوٹ جاؤ۔ سیدنا ابوذرؓ نے قسم کھا کر کہا: اے اللہ کے رسول! میں اپنے اسلام کو چھپا نہیں سکتا۔ ابھی لوگوں کے سامنے اونچی آواز میں جا کر اعلان کروں گا۔ چنانچہ اسی وقت مسجد الحرام میں تشریف لائے اور قریش کے مجمع میں سب کو مخاطب کر کے اپنے اسلام کا برملا اظہار فرمایا۔ یہ سن کر قریش نے کہا: اس بے دین کو لینا۔ یہ کہنا تھا کہ چاروں طرف سے لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور اتنا مارا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ یہ دردناک منظر دیکھ کر سیدنا عباسؓ ان پر گر پڑے اور اہل مکہ سے فرمایا: ''شرم نہیں آتی ایک غفاری کی جان لینا چاہتے ہو جبکہ اس کا قبیلہ تمہاری تجارت کی گذرگاہ میں ہے، اس پر سب ہٹ گئے لیکن

عشق را با مصلحت اندیشی مجنوں چہ کار

ابوذر غفاریؓ برابر کلمہ توحید کو دہراتے رہے اور پھر وہی مسجد الحرام تھی اور وہی صنادید اور اساطین قریش کا مجمع اور وہی ان کی ستم رانی۔

(بخاری جلد ۹ ص ۵۴۵، مسلم جلد ۱ ص ۲۹۵، مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۳۸، البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۳۴، الاصابہ جلد ۲ ص ۶۴)

عمرو بن عبسہؓ کو دعوت اسلام:

سیدنا عمرو بن عبسہؓ اپنے ساتھیوں سے کہا کرتے تھے کہ اسلام لانے میں میرا چوتھا نمبر ہے۔ پوچھا گیا کہ آپ کا چوتھا نمبر کیسے ہے؟ فرمایا: میں زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کی جہالت کو دیکھ کر پریشان ہوا کرتا تھا کہ جن بتوں کو یہ خود اپنے ہاتھوں سے

Marfat.com

تراشتے ہیں پھر انہیں کے سامنے جبین نیاز جھکاتے ہیں۔ اچانک ایک روز میں نے سنا کہ ایک شخص مکہ میں غیب کی خبریں بتاتا ہے اور کچھ ایسی باتیں بتلاتا ہے جو اس معاشرہ میں لوگوں کو پسند نہیں ہیں کہ بتوں کی پوجا نہ کرو، جھوٹ نہ بولو اور کوئی برا کام نہ کرو۔ میں آپ کے بارہ میں یہ باتیں سن کر اونٹنی پر سوار ہو کر فوراً مکہ آیا۔ وہاں پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپ کر رہتے ہیں اور آپ کی قوم آپ کے درپے آزار ہے۔ میں بڑی مشکل سے آپ تک پہنچا اور عرض کی: آپ کون ہیں؟ آپ نے جواب دیا: میں اللہ کا نبی اور رسول ہوں۔ میں نے سوال کیا: اللہ کا نبی کس کو کہتے ہیں؟ فرمایا: اللہ کی طرف سے مخلوق کے نام پیغام لانے والے کو۔ میں نے عرض کیا: کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیغام دے کر بھیجا ہے؟ فرمایا: ہاں۔ میں نے عرض کی: اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیا پیغام دے کر بھیجا ہے؟ فرمایا: اللہ نے مجھے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ اس کو تنہا اور یکتا مانا جائے اور اس کی ذات وصفات میں کسی کو شریک نہ مانا جائے۔ اور بتوں کو توڑ دیا جائے اور صلہ رحمی کی جائے یعنی رشتہ داروں سے اچھا سلوک کیا جائے۔ میں نے عرض کیا: اس دین کے معاملہ میں آپ کے ساتھ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ایک آزاد اور ایک غلام۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے ساتھ سیدنا ابوبکرؓ اور ان کے غلام سیدنا بلالؓ تھے۔ میں نے عرض کی: میں آپ کا اتباع کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی اسلام کا اظہار کر کے یہاں مکہ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: فی الحال تمہارا میرے ساتھ رہنا تمہاری طاقت سے باہر ہے اس لیے اب تم اپنے گھر چلے جاؤ اور جب سنو کہ مجھے غلبہ حاصل ہو گیا ہے تو اس وقت میرے پاس چلے آنا۔ سیدنا عمرو بن عبسہؓ فرماتے ہیں کہ مسلمان ہو کر میں واپس اپنے گھر آ گیا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ میں لوگوں سے آپ کے حالات معلوم کرتا رہتا تھا۔ ایک روز مدینہ طیبہ سے ایک قافلہ آیا۔ میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ وہ مکی جو مکہ سے تمہارے پاس آیا ہے اس کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس

کی قوم نے ان کو قتل کرنا چاہا لیکن وہ اس کو قتل نہ کر سکے اور نصرت الٰہی ان کے اور ان کی قوم کے درمیان رکاوٹ بن گئی اور ہم لوگوں کو اس حال میں چھوڑ کر آئے ہیں کہ سب آپ کی طرف لپک رہے ہیں۔ سیدنا عمرو بن عبسہؓ فرماتے ہیں کہ میں اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ طیبہ پہنچا اور آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی: یا رسول اللہ! کیا آپ مجھ کو پہچانتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، کیا تم وہی شخص نہیں ہو جو مکہ میں میرے پاس آیا تھا؟ میں نے عرض کیا کہ میں وہی ہوں۔ میں نے پھر عرض کی: یا رسول اللہ! جو کچھ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو سکھایا ہے اس میں سے آپ مجھے کچھ سکھا دیں۔

(مسند احمد جلد ۴ ص ۱۱۲، طبقات ابن سعد جلد ۴ ص ۱۵۸)

ایک اور روایت میں ہے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیا پیغام دے کر بھیجا ہے۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ صلہ رحمی کی جائے اور انسانی جانوں کی حفاظت کی جائے اور راستوں پر امن رکھا جائے۔ بتوں کو توڑا جائے اور ایک اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ میں نے عرض کی: یہ احکامات جو اللہ نے آپ کو دے کر بھیجا ہے بہت اچھے ہیں اور میں آپ کو اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں آپ پر ایمان لا چکا ہوں اور میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں آپ کے پاس مکہ میں ٹھہر جاؤں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: عمرو! تم خود دیکھ رہے ہو کہ جس دین کو میں لے کر آیا ہوں لوگ اس کو کس قدر ناپسند کر رہے ہیں، لہٰذا تم اس وقت اپنے گھر جا کر رہو، اور جب تم میرے متعلق یہ سنو کہ میں اپنی ہجرت والی جگہ پر پہنچ گیا ہوں تو اس وقت میرے پاس آ جانا۔ (مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۱۱، الاصابہ جلد ۳ ص ۶، الاستیعاب لابن عبد البر جلد ۲ ص ۵۰۰، دلائل النبوۃ لابی نعیم ص ۸۶)

سیدنا حصینؓ کو دعوت اسلام:

سیدنا عمرانؓ کے والد حصین قریش کے معزز لوگوں میں سے تھے۔ ایک دفعہ قریش

ان کے پاس آئے اور کہا کہ آپ ہماری طرف سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جا کر بات کریں کیونکہ وہ ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ چنانچہ حصین حضور علیہ السلام کے پاس گئے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا بڑے میاں یعنی حصین کے لیے جگہ خالی کر دو۔ حصین کے صاحبزادے سیدنا عمرانؓ اور ان کے ساتھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ حصین نے کہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ ہمیں آپ کی طرف سے یہ باتیں پہنچ رہی ہیں کہ آپ ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حصین! یہ بتاؤ کہ تم کتنے خداؤں کی عبادت کرتے ہو؟ حصین نے کہا: میرے سات خدا زمین پر ہیں اور ایک خدا آسمان پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تمہیں کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچتا ہے تو تم کس خدا کو پکارتے ہو؟ حصین نے کہا: آسمان والے خدا کو پکارتا ہوں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تمہارا مال ہلاک ہو جائے تو کس کو پکارتے ہو؟ حصین نے کہا: آسمان والے خدا کو۔ اس پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ عجیب بات ہے کہ جب تمہاری پکار پر وہ اکیلا خدا تمہاری دادرسی کرتا ہے اور تم اس کے ساتھ اور خداؤں کو شریک کرتے ہو۔ کیا تم آسمان والے خدا کی مرضی اور اجازت سے ان دیوتاؤں کو شریک کرتے ہو یا ان دیوتاؤں سے ڈرتے ہو کہ اگر تم ان کو شریک نہیں کرو گے تو وہ تم پر غالب آ جائیں گے۔ حصین نے کہا: ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی بات درست نہیں ہے۔ حصین کہتے ہیں کہ اس وقت مجھے پتہ چلا کہ آج تک ان سے بڑی ہستی سے میں نے بات نہیں کی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حصین! مسلمان ہو جاؤ، سلامتی اور فلاح پاؤ گے۔ حصین نے کہا اگر اسلام قبول کرلوں تو مجھے اپنی قوم اور خاندان سے خطرہ ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ دعا پڑھو:

اللھم استھدیک لارشد امری وزدنی علماً ینفعنی۔

اے اللہ میں اپنے معاملہ میں زیادہ رشد و ہدایت والے راستہ کی تجھ سے راہ نمائی چاہتا ہوں اور میرے علم نافع میں زیادتی فرما۔

Marfat.com

حصینؓ نے یہ دعا پڑھی اور اس مجلس سے اٹھنے سے قبل مسلمان ہو گئے۔ عمرانؓ نے جب دیکھا کہ ان کا باپ حلقہ بگوش اسلام ہو گیا ہے تو انہوں نے اٹھ کر اپنے والد حصین کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ منظر دیکھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو ابل پڑے اور فرمایا: عمران کے رونے کی وجہ سے میری آنکھیں نمناک ہو گئیں کہ ان کے والد جب اندر آئے تو وہ کافر تھے۔ اس وقت عمران نہ ان کے لیے کھڑے ہوئے اور نہ ہی ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن جب وہ مسلمان ہو گئے تو فوراً ان کا حق ادا کر دیا۔ اس وجہ سے مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ جب سیدنا حصینؓ باہر جانے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا: اٹھو اور انہیں اپنے گھر تک پہنچا آؤ۔ سیدنا حصینؓ جونہی دروازے سے باہر آئے تو قریش نے ان کے تیور دیکھ کر کہا کہ یہ بے دین ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ انہیں چھوڑ کر منتشر ہو گئے۔

(اصابہ جلد اص ۳۳۷)

سیدنا معاویہ بن حیدہؓ کو دعوت اسلام:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سیدنا معاویہ بن حیدہؓ تھے۔ وہ اپنے مسلمان ہونے کا واقعہ یوں بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! میں آپ کی خدمت میں اب تک اس لیے حاضر نہیں ہوا کہ میں نے اپنے ہاتھوں کے پوروں کی تعداد میں قسم کھائی تھی کہ نہ میں کبھی آپ کے پاس آؤں گا اور نہ ہی آپ کے دین کو اختیار کروں گا۔ لیکن اب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور حالت یہ ہے کہ میرے پاس تھوڑا سا علم ہے۔ میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی عظیم ذات کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیا دے کر ہمارے پاس بھیجا ہے؟ فرمایا: دین اسلام دے کر بھیجا ہے۔ سیدنا معاویہؓ نے پوچھا: دین اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: دین اسلام یہ ہے کہ تم یہ کہو کہ میں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا اطاعت شعار بنا لیا اور اللہ تعالیٰ کے سوا باقی سب

Marfat.com

سے الگ ہو گیا۔ اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے قابل احترام ہے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ مشرک جب حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا تو اب اسلام لانے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو اس وقت قبول فرمائیں گے جب وہ مشرکین سے الگ اور جدا ہو جائے یعنی ہجرت کرے۔ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ تمہاری کمر پکڑ کر تم لوگوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤں۔ سنو! میرا رب مجھ سے پوچھے گا کہ میرا دین تم نے میرے بندوں تک پہنچا دیا تھا تو میں عرض کرسکوں گا کہ اے میرے رب! ہاں میں نے پہنچا دیا تھا۔ غور سے سنو! تم میں سے جو حاضر ہیں وہ ان لوگوں تک میرا دین پہنچائیں۔ تمہیں قیامت کے روز حق تعالیٰ شانہ کے سامنے اس حال میں بلایا جائے گا کہ تمہارے منہ بند ہوں گے اور سب سے پہلے ہر آدمی کی ران اور ہتھیلی اس کے اعمال کی خبر دے گی۔ سیدنا معاویہؓ فرماتے ہیں: میں نے عرض کی، یا رسول اللہ! یہی ہمارا دین ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ جہاں بھی رہ کر تم اس پر چلو گے یہ دین تمہارے لیے کافی ہو جائے گا۔ (الاستیعاب جلد ا ص ۳۲۳، الاصابہ جلد ا ص ۳۴۰)

سیدنا عدی بن حاتمؓ کو دعوت اسلام:

سیدنا عدی بن حاتمؓ مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے تھے۔ مذہباً عیسائی تھے۔ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ مقام عقرب میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھیجا ہوا گھوڑ سواروں کا ایک دستہ آیا جو میری پھوپھی اور کچھ لوگوں کو گرفتار کر کے لے گیا اور ان سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں پیش کر دیا۔ جب یہ سب لوگ آپؐ کی خدمت میں پیش ہوئے تو میری پھوپھی نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! میرا مددگار جدا ہو گیا، اولاد ختم ہو گئی۔ میں خود عمر رسیدہ ہو گئی ہوں۔ مجھ سے کوئی خدمت بھی نہیں ہو سکتی۔ آپ مجھ پر احسان فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ پر احسان فرمائے گا'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تمہارا مددگار نمائندہ کون ہے؟ پھوپھی نے جواب دیا: عدی بن حاتم۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہی جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے بھاگا ہوا ہے۔

Marfat.com

پھوپھی فرماتی ہیں کہ آپ نے مجھ پر احسان فرما کر مجھے رہا کر دیا۔ ایک شخص نے کہا: آپ سے سواری مانگ لو۔ پھوپھی نے حضور علیہ السلام سے سواری مانگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس بڑی بی کو سواری دے دی جائے۔ عدی بن حاتم بیان کرتے ہیں کہ وہاں سے رہا ہو کر پھوپھی میرے پاس آئیں اور مجھ سے کہا: تم نے ایسا کام کیا ہے جو تمہارا باپ کبھی نہ کرتا (یعنی تم مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے) اور کہا کہ تمہارا دل چاہے یا نہ چاہے، ان کے پاس ضرور جاؤ۔ سیدنا عدیؓ فرماتے ہیں کہ میں پھوپھی کے کہنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ قیصر و کسریٰ والی بادشاہت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر فرمایا: ''عدی! کس وجہ سے بھاگ رہے ہو؟ کیا اس وجہ سے بھاگ رہے ہو کہ لا الٰہ الا اللہ کہنا پڑے گا؟ تو کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہے؟ کس وجہ سے بھاگ رہے ہو؟ کیا اس وجہ سے بھاگ رہے ہو کہ اللہ اکبر کہنا پڑے گا؟ تو کیا اللہ سے کوئی بڑا ہے؟ آپ کی یہ باتیں سن کر اسلام میرے دل میں داخل ہو گیا۔ میرے اسلام لانے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی اور مسرت سے کھل گیا۔ آپ نے لوگوں کو صدقے کی تلقین فرمائی اور پھر مجھ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہاری ضرور مدد کریں گے اور تمہیں بہت زیادہ دیں گے اور تم لوگ بہت زیادہ فتوحات کرو گے یہاں تک کہ ایک پردہ نشین عورت تن تنہا حیرہ اور یثرب کے درمیان یا اس سے بھی زیادہ لمبا سفر کیا کرے گی اور اسے کسی قسم کا چوری کا ڈر نہ ہو گا۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: تم حیرہ شہر کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کی: میں نے دیکھا تو نہیں البتہ اس شہر کا نام سنا ہے۔ آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اللہ اس دین کو ضرور پورا کریں گے اور ایسا امن ہو گا کہ ایک پردہ نشین عورت تن تنہا حیرہ سے چلے گی اور اکیلے بیت اللہ کا طواف کرے گی اور اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ اور ڈر نہ ہو گا۔ اور تم کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا: کسریٰ بن ہرمز کے خزانے؟ آپ

Marfat.com

نے فرمایا: ہاں، کسریٰ بن ہرمز کے۔ اور مال کی اس قدر بہتات ہو جائے گی کہ کوئی لینے والا نہیں ہوگا۔ یہ قصہ سنانے کے بعد سیدنا عدی بن حاتمؓ نے فرمایا: دیکھو، یہ عورت تن تنہا حیرہ سے آرہی ہے اور اکیلی بیت اللہ کا طواف کر رہی ہے۔ اور میں خود ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے کسریٰ کے خزانے فتح کیے، اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے تیسری بات بھی ضرور پوری ہو کر رہے گی اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۵، ۶۵-۶۶، الاصابہ جلد ۲ ص ۴۶۸، ۴۷۳)

سیدنا ذوالجوشن ضبابی کو دعوت اسلام:

سیدنا ذوالجوشن ضبابیؓ آپ کے صحابی تھے۔ یہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ بدر سے فارغ ہوئے تو میں اپنی قرحاء نامی گھوڑی کا بچھڑا لے کر آپؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور کہا: اے محمد! میں آپ کے پاس قرحاء گھوڑی کا بچھڑا لے کر آیا ہوں تاکہ آپؐ اس کو اپنے استعمال میں لائیں۔ آپؐ نے فرمایا: مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس کے عوض بدر کی زرہوں میں سے تمہاری پسند کی ایک زرہ دے دیتا ہوں۔ میں نے کہا: میں اس کو آج اعلیٰ درجہ کے ایک گھوڑے کے بدلہ میں دینے کو تیار نہیں ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: پھر مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر آپؐ نے مجھے دعوت اسلام دیتے ہوئے فرمایا: اے ذوالجوشن! تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے تاکہ تم السابقون میں سے ہو جاؤ۔ میں نے کہا: نہیں، فرمایا: کیوں؟ میں نے عرض کی کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی قوم نے آپ کو جھٹلایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: بدر میں ان کی شکست کے بارہ میں تمہیں کیسی خبر ملی؟ میں نے عرض کیا: مجھے ساری خبر مل چکی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ہمیں تو تمہیں اللہ کی سیدھی راہ بتانی ہے۔ میں نے عرض کیا: مجھے منظور ہے بشرطیکہ مکہ کو فتح کر کے وہاں رہائش پذیر ہو جائیں۔ آپؐ نے فرمایا: اگر تم زندہ رہے تو اسے بھی دیکھ لو گے۔ پھر آپؐ نے ایک شخص سے فرمایا: اس

Marfat.com

شخص کے تھیلا میں زادِ راہ کے لیے عجوہ کھجوریں ڈال دو۔ جب میں واپس آنے لگا تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: یہ شخص بنو عامر کے مشہور شہ سواروں میں سے ہے۔ سیدنا ذوالجوشن فرماتے ہیں کہ بخدا! میں مقام غور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تھا کہ اتنے میں ایک سوار آیا جس نے مجھے بتایا کہ اللہ کی قسم! محمد کعبہ پر غالب آگئے ہیں اور اس میں تحیر ے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر میں نے کہا: کاش میں پیدا ہوتے ہی مر جاتا اور میری ماں کی گود مجھ سے خالی ہو جاتی۔ کاش میں اسی روز ہی مسلمان ہو جاتا جس روز آپ نے مجھے اسلام کی دعوت دی تھی۔ اور پھر میں آپ سے مقام حیرہ بھی جاگیر کے طور پر مانگتا تو آپ مجھے ضرور دے دیتے۔ چنانچہ میں مسلمان ہو گیا۔ (مجمع الزوائد جلد ۶ ص ۱۶۲)

سیدنا ابو قحافہؓ کو دعوت اسلام:

سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی سیدہ اسماءؓ فرماتی ہیں کہ فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو قحافہ کو اسلام کی دعوت دی۔ فرمایا: مسلمان ہو جائیں سلامتی پالیں گے۔ (مجمع الزوائد جلد ۵ ص ۳۰۵) سیدہ اسماءؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے اور اطمینان کے ساتھ مسجد میں بیٹھ گئے۔ سیدنا ابوبکرؓ اپنے والد ماجد سیدنا ابو قحافہ کو لے کر آپؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ جب آپؐ نے انہیں آتے دیکھا تو فرمایا: ''ابوبکر! بڑے میاں کو وہیں کیوں نہیں رہنے دیا۔ میں خود ان کے پاس جاتا۔'' انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! ان پر زیادہ حق بنتا ہے کہ آپ کے پاس چل کر آئیں۔'' چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے پاس بٹھا لیا اور ان کے دل پر اپنا ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ آپ مسلمان ہو جائیں سلامتی پالیں گے۔ چنانچہ سیدنا ابو قحافہ حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اور کلمہ شہادت پڑھ لیا۔ جب سیدنا ابو قحافہؓ آپ کی خدمت میں لائے گئے تو (عمر کی زیادتی کی وجہ سے) ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال ثغامہ بوٹی کی طرح بالکل سفید تھے۔ آپؐ نے فرمایا: اس سفیدی کو بدل دو لیکن کالا خضاب نہ کرنا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۴۵۱)

سیدنا خالد بن سعید بن العاصؓ کو دعوت اسلام:

سیدنا خالد بن سعید بن العاصؓ ان صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جو اسلام کی دعوت کے آغاز ہی میں مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے اسلام لانے کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ ایک آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے ہیں۔ اس آگ کے گڑھے کا طول و عرض اتنا ہے کہ اللہ ہی جانتے ہیں۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے والد ان کو آگ میں دھکیل رہے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کمر سے پکڑے ہوئے ہیں تاکہ وہ آگ میں نہ گر جائیں۔ وہ گھبرا کر نیند سے اٹھے اور اپنے دل میں کہا: بخدا یہ خواب بالکل سچا ہے۔ اس کے بعد ان کی سیدنا ابوبکرؓ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ان کو اپنا یہ خواب سنایا۔ سیدنا ابوبکرؓ نے فرمایا: تمہارے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کا ارادہ کیا گیا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ تم ان کا اتباع کرو۔ تم ان کا اتباع ضرور کرو گے اور اسلام میں داخل ہو جاؤ گے۔ اور اسلام ہی تم کو آگ میں گرنے سے بچائے گا۔ اور تمہارا باپ آگ میں جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجیاد محلہ میں تشریف فرما تھے۔ سیدنا خالد بن سعیدؓ نے وہاں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''اے محمد! آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ ''آپؐ نے فرمایا: میں تم کو ایک اللہ کی دعوت دیتا ہوں جس کا کوئی شریک نہیں اور اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اور ان پتھروں کی عبادت چھوڑ دو جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں، نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ اور نہ انہیں یہ پتہ ہے کہ کون ان کی پوجا کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔ یہ دعوتی کلمات سن کر سیدنا خالد بن سعیدؓ فوراً مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت خوشی اور مسرت ہوئی۔ اس کے بعد خالدؓ اپنے گھر سے غائب ہو گئے۔ ان کے والد کو ان کے مسلمان ہونے کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ ان کی تلاش میں اس نے آدمی بھیجے جو انہیں ڈھونڈ لائے۔ جب وہ والد کے پاس آئے تو اس نے انہیں خوب ڈانٹا اور جو کوڑا اس کے ہاتھ

Marfat.com

میں تھا اس سے انہیں اس قدر پیٹا کہ وہ کوڑا ٹوٹ گیا۔ پھر کہا اللہ کی قسم! میں تمہارا کھانا پینا بند کردوں گا۔ یہ سن کر سیدنا خالد بن سعیدؓ نے کہا: اگر تم میرا کھانا پینا بند کردو گے تو اللہ تعالیٰ مجھے اتنی روزی ضرور دیں گے جس سے میں اپنی زندگی کے دن گذار سکوں۔ یہ کہہ کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ہر طرح کا خیال رکھتے اور یہ سارا وقت آپ کے ساتھ رہتے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۳۲)

ایک روایت میں ہے کہ سیدنا خالد بن سعیدؓ مکہ کے گرد و نواح میں اپنے والد سے چھپ گئے۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ حبشہ کی ہجرت ثانیہ کے لیے جانے لگے تو اس وقت انہوں نے سب سے پہلے ہجرت کی۔ (الاستیعاب جلد ا ص ۱۰۴) ان کا باپ سعید بن العاصؓ جب بیمار ہوا تو کہنے لگا کہ اگر اللہ نے مجھے اس بیماری سے شفا دی تو ابن ابی کبشہ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے خدا کی میں مکہ میں کبھی عبادت نہیں ہونے دوں گا۔ سیدنا خالدؓ کو جب اس بات کا پتہ چلا تو یہ دعا مانگی: اے اللہ! اسے اس بیماری سے شفا نہ دینا۔ چنانچہ وہ اسی بیماری میں مر گیا۔

(مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۲۴۹، طبقات ابن سعد جلد ۴ ص ۹۵)

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کو دعوت اسلام:

سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی تھے۔ یہ اپنے ایمان لانے کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے عنفوان شباب میں عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں مکہ کے گرد و نواح میں چرایا کرتا تھا۔ ایک دن جب کہ میں بکریاں چرا رہا تھا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: اے جوان! کیا ہمیں دودھ پلاؤ گے؟ میں نے جواب دیا: دودھ تو ہے لیکن میں امین ہوں۔ امانت میں خیانت نہیں کرسکتا، لہٰذا آپ حضرات کو دودھ پلانے سے معذور ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تمہارے پاس کوئی ایسی پٹھ ہے جس کے ساتھ کسی نر نے جفتی نہ کی ہو۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ چنانچہ میں

Marfat.com

ایک پٹھیا لا کر آپ کی خدمت میں لے آئے۔ سیدنا ابوبکرؓ نے اسے پکڑے رکھا اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تھنوں کو چھوا اور دعا کی۔ دودھ کی برکت سے بھر
ہو گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دوہا۔ پیا اور پلایا مجھے اور سیدنا ابوبکرؓ کو اور
پھر نوش فرمایا۔ پھر آپ نے تھنوں کو حکم دیا: "اقلص" سکڑ جا۔ وہ پہلے کی طرح سکڑ گئی۔

پھر دوبارہ میں نے اسلام قبول کر لیا اور بارگاہ رسالت میں عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے یہ سکھائیے۔ آپ نے میرے سر پر بہت شفقت بھرا ہاتھ پھیرا اور فرمایا: بارک اللہ فیک فانک غلام معلم۔ "اللہ تعالیٰ تجھ پر اپنی برکات سے نوازے۔ تم تعلیم یافتہ نوجوان ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی برکت سے سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کا شمار جلیل القدر علماء میں ہوتا تھا۔ (السیرۃ الحلبیہ جلد ۱ ص ۲۶۶، السیرۃ النبویہ ابن کثیر جلد ۱ ص ۳۳۳)

صہیب رومیؓ کو دعوت اسلام:

صہیبؓ کا والد کسریٰ کی حکومت میں ایک اعلیٰ افسر تھا۔ رومی لشکر نے ایران پر حملہ کیا تو صہیب کو جو ابھی چھوٹے بچے تھے قیدی بنا کر لے گئے۔ انہوں نے روم میں ہی نشوونما پائی۔ یہاں تک کہ جوان ہو گئے۔ پھر عرب کے کچھ لوگ روم گئے۔ ان میں سے کسی نے صہیب کو خرید لیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت کیا تو ایک روز صہیب کا شانہ نبوی کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات سیدنا عمار بن یاسرؓ سے ہوئی۔ عمارؓ نے صہیبؓ سے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سننے کے لیے آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ عمارؓ نے کہا: میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ چنانچہ دونوں بارگاہ رسالت میں بیٹھ گئے اور آپ نے ان کے سامنے اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ قرآن حکیم کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ بس پھر کیا تھا۔ دل نور ایمان سے منور ہو گئے اور فوراً دونوں حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ شام تک بارگاہ نبوت ہی میں رہے۔ شام کے وقت چھپ چھپا کر اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ عمار بن یاسرؓ جب گھر پہنچے تو والدہ نے پوچھا کہ دن بھر کہاں غائب رہے؟ سیدنا عمارؓ نے سارا واقعہ

Marfat.com

بیان کر دیا اور اپنے والدین کے سامنے بھی اسلام کی تعلیمات کو پیش کیا۔ وہ دونوں اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی وقت دعوت اسلام کو قبول کر لیا۔ چنانچہ ایک روز میں صہیب رومیؓ، عمار بن یاسرؓ یاسر اور عمار کی والدہ سمیہؓ چاروں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

(اسد الغابہ لابن اثیر جلد ۴ ص ۱۵۶ تذکرہ عمار بن یاسر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ صہیب روم کا پہلا پھل ہے۔ آپ اس وقت ارقم بن ابی ارقم کے مکان پر فروکش تھے اور تیس سے زیادہ صحابہ کرامؓ دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ جن میں سے اکثر حضرات نے مشرکین مکہ کے خوف سے اسلام کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۱۶۲)

سیدنا صدیق اکبرؓ کی دعوت اسلام:

اعلان نبوت کے بعد ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ طور پر دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے اور دوسری طرف سیدنا ابو بکر صدیقؓ دعوت کے اس فریضہ کو سرانجام دے رہے تھے۔ چنانچہ آپ کی دعوت و تبلیغ سے کئی حضرات دائرہ اسلام میں داخل ہوئے جن میں سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ، سیدنا عثمانؓ، سیدنا ابو عبیدہ بن الجراحؓ، سیدنا عبدالرحمن بن عوفؓ، سیدنا طلحہ بن عبید اللہؓ اور سیدنا زبیر بن عوامؓ قابل ذکر ہیں۔ پھر سیدنا صدیق اکبرؓ صرف اکیلے ایمان نہیں لائے بلکہ ان کے ساتھ ان کا پورا خاندان بھی حلقہ بگوش اسلام ہوا سوائے ان کے والد ابو قحافہؓ کے جو فتح مکہ کے روز اسلام لائے تھے اور ایک بیٹا تھا وہ بھی بعد میں ایمان لایا۔ چنانچہ ابن ہشام اور دوسرے مورخین نے سابقون بالایمان کی جو فہرست دی ہے اس میں سیدہ اسماء بنت ابی بکرؓ اور سیدہ عائشہ بنت ابی بکرؓ کا نام بھی ہے۔

(ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۵۲، مواہب اللدنیا جلد ۱ ص ۴۶)

دعوت و تبلیغ کا یہ عمل اندر ہی اندر جاری تھا اور قریش مکہ کی مخالفت بھی اسی طرح اندر ہی اندر ہو رہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ چند ہی روز میں اسلام کا یہ نخل اپنی جڑوں سے اکھڑ کر صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا لیکن اسلام کی دعوت میں وہ کشش تھی کہ

Marfat.com

جس کے کان میں اس کا کلمہ پڑ جاتا وہ ایک مرتبہ اس کی قبولیت کے بارہ میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔ اسی طرح اسلام کا یہ قافلہ منزل بمنزل آگے بڑھتا رہا۔ گویا کہ ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اسلام کی دعوت میں روز بروز تیزی آتی گئی اور نہ صرف مکہ میں آپ کی دعوت کے بارہ میں پرچار ہونے لگا بلکہ دور دور تک مختلف قبائل میں بھی آپ کی دعوت کا پیغام پہنچنا شروع ہو گیا۔ سیدنا عمرو بن عبسہؓ اور عمرو بن مرہ جہنیؓ جیسے سربراہان قبائل بھی حلقہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ اس طرح دعوت اسلام کی مقبولیت اور اسلامی برادری میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ جن لوگوں نے ابتداء میں دعوت اسلام کو لبیک کہا ان میں ہوسکتا ہے کہ کچھ حضرات معاشرہ کے نچلے طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں لیکن عقل وخرد میں سب ہی ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ اس بارہ میں مسٹر ایس۔ پی اسکاٹ کا تبصرہ قابل مطالعہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں کھلی کھلی صداقت و دیانت ودیعت تھی۔ آپ کی حقانیت اور زہد واتقاء پر اس سے بڑھ کر اور کیا قابل وثوق شہادت ہوسکتی ہے کہ آپ کے سب سے پہلے پیروکار اور حلقہ اسلام میں داخل ہونے والے حضرات صاحبانِ دانش وخرد تھے۔ انہوں نے نہایت ادب و احترام اور عقیدت ومحبت کے ساتھ اسلام کی دعوت کو قبول کیا۔ تاریخ کے اوراق میں جس قدر ادیان و مذاہب کا ذکر ملتا ہے، ان میں جتنے لوگ بھی ابتداء میں دولت ایمان و ایقان سے مشرف ہوئے وہ جاہل اور ان پڑھ لوگ تھے جن کا کوئی کیریکٹر ہی نہ تھا اور کسی طرح اس قابل نہ تھے کہ عامۃ الناس اور اس سماج کی اکثریت انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی۔ وہ لوگ تبلیغ کرتے تو ایسی زبان میں جو خلاف محاورہ اور صرف ونحو اور گرامر کے قواعد سے عاری ہوتی تھی۔ اس لیے

Marfat.com

عامۃ الناس ان کا مذاق اڑاتے۔ وہ ایسے سادہ لوح ہوتے تھے کہ اصحاب فلسفہ اور صاحبانِ عقل و دانش اور غیر مذاہب کے مقتدا ان کی سادگی پر ہنسا کرتے تھے۔ ان کی غالب تعداد ملک کے مجرموں، غلاموں، بھکاریوں اور خدمت گاروں پر مشتمل ہوتی تھی، لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر سب سے پہلے ایمان لانے والے نیک کردار، پاکیزہ خصائل، بلند خیال اور اعلیٰ اخلاق صنادید عرب تھے۔ ان نومسلموں کی پاکیزگی اخلاق اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ ان کے اغراض نہایت پاکیزہ اور معتقدات بے حد مخلصانہ تھے۔ اگر کوئی ایسا شخص جو ہر وقت لوگوں سے میل جول رکھتا ہو، وحی والہام کا دعویٰ کرے تو اس کے گہرے اور گاڑھے دوست اس کو بمشکل اس دعوے میں سچا مانتے ہیں۔ کسی مذہبی معلم و مقنن کو اس صورت میں زیادہ کامیابی ہو سکتی ہے جب وہ لوگوں سے دور رہتا ہو نہ اس طرح کہ اپنے معتقدین سے ہر وقت خلا ملا رکھتا ہو، اور ان لوگوں کو ہر وقت اس کے اندرونی حالات جانچنے اور پرکھنے کے مواقع حاصل ہوں۔"

(S.P.Scot: The History of The Moorish Empire in Europe, P: 94, London)

ابتداء میں دعوت اسلام کو قبول کرنے والے حضرات:

اب ایک نظر ان حضرات پر ڈالیں جنہوں نے سنہ ایک اور دو نبوت میں اسلام کی دعوت کو قبول کیا۔ اسلام میں سب سے پہلے داخل ہونے والی خاتون سیدہ خدیجہ طاہرہ سلام اللہ علیہا ہیں۔ ان کے ساتھ ہی ان کی چاروں صاحبزادیاں سیدہ زینب، سیدہ رقیہ، سیدہ ام کلثوم اور سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہن دولت ایمان سے بہرہ یاب ہوئیں۔ ان صاحبزادیوں کے بعد دوسری عورت جو اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئیں وہ سیدنا فاروق اعظمؓ کی ہمشیرہ سیدہ فاطمہ بنت خطابؓ تھیں۔ پھر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام اور آپ کے متبنیٰ سیدنا زید بن حارثہؓ نے اسلام

Marfat.com

کی دعوت کو قبول کر کے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ اسی سال میں سیدنا بلال بن رباحؓ اور ان کی والدہ حمامہؓ حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔ سیدنا ابو ذر غفاری کے بڑے بھائی انیس بن جنادہؓ مسلمان ہوئے اور پھر چند روز کے بعد سیدنا ابو ذر غفاریؓ (ان کا اصلی نام جندب بن جنادہؓ تھا) مشرف با سلام ہو گئے۔ عامر بن فہیرہؓ جو سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے آزاد کردہ غلام تھے اور صہیب رومیؓ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ سیدنا ابوبکرؓ کا پورا گھرانہ سوائے دو آدمیوں کے مسلمان ہوا جن میں سیدہ اسماءؓ اور سیدہ عائشہؓ بھی تھیں۔ عمار بن یاسرؓ کا پورا گھرانہ نور ایمان سے منور ہوا۔ بنی زہرہ کے حلیف جناب خباب بن ارت تمیمیؓ اسلام لائے۔ اسلام لانے میں ان کا چھٹا نمبر بتایا جاتا ہے۔

سنہ ا نبوت ہی میں سیدنا مصعب بن عمیر القرشیؓ جو بنی عبدالدار کے نور چشم تھے، عیاش بن ربیعہؓ، ارقم بن ابی الارقم المخزومیؓ عثمان بن مظعونؓ اور ان کے دو بھائی قدامہ بن مظعونؓ اور عبداللہ بن مظعونؓ اور سیدنا صدیق اکبرؓ کی دعوت پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ سیدنا عثمان بن عفانؓ، سیدنا زبیرؓ، سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ، سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور سیدنا طلحہ بن عبید اللہؓ اور دوسرے کئی ایک حضرات بھی سیدنا ابوبکرؓ کے ہاتھ پر اسلام لا چکے تھے۔ امین الامت سیدنا ابوعبیدہ بن جراحؓ بھی اسی سال حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ سیدنا سعید بن عاصؓ الاموی، عقبہ بن غزوانؓ، مقداد بن عمرو الکندی (مقداد بن اسودؓ) ام ایمنؓ، سیدہ ام الفضل زوجہ سیدنا عباسؓ (اصل نام لبابہ تھا) سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کی والدہ ماجدہ (ام عبد بنت عبدود) حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اندازہ فرمائیں کہ دو سال کے قلیل عرصہ میں اتنے لوگوں کا اپنے آبائی عقیدہ کو چھوڑ کر اس کے بالکل برعکس عقیدہ کو قبول کرنا، شرک کو خیر باد کہہ کر اللہ وحدہ لاشریک کو قلب میں بسانا اسلام کی دعوتی قوت کا اعجاز تھا۔ (السیرۃ النبویہ جلد ا ص ۲۵۳)

دعوت کی ہمہ گیری:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت روز بروز مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کرتی رہی اور کاروانِ اسلام ہر روز مختلف لوگوں کے اس میں شامل ہونے سے بڑھتا رہا یہاں

Marfat.com

تک کہ سنہ ۳ نبوت میں اس قافلہ میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ لوگ جو اتنی تیزی سے کاروانِ اسلام میں داخل ہو رہے تھے اس میں اسلام کی دعوتی قوت کا اثر ہونے کے ساتھ ساتھ دعوت کی ہمہ گیری کو بھی بہت بڑا دخل تھا، کیونکہ دعوت کی ہمہ گیری قلب و ذہن میں خود جگہ بنا لیتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب اشراف قریش نے ابو طالب کی معرفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آخر آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

''میں صرف ایک بات کا مطالبہ کرتا ہوں اگر تم اسے مان لو تو تم سارے عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم تمہارا مطیع و فرماں بردار ہو جائے گا۔''

(البدایہ والنہایہ جلد۲ ص ۱۲۳)

توحید کا کلمہ بظاہر ایک اعتقادی کلمہ ہے لیکن اس کے اندر ہر قسم کی انسانی فتوحات کا راز پنہاں ہے۔ یہ انسانی فطرت کی آواز ہے اس لیے وہ انسانی نفسیات کی انتہائی گہرائیوں میں شامل ہو جاتا ہے اور اکثر خود مخالفین کے اندر اپنے حامی پیدا کر لیتا ہے۔ خالد بن ولیدؓ فتح مکہ سے کچھ پہلے حلقہ اسلام میں داخل ہوئے لیکن اسلام کی سچائی بہت پہلے سے ان کے قلب میں اپنے پاؤں جما چکی تھی۔ اسلام لانے کے بعد انہوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میرے دل میں بہت پہلے یہ بات پڑ چکی تھی کہ حق قریش کی طرف نہیں بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے اور مجھے آپ کے ساتھ مل جانا چاہیے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ نے ان کی بات نقل کی ہے کہ

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تمام جنگوں میں شریک رہا مگر کوئی جنگ ایسی نہیں تھی جس میں میں شریک ہوا ہوں اور یہ خیال لے کر واپس نہ آیا ہوں کہ میں صحیح جگہ نہیں کھڑا ہوں۔'' (البدایہ والنہایہ جلد۴ ص)

اسی طرح بہت سے لوگوں کے بارہ میں مختلف روایات ملتی ہیں کہ ان کے دلوں میں بہت پہلے سے اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا حتیٰ کہ وہ اس کا خواب دیکھنے لگے تھے جیسے سیدنا خالد بن سعید بن العاصؓ نے اسلام لانے سے پہلے خواب

Marfat.com

دیکھا تھا کہ وہ آگ کے بہت بڑے گڑھے کے کنارے کھڑے ہیں۔ انہیں کوئی (ایک روایت میں ان کا والد) دھکا دے کر اس میں گرانا چاہتا ہے۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور انہوں نے ان کو آگ میں گرنے سے بچالیا۔

تین سالوں میں اسلام لانے والے حضرات:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین سالہ خفیہ دعوت کے نتیجہ میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کے نام حسب ذیل ہیں:

بنو ہاشم میں سے:

(۱) جعفر بن ابی طالبؓ۔ (۲) اسماء بنت عمیسؓ زوجہ جعفرؓ بن ابی طالب (۳) صفیہ بنت عبدالمطلبؓ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی) اروٰی بنت عبدالمطلبؓ (۵) عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلبؓ۔

بنی عبد شمس میں سے:

(۶) ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہؓ (۷) سہلہ بنت سہیل بن عمرو (زوجہ ابوحذیفہؓ)

بنو اُمیہ میں سے:

(۸) عثمان بن عفان (۹) اروٰی بنت کریزؓ (والدہ سیدنا عثمانؓ) (۱۰) خالد بن سعید بن العاصؓ (۱۱) امیہ بن خلف (۱۲) ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ، (۱۳) عبداللہ بن جحشؓ (۱۴) ابواحمد بن جحشؓ (۱۵) عبیداللہ بن جحش (یہ سیدہ ام حبیبہؓ کا خاوند تھا۔ ہجرت کر کے حبشہ گیا اور وہاں عیسائی ہو کر مر گیا)

بنو عدی میں سے:

(۱۶) سعید بن زید بن عمرو بن نفیلؓ (سیدنا عمرؓ کے بہنوئی) (۱۷) فاطمہ بنت خطاب (سیدنا عمرؓ کی بہن اور سعید بن زیدؓ کی اہلیہ) (۱۸) زید بن خطابؓ (سیدنا عمرؓ کے

Marfat.com

بھائی)(۱۹) عامر بن ربیعہؓ (۲۰) لیلیٰ بنت ابی حثمہ (عامر کی اہلیہ) (۲۱) معمر بن عبداللہ بن نضلہ۔ (۲۲) نعیم بن عبداللہ النحام (۲۳) عدی بن نضلہؓ (۲۴) عروہ بن اثاثہ (عمرو بن العاصؓ کے ماں جائے بھائی) (۲۵) مسعود بن سوید بن حارثہ (۲۶) واقد بن عبداللہ (۲۷) خالد بن بکیر بن عبد یالیل (۲۸) ایاس بن بکیر (۲۹) عامر بن بکیر (۳۰) عاقل بن بکیر

بنی تیم میں سے:

(۳۱) ام رومان (سیدنا ابوبکرؓ کی اہلیہ) (۳۲) اسماء بنت ابی بکر (۳۳) عائشہ بنت ابی بکرؓ (۳۴) طلحہ بن عبید اللہ (۳۵) صعبہ بنت حضرمی (والدہ سیدنا طلحہؓ) (۳۶) حارث بن خالدؓ (۳۷) صہیب بن سنان رومیؓ (حلیف بنو تیم)

بنو اسد بن عبدالعزیٰ میں سے:

(۳۸) زبیر بن عوامؓ (۳۹) خالد بن حزامؓ (حکیم بن حزامؓ کے بھائی) (۴۰) اسود بن نوفلؓ (۴۱) عمرو بن امیہ

بنو زہرہ میں سے:

(۴۲) عبدالرحمٰن بن عوفؓ (۴۳) شفا بنت عوفؓ (۴۴) سعد بن ابی وقاصؓ (۴۵) عمیر بن ابی وقاصؓ (۴۶) عامر بن ابی وقاصؓ (۴۷) مطلب بن ازہرؓ (۴۸) رملہ بنت ابی عوفؓ (اہلیہ مطلب) (۴۹) طلیب بن ازہرؓ (۵۰) عبداللہ بن شہابؓ

حلفاء بنی زہرہ میں سے:

(۵۸) مصعب بن عمیرؓ (۵۹) ابو الروم بن عمیرؓ (۶۰) خراس بن النضرؓ (۶۱) جہم بن قیسؓ

بنی جمح میں سے:

(۶۲) عثمان بن مظعون (۶۳) قدامہ بن مظعون (۶۴) عبداللہ بن مظعون

Marfat.com

(۶۵) سائب بن عثمانؓ بن مظعون (۶۶) معمر بن حارث بن معمرؓ (۶۷) حاطب بن حارثؓ (۶۸) فاطمہ بنت مجالؓ (۶۹) فکیہہ بنت یسارؓ (۷۰) سفیان بن معمرؓ (۷۱) نبیہ بن عثمانؓ

بنو سہم میں سے:

(۷۲) عبداللہ بن حذافہؓ (۷۳) خنیس بن حذافہ (۷۴) ہشام بن عاص بن وائل (۷۵) حارث بن قیسؓ (۷۶) بشیر بن حارثؓ (۷۷) معمر بن حارثؓ (۷۸) قیس بن حذافہؓ (۷۹) ابوقیس بن حارث (۸۰) عبداللہ بن حارث (۸۱) سائب بن حارثؓ (۸۲) حجاج بن حارثؓ (۸۳) بشیر بن حارث (۸۴) سعید بن حارثؓ

حلفاء بنی سہم میں سے:

(۸۵) عمیر بن رباب (۸۶) محمیہ بن الجزاء

بنو مخزوم میں سے:

(۸۷) ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد (۸۸) ام سلمہؓ (۸۹) ارقم بن ابی ارقم (۹۰) عیاش بن ابی ربیعہؓ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی) (۹۱) اسماء بنت سلامہؓ (۹۲) ولید بن ولید بن مغیرہ (سیدنا خالد بن ولیدؓ کے بھائی) (۹۳) ہشام بن ابی حذیفہؓ (۹۴) سلمہ بن ہشامؓ (۹۵) ہاشم بن حذیفہؓ (۹۶) ہبار بن سفیانؓ (۹۷) عبداللہ بن سفیانؓ

حلفاء بنی مخزوم میں سے:

(۹۸) یاسرؓ (۹۹) عمار بن یاسرؓ (۱۰۰) عبداللہ بن یاسرؓ

بنو عمار بن لوی میں سے:

(۱۰۱) ابوسبرہ بن ابی رہمؓ (۱۰۲) ام کلثوم بنت سہیل بن عمرو (۱۰۳) عبداللہ بن سہیل بن عمرو (۱۰۴) حاطب بن عمروؓ (۱۰۵) سلیط بن عمروؓ (۱۰۶) سکران بن عمروؓ (۱۰۷) یقظہ بنت علقمہؓ (۱۰۸) مالک بن زمعہ (۱۰۹) عبداللہ بن ام مکتومؓ

Marfat.com

بنی فہر بن مالک میں سے:

(۱۱۰) ابو عبیدہ بن الجراحؓ (۱۱۱) سہیل بن بیضاءؓ (۱۱۲) سعد بن قیسؓ (۱۱۳) عمرو بن حارث بن زہیرؓ (۱۱۴) عثمان بن عبد غنم بن زہیر (۱۱۵) حارث بن سعیدؓ (۱۱۶) طلیب بن عمیرؓ۔ (یہ بنو عبد قصی میں سے تھے اور آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے)

ان حضرات کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے اور کچھ غلام اور لونڈیاں بھی تھیں جو ان تین سالوں میں آپ کی خفیہ دعوت کے باوجود ایمان لائیں۔ جن سے کاروانِ اسلام کو بڑی تقویت پہنچی۔

Marfat.com

پہاڑی دعوت

روایات کے مطابق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے بت کدے میں مخفی اور پوشیدہ طور پر توحید کا پرچار کرتے رہے اور لوگ آہستہ آہستہ اس دعوت کی جاذبیت سے حلقہ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ تین سال کی دعوتی تربیت کے بعد یہ حکم نازل ہوا کہ اب علی الاعلان اسلام کی دعوت دیں۔

فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین

آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا ہے اس کا صاف صاف اعلان کر دیجئے۔

لیکن اس سے قبل یہ حکم ملا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو دین اسلام کی دعوت دیں۔

ارشاد خداوندی ہوا:

وانذر عشیرتک الاقربین، واخفض جناحک لمن اتبعک من المومنین۔

(الشعراء:۲۱۴-۲۱۵)

آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیں اور جو ایمان لا کر آپ کا اتباع کرے اس کے ساتھ شفقت اور نرمی کا معاملہ کیجئے۔

اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل ضروری تھی، لیکن یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس معاشرہ میں جو صدیوں سے کفر و شرک کا خوگر تھا اس اللہ وحدہ لاشریک کی توحید کی صدا بلند کرنا اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ وہ لوگ پتھر کے بنے ہوئے

Marfat.com

اندھے اور بہرے بتوں کی پوجا کے عادی تھے اور ان بتوں کی آن پر اپنی جان قربان کرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے، ان کو توحید کی دعوت دینا ایک نہایت مشکل کام تھا۔ لیکن پھر بھی آپ اس حکم کی تعمیل میں صفا کی پہاڑی پر چڑھے۔ اس زمانہ میں یہ پہاڑی بلند تھی۔ اگرچہ آج بھی اس پہاڑی کا وجود ہے لیکن اب یہ پہاڑی شہر مکہ کی سطح کے برابر ہوگئی ہے۔ حرم مکہ اس کے دامن میں تھا۔ اس پہاڑی پر چڑھ کر آپؐ نے نام لے لے کر عرب کے قبائل کو پکارا: اے بنی عدی، اے بنی ہاشم، اے بنی فلاں وغیرہ۔

یہ آواز ہر کان میں پہنچی۔ یہ ایک نہایت محترم شخصیت کی آواز تھی کیونکہ قریش کے تمام قبائل اس شخصیت کے گرویدہ تھے۔ اسے "الصادق" اور "الامین" کے معزز القاب سے پکارتے تھے، لہٰذا یہ آواز سنتے ہی تمام قبائل کے لوگ چھوٹے اور بڑے، خواص اور عوام جمع ہو گئے۔ جب سب لوگ پہاڑی کے دامن میں اکٹھے ہو گئے تو آپ نے ان سب سے پہلے ایک سوال کیا:

"اگر میں یہ کہوں کہ یہ وادی جو اس پہاڑ کے عقب میں ہے، یہاں دشمن کی فوج موجود ہے اور وہ عنقریب تم پر حملہ آور ہونے والی ہے، کیا تم سب لوگ میری اس بات کی تصدیق کرو گے؟"

سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا: "بے شک کیونکہ ہمارا یہ تجربہ ہے کہ آپ ہمیشہ سچ ہی بولتے ہیں۔" جب اپنی راست گوئی کی ان سے تصدیق کروالی تو پھر فرمایا: "عذاب خداوندی کا لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ قبل اس کے کہ عذاب خداوندی کا یہ لشکر تم پر حملہ کرے، میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔" پھر آپؐ نے اپنی نبوت اور اللہ تعالیٰ کی توحید کے موضوع پر کچھ ارشاد فرمایا۔ بہت ممکن تھا کہ لوگ کچھ اثر لیتے اور آپ کے مشن کی تصدیق کرتے، لیکن آپ کے اپنے ہی خاندان بنو ہاشم سے ایک قریبی بوڑھا ابولہب (عبدالعزیٰ) بھڑکتا ہوا اٹھا اور یہ کہتا ہوا اس اجتماع سے چل دیا:

"محمدؐ! تیرے ہاتھ ٹوٹیں، کیا تو نے اسی لیے ہمیں یہاں اکٹھا کیا تھا؟"۔

Marfat.com

(بخاری جلد۲ص ۷۰۲، مسلم جلد اص ۲۰۸، طبری جلد۲ص ۳۱۹، زوض الانف جلد۲ص ۱۰۹)

ابولہب آپ کے والد ماجد عبداللہ کا بڑا بھائی تھا۔ عمر رسیدہ اور خاندان کا سرپرست تھا مال و دولت کا مالک بھی تھا۔ لوگوں نے جب آپ کے اتنے بڑے آدمی کو خفا ہو کر جاتے دیکھا تو دوسرے لوگ بھی اس کو دیکھ کر چل دیئے، لیکن آپ کی یہ دعوت با اثر رہی کیونکہ ہر آدمی کے ذہن میں آپ کی دعوت نبوت اور توحید خداوندی کا سوال گھر کر چکا تھا۔ وہ اپنے گھروں میں جا کر بھی اس بات پر غور وفکر کرتے رہے، ہمدردانہ انداز میں بھی اور مخالفانہ انداز سے بھی۔ اور یہی ایک داعی حق کی کامیابی ہوتی ہے کہ لوگ اس کی بات کو ذہنوں میں رکھ کر اس پر غور وخوض کریں۔

پہاڑی دعوت کا اثر:

آپ کا یہ پہاڑی وعظ ختم ہو گیا۔ لوگ گھروں کو چلے گئے لیکن ہر شخص کے ذہن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سابقہ زندگی تھی جو برف کی طرح بالکل صاف اور شفاف اور شبنم کی طرح پاکیزہ تھی۔ سیدہ خدیجہ طاہرہؓ بھی اسی زندگی کو دیکھ کر آپ پر ایمان لائی تھیں اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے بھی اسی پاکیزہ زندگی کو آپ کی صداقت کی دلیل بنایا۔ فرمایا:

''بے شک میں اس سے قبل تم لوگوں کے درمیان اپنی زندگی بسر کر چکا ہوں کیا تم سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے۔ (۱۶:۱۰)

گویا کہ جب آپ نے کسی انسانی اور دنیوی معاملہ میں جھوٹ نہیں بولا اور چالیس سال تم لوگ آپ کی صداقت کو دیکھ کر اسے ''الصادق'' اور ''الامین'' کہتے رہے ہو تو یہ کیونکر ممکن ہوسکتا ہے کہ اکتالیسویں سال میں قدم رکھتے ہی وہ شخص کذاب اور مفتری بن جائے۔

اب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کے لیے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ وہ یہ کہ آپ نے بنو عبدالمطلب کی ایک دعوت کی جس میں کم وبیش چالیس آدمی اکٹھے ہو گئے۔ اس میں آپ کے چچا ابولہب، ابو طالب، حمزہ اور عباس بھی شامل

تھے۔ کھانا تھوڑا تھا اور آدمی زیادہ۔ آپ نے گوشت کا ایک ٹکڑا لے کر دندان مبارک سے چیرا اور پھر اسی پیالے میں رکھ دیا اور فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر کھاؤ۔ پھر یہ ہوا کہ اسی ایک پیالہ گوشت سے سب مدعوئین سیر ہو گئے اور کچھ بچ بھی گیا۔ ایک پیالہ دودھ تھا۔ سیدنا علیؓ سے آپ نے فرمایا کہ سب لوگوں کو باری باری پلاؤ۔ اسی ایک پیالہ سے سب لوگ سیراب ہو گئے حالانکہ یہ ایک پیالہ صرف ایک آدمی کو سیراب کر سکتا ہے۔

کھانے سے فراغت کے بعد آپ نے کچھ فرمانا چاہا تو آپ کا چچا ابولہب پھر اٹھا اور حاضرین کو مخاطب کر کے کہنے لگا: ''لوگو! اٹھو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آج تمہارے کھانے پر جادو کر دیا ہے۔ ایسا جادو جو اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا۔ ابولہب کی اس بات پر تمام لوگ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور آپ کو کچھ فرمانے کی نوبت نہ آئی۔ دوسرے روز آپ نے پھر اسی طرح دعوت کا اہتمام کیا۔ جب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے انہیں فرمایا کہ جو شی میں نے تمہارے سامنے پیش کی ہے کسی شخص نے بھی اس سے بہتر شی اپنی قوم کے سامنے پیش نہیں کی۔ وہ شی یہ ہے کہ میں دنیا و آخرت کی خیر تمہارے لیے لے کر آیا ہوں۔''

(فتح الباری جلد ۸ ص ۳۸۶، خصائص کبریٰ جلد ۱ ص ۱۲۳، دلائل النبوۃ جلد ۱ ص ۴۲۸، مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۱۱۳، سیرۃ حلبیہ جلد ۱ ص ۲۷۱)

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تو کہہ دی لیکن مشرکین میں اس کا ردّ عمل نہایت سخت ہوا۔ اب آپؐ نے پہلے سے برعکس اعلانیہ توحید خداوندی کا پرچار اور شرک و کفر کی قباحت بیان کرنا شروع کر دی۔ بتوں کی حقیقت اور ان کی مشرکانہ خرافات کو واشگاف لفظوں میں آپؐ نے بیان کرنا شروع کر دیا گویا کہ آپ کا یہ اعلان بقول مولانا حالی ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی
عرب کی زمین جس نے ساری ہلا دی

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس اعلان توحید نے عرب کی پرسکون فضا کو ہلا

کر رکھ دیا۔ کیونکہ ان کی پشتوں کے رسم و رواج کا صفایا ہو رہا تھا۔ ان کے معبودان باطلہ کی جڑ کاٹی جا رہی تھی۔ لیکن دوسری طرف جو شخص یہ بات کہہ رہا تھا وہ بھی کوئی معمولی شخص نہ تھا وہ مکہ کا سب سے زیادہ قابل اعتبار شخص تھا جس سے وہ اس سے قبل برکت حاصل کیا کرتے تھے۔ اپنے معاملات میں اس کا حکم ماننے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ اس کو صادق اور امین کہتے تھے، اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس معاملہ کو کیسے حل کیا جائے۔ ایک طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسری طرف ان کے باطل معبود تھے۔ ان کے نزدیک یہ کہنا کہ یہ بت نفع و نقصان پہنچانے اور ان کی حاجت روائی اور مصائب کے ازالہ کی طاقت نہیں رکھتے، ان کے معبودوں کی سخت توہین تھی بلکہ ان کے حق میں یہ ایک گالی کے مترادف بات تھی۔ ہمارے باپ دادا ان بتوں کی پوجا کرتے رہے ہیں اور مدتوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تو کیا وہ احمق اور گمراہ تھے۔ یہ تو ہمارے بزرگوں کے حق میں بھی گالی ہے۔

اس سے پہلے تو آپ پوشیدہ اور مخفی طور پر یہ باتیں کہتے تھے لیکن اب تو خدائی حکم کے تحت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے گلی کوچوں، بازاروں اور قریش کی مجلسوں میں علی الاعلان اس بات کا پرچار شروع کر دیا کہ اے لوگو! تمہارے یہ بت تمہیں نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ آپ کی ایک ہی آواز تھی اور ایک ہی سلوگن تھا کہ اے لوگو! ''قولوا لا الہ الا اللہ، تفلحوا'' لا الہ الا اللہ کہو تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ یہی بات میلوں ٹھیلوں میں بھی کہی جاتی۔ اب تو ہر ایک کے کان اس بات سے آشنا ہو گئے کہ یہ بت بے کار ہیں۔ ان کی عبادت کرنا فضول ہے کیونکہ یہ ہمارے نفع و نقصان کے مالک نہیں۔ نہ یہ حاجت روا ہیں اور نہ مشکل کشا۔ یہ ساری خوبیاں صرف اور صرف اللہ وحدہ لاشریک میں موجود ہیں۔

رؤسائے قریش ایک مخمصے میں تھے کہ اس شخص کے مقابلہ میں کیا کریں۔ لوگ پہلے ہی سے اس کی ذات سے متاثر ہیں۔ کہیں لوگوں کے ذہنوں میں اس کے

Marfat.com

خلاف ایکشن لینے پر کوئی ہیجان پیدا نہ ہو۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ اس کی دعوت دل کو لگتی ہے، اگر لوگوں نے اس کو قبول کر لیا تو پھر ہمارے خلاف انقلاب کی ایک لہر عوام میں اٹھ کھڑی ہو گی کیونکہ ہمارے گھروں میں دولت کے انبار دراصل عوام کا خون چوس کر حاصل کیے گئے ہیں۔ ہمارے عالی شان مکانات غریبوں کی ہڈیوں پر استوار ہیں۔ ہمارا سارا رعب و دبدبہ غلاموں اور نچلے طبقہ کے دم قدم سے ہے، لہٰذا اس آواز کو ہر طریقہ سے دبانا ہو گا۔

کئی روز کی سوچ بچار اور غور و خوض کے بعد ایک راستہ سمجھ میں آیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس طریقہ سے دعوت توحید کی یہ آواز دب جائے گی۔ وہ راستہ یہ تھا کہ ایک وفد کی شکل میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے پاس جائیں اور ان سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ آپ کو اس مشن سے روکیں، وہ اس وقت بنو ہاشم کے سردار ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کا یتیم بھتیجا ہے۔ وہ اگر روکیں گے تو وہ ضرور ان کے کہنے سے اس کام سے رک جائیں گے۔

چنانچہ اشراف قریش کا ایک وفد ابو طالب کے پاس گیا۔ اس وفد کے ارکان حسب ذیل ہیں:

عتبہ، شیبہ پسران ربیعہ، ابوسفیان بن حرب، ابوالبختری، العاص بن ہشام، الاسود بن مطلب، ابوجہل، ولید بن مغیرہ۔ نبیہ اور منبہ پسران حجاج بن عامر اور عاص بن وائل۔

(السیرۃ النبویہ لابن ہشام جلد ا ص ۲۷۶-۲۷۷)

ان لوگوں نے بڑی احتیاط سے کلام کا آغاز کیا۔ کہا: "ابو طالب! آپ کے بھتیجے نے ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہا ہے اور کہہ رہا ہے۔ ہماری اور ہمارے باپ دادا کی عقلوں کو حماقت زدہ کہتا ہے۔ ہمارے دین کو اباطیل و خرافات کا مجموعہ قرار دیتا ہے اور ہمارے باپ دادا کو گمراہ اور سیدھے راستے سے بھٹکے ہوئے بتاتا ہے، لہٰذا

۱۔ یا تو آپ اس کو ان باتوں سے روک دیں۔
۲۔ یا پھر ہمارے اور ان کے درمیان سے ہٹ جائیں۔

اس وفد کے جواب میں ابو طالب نے انہیں نہایت نرم لہجے میں بات کر کے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم علی الاعلان دین کے فروغ اور اس کی اشاعت کے لیے بلا جھجک مصروف رہے۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ا ص ۲۶۵، تاریخ الاسلام ذہبی جلد ا ص ۱۴۸)

ایک اور روایت میں ہے کہ وفد کے اراکین نے ابو طالب سے کہا کہ یا تو آپ اپنے بھتیجے کو اس کام سے روک دیں ورنہ لڑ کر ہم سے ایک نہ ایک فریق ہلاک ہو جائے گا۔ وفد کے اراکین تو یہ کہہ کر چلے گئے لیکن ابو طالب متفکر ہو گئے کیونکہ ابو طالب میں پوری قوم کی مخالفت کی طاقت نہیں تھی۔ چنانچہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے تو ابو طالب نے کہا: بھتیجے! تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے تھے اور یہ کہہ کر گئے ہیں لہٰذا تم مجھ پر اور اپنے آپ پر رحم کرو اور مجھ پر ناقابل برداشت بار نہ ڈالو۔

آپ ابو طالب کی اس بات اور اس کے لب و لہجہ سے سمجھ گئے کہ ابو طالب میری حمایت اور نصرت سے کنارہ کش ہونا چاہتے ہیں۔ آپ نے نمناک آنکھوں اور غم زدہ قلب کے ساتھ ابو طالب سے فرمایا:

یاعمّ! واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علیٰ ان اترک ھذا الامر حتی یظھرہ اللہ أو اھلک فیہ ماترکتہ۔

(سیرت ابن کثیر جلد ا ص ۴۷۴)

اے چچا! بخدا! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب لا کر رکھ دیں اور یہ کہیں کہ میں اس دعوت کے کام کو چھوڑ دوں تو میں ہرگز اس کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ یا تو اس دین کو غالب کر دے یا پھر میں ہلاک ہو جاؤں۔

ابو طالب نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم صمیم اور اپنے اس دعوتی مشن

پر ثابت قدمی دیکھ کر کہا: "جان عم! میں تمہیں ہرگز دشمنوں کے حوالے نہیں کروں گا۔"

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ، البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۴۷)

اسلام روز بروز اس بت پرست معاشرہ میں نفوذ کر رہا تھا۔ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ کسی نہ کسی شخص کا مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا۔ یہ بات قریش مکہ کے لیے سوہان روح تھی۔ وہ کسی صورت میں بھی اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ابو طالب کے پاس وفد کی ناکامی نے انہیں اور بھی مشتعل کر دیا۔ ادھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر بتوں کی بے چارگی کا برملا چرچا تھا جس سے قریش مکہ کے سینوں پر سانپ لوٹ جاتا اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگتا۔ اس سے پہلے وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا تمسخر اڑانا اپنا دھرم سمجھتے تھے۔ دارالندوہ میں بیٹھ کر بتوں کی آرتی لگاتے اور ہر مجلس میں آپ کا استہزا اڑا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے۔ تنہائی اور خلوت میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی روش سے لات وعزیٰ اور دوسرے بتوں کی طرف داری کے غم میں انگاروں پر لوٹنے لگتے۔ لیکن اب معاملہ اس سے بہت آگے جا چکا تھا۔ اب انہوں نے نہایت سنجیدگی سے اس نئے دین کے روکنے کے بارہ میں سوچنا شروع کر دیا۔

قریش مکہ کی الجھن:

انہی دنوں قریش کے سامنے ایک اور الجھن پیدا ہو گئی یعنی ابھی اعلانیہ اور کھلم کھلا دعوت وتبلیغ پر چند ہی ماہ گزرے تھے کہ حج کا موسم آ گیا۔ قریش کو پتہ تھا کہ اس موسم میں عرب سے مختلف وفود کی آمد شروع ہو گی، لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کوئی ایسی بات کہیں جس کی وجہ سے اہل عرب کے دلوں پر آپ کی دعوت کا کوئی اثر نہ ہو۔ چنانچہ وہ اس بارہ میں مشورہ کے لیے ولید بن مغیرہ کے پاس اکٹھے ہوئے۔ بحث ومباحثہ کے بعد یہ طے پایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست گفتگو کر لی جائے۔ سب اشراف قریش نے ولید بن مغیرہ ہی کو گفتگو کے لیے منتخب

Marfat.com

کیا۔ ولید بن مغیرہ مکہ کا سب سے بڑا دولت مند تھا۔ ایک رئیس کی سب خوبیاں اس میں موجود تھیں۔ بہترین خطیب، بلند پایہ شاعر، نہایت تجربہ کار اور سرد و گرم چشیدہ تھا۔ عمر رسیدہ اور ایسا سلیقہ مند کہ شاہانِ ایران، افریقہ اور شام کے درباروں میں جاتا رہتا تھا اور ان درباروں میں اس کی نہایت عزت افزائی ہوتی تھی۔

ولید بن مغیرہ حسب مشورہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپؐ سے گفتگو کی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشن اور اپنی دعوت کے مقصد کی وضاحت فرمائی اور قرآن حکیم کی چند آیات پڑھ کر سنائیں۔

قرآن حکیم کی آیات نے ولید کے دل پر اثر کیا۔ ولید آپ سے یہ آیات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ آپ کو دین اسلام کی تبلیغ سے منع کیا کرتا وہ خود دعوت و تبلیغ کے پیچ و خم میں گم ہو گیا۔ آپؐ سے وہ کوئی بات نہ کہہ سکا۔ چنانچہ خاموشی سے آپ کی مجلس سے اٹھا اور جب واپس پہنچا تو ایک عجیب و غریب حالت میں تھا۔ بعض روایات میں ہے ولید سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا تھا، لیکن جب قبول اسلام کے بعد گھر واپس آرہا تھا تو راستہ میں ایک دوست ملا۔ ولید نے اس سے اپنے قبول اسلام کا ذکر کیا۔ وہ کہنے لگا: ولید! سخت افسوس کا مقام ہے کہ تو نے اپنے آبائی دین اور بزرگوں کے رسم و رواج کو چھوڑ کر ایک نئے دین کو قبول کر لیا۔ اس نے کہا کہ آخرت کے عذاب کی فکر ہے اس لیے دین حق کو قبول کیا ہے۔ اس نے کہا: عذاب کا اندیشہ ہے تو مجھے کچھ مال دو۔ میں اس کے عوض تمہارے سارے گناہ اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ ولید نے وعدہ کیا کہ میں تمہیں اس قدر مال دوں گا، لیکن اس کے بعد کچھ تھوڑا سا مال اور دستاویز لکھوا کا شہادتیں کرالیں اور دین اسلام کو چھوڑ کر مطمئن ہو بیٹھا کہ تمام گناہ ختم ہو گئے۔ جس پر سورۃ النجم کی ۳۳ سے ۴۱ تک آیات نازل ہوئیں۔ (لباب النقول)

ہجرت نبوی کے چند ماہ بعد ولید مر گیا۔ کہتے ہیں کہ ولید نزع کے وقت بڑی جزع فزع کرتا رہا۔ ابو جہل پاس بیٹھا تھا پوچھا کہ جزع فزع کی کیا وجہ ہے؟ بولا: مجھے

Marfat.com

خوف ہے کہ ابن ابی کبشہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین مکہ میں رواج نہ پا جائے گا۔ ابوجہل نے تسلی دی اور کہا کہ میں اس بات کا ذمہ لے چکا ہوں کہ یہاں محمدؐ کا دین رائج نہ ہونے دوں گا۔

غرضیکہ قرآنی آیات کا ولید بن مغیرہ پر کافی اثر ہوا اور لوگوں کو خیال ہوا کہ ولید بہک گیا ہے اور ہمیں چھوڑ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو گیا ہے۔ لیکن ولید بایں ہمہ عقل و دانش حیران تھا کہ جو کلام اس نے سنا ہے اس کے بارہ میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کیا فیصلہ کرے۔

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کاذب نہیں کہہ سکتے اور نہ وہ کاہن ہے۔ اس کا کلام شعر بھی نہیں ہے کیونکہ بذات خود شعر و سخن کا ماہر ہوں۔ میں کاہنوں کی تک بندیوں کو بھی جانتا ہوں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام پیش کرتا ہے وہ ان سب سے بلند ہے۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس کی تاثیر اور جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ مجھ جیسا پختہ اور ٹھوس آدمی بھی اس کو سن کر چکرا گیا ہے۔''

یہ سن کر لوگوں نے کہا: ''تب ہم کہیں گے کہ وہ (معاذ اللہ) پاگل اور سر پھرا ہے۔'' ولید نے کہا: ''نہیں، وہ پاگل بھی نہیں۔ میں نے بہت پاگل دیکھے ہیں اور ان کی کیفیت بھی۔ اس کے اندر نہ پاگلوں جیسی دم گھٹنے کی کیفیت اور نہ الٹی سیدھی حرکات ہیں اور نہ ان کے جیسی بہکی بہکی باتیں۔ لوگوں نے کہا: ''تب ہم کہیں گے کہ یہ شخص جادوگر ہے۔'' ولید نے کہا: ''یہ شخص جادوگر بھی نہیں۔ میں نے جادوگر اور ان کا جادو بھی دیکھا ہے۔'' لوگوں نے کہا: ''تب ہم کیا کہیں؟'' ولید نے کہا: ''بخدا! اس کی بات بہت مٹھاس رکھتی ہے۔ اس کی جڑ پائیدار ہے اور اس کی شاخ پھل دار۔ تم اس کے بارہ میں جو کچھ بھی کہو گے لوگ اسے باطل سمجھیں گے۔'' ولید نے کہا: ''میری رائے یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شیریں اور شائستہ کلام اور گفتگو کی غیر معمولی تاثیر کا واحد توڑ یہی ہو سکتا ہے کہ تم لوگ پوری قوت سے یہ پراپیگنڈہ کرو کہ

Marfat.com

۱- محمدؐ جادوگر ہے۔ اس کا جادو ایسا ہے کہ ہر گھر تشتت و افتراق کا شکار ہو جاتا ہے۔ بھائی بھائی سے جدا ہو جاتا ہے، لہٰذا تم اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دو۔

۲- وہ اپنے آباؤ اجداد کے دین سے پھر گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم سب، تمہارے باپ دادا اور تمہارے یہ دیوی دیوتا جہنم کا ایندھن ہیں۔

۳- تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دماغ پھر گیا ہے۔

ولید کی رائے ان کے نزدیک ایک وزن رکھتی تھی۔ اس وجہ سے ان سب نے اس سے اتفاق کیا اور قریش کی پوری پراپیگنڈہ مشنری پورے شدومد کے ساتھ حرکت میں آ گئی اور قبائل کے حج کے لیے روانہ ہونے سے پہلے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے دینی کا چرچا عرب کے گلی کوچوں میں ہونے لگا اور نہ صرف آپ بلکہ آپ کے خاندان بنو ہاشم کے خلاف بھی نفرت کی لہر ان تمام قبائل میں دوڑ گئی جو حج کے لیے آنے والے تھے۔

اس کام میں سب سے زیادہ پیش پیش آپ کا چچا ابولہب تھا۔ وہ حج کے دنوں میں لوگوں کے ڈیروں اور عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے بازاروں میں آپ کے پیچھے پیچھے لگا رہتا اور جہاں کہیں بھی آپ دین کی دعوت دیتے وہاں ابولہب کہتا: ''اس شخص کی بات ہرگز نہ ماننا۔ یہ جھوٹا اور بددین ہے۔ یہ اپنے خاندانی بزرگوں کو جہنمی کہتا ہے اور دیوتاؤں کی توہین کرتا ہے۔'' ظاہر ہے کہ خاندان کے سب سے بڑے بزرگ کی بات سے زیادہ اور کس کی بات معتبر ہو سکتی ہے۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۷۱، مسند احمد جلد ۳ ص ۴۹۲، جلد ۴ ص ۳۴۱)

ابوجہل بھی کوئی موقع خالی نہ جانے دیتا جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی نہ کرتا۔ پھر اپنی برائی پر وہ نادم ہونے کے بجائے فخر کرتا۔ سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش کے سرداروں سے ابوجہل نے کہا: ''محمد آپ حضرات کے سامنے اپنا چہرہ خاک آلود کرتا ہے۔'' کہا ہاں۔ اس نے کہا: ''لات وعزیٰ کی قسم! اگر میں نے کبھی اس حالت میں اسے دیکھ لیا تو اس کی گردن روند دوں گا اور اس

کا چہرہ مٹی پر رگڑ دوں گا۔" اس کے بعد ایک مرتبہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھ لیا اور اس زعم میں چلا کہ آپ کی گردن روند دے گا اور آپ کا چہرہ مٹی پر رگڑ دے گا، لیکن لوگوں نے اچانک کیا دیکھا کہ وہ ایڑیوں کے بل پلٹ رہا ہے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا بچاؤ اور تحفظ کر رہا ہے۔ لوگوں نے پوچھا: "ابوالحکم: "کیا ہوا؟" کہا: میرے اور محمدؐ کے درمیان آگ کی ایک خندق ہے، ہولناکیاں ہیں۔" سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر وہ میرے نزدیک آتا تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کا ایک ایک حصہ اچک لیتے۔"

ابن ہشام نے نقل کیا ہے کہ ابوجہل جب کسی طاقتور اور معزز آدمی کے اسلام لانے کی خبر سنتا تو اسے برا بھلا کہتا۔ رسوا اور ذلیل کرتا اور مال و جاہ کو خسارے سے دو چار کرنے کی دھمکیاں دیتا۔ اور اگر کوئی کمزور اور نچلے درجے کا آدمی حلقہ اسلام میں داخل ہوتا تو اسے مارتا اور دوسروں کو بھی اسے مارنے کے لیے برانگیختہ کرتا۔ (ابن ہشام جلد ا ص ۳۲۰)

مختصر یہ کہ قریش مکہ کا یہ ظلم و ستم جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں پر کیا جاتا، اسلام کی دعوتی قوت کو نہ روک سکا اور اسلام کا کاروان روز بروز آگے بڑھتا رہا۔ اور قریش مکہ کی وہ ساری کوششیں جو اسلام کی روز بروز ترقی کو روکنے کے لیے کرتے، سب رائیگاں جارہی تھیں اور نور خدا کفر کی اس حرکت پر خندہ زن ہو رہا تھا۔

قریش مکہ کی کاروان اسلام کو روکنے کی ایک اور کوشش:

کفار مکہ کے جتنے وفد ابوطالب کے پاس گئے وہ سب ناکام و نامراد لوٹے، لہٰذا اب پھر کوشش کی گئی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست گفتگو کی جائے۔ شاید اس طرح سے یہ معاملہ بآسانی حل ہو سکے۔ ایک دفعہ رؤسائے قریش کی ایک مجلس بیٹھی ہوئی تھی جس میں عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا ایک سربرآوردہ رئیس تھا، بھی بیٹھا ہوا تھا، اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حرم کعبہ کے ایک گوشہ میں یاد الٰہی میں مصروف تھے۔ عتبہ نے رؤسائے قریش سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں محمد (صلی

Marfat.com

اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر کچھ تجاویز پیش کرتا ہوں، شاید ان میں سے کوئی تجویز مان لیں اور ہماری پریشانی کا خاتمہ ہو جائے۔ سب نے عتبہ کی اس تجویز کی تائید کی۔ چنانچہ عتبہ اٹھا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور یوں گویا ہوا:

''اے میرے بھتیجے! حسب ونسب میں تیرا ایک بلند مقام ہے لیکن تو نے اپنی قوم کو ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار کر دیا ہے۔ تو نے اس کے اتحاد و یک جہتی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ ان کے باپ دادا کو کافر کہتا ہے اور ان کے بتوں کو برا بھلا کہتا ہے، لہٰذا میں چند تجاویز آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ان میں سے جو تمہیں پسند ہو، اسے قبول کر لو تا کہ آئے روز کی جھک جھک ختم ہو جائے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپ وہ تجاویز پیش کریں میں انہیں سننے کے لیے تیار ہوں۔ عتبہ نے کہا:

(۱) پہلی تجویز تو یہ ہے کہ اگر تمہارا اس دعوت سے مقصد مال جمع کرنا ہے تو ہم تیرے سامنے دولت کے ڈھیر لگا دینے کے لیے تیار ہیں تا کہ تو ملک عرب کا رئیس اعظم بن جائے۔

(۲) اگر اس کا مقصد سرداری اور عزت وشہرت حاصل کرنا ہے تو ہم سب متفقہ طور پر تمہیں اپنا سردار ماننے کے لیے تیار ہیں اور تم سے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم کوئی قدم تیرے حکم کے بغیر نہیں اٹھائیں گے۔

(۳) اور اگر تم حکومت کے طلب گار ہو تو ہم سب تم کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیتے ہیں۔

(۴) اور اگر آپ پر کوئی جنات کا اثر وغیرہ ہے تو ہم آپ کا علاج کرانے کے لیے تیار ہیں اور اس علاج پر جو بھی خرچ ہو گا وہ سارا ہم برداشت کریں گے آپ کو اس کے لیے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

عتبہ یہ ساری تجاویز ایک ایک کر کے آپ کے سامنے پیش کرتا رہا اور آپ خاموشی سے اس کو سنتے رہے۔ جب وہ اپنی تجاویز پیش کر چکا تو آپؐ نے فرمایا: ''اے ابو ولید! آپ نے اپنی بات پوری کر لی۔؟'' اس نے کہا: ہاں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

فرمایا: اب میری بات غور سے سنیں۔ آپ نے سورۃ حم سجدہ کی ایک سے پانچ تک آیات پڑھیں۔ قرآن حکیم کی ان آیات کا یہ اثر ہوا کہ آپ آیات پڑھتے جا رہے تھے اور عتبہ دم بخود سنتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے بازو پیچھے زمین پر ٹیک لیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ سے فرمایا: ''جو تجھے سننا چاہیے تھا وہ تم نے سن لیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔''

عتبہ یہاں سے اٹھ کر جب اپنے ساتھیوں کی طرف گیا تو انہوں نے اسے آتا دیکھ کر آپس میں کہا بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہا کہ ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یہ عتبہ جو آ رہا ہے یہ وہ عتبہ نہیں جو یہاں سے گیا تھا۔ اب اس کا چہرہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ یہ اندر سے بدلا ہوا ہے۔ اتنے میں عتبہ آ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ انہوں نے پوچھا: کیا کر کے آئے؟ عتبہ نے جواب دیا: میں نے وہاں ایک ایسا کلام سنا ہے جو بخدا! میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا۔ وہ نہ شعر ہے، نہ جادو ہے اور نہ کہانت، اے میری قوم! میری بات مانو تو اس کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔ تم اس سے بالکل کنارہ کش ہو جاؤ۔ جو کلام میں سن کر آیا ہوں، بخدا! اس کا بہت بڑا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ اگر عرب کے دوسرے قبائل اس کے ساتھ جنگ کر کے اس کا خاتمہ کر دیں تو تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ اور اگر سارے عرب پر اس نے غلبہ حاصل کر لیا اور اس کی حکومت قائم ہو گئی تو وہ تمہاری حکومت ہی ہو گی کیونکہ وہ تم میں سے ہے۔ اور جو عزت اسے ملے گی وہ بھی تمہاری عزت ہو گی۔ اس طرح تم بغیر کشت و خون کے عرب کے تاج و تخت کے مالک بن جاؤ گے۔ عتبہ کے منہ سے یہ بات سن کر وہ چیخ اٹھے کہ اے ابو ولید! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان کا جادو تم پر بھی چل گیا ہے۔ اور تم بھی اپنے دین سے پھر گئے ہو۔ عتبہ نے جواب دیا: میں نے اپنی رائے تمہیں دے دی ہے۔ اب جو تمہاری مرضی ہے وہ کرو۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۶۳، سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۹۳، زرقانی جلد ۱ ص ۵۷، عیون الاثر لابن سید الناس جلد ۱ ص ۱۹۶)

حافظ ابن کثیرؒ نے ایک اور روایت اس سلسلہ میں نقل کی ہے کہ سرور کائنات صلی

اللہ علیہ وسلم نے جب تلاوت شروع کی تو عتبہ ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہا۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے:

فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود

پس اگر وہ روگردانی کریں تو آپ فرما دیں کہ میں تمہیں ایک ایسی کڑک (عذاب) سے خبردار کر رہا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک جیسی ہے۔

پہلے تو عتبہ بیٹھ کر آپ کے منہ سے یہ قرآنی آیات سن رہا تھا لیکن جب آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی تو عتبہ تھرا کر کھڑا ہو گیا اور یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر رکھ دیا کہ میں آپ کو اللہ اور قرابت کا واسطہ دیتا ہوں کہ ایسا نہ کریں۔ اسے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں وہ کڑک آن نہ پڑے۔ اس کے بعد وہ واپس قریش کے پاس چلا گیا اور انہیں جا کر وہ کچھ کہا جس کا اوپر کی روایت میں ذکر ہے۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۳ ص ۱۵۴)

حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ کی تیسری جلد میں جو روایت نقل کی ہے اس میں ہے کہ

''عتبہ اس کے بعد اپنے گھر بیٹھ رہا اور لوگوں کے پاس نہ گیا۔ ابوجہل نے کہا'' اے گروہ قریش! خدا کی قسم! میرا خیال ہے کہ عتبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف مائل ہو گیا ہے اور اسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کھانا پسند آ گیا ہے اور یقیناً اسے کسی ضرورت اور حاجت کی وجہ سے ایسا کرنا پڑا ہے۔ آؤ ہم عتبہ کے پاس چلیں۔'' چنانچہ وہ گئے۔ ابوجہل نے کہا: ''عتبہ خدا کی قسم! ہمیں اس لیے آنا پڑا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف مائل ہو گئے ہو اور ان کا معاملہ تمہیں پسند آ گیا ہے۔ اگر تمہیں ضرورت ہو تو ہم تمہارے لیے اتنا مال جمع کر دیں جو تمہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کھانے سے بے نیاز کر دے۔'' عتبہ یہ سن کر بگڑ گیا اور قسم کھا کر کہا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کبھی بات نہ کروں گا۔'' (واقسم بالله لایکلم محمداً ابداً) (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۶۴)

Marfat.com

یہ اسلام کی دعوت کا اثر تھا کہ عتبہ جیسا شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور قرآن حکیم کی فصاحت و بلاغت نے اسے شدید طور پر متاثر کیا، لیکن چونکہ مقدر میں ایمان نہیں تھا اس وجہ سے دولت ایمان سے محروم رہا اور جنگ بدر میں سیدنا حمزہؓ کے ہاتھوں واصل جہنم ہوا۔

سیدنا حمزہؓ کا قبول اسلام:

قریش مکہ اسلام کی دعوت کے سامنے سینہ سپر تھے اور پوری قوت سے اس کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کی ہر کوشش رائیگاں جا رہی تھی اور پیغمبر اسلام کی دعوتی قوت کے مقابلہ میں ان کی ہر اسکیم فیل ہو رہی تھی، بلکہ قریش مکہ کی ہر مزاحمت کے نتیجہ میں مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، اور بڑے بڑے جانباز اور سورما مسلمان ہو رہے تھے۔ ایک روز سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا کے پاس سے گذر رہے تھے۔ اتفاقاً ابو جہل بھی اس طرف آ نکلا۔ جونہی اس نے آپ کو دیکھا تو آپ کی شان میں نازیبا الفاظ بکنے شروع کر دیئے لیکن آپ نے ابو جہل کے ان ناشائستہ کلمات کا کوئی جواب نہ دیا اور آگے تشریف لے گئے۔ عبداللہ بن جدعان کی لونڈی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے ابو جہل کی یہ حرکت اچھی معلوم نہ ہوئی۔ اتنے میں سیدنا حمزہؓ اپنا تیر کمان لیے شکار سے واپس لوٹے۔ اس لونڈی نے سیدنا حمزہؓ کو دیکھ کر کہا: ''ابو عمارہ! کاش تم اس وقت موجود ہوتے جب ابو جہل تمہارے بھتیجے کو سخت سست اور ناشائستہ کلمات کہہ رہا تھا۔

یہ الفاظ سن کر سیدنا حمزہؓ کی ہاشمی غیرت جوش میں آ گئی اور بجائے گھر جانے کے وہیں سے ابو جہل کو تلاش کرنے لگے۔ سیدنا حمزہؓ کا یہ معمول تھا کہ شکار سے واپسی پر سیدھے حرم میں حاضر ہوتے۔ چنانچہ اپنے اس معمول کے مطابق حرم میں پہنچے۔ دیکھا کہ ابو جہل قریش کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا ہے۔ آپ نے اسے دیکھتے ہی اس کے سر پر اس زور سے کمان ماری کہ سر سے خون بہنے لگا اور کہا کہ تو محمدؐ کو گالیاں بکتا ہے۔ سن

Marfat.com

لے، میں خود اس کے دین پر ہوں۔ بعض حاضرین مجلس نے ابو جہل کی حمایت میں اٹھنا چاہا لیکن ابو جہل نے سب کو روک دیا اور کہا: ''واقعی میں نے آج اس کے بھتیجے کو بہت سخت سست کہا ہے۔ بعض حاضرین مجلس نے از راہ تعجب کہا: ''ابو عمارہ! کیا واقعی تم صابی (بے دین) ہو گئے ہو؟'' سیدنا حمزہؓ نے فرمایا: ''ہاں، میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ واقعی اللہ کے رسول ہیں اور جو وہ فرماتے ہیں وہ سراسر حق ہے۔ میں ان کے ساتھ ہوں، تم سے جو ہو سکتا ہے کر لو۔''

(نہایۃ الادب جلد ۱۶ص ۲۰۸، دلائل النبوۃ جلد اص ۴۵۹، السیر والمغازی ص ۱۷۱)

یہ سب کچھ رشتہ داری کی عصبیت میں ہو گیا۔ آپ نے اپنے بھتیجے کا انتقام تو لے لیا لیکن جوش میں آ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان بھی کر دیا۔ جب گھر آئے تو نفس امارہ نے ملامت شروع کر دی کہ تو نے یہ کیا کیا؟ اپنے آباؤ اجداد کے صدیوں کے عقیدے کو جلد بازی سے غلط قرار دے دیا۔ تمہارا یہ فیصلہ درست نہیں ۔

اک طرف کعبہ ہے میرا اک طرف ایمان ہے
کس کو رکھوں کس کو چھوڑوں کش مکش میں جان ہے

سیدنا حمزہؓ کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ انہوں نے ایک ایسے دین کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا جس کے بارہ میں انہوں نے کبھی غور وخوض ہی نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ان کی ساری رات نہایت قلق واضطراب میں گزری۔ پوری زندگی میں ایسی مضطرب رات انہوں نے کبھی نہیں گذاری تھی۔ جب صبح ہوئی تو بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

''اے میرے بھتیجے! میں ایک ایسی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آتا۔ اور ایسی بات پر میرا قائم رہنا نہایت مشکل ہے جس کے بارہ میں مجھے یہ پتہ نہیں کہ یہ ہدایت ہے یا گمراہی، نور ہے یا ظلمت۔ لہٰذا اے میرے بھتیجے اس بارہ میں مجھ سے کوئی بات کریں۔''

Marfat.com

سیدنا حمزہؓ کی یہ بات سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی صداقت و حقانیت کے بارہ میں نہایت دل نشین پیرایہ میں کچھ ارشادات فرمائے کہ سیدنا حمزہؓ کے سارے حجابات اٹھ گئے، ساری ظلمتیں کافور ہو گئیں، شک وشبہ کا غبار چھٹ گیا اور صراط مستقیم ایک روشن چراغ کی طرح سامنے نظر آنے لگا۔ بس دوسرے ہی لمحے زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے کہ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ ''انک رسول اللہ'' آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ ساتھ ہی یہ کہا: کہ اے میرے بھتیجے! آپ اپنے اس دین کا بے خوف وخطر اظہار فرماتے رہیے۔ خدا کی قسم! میں اس بات کو کسی صورت پسند نہیں کرتا کہ مجھے ہر وہ نعمت دی جائے جس پر آسمان سایہ فگن ہے تا کہ میں اپنے پہلے دین کی طرف لوٹ جاؤں۔''

بعض روایات میں ہے کہ اس مجلس میں سیدنا حمزہؓ یہ بات کہہ تو آئے کہ میں آج سے مسلمان ہوں لیکن جب گھر آئے تو شیطان نے وسوسہ ڈالا۔ حمزہ! تم تو قریش کے سردار ہو۔ تم نے اس شخص کا کیسے اتباع کر لیا اور اپنے باپ دادا کے دین کو کیوں چھوڑ دیا؟ اس سے تو مر جانا بہتر ہے۔ سیدنا حمزہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے بارگاہِ رب العزت میں دعا مانگی:

''اے اللہ! اگر یہ ہدایت ہے تو اس کی تصدیق میرے دل میں ڈال دے ورنہ اس سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا فرما۔'' (مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۹۳)

امام سہیلیؒ نے روض الانف جلد ا ص ۱۸۶ پر یہی کچھ لکھا ہے۔

بس پھر کیا تھا۔ صبح خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور آپ کی نبوت کی تصدیق دل و جان سے کی۔ پھر کچھ شعر بھی پڑھے۔ جن میں چند ایک حسب ذیل ہیں۔

حمدت اللہ حین ھدی فوادی

الیٰ الاسلام والدین الحنیف

میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے میرے دل کو ہدایت کی راہ دکھائی اسلام جو دین حنیف ہے، اس کو قبول کرنے کے لیے۔

Marfat.com

لدین جاء من ربّ عزیز

خبیر بالعباد بهم لطیف

وہ دین جو اس رب کی طرف سے آیا ہے جو عزت والا ہے اور لطف واحسان فرمانے والا ہے اور اپنے بندوں کے حالات سے باخبر ہے۔

اذا تلیت رسائله علینا

تحدر دمع اللبّ الحصیف

جب اس کے رسائل اور پیغامات کی ہم پر تلاوت کی جاتی ہے تو ہر علم و دانش اور زیرک انسان کے آنسو ٹپکنے شروع ہو جاتے ہیں۔

رسائلُ جاء احمد من هذٰها

بآیات مبینة الحروف

وہ ایسے پیغامات ہیں جو احمد مجتبیٰ لے کر آئے ہیں ایسی آیات کے ساتھ جن کے حروف روشن ہیں۔

واحمد مصطفیٰ فینا مطاع

فلا تغشوه بالقول الضعیف

اور احمد مصطفیٰ وہ ہیں جن کی ہم میں اطاعت کی جاتی ہے۔ کوئی ضعیف اور کمزور قول ان کا گھیراؤ نہیں کرتا۔

(مستدرک حاکم جلد ۱ ص ۱۳۹، زرقانی جلد ۱ ص ۲۵۶، روض الانف جلد ۱ ص ۱۸۶)

ایسے وقت میں جب کہ مسلمان ظلم وستم کی چکی میں بری طرح پس رہے تھے، سیدنا حمزہؓ کا حلقہ اسلام میں داخل ہونا بڑا مفید ثابت ہوا۔ دعوت اسلامی کو بڑی تقویت ملی۔ سیدنا حمزہؓ ایک جواں مرد، بہادر اور نڈر انسان تھے۔ یہ انہی کا حوصلہ تھا کہ بھری مجلس میں ابوجہل کے سر پر کمان مار کر اسے زخمی کر دیا۔ سدنا حمزہؓ کے اسلام لانے سے قریش کے دلوں پر ایک رعب طاری ہو گیا اور وہ سمجھ گئے کہ اب مسلمانوں کو ایذا دینا اور ان پر

Marfat.com

ظلم وستم ڈھانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔

ابتداءً سیدنا حمزہؓ کا ایمان اس حمیت اور جذبہ کے طور پر تھا کہ ان کے بھتیجے کی توہین کی گئی ہے اور سرراہ ان سے دشنام آمیز رویہ اختیار کیا گیا ہے لیکن پھر حق تعالیٰ نے اسلام کے لیے ان کا سینہ کھول دیا۔ اور انہوں نے اسلام کا دامن نہایت مضبوطی سے تھام لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی وجہ سے دین اسلام اور اہل اسلام دونوں کو بڑی عزت دی۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۳۳، عیون الاثر جلد ا ص ۱۹۵، روض الانف جلد ا ص ۱۸۶ زرقانی جلد ا ص ۲۵۶۔ طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۹)

سیدنا عمرؓ کا قبول اسلام:

اسلام کی اس دعوتی قوت کا نتیجہ تھا کہ سیدنا عمرؓ جیسا شخص بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اور اسلام بھی اس وقت قبول کیا جب مکہ کی فضا ظلم و جور کے سیاہ بادلوں سے ہر روز گھمبیر تر ہو رہی تھی۔ قریش مکہ کی ستم رانیاں مسلمانوں کے صبر و تحمل کا امتحان لے رہی تھیں، لیکن سیدنا حمزہؓ کے اسلام قبول کرنے کے واقعہ نے قریش مکہ میں ایک بجلی کا کام کیا۔ ان کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ حمزہؓ جیسا بہادر آدمی بھی مسلمانوں کا بہی خواہ اور اسلام کا حامی و ناصر ہو جائے گا۔ سیدنا حمزہ کے اسلام نے قریش کی پریشانیوں میں اور اضافہ کر دیا اور مسلمانوں کے لیے ہدایت کا راستہ اور روشن ہو گیا۔ سیدنا عمرؓ کا اسلام لانا خرمن کفر پر بجلی ثابت ہوا۔ وہ سنہ ۶ نبوت میں ایمان لائے اور اصحاب سیر نے لکھا ہے کہ وہ سیدنا حمزہؓ سے تین روز بعد دولت ایمان سے بہرہ اندوز ہوئے جس سے کفر کی کمر ہمت ٹوٹ گئی اور وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن اور دعوت کے سامنے اپنے کو بے بس سمجھنے لگے، اور ان کے اسلام کی برق تاباں سے قریش مکہ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ وہ سنہ ۵ نبوت میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ (زرقانی جلد ا ص ۲۷۲)

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ سیدنا عمرؓ کے اسلام لانے کا اصلی اور حقیقی

سبب تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے۔ آپ نے اول تو یہ دعا فرمائی:

اللھم اعز الاسلام باحب الرجلین الیک بعمر بن الخطاب اوبابی جھل بن ھشام.

اے اللہ! عمر بن خطاب یا ابو جہل بن ہشام میں سے جو شخص تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے، اس کے ذریعہ سے اسلام کو قوت و نصرت عطا فرما۔

اس حدیث کو امام احمد اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(ترمذی جلد ۲ ص ۲۰۹، دلائل النبوۃ جلد ۲ ص ۳)

بعد ازاں آپ کو بذریعہ وحی بتایا گیا کہ ابو جہل بن ہشام کے مقدر میں تو اسلام نہیں۔ تب آپ نے خاص طور پر سیدنا عمر بن خطابؓ کے لیے دعا فرمائی۔

اللھم اید الاسلام بعمر بن الخطاب خاصة

اے اللہ! عمر بن خطابؓ کے ساتھ خصوصی طور پر اسلام کو قوت دے۔

(زرقانی جلد ۱ ص ۲۷۳، سنن ابن ماجہ جلد ۱ ص ۳۹)

ایک اور روایت جو ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

اللھم اعزّ الدین بعمر یعنی اے اللہ! عمرؓ سے دین کو عزت عطا فرما۔

(طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۳۶۹، مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۸۳، تاریخ الاسلام ذہبی جلد ۱ ص ۱۸۲)

سیدنا عمرؓ کے اسلام کا سبب جو دعائے نبوی ہے اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان پر اس دعا کی وجہ سے بالکل اچانک اسلام منکشف ہو گیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ اخلاقی زندگی، آپ کا شب و روز دعوت و تبلیغ میں مشغول رہنا، مخالفتوں کی وجہ سے آپ کا اور آپ کے پیغام کا مستقل چرچا جس کی وجہ سے ہر ایک کے لیے آپ کا وجود ایک سوالیہ نشان بن گیا تھا، ان تمام چیزوں نے بے شمار لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کی تخم ریزی کر دی تھی۔ قبائلی عصبیت اور اسلام پرستی کی وجہ

Marfat.com

سے ایک شخص بظاہر عناد اور ضد میں مبتلا ہوتا، لیکن اندر ہی اندر اسلام کی خاموش پرورش کو بھی وہ روک نہ سکتا تھا۔ سیدنا عمرؓ کے اسلام کے بارہ میں عام شہرت یہ ہے کہ اچانک ایک واقعہ ان کے اسلام لانے کا سبب بن گیا حالانکہ معاملہ ایسا نہیں۔ یہ درست ہے کہ آخری مرحلہ میں آپ کے اسلام کا محرک بلاشبہ ایک واقعہ تھا مگر اس کی ابتدائی تخم ریزی آپ کے دل میں بہت پہلے ہو چکی تھی۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ سیدنا عمرؓ اپنی سخت خوئی اور تند مزاجی کی وجہ سے تمام مکہ میں مشہور تھے اور مسلمانوں کو طویل عرصہ تک ان کی سختیاں برداشت کرنا پڑیں، لیکن جملہ روایات پر مجموعی نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ رفتہ رفتہ اسلام ان کے قلب میں جاگزین ہوا۔ جب وہ مسلمانوں پر تشدد کرتے تو ان کے صبر کو دیکھ کر ان کے قلب پر ایک اثر ہوتا کہ آخر اسلام میں کوئی خوبی تو ہے، لیکن اس کے ساتھ سیدنا عمرؓ باپ دادا کی ایجاد کردہ رسموں کا بڑا احترام کرتے تھے اور کسی صورت بھی ان کو چھوڑنے یا ان میں ردّ وبدل کے لیے تیار نہ تھے۔ دوسرے اسلام کی پاکیزہ تعلیمات اور بھی ان کے ذہن کو متاثر کرتیں اور بتوں کی پوجا کے بارہ میں جب اسلام کی تعلیمات پر وہ غور کرتے کہ یہ نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی کوئی نفع اور نقصان پہنچا سکتے ہیں تو ان کے دل میں ان بتوں کے خلاف نفرت کے جذبات بھی پیدا ہو گئے۔ گویا کہ ان کے قلب و ذہن میں متضاد قسم کے جذبات باہم دست و گریبان تھے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ مسلمانوں کی غریب الوطنی سے ان کا دل بھر آیا۔ اور یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ عمرؓ جو مسلمانوں پر ظلم وتشدد کر کے نہایت خوش ہوتا، مکہ سے مسلمانوں کو ہجرت کرتے وقت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نمی اور دل میں رقت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ محمد بن اسحاق کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں کہ ام عبداللہ بنت ابی حثمہؓ فرماتی ہیں کہ

''بخدا! ہم لوگ حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے اور میرے شوہر عامرؓ اپنی بعض ضروریات کے لیے گھر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمر بن خطاب آگئے

Marfat.com

اور میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ابھی تک اسلام نہ لائے تھے۔ ہم لوگوں کو ان سے بڑی تکلیفیں اور سختیاں پہنچی تھیں۔ انہوں نے مجھے کہا: ''ام عبداللہ! کوچ ہو رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا: ''ہاں، خدا کی قسم! ہم لوگ اللہ کی زمین میں سے کسی اور زمین میں چلے جائیں گے، اس لیے کہ تم لوگ ہمیں ستاتے ہو اور ہمارے اوپر تشدد کرتے ہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے کوئی خلاصی کی جگہ پیدا کر دے۔'' ام عبداللہؓ کہتی ہیں: ''عمر نے کہا خدا تمہارا ساتھی ہو (صحبکم اللہ) یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نمناک ہوگئیں جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ (وروایت رقۃ لم اکنْ اراھا) اس کے بعد وہ چلے گئے اور ان کو ہمارے مکہ سے جانے کا بہت ملال تھا۔'' جب میرے شوہر عامر بن ربیعہؓ آئے تو میں نے انہیں یہ واقعہ سنایا۔ وہ کہنے لگے امید رکھو، عمر اسلام میں داخل ہو جائے گا۔'' (السیر والمغازی ص ۱۸۱، دلائل النبوۃ جلد ۲ ص ۹، البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۷۹، ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۴۳)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ سیرۃ ابن ہشام وغیرہ میں مروی ہے۔ سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں: ایک رات میں حرم کعبہ میں گیا اور چاہا کہ بیت اللہ کا طواف کروں۔ میں نے وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے تھے اور نماز میں قرآن حکیم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ (ایک روایت میں ہے کہ سورہ الحاقہ کی تلاوت فرما رہے تھے) فرماتے ہیں: جب میں نے آپ سے قرآن سنا تو میرے دل میں رقت پیدا ہو گئی۔ (فلما سمعت القرآن رق فی قلبی)۔ پس میں خوب رویا اور میرے قلب میں اسلام داخل ہو گیا۔ میں وہیں غلاف کعبہ کے پیچھے کھڑا رہا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نماز ختم فرمائی۔ آپؐ وہاں سے چل دیئے اور میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری آہٹ محسوس کی تو مجھے پہچان لیا۔ آپ نے یہ سمجھا کہ میں آپ کو اذیت دینے کے لیے آپ کا تعاقب کر رہا ہوں۔ آپ نے مجھے ڈانٹا اور فرمایا: ''خطاب کے بیٹے! کیا ابھی تمہارے ایمان لانے کا

Marfat.com

وقت نہیں آیا؟" میں نے کہا: "آ گیا ہے" اس بات پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ پھر فرمایا: "اے عمرؓ! اللہ تمہیں ہدایت دے۔" پھر آپ نے میرے سینے پر اپنا ہاتھ پھیرا اور میرے لیے ثبات کی دعا کی۔ اس کے بعد میں تو واپس آ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۴۸-۳۴۹، سیرۃ حافظ ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۷)

اسی طرح کی ایک اور روایت علامہ ابن جوزیؒ نے بھی نقل کی ہے۔

(عمر بن الخطاب ص ۶)

اس قسم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمرؓ کے قلب کی زمین میں اسلام کی تخم ریزی ہو چکی تھی لیکن ابھی ان کے اندر جاہلی جذبات اور آباء واجداد کے رسمی دین کی عظمت کے احساس کا چھلکا اتنا مضبوط اور سخت تھا کہ دل کے نہاں خانہ میں اٹھکیلیاں لینے والی حقیقت کے مغز پر غالب رہا۔ آخر ایک روز لسان نبوت سے یہ دعا نکلی: "اے اللہ! خاص عمر بن خطاب سے اسلام کو قوت دے۔" (زرقانی جلد ۱ ص ۲۷۳، ابن ماجہ جلد ۱ ص ۳۹) ادھر عمرؓ اپنی سخت طبیعت کے باعث پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے منصوبہ سے گھر سے نکلے۔ ادھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اجابت کے دروازے کھٹکھٹا رہی تھی بلکہ اجابت اس دعا کے استقبال کے لیے آئی۔ خود فرماتے ہیں کہ "میں ابتداء میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت مخالف تھا، اور دین اسلام کی سخت نفرت میرے قلب و ذہن میں موجزن تھی۔" ایک روز ابو جہل نے جو رشتہ میں عمر کا ماموں لگتا تھا، یہ اعلان کیا کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرے گا اس کے لیے ایک سو اونٹ کا کفیل اور ضامن ہوں۔ عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ بات میں نے کسی شخص سے سنی لیکن کچھ اعتبار نہ آیا۔ میں خود ابو جہل کے پاس گیا اور بالمشافہ اس سے بات کر کے اس بات کی تصدیق کی۔ ابو جہل نے کہا: "میں واقعی ضامن اور کفیل ہوں۔" دل میں دشمنی اور مخالفت کے جذبات بھی موجزن تھے اور ادھر سے سو اونٹ کا انعام، جو ایک بہت بڑا

انعام تھا۔ پھر آباء واجداد کے دین کا تحفظ اور تقلیدی عصبیت، ان سب باتوں کے پیش نظر عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکلے۔ اور یہ جرأت صرف اور صرف عمرؓ ہی میں تھی۔ مکے کا اور کوئی نوجوان اکیلے یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ خود کہتے ہیں: ''خیال تھا کہ آپ کا (معاذ اللہ) قصہ تمام کر کے اس خلفشار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دوں جس نے قریش کی زندگی تلخ کر دی ہے اور معاشرتی زندگی میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔

سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں اس ارادۂ بد سے تلوار لے کر نکلا۔ راستہ میں ایک بچھڑا نظر پڑا جس کو لوگ ذبح کرنا چاہتے تھے۔ میں بھی دیکھنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ یکایک میں نے یہ آواز سنی۔ معلوم ہوتا تھا کہ بچھڑے کے پیٹ میں سے کوئی پکارنے والا یہ کہہ رہا ہے:

یاآل ذریح، امر نجیح، رجل یصیح، بلسان فصیح، یدعو الیٰ شھادۃ ان لا الٰہ الاّ اللہ وان محمداً رسول اللہ

یعنی اے آل ذریح: ایک کامیابی کی بات ہے، ایک شخص نہایت فصیح زبان کے ساتھ یہ کہہ رہا ہے اور اس بات کی دعوت دے رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔

سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ آواز سنتے ہی معاً میرے قلب کی گہرائیوں میں یہ خیال مچلنے لگا کہ یہ آواز مجھی کو دی جا رہی ہے اور میں ہی اس آواز کا اصل مخاطب ہوں۔
(زرقانی جلد ا ص ۲۷۶، فتح الباری جلد ۵ ص ۱۳۸)

بچھڑے میں سے آواز سنائی دینے کا واقعہ بخاری باب اسلام عمرؓ میں بھی موجود ہے۔

کوئی نرم دل شخص ہوتا تو اسی آواز کو سن کر اپنے ارادۂ بد سے باز آ جاتا لیکن یہاں تو سیدنا عمرؓ جیسا سخت دل انسان تھا جس کے دل کی سختی میں کمزور اور مظلوم مسلمان کی آہ وبکا اور چیخ و پکار بھی نرمی پیدا نہیں کرتی تھی۔ (بعض روایات کے مفہوم سے یہ

Marfat.com

پتہ چلتا ہے کہ عمرؓ اپنے مسلمان دوستوں کی ہجرت (حبشہ) پر بھی دل گرفتہ تھے) لہٰذا ان کے عزم صمیم میں کوئی فرق اس بچھڑنے کی آواز سے نہ آیا۔ اپنے ارادۂ بد کی تکمیل کے لیے آگے بڑھے۔ ابھی چند قدم آگے بڑھے تھے کہ نعیم بن عبداللہ نحامؓ مل گئے۔ نعیمؓ نے دیکھا کہ عمر کے تیور اچھے نہیں۔ پوچھا: ابن خطاب: کیا ارادہ ہے؟ عمرؓ نے جواب دیا: اس فتنہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے جا رہا ہوں جو محمدؐ نے برپا کر دیا ہے۔ نعیمؓ نے کہا: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے بنو ہاشم اور بنو زہرہ سے کس طرح بچ سکو گے؟'' عمرؓ نے کہا: ''معلوم ہوتا ہے کہ تو بھی صابی (بے دین) ہو گیا ہے اور اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ بیٹھا ہے۔'' نعیمؓ نے کہا: ''ابن الخطاب! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم کرنے سے قبل اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ بنت خطابؓ اور بہنوئی سعید بن زیدؓ دونوں صابی ہو چکے ہیں اور اپنے باپ دادا کے دین کو خیر باد کہہ کر حلقہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔

عمرؓ ان اشتعال انگیز اور طعن آمیز فقروں کو کب برداشت کر سکتے تھے۔ ان الفاظ کو سنتے ہی غصے سے بپھر گئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش چھوڑ کر بہن کے گھر پہنچ گئے۔ خباب بن الارتؓ جو ان کی بہن اور بہنوئی کو قرآن حکیم کی تعلیم دے رہے تھے، عمرؓ کی آہٹ سنتے ہی چھپ گئے۔ عمرؓ گھر میں داخل ہوئے مگر تلاوت قرآن حکیم کی کچھ بھنک عمرؓ کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ عمر جیسے ہی مکان میں داخل ہوئے پوچھا کیا پڑھ رہے تھے۔ بہن اور بہنوئی نے بات کو چھپانا چاہا لہٰذا کچھ دیر خاموش رہے۔ عمرؓ نے اسی تیزی میں کہا: میں نے سنا ہے کہ تم دونوں صابی (بے دین) ہو گئے ہو۔ بہنوئی سعید بن زیدؓ نے کہا: ''عمر! اگر تمہارا دین حق نہ ہو بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا دین حق ہو تو بتلاؤ کیا کرنا چاہیے؟'' بہنوئی کے اس جواب نے عمر کے غصہ کو اور تیز کر دیا اور وہ ان پر پل پڑے۔ بہن شوہر کو بچانے کے لیے آگے بڑھیں تو عمر نے ان کو اس قدر مارا کہ چہرہ خون سے تر بتر ہو گیا۔ اب بہن کو بھی جوش آ گیا، بولیں: ''اے خطاب کے بیٹے! تجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لے، ہم تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو قبول کر چکے ہیں۔

اے اللہ کے دشمن! تو ہمیں محض اس لیے مارتا ہے کہ ہم اللہ کو ایک مانتے ہیں۔ خوب جان لے، ہم اسلام کے حلقہ میں داخل ہو چکے ہیں اگرچہ تیری ناک خاک آلود ہو۔"

بہن کا یہ جوش بھرا جواب سن کر عمرؓ کچھ نرم ہوئے اور غصے میں کچھ ٹھنڈک پیدا ہوئی اور شرم آگین لہجے میں کہا: "مجھے دکھاؤ تم کیا پڑھ رہے تھے؟" بہن نے کہا: "تم ناپاک ہو اور قرآن حکیم کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ جاؤ غسل کر کے آؤ۔"

اب عمرؓ کا غصہ بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا اور اصل حقیقت معلوم کرنے کا شوق اتنا بڑھ چکا تھا کہ بہن کے اس سخت اور توہین آمیز کلام کو نہایت صبر سے برداشت کیا۔ فوراً اٹھے اور غسل کیا اور صحیفہ مطہرہ کو ہاتھ میں لیا۔ اس میں لکھا تھا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سیدنا عمرؓ اللہ جل شانہ کے یہ نام دیکھ کر لرزہ براندام ہو گئے اور صحیفہ مبارکہ کو وہیں رکھ دیا۔ جب اوسان بجا ہوئے تو اسے پھر اٹھایا۔ بسم اللہ کے بعد سورۃ طٰہٰ لکھی تھی۔ قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ ان کے قلب میں نقش ہو رہا تھا۔ فصاحت زبان، محاسن کلام، ندرت بیان، بلندی معانی، جامعیت مطالب، حسن انشاء، شگفتگی الفاظ اور تعلیمات ہدایت کی پاکیزگی پر سر دھنتے رہے۔ آخر جب اس آیت پر پہنچے:

انني انا الله لا اله الاّ انا فاعبدني، واقم الصلوٰة لذكري

بے شک میں ہی معبود برحق ہوں، میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، پس میری ہی عبادت کیا کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

تو صداقت اسلام کا جذبہ کامل اپنی پوری طاقت کے ساتھ قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں محشر انگیز ہوا اور انوار رشد و ہدایت نے رہبری فرما کر چشم بصیرت وا کر دی۔ آنکھیں پرنم ہو گئیں اور زبان سے بے اختیار نکلا: کیسا ہی پاکیزہ کلام ہے۔ حقیقت میں جس معبود کی یہ تعریف ہے اور جس کا یہ کلام ہے وہی قابل پرستش و ستائش ہے (مااحسن الكلام واكرم) اس کے بعد بے اختیار بول اٹھے۔ اشهدان لا اله الاّ الله، اشهد ان محمداً رسول الله سیدنا خباب بن الارتؓ مکان میں چھپے یہ سب

Marfat.com

ماجرا دیکھ اور سن رہے تھے۔ جب انہوں نے سیدنا عمرؓ کی زبان سے کلمۂ شہادت سنا تو فوراً باہر نکل آئے اور سب حضرات نے خوشی سے نعرۂ تکبیر کہا اور جوش مسرت میں ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگا۔ سیدنا خبابؓ نے کہا: عمر! بشارت ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا تمہارے حق میں قبول ہوئی۔ عمرؓ نے سیدنا خبابؓ سے کہا: ''مجھے اسی وقت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو۔''

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت دار ارقم میں تشریف فرما تھے۔ سیدنا خباب بن الارتؓ سیدنا عمرؓ کو ساتھ لے کر دار ارقم کی طرف روانہ ہوئے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر صحابہ کرامؓ جن میں سیدنا حمزہؓ بھی موجود تھے، جو صرف تین روز قبل ایمان لائے تھے، تشریف فرما تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ دستک دی اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔ یہ معلوم کر کے کہ عمرؓ اندر آنا چاہتے ہیں، کوئی شخص دروازہ کو کھولنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ عمر انتہاء درجہ مغلوب الغضب اور اسلام دشمنی میں بڑے غالی تھے۔ مکان میں موجود سب لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ عمرؓ خون خرابہ کرنے آئے ہیں۔ اصل حقیقت حال کا کسی کو پتہ نہ تھا، اس لیے سب خوف زدہ تھے۔ سیدنا حمزہؓ نے فرمایا: دروازہ کھول دو اور آنے دو، اور سن لو، اگر عمرؓ اطاعت حق اور قبول اسلام کے ارادہ سے آیا ہے تو اھلاً وسھلاً اور اگر کسی ایذا رسائی کے ارادہ سے آیا ہے تو اسی کی تلوار ہوگی اور اسی کا سر۔

سیدنا عمرؓ کا اپنا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے دروازہ کھولا گیا اور دو شخصوں نے میرے دونوں بازو پکڑ لیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لا کر مجھے کھڑا کر دیا۔ آپ نے ان دونوں شخصوں سے فرمایا: اس کے ہاتھ چھوڑ دو۔ آپؐ نے پھر میرا کرتہ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور فرمایا: ''اے خطاب کے بیٹے! اسلام لا اور پھر یہ دعا فرمائی: اللھم اھدہ (اے اللہ! اس کو ہدایت فرما) ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اے اللہ! یہ عمر بن خطاب حاضر ہے۔ اے

Marfat.com

اللہ! اس سے اپنے دین کو عزت دے۔" پھر عمرؓ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا:

"عمر کیا تو اس وقت تک باز نہ آئے گا جب تک حق تعالیٰ تجھ پر کوئی رسوا کن عذاب نازل نہ فرمائے۔"

نبوت کی رعب دار آواز نے سیدنا عمرؓ جیسے شجاع اور جری شخص کو لرزہ براندام کر دیا چنانچہ نہایت عاجزی اور فروتنی سے عرض کیا: "حضور! ایمان لانے کی غرض سے حاضر خدمت ہوا ہوں" اور پھر پڑھا: اشهد ان لا اله الاّ الله و اشهدانک رسول الله۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط مسرت سے بلند آواز سے تکبیر کہی جس کے بعد دار ارقم میں موجود تمام حضرات نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور تمام فضا مسرت وشادمانی کے نغموں سے معمور ہو گئی اور اس طرح عمرؓ بھی کاروان اسلام میں داخل ہو گئے اور دعوت اسلام کو اور تقویت ملی۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۴۵-۳۴۶، عیون الاثر جلد ۱ ص ۲۱۶-۲۱۷، زرقانی جلد ۱ ص ۲۷۶)

بعض روایات میں ہے کہ سیدنا عمرؓ کے مسلمان ہونے کی خوشی میں مسلمانوں نے جو صدائے تکبیر بلند کی اس کی آواز مکہ کی گلیوں اور شاہراہوں میں سنی گئی۔

(عیون الاثر جلد ۱ ص ۲۱۷)

علامہ شبلی نعمانیؒ نے بھی سیدنا عمرؓ کے اسلام لانے کا یہی قصہ اپنی کتاب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور الفاروق میں نقل کیا ہے، لیکن علامہ شبلیؒ نے اس واقعہ کی اسناد اور درایت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اردو میں کتابیں لکھنے والے دوسرے مورخین اور سیرت نگاروں نے بھی اس واقعہ کو بڑے شدومد سے لکھا ہے کہ سیدنا عمرؓ گھر سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادہ سے نکلے تھے اور پھر بہن کو مار مار کر لہولہان کیا اور بالآخر مسلمان ہو گئے۔ علامہ شبلیؒ نے اس واقعہ کے بارہ میں لکھا ہے کہ اس واقعہ کو انساب الاشراف بلاذری، طبقات ابن سعد، اسد الغابہ، ابن عساکر اور کامل ابن اثیر میں نقل کیا گیا ہے۔

Marfat.com

اس واقعہ پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرۃ عمر فاروقؓ میں کی ہے۔ اہل علم وہاں ملاحظہ فرمالیں۔ یہاں ہم علامہ شبلیؒ کے جانشین علامہ سید سلیمان ندویؒ کی وضاحت نقل کرتے ہیں جو انہوں نے سیرۃ النبی میں نقل کی ہے سید صاحب لکھتے ہیں:

'دار قطنی نے اس روایت کو مختصر لکھ کر کہا ہے کہ اس کا ایک راوی قاسم بن عثمان بصری قوی نہیں۔ (باب طہارت للقرآن) ذہبی نے مستدرک حاکم ص ۵۱۹ جلد ۴ کے استدراک میں لکھا ہے کہ یہ روایت واہی اور منقطع ہے اور میزان الاعتدال میں قاسم بن عثمان کے حال میں، جو اس روایت کا ایک راوی ہے، لکھا ہے: اس نے حضرت عمرؓ کے اسلام کا ایک قصہ بیان کیا ہے'' وھی منکرۃ جداً '' وہ نہایت منکر ہے۔ کنزالعمال (فضائل عمر بن الخطاب) میں بھی اس روایت کی کمزوری ظاہر کی گئی ہے۔ ان روایتوں کے مشترک راوی اسحاق بن یوسف، قاسم بن عثمان، اسحاق بن ابراہیم الحسینی اور اسامہ بن زید بن اسلم ہیں، اور یہ سب پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔'' (سیرۃ النبیؐ جلد ۳ ص ۳۳۵)

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطابؓ جب دولت اسلام سے بہرہ ور ہوئے تو جبرئیل امین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کی: ''اے محمد! تمام آسمان والے عمر کے اسلام لانے سے خوش ہوئے ہیں۔ (لقداستبشر اھل السماء باسلام عمر)

(عیون الاثر جلد ا ص ۲۲۱، طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۱۹۲، زرقانی جلد ا ص ۲۷۷، ابن ماجہ باب فضل عمر بن الخطاب، مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۲۴، صفۃ الصفوۃ جلد ا ص ۲۷۴، نہایۃ الادب جلد ۱۶ ص ۲۵۶)

سیدنا عمرؓ کو مصائب کا سامنا:

سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب میں اسلام لا چکا تو میں نے ارادہ کیا کہ قریش

Marfat.com

میں جو شخص سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں سب سے بڑھ چڑھ کر ہے، میں سب سے پہلے اسی کے سامنے اپنے قبول اسلام کا اظہار اور اعلان کروں۔ خیال آیا کہ ابوجہل سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور کوئی دشمن نہیں۔ چنانچہ میں سب سے پہلے ابوجہل کے مکان پر گیا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی۔ ابوجہل کو میرے بارہ میں اطلاع مل چکی تھی کہ میں تلوار حمائل کر کے حضور علیہ السلام کے قتل کے ارادۂ بد سے دار ارقم کی طرف گیا ہوں۔ اور وہ ہمہ تن انتظار تھا کہ جلد از جلد خبر ملنے والی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جب اس کو معلوم ہوا کہ عمرؓ دروازہ پر کھڑے ہیں تو اس نے نہایت عجلت سے دروازہ کھولا۔ سیدنا عمرؓ نے ابوجہل کو دیکھتے ہی کہا: ''ماموں! میں اس لیے آیا ہوں کہ تمہیں بتا دوں کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین حق کو قبول کر لیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایمان لے آیا ہوں اور اس کی تصدیق کی ہے۔'' یہ الفاظ سننے تھے کہ ابوجہل پر ایک بجلی سی گری اور اس نے غضب ناک حالت میں جھٹ کواڑ بند کر لیے اور کہا: ''جا تو اور تیرا اسلام دونوں غارت ہوں۔''

(سیرۃ ابن ہشام جلد ا ص ۳۵۰)

ابوجہل نے بددعا تو اپنے بھانجے عمرؓ کو دی تھی لیکن چند ہی سالوں کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ وہ خود اور اس کے تمام عناد پرست ساتھی کس طرح جنگ بدر میں قتل ہوئے اور نہایت خائب و خاسر ہو کر بدر کے کنویں میں پھینکے گئے! اور خدائے قیوم نے اسلام کو عزت و سربلندی عطا فرمائی۔ قبول اسلام کے وقت سیدنا عمرؓ کی عمر ۲۶ سال تھی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ سیدنا عمرؓ جب اسلام لائے تو خیال آیا کہ اپنے اسلام کی کسی ایسے شخص کو اطلاع دوں جو بات کے مشہور کرنے میں بہت زیادہ ماہر ہوتا کہ سب لوگوں کو میرے مسلمان ہونے کی جلد از جلد اطلاع ہو جائے۔ چنانچہ میں جمیل بن معمر کے پاس گیا جو اس بات میں پورے مکہ میں مشہور تھا، اور کہا: ''جمیل! تجھے معلوم ہے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہو گیا ہوں۔'' جمیل

Marfat.com

یہ سنتے ہی اسی حالت میں اپنی چادر کھینچتا ہوا مسجد حرام کی طرف بھاگتا ہوا گیا جہاں تمام سرداران قریش اور ہر قبیلہ کے رؤساء جمع تھے اور جاتے ہی بآواز بلند بولا: "لوگو! سن لو، عمر صابی (بے دین) ہو گیا ہے۔ سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں بھی جمیل کے پیچھے پیچھے گیا اور وہاں جا کر کہا: "لوگو! جمیل غلط کہتا ہے۔ میں صابی نہیں ہوا، میں تو اسلام لایا ہوں اور یہ گواہی دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔" یہ سننا تھا کہ لوگ عمرؓ پر ٹوٹ پڑے اور مارنا شروع کیا۔ "اب حالت یہ تھی کہ لوگ سیدنا عمرؓ کو مار رہے تھے اور سیدنا عمرؓ لوگوں کو مار رہے تھے۔ یہاں تک کہ سورج سر پر آ گیا اور سیدنا عمرؓ تھک کر بیٹھ گئے اور فرمایا: "جو کچھ بن پڑے کر لو، بخدا! اگر ہم لوگ تین سو کی تعداد میں ہوتے تو مکہ میں یا تم رہتے یا ہم رہتے۔"

(سیرۃ ابن ہشام جلد ا ص ۳۴۸-۳۴۹، عمر بن الخطاب لابن جوزی ص ۸)

سیدنا عمرؓ جس روز مسلمان ہوئے اگرچہ آپ بڑے جری اور بہادر تھے اور مکہ کا ہر شخص ان سے دبتا تھا لیکن معاملہ عقیدہ اور دین کا تھا اس وجہ سے سارا مکہ جہاں حیران و ششدر ہو گیا وہاں برافروختہ بھی ہو گیا۔ ایک بہت بڑا ہجوم ان پر چڑھ دوڑا۔ آپ کے صاحبزادے سیدنا عبداللہ بن عمرؓ جن کی عمر اس وقت چھ سال کے قریب تھی، فرماتے ہیں کہ میں اپنے مکان کی چھت پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ پورا میدان برافروختہ ہجوم سے پٹا ہوا تھا۔ سب طرف یہی شور تھا "صبا عمرؓ" عمرؓ دین سے پھر گیا۔ سیدنا ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہجوم نے گھر پر ہلہ بول دیا تھا اور جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں اور سیدنا عمرؓ خوف کے مارے گھر کے اندر تھے۔ اسی دوران ایک شخص آیا۔ وہ بڑی شان و شوکت کا آدمی تھا یعنی آزار اور چادر جو "جبرہ" کہلاتی تھی، زیب تن تھی۔ قمیص میں ریشمی کپڑے کی کفیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ ہجوم کو چیرتا ہوا مکان کے اندر سیدنا عمرؓ کے پاس پہنچا اور ان سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ اور یہ ہجوم کیسا ہے؟

"آپ کی قوم کے آدمی کہہ رہے ہیں کہ عمرؓ کو مار ڈالیں گے اس جرم میں کہ

Marfat.com

میں مسلمان ہوگیا ہوں۔'' سیدنا عمرؓ نے جواب دیا۔ اس رئیس نے کہا: ''ہرگز ایسا ممکن نہیں۔'' اس شخص کی بات سن کر مجھے اطمینان ہوگیا۔ اس کے بعد وہ شخص وہاں سے نکلا اور ہجوم سے کہنے لگا: ''اگر ایک شخص کا رجحان طبع کسی دوسری طرف ہوگیا تو تمہارا اس میں کیا ہے؟'' اور کہا: ''جب بنی عدی (سیدنا عمرؓ کا قبیلہ) کو معلوم ہوگا کہ تم ان سے برسر پرخاش ہو تو کیا وہ خاموش بیٹھے رہیں گے۔'' اس کے بعد اس نے کہا: اس کی طرف کوئی راہ نہیں۔ عمرؓ میری پناہ میں ہے، تم اس کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے۔'' سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: ''جیسے ہی اس شخص کی زبان سے امن اور پناہ کے الفاظ نکلے، تمام ہجوم کائی کی طرح چھٹ گیا۔'' (بخاری جلد ا ص ۵۴۵، سیرۃ ابن ہشام جلد ا ص ۳۴۹، عیون الاثر جلد ا ص ۲۲۰)

روایت کے آخر میں ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کا اس وقت بچپن تھا۔ وہ عاص بن وائل السہمی کو نہیں پہچانتے تھے۔ ہجرت کے بعد جب بڑے ہوئے تو ایک مرتبہ اپنے والد سے پوچھا: ''ابا! وہ شخص کون تھا جس نے ہجوم کو منتشر کیا تھا؟'' سیدنا عمرؓ نے جواب دیا: ''وہ عاص بن وائل تھا جو بنو سہم کا رئیس تھا۔'' (دلائل النبوۃ جلد ۲ ص ۹، سیرۃ ابن ہشام جلد ا ص ۳۴۹، البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۸۲، فتح الباری جلد ۷ ص ۱۳۵)

مختصر یہ کہ سیدنا عمرؓ کا اسلام خرمن کفر پر برق سوزاں بن کر گرا۔ سیدنا حمزہؓ اور سیدنا عمرؓ کے اسلام لانے نے کفر کی صفوں میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا کر دی۔ ان کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔ ادھر مسلمانوں کے کاروان میں ان دو شخصیتوں کے اضافہ نے بڑی تقویت پیدا کی۔ اب قریش مکہ کی چیرہ دستی کے بعد سیدنا عمرؓ کا دریائے خشم بت پرستوں کے خلاف ہر وقت موجزن رہنے لگا۔ ایک روز انہوں نے نہایت دل سوزی کے ساتھ بارگاہ نبوت میں عرض کیا: ''یارسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟'' سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیوں نہیں، ہم یقیناً حق پر ہیں۔'' سیدنا عمرؓ نے عرض کی: ''پھر یہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ مشرکین تو علی الاعلان بت پرستی کریں لیکن ہم

Marfat.com

خدائے عزوجل کے پرستار اور توحید کے علم بردار چھپ کر اپنے خدا کی عبادت کریں۔"
چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: کہ "میں نے ایک روز سیدنا عمر بن خطابؓ سے پوچھا کہ کس وجہ سے آپ کا لقب فاروق پڑا؟" آپ نے جواب دیا: "مجھ سے تین روز پہلے سیدنا حمزہؓ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ پھر جب میں مسلمان ہوا تو میں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی: یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں خواہ زندہ رہیں یا مریں؟" آپ نے ارشاد فرمایا: کیوں نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم لوگ حق پر ہو خواہ زندہ رہو یا اس دنیا سے انتقال کر جاؤ۔
سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں: تب میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! پھر یہ چھپنا کیسا؟ اس ذات برحق کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، ہم ضرور باہر نکلیں گے۔"
چنانچہ ہم دو صفوں میں آپ کو ساتھ لے کر باہر آئے۔ ایک صف میں سیدنا حمزہؓ تھے اور دوسری صف میں میں تھا۔ ہمارے چلنے سے چکی کے آٹے کی طرح ہلکا ہلکا غبار اڑ رہا تھا (لہ کرید ککرید طحین) حتی کہ ہم مسجد الحرام میں داخل ہو گئے۔ سیدنا عمرؓ فرماتے ہیں کہ "قریش مکہ نے مجھے اور سیدنا حمزہؓ کو دیکھا تو ان کے دلوں پر ایسی چوٹ لگی جواب تک نہ لگی تھی۔ اسی روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا لقب فاروق رکھ دیا۔"
(فسمانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الفاروق یومئذ)

(سیرۃ عمر بن الخطاب لابن جوزی ص ۶-۷، صفۃ الصفوۃ جلد ۱ ص ۲۷۲، دلائل النبوۃ لابی نعیم جلد ۱ ص ۷۹-۸۰، عیون التواریخ جلد ۱ ص ۷۵، تاریخ الاسلام ذہبی جلد ۱ ص ۱۸۰ زرقانی جلد ۱ ص ۲۷۷)

اہل اسلام کا دار ارقم سے نکل کر مسجد الحرام میں آنا سیدنا عمرؓ کا ایک بہترین کارنامہ تھا۔ اس سے ایک تو اہل اسلام کو تقویت ملی، دوسرے روسائے قریش کو اپنے جبر و استبداد کا ایوان سرنگوں ہوتا دکھائی دیا۔ اسی وجہ سے سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ
"سیدنا عمرؓ کا اسلام گویا اسلام کی فتح تھی اور ان کی ہجرت نصرت تھی اور ان

Marfat.com

کی خلافت رحمت تھی۔ ان کے مسلمان ہونے سے قبل ہماری مجال نہ تھی کہ ہم مسجد حرام میں خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت کریں لیکن عمرؓ کے مسلمان ہونے کے بعد ہم وہاں بلاخوف وخطر نماز پڑھنے لگے۔"

(البدایہ والنہایہ جلد۳ص ۷۹، زرقانی جلد۱ص ۲۷۷)

سیدنا حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ جب سیدنا عمرؓ دولت اسلام سے بہرہ ور ہوئے تو اسلام بمنزلہ ایک اقبال مند آدمی کے ہوگیا کہ ہر قدم پر ترقی کرتا تھا۔

(طبقات ابن سعد جلد۱ص)

طفیل بن عمرو دوسیؓ پر دعوت کا اثر:

طفیل بن عمرو دوسیؓ قبیلہ دوس کے رئیس تھے۔ یہ قبیلہ یمن کے ایک گوشہ میں آباد تھا اور بڑا طاقتور تھا۔ طفیل شعر وسخن میں نہایت بلند حیثیت کے حامل تھے۔ بڑے زیرک، دانش مند، دانش ور اور فہیم تھے۔ وہ قبیلہ کو اپنی قوت بیانی اور طلاقت لسانی سے جدھر چاہتے مائل کر لیتے تھے۔ قریش سے ان کے حلیفانہ تعلقات تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے قریش مکہ کا یہ معمول تھا کہ جب وہ کسی نووارد کو مکہ میں دیکھتے تو اس کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر متنفر کرنے کی کوشش کرتے کہ اگر وہ خاص آپ ہی کی ملاقات کے لیے مکہ میں آیا ہوتا تب بھی وہ آپ سے ملاقات کے بارہ میں اپنا ارادہ فسخ کر دیتا۔ قریش نے سنا کہ طفیل بن عمروؓ مکہ مکرمہ آئے ہیں تو وہ اس خیال سے سخت پریشان ہوئے کہ اگر انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کر لی اور وہ ان کے گرویدہ ہو گئے تو ان کا سارا قبیلہ دوس حلقہ اسلام میں داخل ہو جائے گا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو تقویت حاصل ہوگی۔

سیدنا طفیل بن عمروؓ خود فرماتے ہیں کہ جونہی میں نے مکہ شہر کی سرزمین پر قدم رکھا قریش کے آدمی مجھ سے آکر ملنے لگے اور ہر شخص مجھے یہی کہتا: "طفیل! تم ہمارے

Marfat.com

شہر میں نووارد اور مہمان ہو، اس لیے ہم تمہیں ازراہ ہمدردی اور خیر خواہی خبردار کرتے ہیں کہ یہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نام کا ایک شخص ہے جس نے ہماری جمعیت، یک جہتی اور وحدت قومی کو پراگندہ اور پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس کا کلام جادو بھرا ہے، اس کی دعوت بڑی موثر ہے، وہ اپنی طلاقت لسانی اور سحر آمیز قوت بیانی سے باپ بیٹے، بھائی بھائی اور میاں بیوی کے مابین جدائی اور مفارقت کی خلیج پیدا کر دیتا ہے۔ اس نے ہمارا قومی شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ تم نووارد سے یہ خطرہ ہے کہ کہیں تم اس کے دامن میں نہ پھنس جاؤ۔ پس یہ ہمارا دوستانہ اور خیر خواہانہ مشورہ ہے کہ مکہ کے قیام کے دوران اس سے دور رہو اور اسکی بات کی طرف ہرگز کان نہ دھرو۔

سیدنا طفیلؓ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس قدر وحشت زدہ کر دیا کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تاکہ بالفرض اگر سرراہ ملاقات بھی ہو جائے تو آپ کی کوئی بات نہ سن سکوں، لیکن یہ ساری باتیں بیکار ثابت ہوئیں۔ کیونکہ دوسرے ہی دن میں نے آپ کو مسجد حرام میں کعبہ کے نزدیک نماز پڑھتے دیکھا۔ مجھے یہ طریق عبادت بہت پسند آیا۔ میں آپ کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں اگرچہ چاہتا تھا کہ آپ کا کلام نہ سنوں لیکن آپ نماز میں جو آیات پڑھ رہے تھے وہ میرے کان تک پہنچ گئیں۔ جب میں نے وہ آیات سنیں تو اس کلام میں بڑی دلآویزی اور جاذبیت معلوم ہوئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا: "میں ایک شاعر، دانشور اور مبصر ہوں۔ نیک و بد میں بخوبی تمیز کر سکتا ہوں۔ اچھے اور برے کو جان سکتا ہوں، میں یہ کلام ضرور سنوں گا۔

جب آپ نماز سے فارغ ہوئے اور مسجد الحرام سے واپس ہوئے تو میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب آپ اپنے دولت کدہ میں پہنچے تو میں بھی پہنچ گیا۔ میں نے خدمت اقدس میں عرض کیا کہ "آپ کی قوم نے مجھے آپ کے کلام سے اس قدر خوف زدہ کیا کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی یہاں تک کہ لوگ مجھے

Marfat.com

"ذوالفطنتین" کہنے لگے، لیکن مشیت ایزدی نے انکار کیا کہ میں آپ کا کلام نہ سنوں۔ چنانچہ آج آپ کا کلام کان میں پڑا تو بہت اچھا معلوم ہوا، لہٰذا آپ اپنا دین مجھ پر پیش کریں۔ اگر آپ کی باتوں میں حق و صداقت کی روح نظر آئی تو ضرور قبول کروں گا۔"
آپ نے دین کے بنیادی اصول میرے سامنے بیان کیے جو قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں پیوست ہو گئے۔ پھر آپ نے قرآن حکیم کی تلاوت فرمائی۔ میں خود عربی کا شاعر تھا۔ محاسن کلام کو بخوبی سمجھتا تھا، بخدا! میں نے قرآن حکیم سے بہتر کوئی کلام نہیں سنا اور آپ کے ارشادات گرامی کے مقابلہ میں کوئی حکیمانہ تقریر نہیں سنی، اور اسلام سے زیادہ معتدل اور متوسط دین اور کوئی نہیں پایا۔ چنانچہ میں بادۂ اسلام کے ایک ہی جام سے سرشار ہو گیا اور اسی وقت دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ بات کامل طور پر نظر آتی ہے کہ دعوت میں آپ کا طریقہ یہ نہ تھا کہ کچھ مقررہ الفاظ کو ہر ایک کے سامنے دہرایا کریں بلکہ مخاطب کی رعایت کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی بات رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ دعوت کے کلمات جب داعی کی زبان سے نکلتے تو اس میں ایک اور شی شامل ہو جاتی اور وہ داعی کی اپنی ذات ہوتی۔ یہ اضافہ دعوت کو ایک زندہ عمل بنا دیتا ہے جو باعتبار حقیقت ایک ہونے کے باوجود اپنی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے جس کی کوئی لگی بندھی فہرست نہیں بنائی جا سکتی۔ داعی کے سینے میں خوف خدا سے لرزتا ہوا دل، مدعو کے ایمان کے لیے بچوں کی سی معصوم اور بے قرار تمنا، یہ جذبہ کہ اگر میں خدا کے بندوں کو خدا کے قریب کر سکوں تو خدا مجھ سے خوش ہو جائے گا، یہ چیزیں نہ صرف کلمات دعوت میں کیفیت کا اضافہ کرتی ہیں بلکہ اس کو باعتبار ظاہر انتہائی متنوع بھی بنا دیتی ہیں کیونکہ مدعو کو متاثر کرنے کا پر شوق جذبہ اس کو مجبور کرتا رہتا ہے کہ ہر ایک کے ذہن کی مکمل رعایت کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنی بات رکھے۔ چنانچہ مکہ مکرمہ کے ابتدائی دور میں ایک بار آپؐ نے ابوسفیان اور اس کی بیوی ہند کو ابن عساکر کی روایت کے مطابق ان الفاظ میں دعوت دی:

Marfat.com

''اے ابوسفیان اور اے ہند! خدا کی قسم! تم کو ضرور مرنا ہے، اس کے بعد تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے، پھر جو بھلا ہو گا وہ جنت میں داخل ہو گا اور جو برا ہو گا وہ جہنم میں پھینکا جائے گا۔ اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، حق کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔'' (وانا اقول لکم بحق)

(کنز العمال جلد ۷ ص ۹۴، مجمع الزوائد جلد ۶ ص ۲۰)

اسی طرح سیدنا عمرانؓ کے والد حصین کو آپ نے جو دعوت اسلام دی، اس میں فرمایا:

''اے حصین! تم کتنے معبودوں کی پرستش کرتے ہو؟ اس نے کہا: سات زمین میں سے اور ایک جو آسمان پر ہے۔'' آپؐ نے فرمایا: ''جب مصیبت آئے تو کس کو پکارتے ہو؟'' اس نے کہا: ''آسمان والے کو۔'' آپ نے پھر پوچھا: ''جب مال پر تباہی آئے تو کس کو پکارتے ہو؟'' اس نے پھر کہا: ''آسمان والے خدا کو۔'' آپ نے فرمایا: ''وہ اللہ تو تنہا تمہاری دادرسی اور فریادرسی کرتا ہے اور تم اس کے ساتھ دوسروں کو کیوں شریک کرتے ہو؟''

اسی طرح مسند احمد بن حنبلؒ میں ابو امامہ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک قبیلہ کا آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ ''اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیا چیز دے کر بھیجا ہے'' آپؐ نے جواب میں فرمایا:

''یہ کہ صلہ رحمی کی جائے، قتل ناحق سے بچا جائے، راستوں میں امن رکھا جائے، بتوں کو توڑا جائے، صرف ایک خدا کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔''

آپ کے لیے ایک مستقل اور اہم ترین ذریعہ دعوت و تبلیغ خود قرآن تھا۔ یہی قرآن آپ نے عتبہ بن ربیعہ کو سنایا، یہی ولید بن مغیرہ کو اور یہی قرآن آپ نے سیدنا طفیل بن عمرو دوسیؓ کو سنایا۔ اور جب بھی کوئی شخص آپ کو ملتا تو آپ اسے قرآن حکیم کا کوئی نہ کوئی حصہ پڑھ کر سناتے۔ روایات میں اکثر اس قسم کے کلمات ملتے ہیں ''ثم ذکر

Marfat.com

الاسلام و تلاعلیھم القرآن، فعرض علیھم الاسلام وقرأ علیھم القرآن۔"
قرآن حکیم کی کشش اور جاذبیت عربوں کے لیے اتنی حیرت انگیز تھی کہ اسلام کے بعض کٹر مخالفین بھی راتوں کو چھپ کر آپ کے مکان کے پاس آتے اور دیوار سے لگ کر آپ کا قرآن سنتے جو آپ رات کی تنہائیوں میں پڑھتے، قرآن حکیم کا آسمانی ادب عربوں کو بے پناہ طور پر متاثر کرتا تھا۔ چنانچہ ولید بن مغیرہ نے قرآن ہی سے متاثر ہو کر اپنے ساتھیوں سے یہ کہا تھا کہ: "یہ تو اتنا بلند کلام ہے کہ دوسرے تمام کلام اس کے آگے پست ہو جاتے ہیں۔" ابن ہشام نے اس سلسلہ میں ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کی تنہائیوں میں قرآن حکیم کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ایک رات اس روح پرور تلاوت کو سننے کے لیے ابوسفیان بن حرب آیا اور چپکے سے ایک کونہ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ پھر ابوجہل رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کو سننے کے لیے اس مجلس میں آیا اور ایک گوشہ میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ایک اور رئیس کفر اخنس بن شریق بھی کشاں کشاں اس محفل میں آ گیا اور وہ بھی ایک کونہ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ تینوں اسلام اور داعی اسلام کے خون آشام دشمن تھے، لیکن قرآن سننے کا شوق ان تینوں کو گھر سے یہاں کھینچ لایا اور وہ تینوں نہایت ذوق وشوق سے قرآن کریم سن رہے تھے رات بھر وہ قرآن کی تلاوت کی کیف و مستی میں ڈوبے رہے یہاں تک کہ صبح صادق نمودار ہو گئی۔ اب یہ تینوں اپنے اپنے گھروں کو چل پڑے۔ راستہ میں ان تینوں کی ملاقات ہو گئی۔ تینوں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ ایسی محفلوں میں ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ اگر عوام الناس کو پتہ لگ گیا کہ ہم رات بھر چھپ چھپ کر قرآن کی تلاوت سن کر لطف اندوز ہوتے ہیں تو ان کا عقیدہ متزلزل ہو جائے گا بلکہ وہ بت پرستی کے اندھیرے سے اسلام کے چاندنے میں آ جائیں گے اور کاروان اسلام کی تعداد میں اور زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔

جب دوسری رات ہوئی تو باوجود آپس کے عہد وپیمان کے، ان تینوں سے صبر نہ

ہو سکا تلاوت کی جاذبیت اور کشش ان تینوں کو پھر گھر سے حرم کعبہ میں کھینچ لائی۔ اور ہر ایک یہی سمجھ رہا تھا کہ صرف وہی آیا ہے اور کوئی نہیں آیا۔ کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی رات پل بھر میں بیت گئی۔ جب صبح کا اجالا پھیلنے لگا اور تینوں اٹھ کر گھروں کو روانہ ہوئے۔ راستہ میں پھر تینوں کی مڈبھیڑ ہو گئی اور پھر ایک دوسرے کو مطعون کرنے لگے اور تاکید کرنے لگے کہ آئندہ یہ غلطی نہ کرنا نہیں تو عوام ہمیں چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ تیسری رات کی شب دیجور جب اپنی سیاہ زلفیں پھیلائے مکہ کے گلی کوچوں پر چھا گئی اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا تو پھر ان تینوں کے دلوں میں قرآن کی تلاوت سننے کے شوق کی چنگاری سلگنے لگی۔ چنانچہ وہ پھر کشاں کشاں اپنے سے ایک دوسرے کو چھپاتے ہوئے مسجد حرام میں آئے جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نہایت دل کش لحن میں اللہ کے کلام قرآن حکیم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ لیکن جب یہ رات بھی صبح آشنا ہوئی تو وہ پھر وہاں سے اٹھ کر گھروں کو روانہ ہوئے اور راستہ میں پھر تینوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ فرط خجالت سے وہ اب ایک دوسرے سے آنکھیں ملانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال پھر آپس میں پختہ عہد و پیمان کیا کہ اب حرم کعبہ میں آپ کا قرآن سننے نہیں آئیں گے۔

جب صبح ہوئی تو اخنس بن شریق ابوسفیان کے گھر آیا کہا:

اے ابو حنظلہ! (ابوسفیان کی کنیت) مجھے بتاؤ کہ جو کلام تو نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اس کے بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

ابوسفیان نے جواب دیا:

"ابو ثعلبہ! (یہ اخنس بن شریق کی کنیت ہے) بخدا! بعض چیزیں جو میں نے سنی ہیں ان کو میں جانتا تھا اور اس کے مفہوم سے بھی میں آشنا تھا لیکن بعض چیزوں سے مجھے بالکل ناآشنائی ہے

اخنس بن شریق نے کہا: بخدا میرا بھی یہی حال ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر پھر اخنس ابوجہل کے گھر گیا اور اس سے پوچھا:

Marfat.com

''اے ابوالحکم! جو کلام تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا اس کے بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے؟''

ابوجہل نے کہا:

''میں نے کیا خاک سنا؟ دراصل بات یہ ہے کہ ہمارا اور بنو عبد مناف کا جھگڑا اس بات پر تھا کہ قوم کا سردار کون ہے۔ اس شرف کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بھی اپنے دسترخوان کو وسیع کیا اور ہر غریب اور مسافر کو کھانا کھلایا۔ ہم نے بھی ان کے مقابلہ میں اپنے دسترخوانوں کو اسی طرح وسیع کیا۔ انہوں نے بھی لوگوں کے بوجھ اٹھائے اور ہم نے بھی بوجھ اٹھائے۔ انہوں نے بھی داد و دہش سے مانگنے والوں کی جھولیاں بھریں اور ہم نے بھی ان پر گوئے سبقت لے جانے کے لیے اپنی سخاوت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ اور جب ہم مقابلہ کے دو گھوڑوں کی مانند ہو گئے تو انہوں نے اچانک اعلان کر دیا کہ ہم میں ایک نبی ہے جس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ اب ہم یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں۔ بخدا! ہم تو اس پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے۔ (واللہ! لانؤمن به ابداً ولا نصدقه) (ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۳۷)

ابوجہل کے منہ سے یہ کلمات سن کر اخنس بن شریق اٹھا اور اس کو خشم ناک حالت میں بڑیں ہانکتے ہوئے چھوڑ کر چلا گیا۔

تبلیغ اسلام کے لیے قرآن سنانا اس زمانہ میں ایک عام طریقہ تبلیغ بن گیا تھا۔ چنانچہ سیدنا مصعب ابن عمیرؓ جب ایک داعی اور مبلغ کی حیثیت سے مدینہ طیبہ بھیجے گئے تو ان کا طریقہ بھی یہی تھا کہ لوگوں سے باتیں کرتے اور قرآن سناتے۔ قرآن حکیم سنانے کی وجہ سے ان کا نام ''مقری'' پڑ گیا۔ (وکان یدعی المقری) (حلیۃ الاولیاء جلد ۱ ص ۱۳۷)

نبوت کے دسویں سال یثرب کے دو شخص سعد بن زرارہ اور ذکوان بن قیس مکہ آئے اور مکہ کے رئیس عتبہ بن ربیعہ کے ہاں ٹھہرے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا

Marfat.com

تذکرہ سنا تو آپ سے ملنے کے لیے آئے۔ آپ نے ان دونوں کو قرآن سنایا اور اسلام کی دعوت دی۔ دونوں حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ پھر وہ اپنے میزبان عتبہ کے پاس جانے کے بجائے سیدھا یثرب چلے گئے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے اہل یثرب تک اولاً اسلام پہنچایا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۶۰۸)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ مستشرقین کا یہ الزام کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے سراسر غلط اور باطل ہے۔ ان حالات میں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں ایسی زندگی بسر کر رہے تھے کہ کوئی ان کا معاون و مددگار نہ تھا اور اسی وجہ سے تین سال خفیہ دعوت دیتے رہے اور اس دوران ایسی ہستیاں مشرف با سلام ہوئیں جن کی بے مثال خوبیوں اور عظیم صلاحیتوں کا ہر شخص معترف تھا۔ انہوں نے ایسے وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے قبول کیا جب کہ کسی کے پاس کوئی تلوار نہ تھی اور نہ ہی کسی کے پاس ان کو دینے کے لیے کوئی مال تھا۔ بلکہ اسلام قبول کرنے والوں کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ مشرکین نے ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، لیکن ان میں کسی نے بھی ان مصائب کی وجہ سے اسلام کو نہ چھوڑا۔ وہ لوگ فطری طور پر اس قدر نڈر اور بے باک تھے کہ وہ کسی جابر سے جابر حکمران کے خوف سے کسی باطل کے سامنے سر جھکا نہیں سکتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور اسلام کی حقانیت کے حسن و جمال نے اور اسوہ پیغمبر کی رعنائیوں اور زیبائیوں نے ان کے دلوں کو اسلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا شیدائی بنایا کہ دنیا کی کوئی شی انہیں اسلام سے ہٹا نہ سکی۔ یہ لوگ ڈرپوک اور بزدل بھی نہ تھے بلکہ اس قدر جری اور بہادر تھے کہ جن کی ہیبت سے کوہساروں کے دل لرزتے تھے اور جن کے رعب سے سمندروں کے طوفان سہم جایا کرتے تھے۔ اگر دو منٹ کے لیے یہ مان لیا جائے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا تو یہ بتایا جائے کہ جن لوگوں نے تلوار چلا کر اسلام کو پھیلایا ان کے گلوں پر کس نے تلوار چلائی تھی؟ بلکہ ان پر تو خود تلواریں چلا کر اسلام سے بدظن

Marfat.com

کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ہر کوشش رائیگاں گئی۔ ابوبکرؓ جیسے زیرک و دانا، عمرؓ جیسے بہادر و مدبر، عثمان جیسے غنی و فیاض اور علیؓ جیسے شیر دل اور علم و حکمت کے نیر اعظم کی بات چھوڑیں ایک معمولی غلام بلالؓ ہی کو لے لیں، مکے کے گلی کوچوں میں ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں لیکن ان کے منہ سے صرف ایک آواز نکلتی ہے:

احد، احد، انالااشرک بالله شیئاً، انا کافر بللات والعزّیٰ

وہ یکتا ہے، وہ یکتا ہے، میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھیراتا۔ میں لات اور عزیٰ کا انکار کرتا ہوں۔

اور علامہ حلبیؒ کا یہ جملہ کتنا پیارا ہے۔

کان بلال بقوله احد، احد، یمزج مرارة العذاب بحلاوة الایمان

بلال احد احد کہہ کر عذاب کی تلخی میں ایمان کی مٹھاس کو ملا رہے تھے۔

اور عذاب کی تلخی کتنی تھی؟ وہ بھی کتابوں میں بیان کی گئی ہے، سیدنا عمرو بن العاصؓ جو اس زمانہ میں ابھی اسلام سے آشنا نہ ہوئے تھے، بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں بلال کے پاس سے گذرا جب کہ اسے گرم کنکریوں پر لٹا کر عذاب دیا جا رہا تھا۔ وہ کنکریاں اتنی شدید گرم تھیں

ولو ان بضعة لحم وضعت علیه لنضجت

کہ اگر گوشت کا ایک ٹکڑا ان پر رکھا جائے تو ان کی حرارت سے وہ پک جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے ہر حالت میں دعوت اسلام دی:

دین کی دعوت دینا ایک ایسا عمل ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حالت میں انجام دیا۔ بازاروں، میلوں ٹھیلوں، مختلف لوگوں کے اجتماع میں غرض کہ جہاں بھی آپ کو موقع ملا آپ نے دین کی دعوت سے گریز نہیں کیا۔ قرآن حکیم میں ہے کہ ''اے نبی! اگر آپ ان کافروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، یہ ایمان نہیں لائیں گے۔'' قرآن حکیم کے اس اعلان کے بعد بھی روایات سے پتہ چلتا

Marfat.com

ہے کہ آپ نے زندگی کا ہر لمحہ دین کی دعوت دینے میں گذارا۔ اور اس کے لیے مختلف تکالیف بھی برداشت کیں۔ چنانچہ ربیعہ بن عبادؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زمانہ جاہلیت میں ذوالمجاز کے بازار میں دیکھا کہ آپ لوگوں سے فرما رہے تھے: ''اے لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہو، کامیاب ہو جاؤ گے اور لوگ آپ کے ارد گرد جمع تھے اور آپ کے پیچھے ایک روشن چہرے والا بھینگا آدمی تھا جس کی دو زلفیں تھیں۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ (نعوذ باللہ) یہ شخص بے دین اور جھوٹا ہے۔ جہاں بھی آپ تشریف لے جاتے وہ آپ کے پیچھے ہوتا۔ میں نے لوگوں سے اس شخص کے بارہ میں پوچھا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ آپ کا چچا ابولہب ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۱۴۱، مجمع الزوائد جلد ۶ ص ۲۲ وعزاہ الحافظ فی الفتح جلد ۷ ص ۱۵۶ الی البیہقی واحمد وقال صححہ ابن حبان) اور حافظ ہیثمی ہی نے ایک اور روایت نقل کی ہے جس میں ہے کہ آپ ابولہب سے بھاگتے تھے اور وہ آپ کا تعاقب کرتا تھا۔ اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ لوگ آپ پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ لوگوں میں سے میں نے کسی کو آپ کے سامنے بولتے ہوئے نہیں دیکھا اور آپ مسلسل دعوت دیتے جاتے تھے اور خاموش نہیں ہوتے تھے۔

(مجمع الزوائد جلد ۶ ص ۲۲)

اسی طرح آپ سوق عکاظ میں جا کر اللہ کے دین کی دعوت دیتے تھے اور مختلف قبائل پر اسلام پیش کرتے تھے۔

(دلائل النبوۃ ص ۱۰۰ لابی نعیم، البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۱۴۱)

سفر میں بھی دین کی دعوت دینا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی سفر میں ہوتے اس حالت میں بھی اگر کوئی شخص آپ کو مل جاتا تو آپ اس کو دین کی دعوت دینے سے احتراز نہ کرتے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ کو ایک دیہاتی مل گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا

Marfat.com

''کہاں کا ارادہ ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔'' آپؐ نے فرمایا: ''کیا تم کوئی بھلی اور اچھی بات حاصل کرنا چاہتے ہو۔'' اس نے پوچھا: ''وہ بھلی بات کیا ہے؟'' آپ نے فرمایا: تم کلمۂ شہادت پڑھ لو۔ اس نے کہا جو بات آپ کہہ رہے ہیں اس پر کوئی گواہ ہے؟ آپ نے فرمایا: ''یہ درخت گواہ ہے۔'' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخت کو بلایا اور وہ درخت وادی کے کنارے پر تھا۔ وہ زمین کو پھاڑتا ہوا آپ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ آپ نے اس سے تین مرتبہ گواہی طلب کی، اس نے تین مرتبہ گواہی دی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے فرما رہے ہیں بات ویسے ہی ہے۔ پھر وہ درخت واپس اپنی جگہ چلا گیا۔ وہ دیہاتی اپنی قوم کے پاس چلا گیا اور جاتے ہوئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر میری قوم والوں نے میری بات مان لی تو میں ان سب کو آپ کے پاس لے آؤں گا ورنہ میں خود آپ کے پاس واپس آ جاؤں گا اور آپ کے ساتھ رہا کروں گا۔''

(اخرجہ الحاکم، البدایہ والنہایہ جلد ۶ ص ۱۲۵، وقال الہیثمی جلد ۸ ص ۲۹۲، رواہ الطبرانی ورجالہ رجال الصحیح)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ کتابوں میں مرقوم ہے۔ سیدنا سعد کے بیٹے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاتھ سیدنا ابوبکرؓ کی معیت میں تشریف لائے۔ سیدنا ابوبکرؓ کی ایک صاحبزادی جو کہ شیر خوار تھی ہمارے ہاں رضاعت کے سلسلہ میں رہتی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش تھی کہ مدینہ کا سفر چھوٹے راستہ سے کیا جائے۔ سیدنا سعدؓ نے حضور سے عرض کیا کہ رکوبہ گھاٹی کے نیچے سے جو راستہ جاتا ہے وہ زیادہ قریب ہے، لیکن وہاں قبیلہ اسلم کے دو رہزن رہتے ہیں جن کو مہانان کہا جاتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کے پاس سے گذرنے والے راستہ سے سفر کریں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان ڈاکوؤں والے راستہ سے ہمیں لے چلو، سیدنا سعدؓ فرماتے ہیں کہ ہم اس راستہ سے چلے۔ جب ہم ان ڈاکوؤں کے قریب پہنچے تو ان میں سے ایک دوسرے

Marfat.com

کو کہہ رہا تھا: "لو یہ یمانی آ گیا۔" سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو اسلام کی دعوت دی اور ان پر اسلام پیش کیا۔ وہ دونوں حضور علیہ السلام کی دعوت سے مسلمان ہو گئے۔ آپ نے ان دونوں کے نام پوچھے: انہوں نے کہا ہم مہانان (یعنی دو گرے پڑے آدمی) ہیں۔ آپ نے فرمایا: نہیں تم دونوں مکرمان (یعنی قابل اکرام) ہو۔ پھر آپ نے انہیں اپنے پاس مدینہ آنے کا حکم دیا۔ (مسند احمد جلد ۴ ص ۴۷، مجمع الزوائد جلد ۶ ص ۵۸)

شعب بنی ہاشم اور دعوت اسلام:

جب بنو ہاشم اور بنو مطلب نے مل کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت و صیانت کا عہد و پیمان کیا تو دونوں خاندانوں کے اس فیصلے نے قریش مکہ کو چکرا دیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت کو کس طرح روکا جائے۔ اور وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ اگر انہوں نے ابو طالب کے بھتیجے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا اقدام کیا تو مکہ کی وادی مشرکین کے خون سے رنگین ہو جائے گی، لہٰذا انہوں نے اب اپنی اسٹریٹجی (Strategy) میں تبدیلی کی اور اب اقدام قتل کے بجائے ظلم کی ایک اور راہ تجویز کی جو پہلی تمام ظالمانہ کارروائیوں سے زیادہ سنگین اور سخت تھی۔ اور وہ ظالمانہ کارروائی یہ تھی کہ قریش نے متفقہ طور پر ایک تحریری معاہدہ تیار کیا کہ

> "جب تک بنو ہاشم اور بنو مطلب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لیے ان کے حوالے نہ کر دیں گے، ان دونوں خاندانوں سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر دیئے جائیں۔ نہ کوئی شخص ان سے میل جول اور بات چیت کرے گا، نہ ان کے ہاتھ کوئی چیز بیچے گا، ان کے پاس کھانے کا کسی قسم کا کوئی سامان نہ جانے دے گا، ان سے کسی قسم کی رواداری نہ برتے گا اور نہ ہی ان کے ساتھ رشتہ بیاہ کرے گا۔"

اس معاہدہ پر تمام قبائل قریش کے قریبا تمام سربرآوردہ حضرات نے دستخط کیے، اور جب یہ معاہدہ مرتب ہو گیا تو اس کو خانہ کعبہ کی چھت سے آویزاں کر دیا گیا۔

اس معاہدہ کے بعد بنو ہاشم اور بنو مطلب کا مکمل بائیکاٹ شروع ہو گیا۔ ابولہب کے سوا بنو ہاشم اور بنو مطلب کے تمام افراد خواہ وہ مسلمان تھے یا کافر، سمٹ کر شعب بنی ہاشم میں محبوس ہو گئے۔ اس درہ میں مسلسل تین سال یہ دونوں خاندان محبوس رہے۔ یہ تین سال نہایت سنگین تھے ان دونوں خاندانوں سے قبائل مکہ کا ہر قسم کا تعاون اٹھ گیا۔ قریش ان تمام اشیائے خوردنی کو جن کی نسبت انہیں ادنیٰ احتمال ہوتا تھا کہ وہ ہاشمیوں اور مطلبیوں کے ہاتھ پڑ جائیں گی ہر قیمت پر فی الفور خرید لیتے۔ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے سب لوگ جب اس گھاٹی اور درہ میں چلے گئے تو ان کے سکونتی مکانات مقفل ہو گئے اور درہ میں کوئی بھی شی میسر نہ تھی کیونکہ قریش نے اس درہ کو ہر طرف سے محصور کر لیا تھا اور کھانے پینے کی کوئی چیز درہ کے اندر پہنچنے نہ دیتے تھے۔ جب ان دونوں خاندانوں کے بچے بھوک سے بلبلاتے اور ان کی آواز باہر دور دور تک سنائی دیتی تو سیاہ دل اور سنگ دل قریش سن سن کر خوش ہوتے، لیکن جو ان میں رحم دل تھے ان کو ناگوار گزرتا اور صاف کہتے کہ کیا تم کو نظر نہیں آتا کہ منصور بن عکرمہ پر کیا آفت نازل ہوئی ہے؟

مختصر یہ کہ اس سوشل بائیکاٹ کے باوجود اس دور میں فاقہ کشی اور مشکلات نے نہایت خوفناک صورت پیدا کر رکھی تھی لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فریضہ دعوت وتبلیغ سے ایک لمحہ بھی غافل نہ ہوئے اور آپ برابر اس کو جاری رکھے رہے۔ وحی الٰہی بھی نازل ہوتی رہی اوامر ونواہی کا سلسلہ بھی جاری رہا اور مخالفین دین کے لیے سخت وعیدیں بھی نازل ہوتی رہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ محصوری کے باوجود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مسلمان حج کے دنوں میں شعب بنی ہاشم سے باہر نکلتے اور حج کے لیے آنے والے لوگوں کو دین اسلام کی دعوت دیتے اور جس مقصد کے لیے قریش مکہ نے ان اللہ والوں کو گھاٹی میں محصور کیا تھا، وہ پھر بھی پورا نہ ہوا کیونکہ اسلام کی دعوت برابر جاری رہی۔

آپ کی زندگی کے شب وروز اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ لوگوں کو دین

Marfat.com

کی دعوت دینے میں آپ بچوں کی طرح حریص تھے۔ طبری نے سیدنا ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک روز مکہ کے اشراف اور سربرآوردہ لوگ غروب آفتاب کے بعد بیت اللہ کے پاس جمع ہوئے اور آپ کو بات چیت کے لیے بلایا۔ ان کا یہ پیغام سن کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت تیزی سے آئے۔ آپ کو خیال ہوا کہ ان لوگوں کا شاید قبول حق کی طرف کچھ میلان ہو گیا ہے اور آپ قریش کی ہدایت کے لیے بے حد حریص تھے۔ (کان علیهم حریصاً یحب رشد هم) اور ان کی ہلاکت آپ پر گراں گزرتی تھی۔ لیکن بلانے والوں نے آپ کو بات ماننے کے لیے نہیں بلکہ صرف بحث و مباحثہ کے لے بلایا تھا۔ چنانچہ ایک طویل گفتگو کے بعد آپ غمگین واپس لوٹے۔ سیرۃ ابن ہشام میں ہے کہ

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت حزن و ملال کے ساتھ اپنے گھر واپس آئے کیونکہ قوم سے جس شی کی امید لگا کر آپ گئے تھے، اس کو نہ پایا۔ وہ لوگ اس سے بہت دور تھے۔" (تہذیب سیرۃ ابن ہشام جلد ا ص ٦٨)

غرضیکہ ان سنگین حالات میں بھی آپ دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے اور ایک لحہ کے لیے بھی اس سے غافل نہ ہوئے۔ اور جب تین سال کے بعد آپ شعب بنی ہاشم سے باہر نکلے پھر بھی آپ نے دین کی دعوت کا کام شروع رکھا۔ اب قریش مکہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس دعوت کے کام کو کیسے روکیں کیونکہ دعوت و تبلیغ کے جاری رہنے سے مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا جو قریش مکہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

......❀......

Marfat.com

طائف میں دعوت و تبلیغ

شعب بنی ہاشم سے واپس آنے کے تھوڑا عرصہ بعد ابو طالب کا انتقال ہو گیا اور اس کے چند روز بعد سیدہ خدیجہ سلام اللہ علیہا بھی اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو انتقال فرما گئیں۔ ابو طالب شیخ قبیلہ تھے اور سیدہ خدیجہؓ جان فدا و جان نثار زوجہ محترمہ۔ ان دونوں نے ہر آڑے وقت میں آپ کے لیے پناہ کا کام دیا۔ ان دونوں کی وفات سے آپ کی پناہ کی یہ دونوں دیواریں منہدم ہو گئیں۔ ان دونوں کی وفات نے آپ کے قلب میں غم و الم کے جذبات موجزن کر دیئے۔ اب قریش مکہ کے لیے راستہ صاف ہو گیا اور آپ کی قوم کی طرف سے مصائب کا ایک طومار بندھ گیا اور وہ کھل کر آپ پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے لگا۔ چنانچہ اس سال کا نام سیرت کی کتابوں میں عام الحزن یعنی غم کا سال ہے۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ابو طالب اور سیدہ خدیجہؓ کی وفات کے بعد قریش کی لابی کھل کر سامنے آ گئی اور انہوں نے دیکھا کہ اب آپ کی ظاہری پناہ کی دیواریں منہدم ہو گئی ہیں، لہٰذا انہوں نے بے پناہ مظالم اور اذیتیں شروع کر دیں۔ اور سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نازک حالت'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

''اب پیغمبر عرب کی حالت بہت نازک تھی۔ آپ یا تو مکہ میں غلبہ حاصل

کریں، یا اپنے دعاوی رسالت و نبوت کو ترک کر دیں، یا پھر اسی جدوجہد میں ہلاک ہو جائیں، یا تو اسلام بت پرستی کو تباہ کر دے یا پھر بت پرستی اسلام کو نیست و نابود کر دے۔ آپ کے پیروکار اگرچہ جان نثاری کے جذبہ کے تحت آپ کے ساتھ تھے اور ان میں سے چند ایک شہر میں با اثر بھی تھے، لیکن پھر بھی ایک کثیر لشکر کے مقابلہ میں مٹھی بھر تھے۔'' (لائف آف محمد جلد ۲ ص ۱۹۷)

اور ابن اثیر نے الکامل میں لکھا ہے:

''قریش ابو طالب کی وفات کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچانے میں اس حد تک پہنچ گئے کہ ابو طالب کی زندگی میں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کوئی بدبخت آپ کے سر پر مٹی ڈال دیتا اور کوئی آپ پر نماز میں اونٹ کی اوجھ ڈال دیتا۔'' (ابن اثیر جلد ۲ ص ۳۴)

اسی طرح حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ

''یہ تکالیف اور اس قسم کی دیگر ایذائیں ابو طالب کی وفات کے بعد ہونے لگیں۔'' (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۱۳۵)

ایسے مایوس کن حالات میں ایک ظاہر بین نگاہ یہی کچھ دیکھ سکتی ہے اور اسباب پرست اذہان یہی کچھ سوچ سکتے ہیں، لیکن اہل بصیرت اور اہل عقیدت کے نزدیک سفر طائف اور اس کے بعد کے واقعات میں آپ کی صداقت اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین واثق کا ثبوت ہے کیونکہ استقامت کا امتحان ایسے ہی حالات میں ہوتا ہے جب ظاہری اسباب کلی طور پر منقطع ہو جائیں تو خدا کے وعدوں کے خلاف دل میں ذرہ برابر ہلچل نہ ہو اور ایمان میں معمولی سا بھی تزلزل نہ آئے۔ ایسے ہی حوصلہ شکنی اور عزم صمیم کو پامال کرنے والے حالات و حوادث کے وقت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی استقامت آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔

نبی اور رسول کی کتاب زندگی کا ہر ورق امت کے لیے مشعل راہ ہوتا ہے اس

Marfat.com

لیے وہ اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ کرنے کے باوجود ظاہری ذرائع اور اسباب سے اپنا دامن نہیں جھٹکتا کیونکہ اگر اسباب کے سلسلہ کو یک قلم چھوڑ دیا جائے تو اس عالم اسباب کا تمام نظام ہی منتشر اور درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب ابو طالب کی رحلت کے بعد قریش کو موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اب تک نہ کر سکتے تھے، اس کو کر گزریں، تو آپ کو بھی ایسے ذریعہ کی تلاش ہوئی جو عرب کے قانون کے بموجب آپ کے لیے پناہ بن سکے، لیکن مٹھی بھر مسلمانوں یا آل ہاشم کے علاوہ بچہ بچہ آپ کا جانی دشمن تھا اور اگر کوئی ہمدرد بھی تھا تو کس کی ہمت تھی کہ قریش کے مقابلہ میں آپ کی ڈھال بن سکے، لہٰذا آپ نے اس مقصد کے لیے مکہ کے باہر نظر دوڑائی۔ چنانچہ شوال سنہ ۱۰ نبوت میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف جانے کا عزم فرمایا۔ طائف مکہ مکرمہ سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر مشرق کی طرف واقع ہے۔ پہاڑی علاقہ ہے جو نہایت سرسبز و شاداب ہے سیر ولیم میور نے یورپ کے متعدد سیاحوں کے اقوال طائف اور اس کے عام میووں اور پھلوں خصوصاً انگوروں اور گلاب کے پھولوں کی تعریف میں نقل کیے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ساٹھ میل کی مسافت آتے جاتے پیدل طے فرمائی تھی۔ آپ کے ساتھ آپ کے آزاد کردہ غلام سیدنا زید بن حارثہؓ تھے۔ راستہ میں جس قبیلے پر سے آپ کا گزر ہوتا، آپ اسے اسلام کی دعوت دیتے۔ آپ پہلے قبیلہ بنو بکر میں تشریف لے گئے لیکن انہوں نے آپ کو اپنے ہاں نہ ٹھیرنے دیا۔ وہاں سے آپ نے طائف کے شہر کا قصد فرمایا جو قبیلہ ثقیف کا مرز و بوم تھا۔ گو مکہ مکرمہ کی طرح طائف بھی آپ کے لیے بھڑوں کا چھتہ بنا ہوا تھا تاہم آپ تن بہ تقدیر یہاں تشریف لائے۔

آپؐ نے دس روز طائف میں قیام فرمایا (طبقات ابن سعد جلد ۱ ص ۱۴۲)

یہاں کے سردار بنو ثقیف کے تین بھائی عبدیالیل، مسعود اور حبیب تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ ان پر پڑی کہ اگر وہ پناہ میں لے لیں تو فریضۂ دعوت و تبلیغ کی

ادائیگی میں آسانی ہو۔ آپ نے عوام و خواص سبھی کو اسلام کی دعوت دی۔ رؤساء اور معززین کے مکانوں پر پہنچ کران سے گفتگو کی، لیکن آپ کی اس دعوت کا ان لوگوں نے بڑا بھونڈا جواب دیا، وہ یہ کہ اوباش اور آوارہ گردوں کو شہ دے دی اور آپ کو نہ صرف پتھر مارے گئے بلکہ گالیوں اور بدزبانیوں کے پتھر بھی مارے۔ سنگ باری سے آپ سخت زخمی ہو گئے لیکن اس زخمی حالت میں بھی آپ دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ اس زخمی حالت میں آپ نے عتبہ اور شیبہ پسران ربیعہ کے باغ میں ایک درخت کے سایہ میں پناہ لی۔ عتبہ اور شیبہ اس وقت باغ میں موجود تھے۔ یہاں جب آپ کو قدرے اطمینان اور آرام نصیب ہوا تو آپ نے وضو فرمایا اور قبلہ رو ہو کر اپنے معبود حقیقی اور مالک ارض و سماء کی بارگاہ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا فرمائی۔ اس دعا کے ایک ایک جملہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ طائف میں اس بدسلوکی سے دوچار ہونے کے بعد اور کسی ایک بھی شخص کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے آپ کس قدر دل فگار تھے اور آپ کے احساسات اور جذبات پر حزن و ملال اور رنج و غم کے کیسے گھنے اور دبیز بادل چھائے ہوئے تھے۔ اہل طائف کی وحشیانہ حرکتوں سے مجروح اور زخمی محمد صلی اللہ علیہ وسلم انگور کے چھدرے سایہ میں نڈھال بیٹھے ہیں۔ دل فگار اور درد سے لبریز۔ زخموں میں ٹیس اور چبھن، مگر پیشانی بارگاہ الوہیت میں سجدہ ریز اور زبان مبارک مصروف دعا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش میں نغمہ ریز۔ آپ بارگاہ الوہیت یوں عرض پرداز ہوئے:

''اے اللہ! میں اپنی عجز و بے بسی اور لوگوں کی نظروں میں اپنی بے قدری اور بے بضاعتی کا تجھ سے شکوہ سنج ہوں۔ اے سارے مہربانوں میں سب سے زیادہ مہربان ذات! اے کمزوروں اور ناتوانوں کے مربی! تو ہی میرا بھی رب ہے، تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ یا کسی بیگانے کے سپرد کرے گا جو میرے ساتھ نفرت اور تندی سے پیش آئے؟ کیا کسی دشمن کے جس کو تو نے میرے معاملے کا مالک بنا دیا ہے؟ اگر تو مجھ سے ناخوش نہیں ہے تو مجھے ان

مصائب کی کوئی پروا نہیں۔ تیری عافیت اور بخشش میرے لیے بہت وسیع ہے۔ میری سمائی تیری عافیت کی گود ہی میں ہے، تیرے چہرے کا وہ نور جس سے اندھیریاں روشنی بن جاتی ہیں، جس کے ادنیٰ جلوے سے دنیا اور آخرت کے بگڑے ہوئے کام سنور جاتے ہیں، میں اسی نور کی پناہ لیتا ہوں، میں پناہ مانگتا ہوں اس چیز سے کہ مجھ پر تیرا غضب اور عتاب نازل ہو، تجھ ہی کو منانا ہے اور اس وقت تک منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہو جائے۔ اے اللہ! مجھ میں نہ طاقت ہے اور نہ زور۔ جو کچھ طاقت ہے وہ تیرا ہی صدقہ ہے، جو کچھ قوت ہے وہ تیری ہی عطا ہے، میری کوئی تدبیر کارگر نہیں، کارساز تو ہی ہے، بگڑی کو بنانے والا تو ہی ہے۔''

ادھر یہ دردمندانہ دعا ہو رہی تھی ادھر باغ کے مالکان عتبہ اور شیبہ پسران ربیعہ جو اس وقت باغ میں موجود تھے، انہیں غیرت آئی کہ ان کے شہر کے ایک شخص کے ساتھ طائف والوں نے یہ بدسلوکی کی ہے۔ انہوں نے انگوروں کے چند خوشے پلیٹ میں رکھ کر غلام کو دیئے کہ وہ ان مظلوم مہمانوں کے پاس لے جائے۔ غلام کا نام عداس تھا جو مذہباً عیسائی تھا۔ عداس نے اپنے مالکان کے حکم کی فوری تعمیل کی۔ عداس انگور کے خوشوں سے بھری ہوئی پلیٹ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا۔ جب آپ نے انگوروں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو زبان سے کہا: بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ آپ کے منہ سے یہ کلمات سن کر عداس چونکا۔ یہ بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی دراصل ایک دعوت دین تھی جس نے عداس کو چونکا دیا۔ اس نے کہا: یہ جملہ تو اس شہر کے لوگ نہیں بولتے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور تمہارا دین کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: ''میں عیسائی ہوں اور نینویٰ کا رہنے والا ہوں۔'' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اچھا تو تم مرد صالح یونس بن متی کے شہر کے رہنے والے ہو؟'' عداس نے پھر پوچھا: ''آپ یونس بن متی کو کیسے جانتے ہیں؟'' حضورؐ نے فرمایا: ''وہ میرے بھائی

Marfat.com

تھے، میرے اور ان کے درمیان نبوت کا رشتہ ہے۔ وہ بھی اللہ کے نبی تھے اور میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔" عداس یہ سن کر تڑپ اٹھا اور فوراً جھک کر آپؐ کے سر اور ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیا۔" اس کے مالکان دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ آپس میں کہنے لگے: "لواب اس شخص نے ہمارے غلام کو بگاڑ دیا۔" عداس جب واپس آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا: یہ کیا معاملہ تھا؟ عداس نے جواب دیا: "آقا! اس وقت روئے زمین پر اس شخص سے بہتر اور کوئی شخص نہیں ہے؟ یہ اللہ کا نبی ہے۔ اس نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جسے نبی کے سوا اور کوئی نہیں بتا سکتا۔"

(دلائل النبوۃ بیہقی جلد ۱ص ۳۸۹، دلائل النبوۃ لابی نعیم جلد ۱ ص ۱۰۳، الدرر فی اختصار المغازی والسیر ص ۶۵)

ان دونوں نے عداس کو ڈانٹا اور کہا کہ کہیں یہ شخص تمہیں تمہارے دین سے منحرف نہ کر دے کیونکہ تمہارا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۱۲۶)

دعوتی جدوجہد میں دوبارہ مصروفیت:

طائف سے واپسی پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر سے دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا اور عرب کے مختلف قبائل میں جا کر آپ نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دی، لیکن افسوس کہ ان قبائل نے آپ کی دعوت کا کوئی مثبت جواب نہ دیا۔ قبائل سے مثبت جواب نہ پا کر اب آپ نے تجارتی منڈیوں میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے نہ صرف قبائل اور وفود پر اسلام اور اپنی نبوت کو پیش کیا بلکہ افراد اور اشخاص کو بھی اسلام اور توحید کی دعوت دی۔ ان میں بعض نے آپ کی دعوت کو قبول کیا اور بعض نے انکار بھی کیا۔ جب آپ عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے میلوں میں قدم رنجہ فرماتے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دیتے تو آپ کا بدنصیب چچا ابولہب عام طور پر ساتھ جاتا اور جب آپ انہیں اسلام کی دعوت دیتے تو یہ کم بخت برابر سے یہ کہتا رہتا کہ یہ شخص صابی ہے، دین سے پھر گیا ہے، یا معاذ اللہ اس کا دماغ چل گیا

Marfat.com

ہے۔ اسی طرح ابوجہل نے بھی مخالفت اور مزاحمت کا وہی رنگ اختیار کر رکھا تھا جو ابولہب کا تھا کیونکہ یہ دونوں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن تھے۔ چنانچہ ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سید موجودات صلی اللہ علیہ وسلم ذوالمجاز کے میلے میں گئے۔ میں ابھی تک شرف ایمان سے مشرف نہیں ہوا تھا۔ آپ نے ایک مجمع میں کھڑے ہو کر تقریر شروع کی جس میں لوگوں سے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ذات قابل پرستش نہیں۔ اسی کی عبادت کرو اور بتوں کی پرستش سے باز آجاؤ۔" جب تک آپؐ وعظ فرماتے رہے ابوجہل خاک اٹھا اٹھا کر آپ پر پھینکتا رہا اور یہ کہتا رہا کہ اس شخص کے چکر میں نہ آنا۔ یہ تو تمہیں تمہارے معبودوں لات وعزیٰ کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے۔

ان ساری مزاحمتوں اور مخالفتوں کے باوجود آپ نے نہ صرف وفود اور قبائل میں اسلام کی توحید اور اپنی نبوت کی دعوت دی بلکہ مختلف افراد کو بھی اللہ کے دین کی دعوت دی اور کئی سعید روحیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اسلام کے گرویدہ ہو گئیں جن میں رکانہ، ایاس بن معاذ اور سوید بن صامت وغیرہ نہایت قابل ذکر ہیں۔

اہل مدینہ کو دعوت اسلام:

مدینہ میں دو قبیلے آباد تھے۔ ایک اوس اور دوسرا خزرج۔ یہ دونوں ہم نسب تھے اور آپس میں ان کی رشتہ داری ہونے کے باوجود جاہلیت کی وجہ سے یہ خود بھی لڑتے رہے اور یہودی قبائل ان کو لڑاتے بھی رہے کیونکہ ان کی آپس کی جنگ میں ہی وہ اپنی بھلائی سمجھتے تھے اور ان کے اتفاق و اتحاد کو اپنے لیے موت کا پیام تصور کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قبیلہ خزرج کے سردار سیدنا سعد بن عبادہؓ تھے اور اوس کے سردار سیدنا سعد بن معاذؓ تھے۔

سنہ ۱۱ نبوی کے حج کے زمانہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستور اور معمول کے مطابق سیدنا ابوبکرؓ کی معیت میں قبائل عرب سے ملاقات کے لیے اور انہیں دین کی دعوت دینے کے لیے منیٰ کی طرف نکلے اور پھرتے پھراتے قبیلہ خزرج کے ایک

Marfat.com

گروہ کے پاس پہنچے۔ اسی رات آپ بنو ذہل اور بنو شیبان بن ثعلبہ کے ڈیروں پر بھی گئے اور اسلام کے بارہ میں ان سے بات چیت کی لیکن انہوں نے کوئی امید افزا جواب نہ دیا۔ ان سے امید افزا جواب نہ پا کر آپ منیٰ کی گھاٹی کی طرف سے گذرے تو خزرج کے اس گروہ سے آپ کی ملاقات ہو گئی۔

آپؐ نے ان سے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' انہوں نے کہا: ''ہم خزرج کے چند افراد ہیں۔'' آپ نے انہیں دین اسلام کی دعوت دی اور انہیں قرآن سنایا۔ آپ کی دعوت اور قرآن کی تلاوت نے ان کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا اور انہوں نے آپس میں کہا: ''دیکھو بھئی! یہ وہی نبی ہے جس کی آمد کے ڈراوے یہودی ہمیں دیا کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہم سے سبقت لے جائیں۔'' چنانچہ نہایت اطمینان سے انہوں نے آپ کی دعوت قبول کی۔ آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور اسلام کو قبول کر لیا۔ اس طرح اسلامی دعوت کو چند کار آمد بیج دستیاب ہو گئے جو دیکھتے ہی دیکھتے سرو قامت درختوں میں تبدیل ہو گئے اور ان کی پرفضا گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر مسلمانوں نے برسوں جور و ستم کی تپش سے راحت پائی۔

ان افراد نے قبول اسلام کے بعد عرض کیا کہ ہم نے اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑا ہے کہ اس سے زیادہ کسی اور قوم میں باہمی عداوت نہیں پائی جاتی۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کی وجہ سے ان کو جمع کر دے۔ ہم واپس جاتے ہیں اور آپ کے دین کی جس کو ہم نے قبول کیا ہے، انہیں بھی دعوت دیتے ہیں۔ اگر اللہ نے ان کو آپ پر اکٹھا کر دیا تو کوئی شخص آپ سے زیادہ طاقتور نہ ہو گا۔ اب ہم آئندہ سال حج کے موقع پر آپ سے ملیں گے۔ محمد بن اسحاق اور زہری کا بیان ہے کہ یہ چھ آدمی تھے۔

(۱) رافع بن مالکؓ (۲) ابو اسامہ اسعد بن زرارہؓ (۳) عوف بن حارث بن رفاعہؓ
(۴) قطبہ بن عامر بن حدیدہؓ (۵) عقبہ بن عامرؓ (۶) جابر بن عبداللہ بن ربابؓ

حافظ ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے کہ بعض حضرات نے جابر بن عبداللہؓ کے بجائے عبادہ بن صامتؓ کا نام لکھا ہے۔

Marfat.com

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۴۲۸-۴۳۰، عیون الاثر جلد ۱ ص، زرقانی جلد ۱ ص ۳۱۰، البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۱۴۸، فتح الباری جلد ۷ ص ۱۷۱، زاد المعاد جلد ۲ ص ۵۰)

ابن سعدؒ نے طبقات میں لکھا ہے کہ سیدنا اسعد بن زرارہؓ اور ذکوان بن عبدالقیسؓ مدینہ کے عمائدین میں سے تھے۔ یہ دونوں عتبہ بن ربیعہ رئیس مکہ کے پاس مدد حاصل کرنے کے لیے پہنچے۔ عتبہ نے مدد سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم خود ایک عجیب پریشانی میں مبتلا ہیں کیونکہ ہمارے ہاں ایک شخص پیدا ہو گیا ہے۔ یہ ہمارے دیوی دیوتاؤں کی مذمت کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ اس نے ہمارے مذہبی اور معاشرتی نظاموں کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے اس کی اس پریشانی نے ہماری راتوں کو نیند اور صبح کا سکون چھین رکھا ہے، لہٰذا ہم آپ کی مدد سے اپنے کو معذور سمجھتے ہیں۔

عتبہ کی ان باتوں نے ان دونوں کے لیے تجسس پیدا کر دیا کہ اس ہستی سے ضرور ملاقات کرنی چاہیے جس نے ان کو پریشان کر دیا ہے۔ اگرچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملنے پر پکٹنگ لگی ہوئی تھی لیکن یہ حضرات آپ سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آپ نے انہیں قرآن حکیم سنایا، دین اسلام کی دعوت دی، توحید خداوندی سے آشنا کیا، دیوی دیوتاؤں کی حقیقت واضح کی، دل صاف تھا اور طبیعت میں کوئی تعصب نہ تھا اس وجہ سے جلد ہی اسلام دل کی گہرائیوں میں اتر گیا اور فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

اسعدؓ بن زرارہ نے مدینہ پہنچتے ہی اس کا تذکرہ اپنے دوست ابوالہیثم بن التیہان سے کیا اور بتایا کہ میں حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا ہوں۔ وہ بھی مسلمان ہو گئے۔ دو بزرگ اور تھے۔ ایک رافع بن مالک ازرقی اور دوسرے معاذ بن عفراء۔ یہ حج یا عمرہ کے لیے مکہ آئے۔ اتفاقاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہو گئی اور تبادلہ خیالات کا موقع مل گیا۔ یہ دونوں بھی آپ کی دعوت سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ (طبقات جلد ۱ ص ۱۴۶)

Marfat.com

مدینہ میں اسلام کا پھیلاؤ

عقبہ کے مقام پر اسلام قبول کر کے یہ چھ سعادت مند حضرات مدینہ واپس پہنچے تو انہوں نے ہر محلہ اور ہر مجلس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی دعوت اور مشن کا تذکرہ شروع کر دیا۔ پھر حسب وعدہ آگلے سال سنہ ۱۲ نبوی میں حج کے موقع پر ۱۲ آدمی عقبہ کے مقام پر آپ سے ملے جہاں گذشتہ سال خزرج کے لوگوں کی ملاقات ہو گئی تھی۔ ان بارہ آدمیوں میں سے پانچ تو وہی تھے جو گذشتہ سال مسلمان ہوئے باقی سات آدمیوں میں پانچ خزرج اور دو قبیلہ اوس کے تھے۔ ان بارہ حضرات سے مقام عقبہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب ذیل بیعت لی:

''ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں گے اور نہ چوری کریں گے، نہ زنا کریں گے، اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے، کسی پر جھوٹا الزام نہ لگائیں گے، اور یہ کہ نیکی کے کسی کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہ کریں گے، اور آپ کا فرمان سنیں گے اور مانیں گے خواہ وہ حکم ہمیں گوارا ہو یا ناگوار ہو، اور خواہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے۔ ہم حکومت کے معاملہ میں اہل حکومت سے نزاع نہ کریں گے، ہم ہر حال میں اور جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔''

جب یہ بارہ افراد واپس مدینہ جانے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

سیدنا مصعب بن عمیرؓ اور سیدنا عبداللہ بن ام مکتومؓ کو تعلیم القرآن کے لیے ان کے ساتھ بھیجا تا کہ انہیں اسلام اور اس کی تعلیمات سے روشناس کرائیں۔ چنانچہ مدینہ منورہ جا کر سیدنا مصعب بن عمیرؓ سیدنا اسعد بن زرارہؓ کے ہاں ٹھہر گئے اور انصار کے لوگوں کو ساتھ لے کر بڑی تیزی سے اسلام پھیلانا شروع کیا۔ بنی عبدالاشہل میں سے عباد بن بشرؓ اور ان کے حلفاء میں سے سیدنا محمد بن مسلمہؓ نے سیدنا مصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد بنی عبدالاشہل کے سردار سیدنا سعد بن عبادہؓ اور سیدنا اسید بن حضیرؓ ایک ہی روز ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ ان کے حلقہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان کا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا حتیٰ کہ بنی عبدالاشہل کے محلہ میں ایک بھی غیر مسلم نہ رہا۔

اس سے آپ اسلام کی دعوتی قوت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بنی عبدالاشہل کا پورا قبیلہ چند ہی روز میں مسلمان ہو گیا۔ اور قبیلہ کے سردار سیدنا سعد بن معاذؓ اور سیدنا اسید بن حضیرؓ کے مسلمان ہونے کا دلچسپ واقعہ بھی اسلام کی دعوتی قوت کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک روز سیدنا اسعد بن زرارہؓ اور سیدنا مصعب بن عمیرؓ کے ہمراہ قبیلہ بنی ظفر کے ایک باغ میں گئے۔ وہاں وہ حضرات اکٹھے ہو گئے جو حلقہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ اس اجتماع کی اطلاع جب سیدنا سعد بن معاذؓ اور سیدنا اسید بن حضیرؓ کو ملی تو سعدؓ نے اسیدؓ سے کہا: ذرا ان دونوں آدمیوں کے پاس جاؤ جو ہماری بستیوں میں آ کر ہمارے کمزور لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ انہیں ہمارے علاقے میں آنے سے بالکل روک دو۔ اگر اسعد بن زرارہؓ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں خود جاتا، لیکن تمہیں پتہ ہے کہ وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے اور میں اس کے منہ لگنا نہیں چاہتا۔ اسیدؓ یہ سن کر اپنا حربہ لیے ہوئے وہاں پہنچے۔ اسعدؓ نے انہیں آتے دیکھ کر مصعب بن عمیرؓ سے کہا: ''یہ اپنی قوم کا رئیس آ رہا ہے، اس کو نہایت اچھے طریقے سے اللہ تعالیٰ کی بات پہنچانے کا حق ادا کر دو۔'' سیدنا مصعبؓ نے کہا ''اگر یہ آ کر بیٹھ گئے تو پھر میں بات کروں گا۔'' سیدنا اسیدؓ ان کے سامنے آ کر بڑے درشت انداز میں کھڑے ہو گئے اور کہا: ''تم یہاں کس لیے

آئے ہو؟ تم ہمارے کمزور لوگوں کو بے وقوف بناتے ہو۔ اگر جان کی خیر چاہتے ہو تو ادھر کا پھر رخ نہ کرنا۔" سیدنا مصعبؓ نے فرمایا: "آپ ذرا چند لمحے بیٹھ کر ہماری بات کو سنیں، اگر پسند آئے تو قبول کر لیجئے ورنہ رد کر دیں۔" اسیدؓ نے کہا: "بات تو آپ کی درست ہے۔" اور اپنا نیزہ زمین میں گاڑ کر ان کے پاس آ بیٹھے۔ سیدنا مصعب بن عمیرؓ نے ان کو اسلام کی تعلیمات بتائیں اور قرآن حکیم کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔

سیدنا اسعد بن زرارہؓ اور سیدنا مصعبؓ دونوں کا بیان ہے کہ خدا کی قسم! اسیدؓ کے چہرے کی بشاشت اور ان کے انداز کلام کی نرمی دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ اسلام ان کے قلب کی اتھاہ گہرائیوں میں براجمان ہو رہا ہے۔ جب انہوں نے اپنی بات ختم کی تو اسید بن حضیرؓ نے کہا:

مااحسن هذا الکلام واجمله — یہ کیا عمدہ اور حسین کلام ہے۔

انہوں نے پوچھا: تم لوگ جب اس دین میں داخل ہوتے ہو تو کیا کرتے ہو؟

انہوں نے جواب دیا: "غسل کرتے ہیں، یہ سن کر وہ اسی وقت اٹھے، پاک صاف ہو کر آئے، کلمہ شہادت پڑھا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر فرمانے لگے، میرے پیچھے ایک آدمی ہے، وہ اگر تمہاری پیروی اختیار کرے تو اس کی قوم میں سے ایک آدمی بھی اس کے خلاف نہ چلے گا۔ میں جا کر ابھی اس کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔" یہ کہہ کر سیدنا اسید بن حضیرؓ اپنا نیزہ لے کر سیدنا سعد بن معاذؓ کی طرف چلے جن کے پاس ان کے قبائل کے لوگ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سعدؓ نے ان کو آتے دیکھ کر کہا: "میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ یہ وہ چہرہ نہیں ہے جسے لیے ہوئے اسید گئے تھے۔ (احلف بالله لقد جاء کم اسید بغیر الوجه الذی ذهب به من عند کم)

(ابن ہشام جلد ا ص ۴۳۵-۴۳۶، عیون الاثر جلد ا ص ۲۶۸-۲۶۹)

سیدنا اسید بن حضیرؓ جب مجلس کے سامنے کھڑے ہوئے تو سعدؓ نے پوچھا: "کیا کر کے آئے؟" انہوں نے کہا: "میں نے دونوں آدمیوں سے بات کی، مجھے ان میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔" میں نے انہیں روکا تو انہوں نے جواب دیا جو کچھ آپ

Marfat.com

چاہتے ہیں ہم وہی کریں گے۔ پھر سیدنا زرارہؓ نے کہا: ''میں نے سنا ہے کہ بنی حارثہ اسعد بن زرارہؓ کو قتل کرنے کے لیے نکلے ہیں۔ اس لیے وہ جانتے ہیں کہ اسعدؓ تمہارا خلیرا بھائی ہے اور وہ تمہاری تذلیل کرنا چاہتے ہیں۔'' یہ سننا تھا کہ سعدؓ نہایت غصے میں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنا نیزہ لے کر تیزی سے چلے تاکہ بنی حارثہ کا حملہ ہونے سے پہلے اپنے بھائی تک جا پہنچے۔ جاتے ہوئے انہوں نے اسیدؓ سے کہا: ''بخدا! میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے بھیجنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔'' سیدنا اسعدؓ نے ان کو دور سے آتے دیکھ کر سیدنا مصعبؓ سے کہا: ''یہ ایسا سردار ہے جس کے پیچھے اس کی ساری قوم ہے۔ یہ مسلمان ہو گیا تو قوم کا ہر آدمی اسلام قبول کر لے گا۔'' وہاں پہنچ کر جب سعدؓ نے دیکھا: اسعدؓ اور مصعبؓ دونوں اطمینان سے بیٹھے ہیں تو سمجھ گئے کہ اسیدؓ کا مقصد دراصل مجھے ان کی بات منوانا تھا۔ وہ نہایت غضب ناک انداز میں آ کر کھڑے ہوئے اور اسعد بن زرارہؓ سے کہا: ''ابوامامہ! اللہ کی قسم! اگر میرے اور تمہارے درمیان قرابت کا رشتہ نہ ہوتا تو یہ شخص (مصعبؓ) مجھ سے نہ بچ سکتا تھا۔ کیا تو ہمارے گھر میں ہم پر اس چیز کو مسلط کرنا چاہتا ہے جو ہمیں پسند نہیں ہے؟'' سیدنا مصعب بن عمیرؓ نے کہا: ''کیا آپ بیٹھ کر ہماری بات نہ سنیں گے؟ اگر وہ پسند آئے تو قبول فرما لیں نہ پسند آئے تو رد کر دیں۔'' سعدؓ نے کہا: ''یہ تو درست بات ہے۔'' پھر وہ اپنا نیزہ زمین میں گاڑ کر بیٹھ گئے۔ سیدنا مصعبؓ نے ان کے سامنے اسلام اور اس کی تعلیمات کو پیش کیا اور قرآن حکیم پڑھ کر سنایا۔ سیدنا اسعدؓ اور سیدنا مصعبؓ کا بیان ہے کہ ہم ان کو بولنے سے پہلے ہی ان کے چہرے کی تروتازگی اور بشاشت سے سمجھ گئے کہ اسلام ان کے دل پر دستک دے رہا ہے اور ان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچ گیا ہے۔ سعدؓ نے ساری بات سننے کے بعد کہا کہ اس دین میں داخل ہونے کے لیے تم لوگ کیا کرتے ہو؟'' انہوں نے وہی بات کہی جو سیدنا اسید بن حضیرؓ سے کہی تھی۔ چنانچہ وہ بھی حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے اور اپنا نیزہ لیے ہوئے اپنے قبیلہ میں چلے گئے۔

Marfat.com

سیدنا سعدؓ جب لوگوں کے سامنے پہنچے تو قبیلہ کے لوگوں نے ان کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا کہ ان کے دل کی دنیا میں انقلاب آ چکا ہے۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا: ''اے بنی عبدالاشہل! تم میرے متعلق کیا کہتے ہو؟'' پورے قبیلہ نے جواب دیا: ''آپ ہمارے سردار ہیں۔ ہم میں سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والے اور سب سے زیادہ صائب الرائے ہیں۔'' سیدنا سعدؓ نے یہ جواب سن کر کہا: ''تمہارے مردوں اور تمہاری عورتوں سے بات کرنا مجھ پر حرام ہے جب تک کہ تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہ لاؤ۔'' چنانچہ شام ہونے سے پہلے پہلے قبیلہ کے سب مرد اور عورتیں مسلمان ہو گئے، صرف ایک شخص الاصیرم عمرو بن ثابت رہ گئے، لیکن وہ بھی عین غزوہ احد کے موقع پر حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے اور ایک سجدے کی نوبت آنے سے قبل ہی شہید ہو گئے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ جنتی ہے۔ بنی عبدالاشہل میں ایک بھی منافق نہیں تھا۔

اسلام نے سیدنا سعد بن معاذؓ اور سیدنا اسید بن حضیرؓ کے دلوں کی دنیا ایسی تبدیل کی کہ بتوں کی پوجا کرنے والے ان دونوں حضرات کو لوگوں نے دیکھا کہ بنی عبدالاشہل کے بت توڑتے پھرتے تھے۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۴۳۶، عیون الاثر جلد ۱ ص ۲۶۹، البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۱۵۲، زاد المعاد جلد ۲ ص ۵۱)

سیدنا مصعب بن عمیرؓ سیدنا اسعد بن زرارہؓ ہی کے گھر میں مقیم رہے اور وہیں سے اسلام کی دعوت دیتے رہے یہاں تک کہ انصار کے ہر گھر میں چند مرد اور عورتیں مسلمان ہو گئیں۔ صرف بنی امیہ بن زید اور خطمہ اور وائل کے مکانات باقی رہ گئے۔ مشہور شاعر قیس بن اسلت انہی کا آدمی تھا اور یہ لوگ اسی کی بات مانتے تھے۔ اس شاعر نے انہیں جنگ احزاب تک قبول اسلام سے روکے رکھا۔''

سیدنا جابر بن عبداللہ انصاریؓ فرماتے ہیں کہ وہ مکہ میں آپ کی دعوت اور لوگوں کے انکار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آخرکار اللہ تعالیٰ نے ہمیں یثرب سے آپ کی

Marfat.com

خدمت میں بھیج دیا اور ہم نے آپ کے دعویٔ نبوت کی تصدیق کی اور حال یہ ہو گیا کہ ایک آدمی گھر سے نکلتا، ایمان لاتا، قرآن پڑھتا اور پلٹ کر جب گھر جاتا تو اس کے گھر والے بھی مسلمان ہو جاتے اور اس طرح انصار کے محلوں میں سے کوئی ایسا محلہ نہ رہا جس میں مسلمانوں کا ایک گروہ نہ پایا جاتا ہو اور علی الاعلان اپنے اسلام کا اظہار نہ کرتا ہو۔

اسلام کی اس دعوت کو مدینہ کے ان لوگوں نے قبول کیا جنہوں نے دکھائی دینے والے خداؤں کے ہجوم میں دکھائی نہ دینے والے خدا کو پایا اور اس کو اپنا سب کچھ بنا لیا۔ عظمت کے میناروں کے درمیان انہوں نے خدائے بزرگ و برتر کے پیغمبر کو پہچانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ ایک اجنبی دین (غریب دین) اپنی ساری بے سروسامانی کے باوجود ان کی نظر میں اس قدر محبوب ہو گیا کہ اس کی خاطر کوئی بھی قربانی کرنا ان کے لیے مشکل نہ رہا۔ غرضیکہ انہوں نے ایک ایسی سچائی کو پا لیا جو ابھی مجرد روپ میں تھی۔ جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں۔ جس سچائی کے لیے اپنا سب کچھ دے دینا تھا لیکن دنیا میں اس کے بدلے کچھ بھی نہ پانا تھا کیونکہ نبیوں اور رسولوں کو ہر دور میں ایک ہی سب سے بڑی رکاوٹ پیش آئی ہے، وہ یہ کہ ان کی مخاطب قوموں کے پاس جو دین ہوتا تھا اس کے ساتھ مادی رونقیں اور در و دیوار کی عظمتیں شامل ہوتی تھیں۔ دوسری طرف وقت کا پیغمبر اور رسول دلیل مجرد کی سطح پر کھڑا ہوتا تھا۔ یہ لوگ جو اسلام کی دعوت کو قبول کر رہے تھے انہوں نے اپنے خلوص اور پیغمبر کی نگاہ حقیقت شناس سے اپنے آپ کو اس مقام پر فائز کر لیا تھا اور اپنے اندر یہ انوکھی صفت پیدا کر لی تھی کہ وہ حق کو دلیل مجرد کی سطح پر پا سکیں اور اپنے آپ کو ایک ایسے حق کے حوالے کر دیں جس نے ابھی ظواہر کا روپ اختیار نہیں کیا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے اس بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک ایسے حق کے لیے اپنا سب کچھ سونپ دیا جس سے بظاہر دنیا میں کچھ بھی ملنے والا نہیں تھا۔

دو سال میں مدینہ طیبہ میں اسلام کی دعوتی قوت سے اتنے لوگ دائرہ اسلام میں

Marfat.com

داخل ہو گئے جب کہ مکہ میں ۱۳ سال کے طویل عرصہ میں چند لوگ مسلمان ہوئے۔ مدینہ منورہ میں اسلام کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ یہ ہوئی کہ پہلے ہی مرحلہ میں وہاں کے ممتاز اور اشراف لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ (اسلم اشرافھم) چونکہ یہ قبائلی دور تھا اور قبائل میں یہ رواج تھا کہ سردار قبیلہ کا جو مذہب ہوتا تھا وہی پورے قبیلے کا مذہب ہوتا تھا۔ اس لیے مدینہ میں بہت تیزی سے اسلام پھیلنے لگا حتیٰ کہ کوئی گھر نہ بچا جس میں اسلام داخل نہ ہو گیا۔

Marfat.com

معاہدہ حدیبیہ اور دعوت و تبلیغ

سنہ ٦ ہجری میں کفار مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین حدیبیہ کے مقام پر ایک معاہدہ ہوا جس کو معاہدہ حدیبیہ کہتے ہیں۔ آپ مدینہ منورہ سے آئے تو عمرہ کے لیے تھے لیکن قریش نے آپ کو عمرہ کرنے سے روکا۔ آپؐ نے قریش کی اس حماقت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا

''قریش پر افسوس، وہ جنگوں میں تباہ ہو گئے مگر پھر بھی عقل ٹھکانے نہیں آئی۔ اگر آج وہ مسلمانوں اور تمام عرب زائرین کو طواف اور زیارت کعبہ سے نہ روکتے تو ان کا کیا بگڑتا۔''

لیکن وہاں تو ایک ضد تھی، ایک عناد تھا، تعصب تھا کہ مسلمانوں کو عمرہ نہیں کرنے دینا۔ چنانچہ بات آپس کی گفت و شنید پر پہنچ گئی جس کے نتیجہ میں معاہدہ حدیبیہ ہوا۔ یہ معاہدہ بظاہر اپنے متن کے لحاظ سے مسلمانوں کے خلاف تھا جس کی وجہ سے مسلمان اور خصوصی طور پر سیدنا عمرؓ سخت پریشان ہوئے کہ اہل مکہ سے دب کر یہ معاہدہ کیوں کیا جا رہا ہے، لیکن اس معاہدے کے اثرات اور نتائج نہایت خوشگوار ثابت ہوئے۔ بظاہر یہ معاہدہ دشمن کے سامنے جھک جانا تھا جیسا کہ صحابہ کرامؓ نے سمجھا اور اسی وجہ سے وہ شکستہ خاطر اور مغموم تھے لیکن فراست نبوی جو کچھ سمجھ رہی تھی اور رسالت کی دور رس نگاہیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں وہ سوائے ابوبکر صدیقؓ مزاج شناس نبوت کے اور

Marfat.com

کوئی نہیں سمجھ رہا تھا۔ اسی وجہ سے سیدنا عمرؓ کو انہوں نے وہی جواب دیا تھا جو خود نبوت نے دیا۔ اس سے مقام صدیقیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

یہ معاہدہ دراصل اپنے آپ کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لیے وقفہ حاصل کرنا تھا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے تمام مطالبات تسلیم کر کے ان سے صرف ایک یقین دہانی لے لی تھی وہ یہ کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان دس سال تک کوئی لڑائی نہ ہوگی۔ اب تک یہ تھا کہ مسلسل حالت جنگ کی وجہ سے دعوت و تبلیغ کا کام عرب اور اطراف عرب میں رکا ہوا تھا۔ جونہی آپ حدیبیہ سے لوٹے فوراً دعوت و تبلیغ کا کام عرب اور اطراف عرب مین تیزی سے شروع کر دیا۔ ابتدائی زمین پہلے ہی سے تیار ہو چکی تھی اب صرف تخم ریزی کی ضرورت تھی۔ پرامن حالات نے جو موقع دیا اس میں دعوت کا کام نہایت تیزی سے پھیلنے لگا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسلام کے حلقہ میں آنے شروع ہو گئے۔ عرب قبائل ایک کے بعد ایک اسلام میں داخل ہونے لگے۔ عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں اسلام کی دعوت پھیلائی جانے لگی۔ کفار مکہ کی طرف سے مامون ہو کر آپ نے مختلف ملکوں کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو خطوط کے ذریعہ اسلام کی دعوت دی۔ خیبر کے یہودیوں کے خلاف کارروائی کی اور ان کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن حکیم نے بھی یہ واضح کیا ہے کہ ''عصمة من الناس '' کا راز دعوت میں چھپا ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک، وان لم تفعل فمابلغت رسالتک، واللہ یعصمک من الناس۔

اے رسول! جو کچھ بھی آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اپنا حق رسالت ادا نہ کیا اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ و مصئون رکھے گا۔

اسلام کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ جب اہل ایمان کے لیے دوسروں سے عدم تحفظ

Marfat.com

کا خطرہ ہو یا مغلوبیت کا سوال پیدا ہو تو ان کو دعوت الیٰ اللہ کے کام کی طرف دوڑنا چاہیے۔ اس کام میں لگنے سے خدا کا قانون ان کے حق میں متحرک ہوگا اور وہ غیر معمولی اسباب پیدا ہوں گے جو بالآخران کے لیے نجات اور کامیابی کا زینہ بن جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ممکن قیمت دے کر جنگ و جدال کا ماحول ختم کیا اور پرامن حالات میں دعوتی عمل جاری کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال کی قلیل مدت میں مسلمانوں کی تعداد چار گنا سے بھی زیادہ ہوگئی۔ دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ داخلی استحکام اور تیاری کا کام بہت بڑے پیمانے پر ہونے لگا، اور صرف دو سال بعد اسلام اتنا طاقتور ہو گیا کہ قریش نے لڑے بھڑے بغیر ہتھیار ڈال دیئے۔ جس مکہ سے توہین آمیز پالیسی پر اپنے کو راضی کرلیا گیا تھا اسی مکہ میں اس واپسی سے فاتحانہ داخلہ کا راستہ نکل آیا۔

اس معاہدہ کی وجہ سے فریقین کی آمدورفت شروع ہوگئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات اور ربط کی وجہ سے مشرکین مدینہ میں آتے اور کئی کئی روز تک قیام کرتے، مسلمانوں سے ملتے جلتے اور مسلمانوں کے اخلاق، اخلاص، دیانت، نیکوکاری اور دعوتی کلمات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے اور اس وجہ سے ان کے دل اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے۔ چنانچہ اس عرصہ میں صنادید قریش اسلام میں داخل ہوئے جو اس سے قبل لڑائیوں سے داخل نہ ہو سکے تھے۔

مختصر یہ کہ اس صلح نے مشرکین مکہ اور دوسرے قبائل پر گہرے اثرات چھوڑے اور وہ نہایت تیزی کے ساتھ اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ اس وجہ سے معاہدہ حدیبیہ کا واقعہ ایک فتح مبین تھی۔

اس صلح کی ایک دفعہ جو مسلمانوں پر بہت شاق گزری تھی کہ قریش کا جو آدمی بھاگ کر مسلمانوں کے پاس آئے گا، مسلمان اسے واپس کر دیں گے، لیکن مسلمانوں میں سے جو شخص پناہ کی غرض سے بھاگ کر قریش کے پاس آئے گا قریش اسے واپس نہ کریں گے۔ یہ شق بھی مسلمانوں کے لیے نقصان دہ نہ ہوئی بلکہ بہت مفید ثابت ہوئی

Marfat.com

کیونکہ کوئی مسلمان مدینہ منورہ سے مسلمان رہتے ہوئے بھاگ نہیں سکتا تھا کیونکہ مدینہ تو ان کا مرکز ایمان تھا اور مومن ہوتے ہوئے کوئی شخص اپنے مرکز ایمان سے بھاگنے کی کبھی سوچ کا بھی نہیں، وہ صرف مرتد ہو کر بھاگے گا۔ اور اگر وہ مرتد ہو جائے تو مسلمان معاشرہ کو اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

انه من ذهب منا اليهم فابعده الله (مسلم جلد۲ ص ۱۰۵)

بے شک جو ہمیں چھوڑ کر مشرکین کی طرف بھاگا اللہ نے اسے دور کر دیا یعنی تباہ و برباد کر دیا۔

اور جو لوگ مسلمان ہوتے وقت مکہ میں کفار کی ایذائیں سہہ رہے تھے جیسے ابو جندل وغیرہ تو اگرچہ ان کے لیے اس معاہدہ کی رو سے مدینہ میں پناہ گزین ہونے کی کوئی گنجائش نہ تھی، لیکن اللہ کی زمین تو ان کے لیے کشادہ تھی، وہ اور کہیں جا کر پناہ حاصل کر سکتے تھے، اور مسلمان جہاں بھی جائے گا اللہ کے دین کی دعوت ضرور دے گا اور اپنے ایمان کے نور کو ضرور پھیلائے گا۔ اس بات کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں واضح فرمایا: ''ان کا جو آدمی ہمارے پاس آئے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی نہ کوئی کشادگی اور مخرج نکال دے گا۔'' (مسلم جلد۲ ص ۱۰۵)

چنانچہ ہوا بھی یہی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب واپس مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو ایک شخص ابو بصیرؓ مشرکین مکہ کی قید سے بھاگ کر مدینہ منورہ پناہ حاصل کرنے کے لیے پہنچے۔ قریش کے دو آدمی ان کے پیچھے فوراً مدینہ پہنچے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ معاہدہ کی رو سے آپ نے ابو بصیرؓ کو ان دونوں آدمیوں کے حوالے کر دیا اور ابو بصیرؓ سے فرمایا کہ میں معاہدہ کے خلاف نہیں کر سکتا، لہٰذا بہتر ہے کہ تم ان دونوں کے ساتھ چلے جاؤ۔ ابو بصیرؓ نے ابو جندلؓ کی طرح آپ کے حضور میں واپس جانے پر آہ و زاری کی کہ آپ مجھے مشرکین کی طرف واپس کر

رہے ہیں جو مجھ کو میرے دین اسلام سے پھیرنا چاہتے ہیں اور طرح طرح سے مجھے ایذائیں دیتے ہیں۔ آپ نے ابو بصیرؓ کو تسلی دی اور صبر کی تلقین فرمائی اور یہ بھی فرمایا: ''امید رکھو عنقریب اللہ تعالیٰ تمہاری کشادگی اور نجات کی صورت پیدا فرما دے گا۔'' ابو بصیرؓ بادل نخواستہ ان دونوں آدمیوں کے ساتھ واپس ہو لیے۔ جب ذوالحلیفہ پہنچے اور جو کھجوریں ان کے پاس تھیں وہ کھانے لگے تو ابو بصیر نے ان میں سے ایک شخص سے کہا کہ اے فلاں! میں دیکھتا ہوں کہ تمہاری یہ تلوار کیسی عمدہ ہے؟ اس نے تلوار کو نیام سے نکال کر کہا: ہاں ہاں، واللہ واقعی بہت عمدہ ہے۔ میں نے بارہا اس کو آزمایا ہے۔ ابو بصیرؓ نے کہا: ذرا مجھے دکھلاؤ تو، میں بھی تو دیکھوں کیسی ہے؟ اس احمق نے ابو بصیرؓ کو تلوار دے دی۔ جونہی ابو بصیرؓ نے تلوار پکڑی فوراً ایک ایسا بھرپور وار کیا کہ وہ ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا شخص بھاگ کر فوراً مدینہ آیا اور دوڑتا ہوا مسجد نبوی میں گھس گیا اور ہانپتا کانپتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''خدا کی قسم! میرا ساتھی قتل کر دیا گیا اور میں بھی قتل کر دیا جانے والا ہوں۔''

اتنے میں ابو بصیرؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کا عہد پورا کر دیا۔ آپ نے بھی مجھے ان کی طرف لوٹا دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے نجات دے دی۔'' آپ نے فرمایا: ''اس کی ماں کی بربادی ہو، اسے اگر کوئی ساتھی مل جائے تو یہ تو جنگ کی آگ بھڑکا دے گا۔'' آپ کے اس ارشاد سے ابو بصیرؓ سمجھ گئے کہ اگر میں یہاں رہا تو آپ پھر مجھے مشرکین کے حوالے کر دیں گے۔'' اس لیے وہ مدینہ طیبہ سے نکل کر ساحل سمندر پر آ کر قیام پذیر ہو گئے اور اس شاہراہ پر مقیم ہوئے جہاں سے قریش کے کاروان تجارت شام کو آتے جاتے تھے۔ مکہ کے بے بس مسلمانوں کو جب ابو بصیرؓ کے یہاں قیام کا پتہ چلا تو وہ بھی راتوں کی تاریکی میں چھپ چھپ کر ابو بصیرؓ کے پاس پہنچ گئے۔ ابو جندلؓ بھی کسی طریقہ سے مکہ چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق ستر آدمیوں

کی ایک جماعت (اور امام سہیلیؒ کے مطابق تین سو آدمی۔ ملاحظہ ہو زرقانی جلد ۲ ص ۲۰۳) یہاں جمع ہو گئے۔ اب ان لوگوں نے قریش کے شام آنے جانے والے ہر قافلہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنی شروع کر دی۔ قافلہ والوں کو مار کر ان کا مال ضبط کر لیتے یہاں تک کہ قریش کے تجارتی قافلوں کا وہاں سے گزرنا مشکل ہو گیا۔ آخر قریش نے تنگ آ کر کچھ آدمی آپ کی خدمت میں بھیجے کہ ہم آپ کو اللہ اور قرابت کا واسطہ دیتے ہوئے التماس کرتے ہیں کہ آپ ان لوگوں کو اپنے پاس مدینہ بلا لیں۔ اب جو بھی آپ کے پاس جائے گا ہم اس کو ہرگز واپس نہیں لیں گے۔ گویا معاہدہ کی اس شق کو خود انہوں نے منسوخ کر دیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک والا نامہ ابو بصیرؓ کے نام ارسال فرمایا اور اسے اپنے ساتھیوں سمیت مدینہ چلے آنے کو کہا۔ یہ والا نامہ ابو بصیرؓ کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ اس دنیا سے عالم آخرت کو انتقال فرما رہے تھے۔ امام سہیلیؒ نے لکھا ہے کہ جب آپ کا والا نامہ ابو بصیرؓ کے پاس پہنچا تو وہ پڑھتے جاتے تھے اور خوش ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور والا نامہ ان کے سینہ پر تھا اور ایک روایت میں ہے کہ ہاتھ میں تھا۔

(روض الانف جلد ۲ ص ۲۳۳، عیون الاثر جلد ۲ ص ۱۷۸-۱۸۰ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ ص ۳۲۳-۳۲۴)

سیدنا ابو جندلؓ نے سیدنا ابو بصیرؓ کی تجہیز و تکفین کی اور انہیں اس جگہ دفن کر دیا اور اس کے قریب ایک مسجد تعمیر کر دی۔ پھر وہ سب آدمیوں کو ساتھ لے کر مدینہ طیبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے۔ اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے کشادگی پیدا فرما دی جو مکہ سے قریش کی سزاؤں کی وجہ سے بھاگ کر مدینہ آنا چاہتے تھے، لیکن معاہدہ کی رو سے مدینہ میں انہیں پناہ نہیں مل سکتی تھی۔

Marfat.com

سیدنا خالد بن ولیدؓ دائرۂ اسلام میں

سنہ ۷ ہجری میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کی ادائیگی کے بعد مدینہ واپس لوٹ آئے لیکن مکہ کے تین روزہ قیام میں جو اثرات آپ اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے اہل مکہ کے دلوں پر چھوڑے ان کے نتائج جلد برآمد ہونے لگے۔ چنانچہ قریش کے جانباز خالد نے جو فن سپاہ گری میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے اور جنہوں نے غزوہ احد کی لڑائی کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا، قریش کے عام اجتماع میں یہ اعلان کر دیا:

''سنو! ہر ذی عقل شخص پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو جادوگر ہیں اور نہ ہی شاعر۔ ان کا کلام رب العالمین کا کلام ہے، لہٰذا ہر ذی شعور شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ آپ کی اتباع کرے۔''

جس اجتماع میں سیدنا خالد بن ولیدؓ نے یہ بات کہی تھی اس میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی موجود تھا۔ وہ خالدؓ کا جانی دوست تھا لیکن معاملہ عقیدہ کا تھا لہٰذا اس نے فوراً اٹھ کر خالدؓ کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم کبھی یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ تم اسلام کے گرویدہ ہو جاؤ گے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے والد، تمہارے چچا اور تمہارے دوسرے اعزاء و اقرباء کو قتل کروایا تھا۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایسے خیالات کا کبھی بھی اظہار نہ کرتا، لیکن خالدؓ کا ایک ہی جواب تھا کہ عکرمہ تمہاری بات جاہلیت کی پرستاری ہے۔ مجھ پر حقیقت منکشف ہو چکی ہے لہٰذا میں مسلمان ہو گیا ہوں اور اسلام کو دل سے قبول کر لیا ہے۔

Marfat.com

خالدؓ کے اس بیان نے مکہ میں ہلچل مچا دی۔ خالدؓ کوئی معمولی شخص نہیں تھے۔ ایک رئیس کے بیٹے اور خود ایک بہترین سپہ سالار تھے جس نے پوری زندگی کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ ان کی یہ ساری خوبیاں قریش کے ذہن میں تھیں۔ چنانچہ ابوسفیانؓ کو جب خالدؓ کے خیالات کا پتہ چلا تو انہوں نے خالد کو اپنے ہاں بلا کر پوچھا کہ کیا تم واقعی مسلمان ہو گئے ہو؟ خالدؓ نے کہا: میں واقعی اسلام کا گرویدہ ہو گیا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ ابو سفیان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ان پر پل پڑا، لیکن اتفاق سے عکرمہ بن ابی جہل بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے ابوسفیان کا دامن کھینچتے ہوئے کہا:

''ابوسفیان! خدا کی قسم، جس خطرہ کا تمہیں ڈر ہے اس سے میں بھی خائف ہوں۔ ورنہ خالدؓ کی طرح میں بھی وہی کہتا اور ان کے دین کو دل و جان سے قبول کر لیتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ایک سال کے اندر اندر مکہ کے سب لوگ دین محمدؐ کو قبول نہ کر لیں۔'' ابوسفیان یہ بات سن کر خاموش ہو گیا اور اس نے خالد بن ولیدؓ سے کوئی تعرض نہ کیا۔

ملاحظہ فرمائیں کہ سیدنا خالد بن ولیدؓ فن سپہ گری میں نہایت ماہر۔ جاہلیت میں بھی کبھی جنگ میں شکست سے دوچار نہیں ہوئے۔ کئی لڑائیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑ چکے ہیں، لہٰذا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی مہارت سے متاثر ہو کر حلقہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔ یہ صرف اور صرف اسلام کی دعوتی قوت اور نبوی اخلاق کا اثر تھا کہ خالد بن ولیدؓ جیسا شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں اسلام کا گرویدہ کیسے ہوا حالانکہ میرے دل میں اسلام کے خلاف سخت نفرت اور دشمنی کے جذبات موجزن تھے۔

فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے میری بھلائی کا ارادہ فرمایا تو اس نے میرے دل میں اسلام کی محبت اور شیفتگی ڈال دی۔ ایک روز اچانک میرے دل میں یہ خیال آیا کہ جس جنگ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش مکہ کے

Marfat.com

ساتھ جاتا ہوں اور پھر واپس آتا ہوں۔ تو واپسی پر میرے دل کی ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ میرا دل مجھے ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خالد! تیری یہ تمام کوششیں اور یہ تمام تگ و دو بالکل بے سود اور لاحاصل ہے۔ بلا شک وشبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ضرور غالب ہوں گے۔ چنانچہ حدیبیہ کے موقع پر میں قریش کے سواروں میں سے تھا۔ میں نے مقام عسفان میں آپ کو دیکھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ صلوٰۃ الخوف پڑھ رہے تھے۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ نماز کی حالت میں آپ پر حملہ کروں لیکن آپ میرے اس ارادہ سے آشنا ہو گئے اور میں آپ پر حملہ نہ کر سکا۔ اس وقت میرے قلب و ذہن نے مجھے بتایا کہ یہ شخص من جانب اللہ ہے۔ چنانچہ میں نامراد واپس لوٹا۔

جب آپ حدیبیہ میں قریش سے صلح کا معاہدہ کر کے واپس ہوئے تو میں نے کہا کہ قریش کی تمام سطوت و شوکت خاک میں مل گئی اور شاہ حبشہ تک آپ کا مطیع و منقاد ہو چکا ہے اور آپ کے ساتھی نجاشی کے پاس نہایت امن و امان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں بہت پریشان تھا کہ کیا کیا جائے۔ ایک خیال آیا کہ ہرقل شاہ روم کے پاس جا کر نصرانی ہو جاؤں، اور شاہان عجم کے تابع ہو کر اپنی زندگی کے دن گزاروں۔ پھر یہ خیال آیا کہ چند روز اپنے وطن ہی میں رہ کر دیکھوں کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ اسی خیال میں تھا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کے لیے مکہ تشریف لائے۔ میں اس وقت مکہ سے باہر نکل گیا اور ادھر ادھر چھپ گیا۔ آپ جب عمرۃ القضاء سے فارغ ہوئے تو میرا بھائی ولید بن ولید جو آپ کے ہمراہ تھا، مجھے تلاش کرنے لگا، مگر میں تلاش کے باوجود اسے نہ ملا کیونکہ میں روپوش تھا۔ بعد ازاں میرے بھائی نے مجھے اس مضمون کا ایک خط لکھا کہ

''میں نے اس سے زیادہ حیرت زا اور تعجب خیز بات نہیں دیکھی کہ تیری رائے اسلام جیسے پاکیزہ اور عمدہ دین کے قبول کرنے سے ابھی تک ابا کر رہی ہے حالانکہ تیری عقل تیری عقل ہے (یعنی تو نہایت عقل مند آدمی سمجھا جاتا ہے)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرا حال دریافت فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ خالد کہاں ہے؟ میں نے بارگاہِ نبوت میں عرض کیا: "یا رسول اللہ!" عنقریب اللہ تعالیٰ اسے آپ کے پاس لے کر آئے گا۔" آپ نے بھی مجھے فرمایا کہ تعجب ہے کہ اس جیسا عقل مند اور زیرک انسان ابھی تک اسلام سے ناآشنا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا: کہ اگر خالد اہل اسلام کے ساتھ مل کر دین حق کی مدد کرتا اور اہل شرک و باطل کا خاتمہ کرتا تو یہ اس کے لیے کہیں بہتر ہوتا اور ہم اس کو دوسروں پر مقدم رکھتے۔ پس اے میرے بھائی! تجھ سے یہ بہترین مواقع ضائع ہو گئے، تو ان کی تلافی کر۔ ابھی تلافی اور تدارک کا وقت ہے۔"

خالد بن ولید کا بیان ہے کہ جب میرے بھائی کا یہ خط میرے پاس پہنچا تو میں نے اسلام کے بارہ میں اب اور انداز سے سوچنا شروع کیا اور اسلام سے میری رغبت و محبت میں اضافہ ہوا، اور سفر ہجرت کا ایک خاص سرور اور نشاط دل میں پیدا ہو گیا، اور خط میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے میرے بارہ میں جو ریمارکس تھے، انہوں نے مجھے ایک خاص خوشی اور مسرت عطا کی۔ چنانچہ میں نے اسباب سفر مہیا کر کے مدینہ منورہ جانے کا ارادہ کیا۔ اور میں نے یہ چاہا کہ کوئی اور بھی میرا رفیق سفر ہو جائے۔ میں نے صفوان بن امیہ سے ملاقات کی اور اسے کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب و عجم پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر ان کا اتباع کر لیں تو یہ ہمارے لیے بہت بہتر ہوگا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف ہمارا شرف ہو گا۔ صفوان نے میری بات سن کر نہایت سختی سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ اگر تمام روئے زمین پر میرے سوا کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے باقی نہ رہے تو میں پھر بھی اس کے دین کو قبول نہیں کروں گا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس کے یہ جذبات صرف اس وجہ سے ہیں کہ اس کا باپ اور بھائی جنگ میں مارے گئے ہیں۔ بعد ازاں میں عکرمہ بن ابی جہل سے ملا اور اس سے بھی وہی کہا جو میں نے صفوان بن امیہ سے کہا

Marfat.com

تھا لیکن اس نے بھی اتنی ہی درشتی سے وہی جواب دیا جو صفوان نے دیا تھا۔ میں ان دونوں سے ناامید ہو کر سیدھا اپنے گھر گیا۔ اونٹنی کو تیار کیا اور زاد راہ ساتھ لیا اور خیال کیا کہ چلو عثمان بن طلحہ سے ملاقات کر لوں۔ وہ میرا بڑا اچھا دوست ہے، لیکن مجھے یاد آیا کہ اس کا باپ دادا بھی قتل ہوئے ہیں، لہٰذا متردد ہو گیا کہ عثمان سے اپنے خیالات کا ذکر کروں یا نہ کروں۔ پھر خیال آیا کہ ذکر کرنے میں کیا حرج ہے، میں تو اب جانے کا عزم کر چکا ہوں۔ چنانچہ میں عثمان بن طلحہ کے پاس گیا اور اس سے بھی وہی کچھ کہا جو میں صفوان اور عکرمہ سے کہہ چکا تھا۔ عثمان بن طلحہ نے میری بات کو قبول کر لیا اور کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ مدینہ چلتا ہوں۔ تم چلو اور مقام یاجج میں تم سے آملوں گا، اگر تم وہاں پہلے پہنچ جاؤ تو وہاں میرا انتظار کرنا۔

خالد بن ولید کہتے ہیں کہ مقام یاجج پر عثمان بن طلحہ مجھے مل گئے۔ صبح سویرے ہم وہاں سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے۔ جب مقام ھدہ پر پہنچے تو عمرو بن العاص سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی اسلام لانے کے ارادہ سے مدینہ جا رہے تھے۔ عمرو بن العاص نے ہمیں دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور ہم نے انہیں پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ وہ بولے: اسلام میں داخل ہونے کے لیے مدینہ جا رہا ہوں۔ ہم نے کہا کہ ہم بھی اسی لیے مدینہ جا رہے ہیں۔ (البدایہ والنہایہ جلد۴ ص ۲۳۸-۲۳۹)

اب عمرو بن العاص کی بات سنیئے۔ فرماتے ہیں کہ میں اسلام میں داخل ہونے کے لیے جب ھدہ کے مقام پر پہنچا تو وہاں دو آدمیوں سے میری ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک خالد بن ولید تھے۔ میں نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ خالد نے جواب دیا:

دخل الناس في السلام فلم يبق احد به طعم (بیہقی من طریق الواقدی)

لوگ اسلام میں داخل ہو گئے اور کوئی صاحب ذوق شخص باقی نہیں رہا جو اسلام میں داخل نہ ہوا ہو۔

چنانچہ یہ تینوں جو قریش میں نہایت اہم شخصیتیں سمجھی جاتی تھیں، سفر کی

Marfat.com

منزلیں طے کرتے کرتے مدینہ داخل ہوئیں اور اپنی سواری کے اونٹ مقام حرہ پر بٹھائے۔ خالد کہتے ہیں کہ کسی شخص نے ہماری خبر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی۔ آپ ہماری آمد سے نہایت خوش ہوئے۔ میں نے عمدہ کپڑے زیب تن کیے اور آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کے لیے چلا۔ مجھے میرا بھائی ولید مل گیا۔ اس نے کہا جلدی چلو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے آنے کی خبر مل گئی ہے اور وہ تمہارے منتظر ہیں۔ ہم تیزی کے ساتھ چلے۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جونہی مجھے دیکھا تو تبسم فرمایا۔ میں نے کہا: السلام علیک یا رسول اللہ! آپ نے نہایت خندہ پیشانی سے میرے اس سلام کا جواب دیا۔ میں نے کلمۂ شہادت پڑھا۔ آپؐ نے فرمایا: قریب ہو جاؤ۔ پھر فرمایا:

''حمد ہے اس ذات کی جس نے تجھے اسلام کی توفیق ارزانی فرمائی۔ میں دیکھتا تھا کہ تو صاحب فہم و دانش ہے اور مجھے پوری امید تھی کہ وہ عقل تجھ کو بھلائی کی طرف ضرور لائے گی۔''

خالد بن ولیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے بارگاہ نبوت میں عرض کی کہ آپ دیکھتے تھے کہ میں جنگوں میں آپ کے اور حق کے مقابلہ میں آپ کے سامنے آتا تھا جس سے بہت شرمندہ اور نادم ہوں، اس لیے آپ سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ میری تمام خطاؤں کو معاف فرمادے۔ آپ نے مجھے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ

''اسلام ان تمام خطاؤں اور گناہوں کو ختم کردیتا ہے جو اس سے پہلے ہو چکے ہیں۔''

پھر آپ نے میرے لیے یہ دعا فرمائی:

''اے اللہ! خالد بن ولید کی ان تمام خطاؤں کو معاف فرمادے جو اس نے اللہ کے راستہ سے روکنے کے لیے کی ہیں۔''

پھر میرے بعد عثمان بن طلحہؓ اور اس کے بعد عمرو بن العاصؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھ پر بیعت کی۔ (البدایہ والنہایہ جلد۴ ص ۲۴۰)

Marfat.com

سیدنا عمرو بن العاصؓ کا بیان ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کے بعد سب سے پہلے خالد بن ولیدؓ نے بیعت کی۔ پھر عثمان بن طلحہؓ نے اور پھر میں بیعت کے لیے آگے بڑھا تو اس وقت میری یہ حالت تھی کہ

''خدا کی قسم! میں آپ کے سامنے بیٹھ تو گیا لیکن شرم و ندامت سے پانی پانی تھا۔ پیشانی پر ندامت کا پسینہ تھا۔ آنکھیں ندامت کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ بالآخر میں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی اور عرض کیا کہ بیعت اس شرط پر کرتا ہوں کہ میری تمام گذشتہ خطائیں اور قصور معاف کر دیئے جائیں۔ آپ کی شان کریمی نے میرے عرق انفعال کو موتی سمجھ کر چن لیا اور فرمایا: ''عمرو! اسلام ان تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے جو اسلام سے پہلے کفری حالت میں کیے گئے ہوں۔ اسی طرح ہجرت بھی گناہوں کو ختم کر دیتی ہے۔ (اور تم تینوں نے تو دونوں کام ہی کیے ہیں یعنی اسلام بھی لائے اور ہجرت بھی کی)۔

سیدنا عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ ''اللہ لم یزل ولا یزال کی قسم! جس روز سے ہم دائرہ اسلام میں داخل ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روز سے ہر مہم میں میرے اور خالدؓ کے برابر اپنے اصحاب میں سے کسی کو نہیں سمجھا۔''

(البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۲۳۸)

سیدنا عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں اور خالدؓ اور عثمانؓ صفر سنہ ۸ھ میں مشرف باسلام ہوئے۔ جب یہ تینوں حضرات اسلام میں داخل ہو گئے تو آپ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

''مکہ نے اپنے جگر گوشوں کو ہمارے حوالے کر دیا ہے۔''

یہ تھا اس دعوتی عمل کا مختصر جائزہ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور مدینہ میں دعوت نبوت کے بعد شروع کیا اور ۲۳ سال کے مختصر عرصہ میں ایک لاکھ سے زائد

Marfat.com

نفوس دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، اس قدر لوگوں کا اسلام میں داخل ہونا ان کے اس دعویٰ کی مکمل تردید کرتا ہے۔

مشہور مستشرق منٹگمری واٹ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جو کتاب لکھی ہے اس کی دوسری جلد ''محمد ایٹ مدینہ'' میں اس نے نبی کریم کے عہد میں غزوات و سرایا کی تعداد نوے کے قریب دی ہے۔ ان میں تلوار سے جو لوگ قتل ہوئے ان کی تعداد ۱۰۱۸ ہے۔ اس تعداد میں مسلمانوں اور کافروں دونوں کے مقتول شامل ہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے کہ انسانی جانوں کی اس قیمت پر اسلام نے نبی نوع انسان کو کیا دیا۔ بت پرستی کی لعنت سے نجات دلائی۔ توحید کی عظمتوں سے روشناس کرایا۔ عرب کے لوگ جو صدیوں سے ایک دوسرے کے خون کی ندیاں بہایا کرتے تھے بلکہ بہا رہے تھے انہیں اخوت کا درس دے کر بھائی بھائی بنا دیا۔ ان کے دلوں میں رافت و رحمت کے جذبات کی تخم ریزی کی۔ ان کو قانون کا پابند بنایا جب کہ وہ قانون کی پابندیوں کو اپنی توہین سمجھتے تھے اور اس دنیا کو جو جہالت و گمراہی کی دبیز تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی اور انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا، ان کو تہذیب و ثقافت کا درس دیا۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی حقیقت سمجھ آتی ہے۔

انا نبی الرحمة، انا نبی الملحمة۔

میں رحمت و رافت کا نبی ہوں اور جنگ و جدال کا بھی علم بردار ہوں۔

گویا کہ ۱۰۱۸ انسانی جانوں کو قربان کر کے نبی نوع انسان کی روحانی، سماجی، معاشی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی و عمرانی زندگی کو یک قلم تبدیل کر دینا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ خون ریزی اور دہشت گردی نہیں جیسا کہ متشرقین کہتے ہیں بلکہ یہ انسانیت کو تباہیوں اور بربادیوں سے بچانے کے لیے جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جو لوگ ۱۰۱۸ انسانوں کے کام آنے کو دہشت گردی اور خون ریزی کا نام دیتے ہیں ان کو جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم کی تباہ کاریوں کو بھی

Marfat.com

نظر میں رکھنا چاہیے جنہوں نے لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کو موت کے منہ میں دھکیل کر انسانیت کی گاڑی کے پہیوں کو جام کر دیا۔ ان جنگوں میں کتنا نقصان ہوا؟ مالی نقصان کی تو کوئی تفصیل نہیں دی جا سکتی، جانی نقصان کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں۔
ہلاک ہونے والوں کی یہ تعداد پہلی جنگ عظیم کی ہے جو صرف چار سال رہی۔ اس میں مندرجہ ذیل ملکوں کے جو آدمی مارے گئے اس کی تفصیل یہ ہے:

۱-	روس	۱۷ لاکھ
۲-	جرمنی	۱۶ لاکھ
۳-	فرانس	۱۳ لاکھ ستر ہزار
۴-	اٹلی	۴ لاکھ ساٹھ ہزار
۵-	آسٹریا	۸ لاکھ
۶-	برطانیہ	۷ لاکھ
۷-	ترکی	۲ لاکھ پچاس ہزار
۸-	بلجیئم	ایک لاکھ دو ہزار
۹-	بلغاریہ	ایک لاکھ
۱۰-	رومانیہ	ایک لاکھ
۱۱-	سربیا د مانٹی نیگرو	ایک لاکھ
۱۲-	امریکہ	پچاس ہزار

دوسری جنگ عظیم میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کچھ یوں ہے

۱-	روس	۲ کروڑ دس لاکھ
۲-	جرمنی	۶۰ لاکھ سے سوا کروڑ تک
۳-	پولینڈ	۹ لاکھ
۴-	چین	۳۰ لاکھ

Marfat.com

۵- جاپان	....	۲۷لاکھ سے ۶۰لاکھ تک
۶- آسٹریا	....	۷لاکھ
۷- رومانیہ	....	۷لاکھ
۸- فن لینڈ	....	ایک لاکھ تراسی ہزار ایک سو چھیاسٹھ
۹- چیکوسلاوکیہ	....	۶۰ ہزار
۱۰- ذیکوسلاوکیہ	....	۳۰لاکھ پچاس ہزار
۱۱- امریکہ	....	۱۰لاکھ ستر ہزار
۱۲- برٹش امپائر (برطانیہ)	....	۱۴لاکھ ۳۰لاکھ
۱۳- فرانس	....	۱۰لاکھ
۱۴- اٹلی	....	۱۱لاکھ
۱۵- یوگوسلاویہ	....	۱۶لاکھ ۸۵ ہزار
۱۶- ہنگری	....	۶لاکھ
۱۷- ہالینڈ	....	۲لاکھ ۷۵ ہزار
۱۸- بلجیئم	....	۶۰لاکھ
۱۹- فلپائن	....	۳۰ ہزار

ان اعداد و شمار میں قیدیوں اور زخمیوں کی تعداد شامل نہیں اور نہ ہی ہندوستان اور کالونیوں کے لوگ شامل ہیں جنہوں نے اپنے ملکوں کی طرف سے جا کر محاذ جنگ پر اپنی جانیں قربان کیں۔ (اخبار کوثر ۹ ستمبر ۱۹۴۵ء)

تعجب کی بات یہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال میں ۱۰۱۸ نفوس قربان کر کے دنیا میں ایک غیر خونی انقلاب برپا کر دیا جب کہ موجودہ دور میں ۴ کروڑ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار کر بھی دنیا میں کوئی انقلاب نہ آیا بلکہ یہ ساری قتل و غارت بے مقصد رہی۔ پھر ہیروشیما اور ناگا ساکی پر امریکہ کے ایٹم بموں

Marfat.com

نے جو قیامت برپا کی اس کی خونچکاں داستان سننے کا کسی میں حوصلہ نہیں کیونکہ اس کے اثرات آج تک نسلوں میں چلے آ رہے ہیں۔

مستشرقین کا یہ کہنا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، دراصل حقائق سے اغماض کا نتیجہ ہے۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو یہ واضح ہدایات دی ہیں کہ وہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کریں۔ قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں حکم دیا۔

لا اکراہ فی الدین، قد تبین الرشد من الغی. (البقرہ:۲۵۶)

دین میں کوئی زبردستی نہیں، بے شک واضح ہو گئی ہے ہدایت گمراہی سے

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کام نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں بلکہ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ لوگ کو بتا دیں کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ جنت کی ابدی بہاروں کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے اور جہنم کے خارزاروں اور آگ سے بھرے غاروں کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے۔ ان حقائق کی تبلیغ کے بعد آپ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اب جس کی مرضی ہے وہ حق کی روشنی سے اپنے قلب ونظر کو منور کر لے اور جس کا جی چاہے باطل کی تاریکیوں میں دھکے کھاتا رہے۔ اسی شی کو قرآن حکیم کی ایک اور آیت میں یوں بیان فرمایا:

فذکر، انما انت مذکر، لست علیھم بمصیطر۔ (الغاشیہ:۲۱-۲۲)

پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں کیونکہ آپ کا کام سمجھانا ہی ہے۔ آپ ان کو جبر اور زبردستی سے منوانے والے تو نہیں ہیں۔

ان آیات سے پتہ چلا ہے کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ کسی کو مسلمان بنانے کے لیے طاقت کا استعمال نہ کیا جائے، اس لیے آپ سے اور آپ کے پیروکاروں سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن کاموں سے روکا ہے آپ وہی کام کریں۔ چنانچہ موجودہ دنیا کے ایک بہت بڑے فاضل استاذ ابوزہرہ لکھتے ہیں:

"یہ بات ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو اسلام قبول

Marfat.com

کرنے پر مجبور کیا ہو، بلکہ یہ بات ثابت ہے کہ بعض انصار نے اپنی اولاد کو زبردستی اسلام میں داخل کرنے کا ارادہ کیا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔" (سیرۃ خاتم النبیین، استاذ ابوزہرہ جلد ۲ ص ۵،۳)

بلکہ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ کسی شخص کو بھی زبردستی اس کے دین سے پھیرا نہیں جا سکتا۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو جن لوگوں نے بت پرستی چھوڑ کر داعیٔ اسلام کی آواز پر لبیک کہا اور حلقہ اسلام میں داخل ہوئے، ان پر کس قدر سختیاں کی گئیں۔ اوروں کو تو چھوڑ یئے، عرب کے جن غلاموں نے دامن اسلام میں پناہ لی تھی، ان پر کون کون سی سختی نہیں کی گئی۔ سیدنا بلال حبشیؓ جو ایک غلام کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے، ان پر جو جو سختیاں کی گئیں، قلم کو ان کی تاب نگارش نہیں۔ ان کے مالک امیہ بن خلف کو جب پتہ چلا کہ اس کا حبشی غلام بلال مسلمان ہو گیا ہے تو غصہ سے اس کا خون کھولنے لگا۔ اس نے یہ عزم کر لیا کہ وہ اس پر اتنی سختی کرے گا کہ وہ مجبوراً اس نئے دین سے اپنا رشتہ توڑ لے گا۔ چنانچہ اس نے جو جور و ستم وہ آزما سکتا تھا، ان پر آزمایا لیکن تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ میخانہ وحدت کا یہ مستانہ کیف و مستی میں کھویا رہتا اور احد احد کے نعرے لگا کر کفر و شرک کے پجاریوں کا منہ چڑاتا۔ سیدنا عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں۔ میں ایک روز بلالؓ کے پاس سے گذرا جب کہ اسے گرم کنکریوں پر لٹا کر عذاب دیا جا رہا تھا۔ وہ کنکریاں اتنی شدید گرم تھیں کہ اگر گوشت کا ٹکڑا بھی ان پر رکھا جائے تو وہ ان کی گرمی سے پک جائے۔ (ولو ان بضعة لحم وضعت عليه لنضجت) اس کے باوجود وہ کہہ رہے تھے۔ "انا كافر باللات والعزىٰ" میں لات اور عزیٰ کا انکار کرتا ہوں۔ امیہ ان کے منہ سے یہ کلمات سن کر اور زیادہ غضب ناک ہو جاتا ہے اور انہیں اور اذیت دینے لگتا ہے۔ ان کے گلے کو زور سے دباتا ہے یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔

علامہ حلبیؒ کی روایت کے مطابق ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر سے گزر ہوا جہاں سیدنا بلالؓ کو ان کا مالک اذیتیں دے رہا تھا۔ آقا عذاب دے رہا تھا اور یہ

Marfat.com

کیف و مستی سے سرشار نیم مدہوشی کے عالم میں احد احد کے نعرے لگا رہے تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جونہی اس حالت میں بلالؓ کو دیکھا تو مژدہ کے طور پر فرمایا: جس اللہ وحدہ لاشریک کے تم نعرے لگا رہے ہو وہی ان اذیتوں اور تکلیفوں سے تمہیں عنقریب نجات دے گا۔ علامہ حلبیؒ نے سیدنا بلالؓ کے اس ''احد احد'' کے جملہ کے بارہ میں فرمایا:

کان بلال بقوله احد احد یمزج مرارة العذاب بحلاوة الایمان۔

یعنی سیدنا بلالؓ احد احد کہہ کر عذاب کی تلخی میں ایمان کی حلاوت کو ملا رہے تھے۔

اسی طرح سیدہ زنیرہؓ جو کہ ایک مشرک کی کنیز تھیں جب حلقہ اسلام میں داخل ہوئیں تو ان کے ظالم و جابر اور بے رحم مالک نے ان پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی یہاں تک کہ ان کی بینائی جاتی رہی۔ ایک روز ابوجہل نے سیدہ زنیرہؓ سے طعنہ کے طور پر کہا: دیکھ ہمارے لات و عزیٰ نے تیری آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ انہوں نے بلا جھجک برجستہ جواب دیا: لات اور عزیٰ میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ میری بینائی ختم کر سکیں اور نہ ہی انہیں کسی کو نفع نقصان پہنچانے کی قدرت ہے:

هذا امر من السماء و ربی قادر علیٰ ان یرد بصری

یہ تو سب کچھ آسمانی حکم ہے اور میرا رب اس بات پر بخوبی قادر ہے کہ میری بینائی لوٹا دے۔

روایات میں ہے کہ جب صبح ہوئی تو ان کی بینائی لوٹ آئی۔

اسی طرح سیدنا خباب بن الارتؓ جب حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو ان کی مالکہ ام انمار نہایت برہم ہوئی۔ وہ سنگ دل لوہے کا ایک ٹکڑا بھٹی میں گرم کرتی جب وہ لال سرخ ہو جاتا تو اسے چمٹے سے اٹھا کر سیدنا خبابؓ کے سر پر رکھ دیتی۔ ان سے ان کو جو اذیت پہنچتی اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

ایک روز انہوں نے اپنی داستان الم یوں بیان فرمائی کہ میں نے ایک روز دیکھا کہ کفار نے میرے لیے آگ بھڑکائی ہے۔ مجھے زمین پر لٹا دیا۔ پھر اس آگ

Marfat.com

کے انگارے میری پشت پر رکھے۔ ان کی تپش سے میری چربی پگھلی اور اس سے یہ انگارے ٹھنڈے ہوئے۔ (سیرۃ حلبیہ جلد ص ۳۸۶)

جانی اذیتوں کے ساتھ ان کو مالی نقصانات سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ مسلم میں ہے کہ سیدنا خبابؓ فرماتے ہیں کہ میں لوہاروں کا کام کیا کرتا تھا اور تلواریں بنایا کرتا تھا۔ مکہ کے ایک سردار عاص بن وائل نے مجھ سے تلواریں خریدیں اور ان کی قیمت اس کے ذمہ تھی۔ جب میں اس سے ان کی قیمت مانگتا تو اس بے ایمان نے کہا: ''بخدا! میں تمہیں اس وقت تک قرض ادا نہیں کروں گا جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار نہیں کرو گے۔ سیدنا خبابؓ نے بڑی جرأت سے جواب دیا:

واللہ لا اکفر بمحمد حتی تموت ثم تبعث۔

(السیرۃ النبویہ لابن کثیر جلد ا ص ۲۹۶)

خدا کی قسم! میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کبھی بھی انکار نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو مر جائے اور پھر تو قبر سے اٹھ کھڑا ہو۔

انہی ستم رسیدہ لوگوں میں ایک سیدنا عمار بن یاسرؓ اور ان کے اہل خاندان تھے۔ ان کو بھی آگ کی اذیتیں دی جاتی تھیں اور عربوں کے ہاں آگ کی اذیت سب سے زیادہ اذیت سمجھی جاتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی اس طرف جاتے جہاں انہیں آگ کی یہ اذیت دی جاتی تو اپنا دست شفقت ان کے سر پر پھیرتے اور فرماتے: ''اے آگ! تو جس طرح ابراہیم علیہ السلام کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث بنی تھی اسی طرح عمارؓ کے لیے بھی ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا باعث بن جا۔'' ایک روایت میں ہے کہ ایک روز سیدنا عمار بن یاسرؓ نے اپنی پشت سے قمیض اٹھائی تو وہاں برص کی طرح سفید داغ تھے۔ یہ داغ آگ کے جلانے کے نشانات تھے جو برص کے داغوں کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ ان انگاروں کا جلانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے پہلے پہلے تھے۔ اس دعا کے بعد پھر ان انگاروں کی مجال نہ تھی کہ سیدنا عمارؓ کو جلاتے اور اذیت دیتے۔ (سیرۃ حلبیہ جلد ا ص ۳۸۶)

یہ صرف چند واقعات ان لوگوں کے ہیں جن کو دین اسلام سے برگشتہ کرتے کے لیے ہر حربہ اختیار کیا گیا۔ طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، آگ کے عذاب دیئے گئے لیکن ان میں سے نہ کوئی مرد اور نہ کوئی عورت اسلام سے برگشتہ ہوئی۔ معلوم ہوا کہ جبر اور زبردستی کے ساتھ کسی کو اس کے دین سے برگشتہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو یہ لوگ ضرور اس نئے دین کو ان اذیتوں کے باعث چھوڑ دیتے۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا مشن یہ ہوتا کہ تلوار سے اسلام کو پھیلایا جائے تو مختلف غزوات و سرایا اور دوسری جنگوں میں جو لوگ قیدی بن کر آئے تھے اور مسلمانوں کے قبضہ میں تھے، ان کی جان بخشی کی ایک ہی صورت ہوتی کہ وہ اسلام قبول کر لیں، لیکن ایسا نہیں ہوا، آپ نے تمام اسیروں اور قیدیوں کو یا تو فدیہ لے کر چھوڑ دیا یا پھر اپنی رحمۃ للعالمینی کا مظاہرہ کر کے ان کو آزاد کر دیا بلکہ کئی لوگ ایسے تھے جو آپ کو قتل کرنے کی نیت سے آئے تھے، آپؐ نے ان کو بھی اپنے دامن عفو میں چھپا لیا۔ غزوہ بدر میں جو قیدی آئے تھے وہ وہ لوگ تھے جنہوں نے تیرہ سال آپ کو ہر قسم کی اذیتیں دی تھیں لیکن آپ نے انہیں بھی کچھ نہیں کہا۔ ان لوگوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو بھی تھا۔ یہ قریش میں بڑا زبان آور اور شعلہ بیان خطیب تھا۔ اسے قیدیوں میں دیکھ کر سیدنا عمرؓ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا: یارسول اللہ! سہیل بن عمرو کے اگلے دو دانت تڑوا دیجئے اس سے اس کی زبان پلٹ جایا کرے گی اور پھر وہ کسی جگہ خطیب بن کر آپ کے خلاف کھڑا نہیں ہو سکے گا، لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمرؓ کی اس درخواست کو مسترد فرما دیا اور فرمایا کہ میں مثلہ کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میں نبی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فدیہ کے عوض رہا کر دیا اور زبردستی کر کے اس کو مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کی۔

اسیران بدر میں ایک نوفل بن حارث بھی تھے۔ جب ان سے فدیہ لانے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ میرے پاس کچھ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: وہ

Marfat.com

نیزے کہاں ہیں جو تم جدہ میں چھوڑ آئے ہو؟ نوفل نے جواب دیا: بخدا! اس بات کا علم میرے سوا کسی اور کو نہ تھا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ نوفل وہ نیزے لے آئے اور ان کو اپنے فدیہ میں بارگاہِ رسالت میں پیش کر دیا۔ ان نیزوں کی تعداد ایک ہزار تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عباسؓ اور نوفلؓ کے مابین مواخات کا رشتہ قائم فرما دیا۔ (زرقانی جلد ۱ص ۴۴۳، مستدرک حاکم جلد ۲ص ۲۴۶)

غزوہ بدر میں ستر (۷۰) قیدی آئے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صحابہ کرامؓ میں تقسیم فرما دیا اور ساتھ ہدایت فرمائی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ (سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ص ۳۵۶) عمرو الجمحی ایک مشہور شاعر تھا۔ وہ اکثر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں شعر کہا کرتا تھا۔ وہ بھی غزوہ بدر میں قیدی ہو کر آیا۔ جب اس سے فدیہ کا مطالبہ کیا گیا تو کہنے لگا: میں تو تہی دست ہوں۔ پانچ لڑکیوں کا خرچہ میرے ذمہ ہے، لہٰذا آپ مجھے بغیر فدیہ کے ہی رہا کر دیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا عذر قبول فرماتے ہوئے بلا فدیہ اس کو رہا کر دیا۔ وہ آپؐ کے اخلاق حسنہ سے متاثر ہوا۔ مکہ جا کر آپ کی تعریف میں اشعار کہے اور قصیدے لکھے لیکن پھر بدبختی اور شقاوت دامنگیر ہوئی اور جنگ احد کے موقع پر مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز اشعار لکھے۔ جنگ احد میں پھر گرفتار ہوا اور قتل ہوا۔ (سیرۃ حلبیہ جلد ۲ص ۲۲۲)

ان تمام واقعات سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی قیدی سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ میں تمہیں اس شرط پر رہا کرتا ہوں کہ تم اسلام کی دعوت کو قبول کر لو ورنہ پھر تمہیں قتل کر دیا جائے گا بلکہ آپ نے تو ان لوگوں کو بھی اپنی رحمۃ للعالمینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یک قلم غیر مشروط آزاد کر دیا جنہوں نے بیس اکیس سال سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ کو ہر قسم کی اذیتیں دیں۔ اب اگر تلوار کے دار سے لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود ہوتا تو فتح مکہ سے بڑا کون سا دن تھا جس روز تمام اساطین قریش پابجولاں آپ کے سامنے کھڑے تھے اور ایک اشارہ ابرو سے آپؐ ان کا

Marfat.com

کام تمام کروا سکتے تھے، لیکن آپ نے ایک ہی لفظ سے ان سب کو رہا کر دیا کہ "اذھبوا انتم الطلقاء، لا تثریب علیکم الیوم"

پھر اگر تلوار کے زور ہی سے غیر مسلموں کو مسلمان بنانا مقصود ہوتا تو تمام دنیا جانتی ہے کہ مسلمانوں نے آٹھ سو سال اسپین پر حکومت کی لیکن اتنے طویل غلبہ کے باوجود انہوں نے کسی مذہب کو وہاں ختم نہیں کیا اور ہر مذہب کو کھلی آزادی تھی کہ وہ اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ لیکن جب وہاں عیسائیوں نے غلبہ حاصل کیا اور مسلمانوں کے اقتدار کا آفتاب غروب ہوا تو پھر ایک عیسائی مملکت میں مسلمانوں کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ عیسائیت کو قبول کر لیں یا پھر عیسائی سفاکوں اور پادریوں کی تلوار کے آگے سر رکھ کر اس کو کٹوا دیں اور یا بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں کود جائیں۔

اگر ان مستشرقین کی اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے اقتدار اور اپنی طاقت کو اپنے دین کی اشاعت کے لیے استعمال کیا تو پھر ایک اور سوال ذہنوں میں ابھرتا ہے۔ جس کا جواب یہ مستشرقین کبھی نہیں دے سکتے کہ جن لوگوں نے اسلام کی اشاعت کے لیے تلوار استعمال کی ان کے اپنے مسلمان ہونے کا کیا سبب تھا؟ ان کو کس کی تلوار نے مسلمان بنایا؟ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اکیلے دین کی اشاعت و تبلیغ کے لیے اٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی تلوار نہ تھی۔ وہ بغیر تلوار کے مکہ کے گلی کوچوں میں لوگوں کو ایک ہی دعوت دیتے "یا ایھا الناس! قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا" اے لوگو! لا الہ الا اللہ کہو، تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ اور ساری دنیا نے دیکھا کہ اس ایک آواز پر لبیک کہنے کے لیے ایک ایک کر کے لوگ آتے گئے اور تیرہ (۱۳) سال کے عرصہ میں وہ ایک کارواں کی شکل اختیار کر گئے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

Marfat.com

مستشرقین اور اسلام پر اعتراضات کے تیر برسانے والے یہ بتائیں کہ ان تلوار چلانے والوں پر کس نے تلوار چلائی کہ وہ اس تلوار کی ضرب کاری سے ایسے مسلمان ہوئے کہ اب دوسروں پر تلوار چلا کر انہیں دائرہ اسلام میں داخل کرنے لگے۔ اور اس دین نے ان کے اذہان وقلوب کو اتنا مسخر کیا کہ وہ اس دین کی خاطر اپنا گھر بار، وطن اور رشتہ دار سب کچھ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ سب مستشرقین کی یاوہ گوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طاقت نے ابتدائی مسلمانوں کو اسلام کا شیدائی بنایا وہی طاقت ہر دور میں لوگوں کو متاثر کر کے حلقہ اسلام میں داخل کرتی رہی۔ اور وہ طاقت تلوار اور اقتدار کی نہ تھی بلکہ تعلیمات اسلامی کے حسن کی طاقت تھی جو لوگوں کو متاثر کرتی۔ غور وفکر کرنے کی بات ہے کہ یورپ کے مستشرقین سیدنا خالد بن ولیدؓ، سیدنا ابو عبیدہ بن جراحؓ، سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ، سیدنا عمرو بن عاصؓ اور دیگر مسلم جرنیلوں کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی خاراشگاف تلوار دیکھ کر شور مچاتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے لیکن وہ اس بات پر غور وفکر نہیں کرتے کہ ان لوگوں کو حلقہ اسلام میں کون سی چیز لائی تھی، اور صدیوں پرانی بتوں کی محبت ان کے دلوں سے نکال کر کس چیز نے اسلام کی محبت کا بیج بویا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے کئی عقل وخرد رکھنے والے مستشرقین نے اس الزام کی تردید کی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ چنانچہ تھامس کارلائل نے اسلام پر لگائے گئے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے:

Much has been said of Mahomet's propagation his religion by the sword. The sword indeed: but where will you get your sword! Every new opinion. at its starting. is precisely in a minority of one. In one man's head alone there it awells as yet. One man alone of the whole world believes it: there is one man against all men. He takes a sword and tryies to propagate with that. will do little for him. You must first get your sword. On the whole. a thing will propagate itself as it can. We do not

Marfat.com

find, of the Christian religion either, that it always disdained the Sword, when once it had got one. Charlemagne's conversion of the Saxons was not by preaching.
(On Hero and Hero Worship P.395-396)

اس بارہ میں بہت کچھ کہا گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے دین کو تلوار کے زور سے پھیلایا.......... اگر واقعی یہ دین تلوار کے زور سے پھیلا تھا تو وہ تلوار آئی کہاں سے تھی؟ ہر نئی رائے اور نیا نظریہ ابتداء میں صرف ایک شخص کے ذہن میں جنم لیتا ہے اور آغاز میں صرف ایک شخص اس رائے اور نظریہ پر یقین رکھتا ہے۔ ایک آدمی ایک طرف ہوتا ہے اور دوسری ساری انسانیت دوسری طرف۔ ان حالات میں وہ اکیلا آدمی اگر تلوار پکڑ کر کھڑا ہو جائے اور اپنے نظریہ اور رائے کی نشر واشاعت تلوار کے زور سے شروع کر دے تو وہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو گا۔ پہلے تلوار حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ شروع میں ہر شئی اپنی استطاعت کے مطابق اپنا پرچار خود کرتی ہے۔ عیسائیت کے بارہ میں بھی تاریخ ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ جب تلوار اس کے ہاتھ میں آ گئی تو اس کے بعد بھی اس نے ہمیشہ اس کے استعمال سے پرہیز کی۔ شارلیمان نے بھی سیکسن قبائل کو اپنی تبلیغ سے عیسائیت میں داخل نہیں کیا تھا۔

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد دعوتِ اسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت اسلام دور دور تک پھیل گیا تھا۔ اسلام کا یہ پھیلاؤ تلوار کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ دعوت کی قوت کی وجہ سے تھا۔ جوں جوں لوگ اسلام قبول کر کے متحد ہو رہے تھے عرب کے کمزور قبائل ان میں شریک ہوتے گئے۔ اسلام کے داعی کا یہ وعدہ تھا کہ اسلام قبول کرنے پر دشمنوں سے ان کی حفاظت کی جائے۔ یہ صرف وعدہ ہی نہیں تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حقیقی معنوں میں حفاظت بھی کی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سن کر ایک عرب چلا اٹھا: ہائے افسوس! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا، جب تک آپ زندہ تھے تو میں امن میں تھا اور اپنے دشمنوں سے محفوظ تھا۔ اس فریاد کی گونج تمام دیار عرب میں پھیل گئی۔

یہ بھی درست ہے کہ جو لوگ فتح مکہ کے بعد اپنا نفع نقصان سوچ کر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے ان میں دین کا وہ جوش اور ولولہ نظر نہیں آتا جو السابقون الاولون کے مسلمانوں میں تھا۔ لیکن ان میں بہت سے لوگ ایسے ضرور تھے جنہوں نے سچے مومنوں کی تعداد میں اضافہ کیا اور جن کے سینوں میں دین اسلام کی سچی تڑپ موجود تھی اور وہ دعوت دین کے لیے اور اپنے بھائیوں کی تعلیم و تلقین میں اپنی جانیں نثار کرنے کو بھی تیار تھے۔ صحابہ کرامؓ وہ لوگ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی وارث اور آپ کی

Marfat.com

تعلیمات کے سچے امین تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو آئندہ چل کر اسلام کے صحیح داعی بنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے ان میں ایک نیا انداز فکر اور ایک نیا شعور پیدا کیا۔ وہ اس سے قبل اس سے اعلیٰ وارفع اور مہذب تخیل سے کبھی آشنا نہیں ہوئے تھے۔ ان حضرات کو دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات اور تعلیمات کی تخم ریزی ایک نہایت عمدہ، زرخیز اور نفع بخش زمین میں ہوئی تھی۔ یہ جماعت جو آپ کی تعلیمات کے باعث سے پیدا ہوئی وہ نہایت اعلیٰ اوصاف کی حامل جماعت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی وراثت کے یہی وہ پاسبان تھے جو شجر اسلام کی بیخ و بن ثابت ہوئے جن سے بعد میں اسلام کے محدثین، فقہاء اور علماء پیدا ہوئے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے آپ کی رحلت کے بعد سیدنا ابوبکرؓ کی خلافت میں آپ کی ہدایات کے تحت شام کی مہمات میں بھرپور حصہ لیا۔ جب بعض لوگوں نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر اس پر کچھ اعتراض کیا تو سیدنا ابوبکرؓ نے ان کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انحراف نہیں کروں گا۔ یہ فوجی مہم ان جنگوں کے سلسلہ کی پہلی کڑی تھی جس میں عربوں نے شام، ایران اور شمالی افریقہ کو زیر نگین کیا۔ ایران کی قدیم سلطنت کو تہ و بالا کیا اور رومیوں سے ان کی سلطنت کے چند بہترین صوبے چھین لیے۔ اس طرح عرب فاتحین کے نقش قدم پر دین اسلام بھی پھیلتا رہا۔ یہ عظیم فتوحات جن سے ایک اسلامی اور عربی سلطنت کی بنیادیں پڑیں، یقیناً کسی جہاد کا نتیجہ نہیں جو اسلام پھیلانے کی غرض سے کی گئی ہوں، مگر ان فتوحات کے بعد عیسائیوں نے اس کثرت سے اپنے آبائی دین کو خیر باد کہا کہ مستشرقین نے اس سے یہی سمجھا کہ ان فتوحات کی غرض و غایت اشاعت اسلام ہی تھی۔ چنانچہ مستشرقین نے اپنی کتابوں میں لکھ دیا اور یہ لکھ کر انہوں نے دنیا کو دھوکا دیا کہ تلوار اسلامی تبلیغ کا آلۂ کار ہے۔ اور اس سے تیغ اسلام کی کامیابی سے اہل اسلام کی اصلی اور خالص تبلیغی سرگرمی نظر انداز ہوگئی۔

Marfat.com

عیسائی عربی قبائل کا قبول اسلام:

اسلامی فوجوں کا جن سرحدی علاقوں میں گزر ہوا وہاں سے بہت سے عربی قبائل بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ اس لیے یہ بات باعث تعجب نہیں کہ بہت سے عیسائی بدوی اسلام کی اشاعت کی تیز و تند رو میں بہہ نکلے اور ان عربی قبائل نے جو کئی صدیوں سے عیسائی چلے آ رہے تھے، اپنا مذہب ترک کر کے دین اسلام کو اختیار کر لیا۔ ان میں ایک بنو غسان کا قبیلہ بھی تھا۔ یہ فلسطین کے مشرقی صحرا اور جنوبی شام پر مسلط تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جن کی بابت یہ کہا گیا تھا کہ ''وہ زمانہ جاہلیت میں سردار تھے اور اسلامی دور میں بھی ستارے بن کر چمکے۔'' (مروج الذہب، مسعودی جلد ۴ ص ۲۳۸) اسی طرح ولیم میور مستشرق نے لکھا ہے کہ ۱۴ھ میں جب ایرانی لشکر نے قادسیہ کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھائی تو بہت سے عیسائی قبائل جو دریائے فرات کے دونوں کناروں پر آباد تھے، مسلمانوں کے امیر لشکر سیدنا سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس آئے اور کہا: ''جو قبیلے ہم سے پہلے حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے وہ ہم سے زیادہ عقل مند اور دانش مند نکلے۔ اب جب کہ ایرانی وزیر جنگ رستم مارا گیا ہے، ہم نیا دین (اسلام) قبول کرتے ہیں۔'' اس طرح شمالی شام کی فتح کے بعد بہت سے عیسائی بدوی قبائل دین اسلام میں داخل ہو گئے۔ (خلافت، ولیم میور ص ۱۲۱)

اس بارہ میں تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ قبول اسلام کے معاملہ میں مسلمانوں نے کوئی جبر و تعدی نہیں کی۔ یہ مسلمانوں کے اخلاق اور اس کی دعوتی قوت کا نتیجہ تھا کہ وہ سب قبائل حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند عیسائی قبائل سے عہد نامے کیے تھے اور ان کی مکمل حفاظت کا ان سے وعدہ کیا تھا اور اس بات کی بھی ضمانت دی تھی کہ وہ اپنے مذہبی معاملات اور امور میں آزاد رہیں گے۔ اور ان کے پادریوں کے حقوق اور اختیارات بدستور قائم رہیں گے۔ (تاریخ اسلام کہتانی جلد ۲ ص ۲۶۰، ص ۲۹۰)

Marfat.com

۱۳ھ میں جنگ جسر ہوئی۔ اس میں مسلمان فوج دریائے فرات اور ایرانی لشکر کے درمیان گر گئی اور قریب تھا کہ تمام مسلمان فوج تباہ ہو جائے، بنو طے کا ایک عیسائی سردار لپک کر آگے بڑھا اور ایک دوسرے عرب کے ساتھ مل کر امیر لشکر سیدنا مثنیٰ بن حارثہ کے دوش بدوش ایرانیوں کے مقابلہ میں ڈٹ گیا اور کشتیوں کے پل کی حفاظت میں سینہ سپر ہو گیا جس کے ذریعہ سے مسلمان فوج ترتیب کے ساتھ واپس ہو سکتی تھی۔ شکست کے اس داغ کو دھونے کے لیے جب تازہ دم افواج بھرتی کی گئیں اور ہر جانب سے لوگ کمک کے لیے آنے لگے تو ان میں بنو نمر کا وہ عیسائی قبیلہ بھی تھا جو رومی سلطنت کی حدود میں آباد تھا۔ اسی طرح جنگ بویب (۱۳ھ) میں اس آخری حملہ سے ذرا پہلے جس سے میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا، مثنیٰ بن حارثہ کے ساتھ ایک عیسائی سردار بھی تھا جن دونوں نے مل کر طوفانی حملہ کیا جس سے ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور اسلامی فتوحات کی شاندار فہرست میں ایک اور فتح کا اضافہ ہو گیا۔ اس معرکہ میں جن لوگوں نے داد شجاعت دی ان میں ایک دوسرے عیسائی بدوی قبیلے کا ایک نوجوان بھی تھا جو اپنے گھوڑ سوار ساتھیوں کے ساتھ میدان کارزار میں اس وقت نمودار ہوا جب مسلمان فوج اپنی صفیں درست کر رہی تھی۔ ان لوگوں نے اپنے ہم قوم عربوں کے ساتھ مل کر دشمن پر حملہ کیا۔ عیسائی نوجوان دشمن کے قلب میں گھسا اور ان کے سردار کو قتل کر کے اس کے آراستہ و پیراستہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور یہ نعرہ لگاتے ہوئے مسلمانوں کی صفوں میں آ گیا کہ "میں بنو تغلب میں سے ہوں اور میں نے ہی عجمی سردار کو قتل کیا ہے اور یہ اس کا گھوڑا ہے۔" (خلافت، میور ص ۹۰-۹۴) بنو تغلب وہ قبیلہ تھا جس نے ۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ایک سفارت بھیجی تھی۔ اس سفارت کے جو افراد مشرک تھے وہ تو دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور باقی ماندہ عیسائیوں کے ساتھ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عہد نامہ کیا جس کی رو سے وہ لوگ اپنے قدیم مذہب پر رہنے کے مجاز تھے۔ یہ قبیلہ ایک مدت دراز تک عیسائیت پر قائم رہا اور

Marfat.com

مسلمانوں نے کبھی بھی انہیں ترک عیسائیت پر مجبور نہ کیا۔ اسی طرح ۱۲ھ میں جب قبیلہ تنوخ کے اکثر لوگوں نے دوسرے عیسائی قبائل کے ساتھ مل کر خالد بن ولیدؓ کی اطاعت قبول کر لی تو ان میں سے اکثر لوگ مسلمان ہو گئے اور بعض لوگ قریباً ۱۵۰ سال تک اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے۔

حیرہ کے عیسائیوں کا معاملہ:

حیرہ اس زمانہ میں عرب کے نہایت مشہور شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ سیدنا خالد بن ولیدؓ نے جب اس کو فتح کیا تو انہوں نے اہل حیرہ کو اسلام قبول کرنے کی کچھ رغبت دلائی لیکن وہ اسلام کی طرف مائل نہ ہوئے۔ سیدنا خالد بن ولید کا یہ خیال تھا کہ ان کو رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں شامل کرنے کے لیے صرف اتنا یاد دلانا کافی ہے کہ ان کی رگوں میں عربی خون دوڑ رہا ہے۔ چنانچہ جب اہل حیرہ صلح کی شرائط کرنے کے لیے سیدنا خالد بن ولیدؓ کے پاس آئے تو سیدنا خالدؓ نے ان سے پوچھا: ''تم کون ہو؟ عرب ہو یا عجمی؟'' سردار وفد عدی نے کہا: ''ہم خالص عرب ہیں اور کچھ ہم میں متعرب ہیں۔'' سیدنا خالدؓ نے کہا کہ اگر تم عرب ہوتے تو تم ہماری مخالفت نہ کرتے اور نہ ہی ہماری بات سے کراہت کرتے۔'' اب تم تین باتوں میں سے ایک بات مان لو: اول تو ہمارا دین اختیار کر لو، اس صورت میں تمہارے حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو ہمارے ہیں۔ دوسرے جزیہ دو اور اگر یہ دونوں باتیں منظور نہیں تو پھر تیسری بات جنگ ہے۔ بخدا! میں تمہارے پاس ایسے لوگوں کو لایا ہوں جو مرنے کی اس سے زیادہ آرزو رکھتے ہیں جتنی کہ تم زندہ رہنے کی تمنا اور خواہش رکھتے ہو۔ عدی نے ان تینوں میں سے دوسری بات منظور کی یعنی کہا کہ ہم جزیہ دیں گے۔ خالدؓ نے کہا: ''تم لوگ بدقسمت ہو۔ یاد رکھو! کفر ایک ایسا بیابان ہے جس میں انسان اپنا راستہ کھو دیتا ہے۔'' مختصر یہ کہ اہل حیرہ نے اسلام قبول نہیں کیا بلکہ جزیہ قبول کر لیا لیکن سیدنا خالدؓ نے ان کے اسلام قبول نہ کرنے پر افسوس کا اظہار تو کیا ان پر جبر نہیں کیا کہ اسلام کو ضرور قبول کریں۔ جس سے

Marfat.com

صاف عیاں ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے مسلمان فاتحین اور ان کے بعد آنے والے مسلمانوں نے مسیحی عربوں کے ساتھ جس رواداری کا سلوک کیا اس سے یقینی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جن عیسائی قبائل نے اسلام قبول کیا تھا، انہوں نے اسے برضا و رغبت قبول کیا تھا کسی کے جبر سے قبول نہیں کیا تھا، یعنی یہ مسلمانوں کی دعوتی قوت کا اثر تھا ان کی تلوار کا اثر نہیں تھا۔ کیونکہ تلوار جسموں کو تو فتح کر سکتی ہے دلوں کو فتح نہیں کر سکتی۔ دلوں کو فتح دعوت اور اخلاق کرتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور دنیا کا کوئی ذی شعور شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں نے اپنی دعوتی قوت اور اخلاق سے اسلام کی نشر و اشاعت کی اور کسی شخص پر اسلام قبول کرنے کے لیے جبر و تشدد سے کام نہیں لیا۔ تاریخ میں ہے کہ جب مسلمان فوجیں اردن کی وادی میں پہنچیں اور سیدنا ابوعبیدہ بن جراحؓ نے فحل کے مقام پر اپنے خیمے نصب کیے تو ملک کے عیسائی باشندوں نے عربوں کو لکھا: کہ اے مسلمانو! ہم تمہیں رومیوں پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ ہمارے ہم مذہب ہیں کیونکہ تم ہمارے ساتھ عہد و پیمان کی پابندی کرتے ہو اور ہمارے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے ہو اور بے انصافی سے احتراز کرتے ہو اور تمہاری حکومت ہمارے اوپر ان کی حکومت سے بہتر ہے کیونکہ انہوں نے ہمارے گھروں اور ہمارے مال و متاع کو لوٹ لیا ہے۔ (فتوح الشام ازدی ص ۹۷) اسی طرح جب ہرقل شاہ روم کی فوج حمص کے قریب آئی تو شہر والوں نے فصیل کے دروازے بند کر دیئے اور اہل اسلام سے کہا: ہم تمہاری حکومت اور تمہارے عدل و انصاف کو رومیوں کی حکومت اور ان کی بے انصافی کے مقابلہ میں بہتر سمجھتے ہیں۔

(فتوح البلدان بلاذری ص ۱۳۷)

بیت المقدس کے عہد نامہ میں ذمیوں کے حقوق کا تحفظ:

سیدنا عمرؓ نے عیسائیوں کے ساتھ بیت المقدس کے بارے میں عہد نامہ کیا تھا اس میں بھی بیت المقدس کے لوگوں کو پورا پورا تحفظ دیا گیا۔ طبریؒ نے وہ عہد نامہ یوں نقل کیا ہے۔

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم: ھذا ما اعطیٰ عبداللہ عمر امیر المومنین اھل ایلیاء من الامان اعطاھم امانا لا نفسھم واموالھم ولکنائسھم وصلبانھم وسقیمھا وبریئھا وسائر ملتھا انہ لا تسکن کنائسھم ولا تھدم ولا ینتقص منھا ولا من حیزھا ولا من صلیبھم ولا من شئی من اموالھم ولایکرھون علیٰ دینھم ولایضار احد منھم۔ (طبری جلد۲ص۱۰۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○ یہ وہ امان ہے جو اللہ کے بندے عمر امیر المومنین نے ایلیاء والوں کو عطا کی۔ یہ امان ان کی جان و مال اور ان کے کلیسوں اور صلیبوں کے لیے ہے۔ ان کی ساری ملت، چاہے وہ بیمار ہوں یا تندرست سب شامل ہیں۔ ان کی عبادت گاہوں اور گرجوں میں سکونت اختیار نہیں کی جائے گی اور نہ ہی ان کو منہدم کیا جائے گا۔ ان کے گرجوں اور کنیسوں، ان کے ملحقات، ان کی صلیبوں اور ان کی جائدادوں میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ دین کے بارہ میں ان پر کوئی جبر و تشدد نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان میں کسی کو کوئی آزار اور تکلیف پہنچائی جائے گی۔

سیدنا عمرؓ کا غیر مسلموں سے حسن سلوک کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ سیدنا عمرؓ اور بطریق صفرینوس کلیسائے قیامت میں تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ پادری نے سیدنا عمرؓ سے کہا کہ آپ کنیسہ ہی میں نماز پڑھ لیں لیکن سیدنا عمرؓ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے انکار کر دیا اور فرمایا: اگر میں نے آج ایسا کیا تو ہو سکتا ہے کہ کل مسلمان یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ ہمارے خلیفہ نے چونکہ اس میں نماز پڑھی تھی اس وجہ سے یہ اسلامی معبد ہے اور یہ اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی۔

یہ بھی آپ کے ذمیوں سے حسن سلوک کی ایک بین دلیل ہے کہ آپ نے عیسائی جذامیوں کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا ہوا تھا۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۱۲۹) سیدنا عمرؓ نے اہل ذمہ کو اپنی آخری وصیت میں بھی فراموش نہیں کیا

اور اپنے جانشین کو اس کے اعلیٰ منصب کے فرائض یاد دلاتے ہوئے ان کے بارہ میں ہدایت فرمائی کہ

''میں اہل ذمہ کو تمہارے سپرد کر کے جا رہا ہوں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اور امان میں ہیں۔ ان کے ساتھ جو عہد و پیان کیا گیا ہے اس کی پابندی کی جائے اور اہل ذمہ پر ان کی طاقت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔''

(طبقات ابن سعد جلد ۳ ص ۲۴۶)

جزیہ:

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ عیسائیوں پر جزیہ صرف اس لیے لگایا جاتا تھا کہ انہیں اسلام قبول کرنے سے انکار تھا، لہٰذا جزیہ کے ذریعہ ان کو اسلام لانے پر مجبور کیا گیا۔ اس سوال کے جواب سے قبل جزیہ کی حقیقت سے آشنائی ضروری ہے۔ جزیہ کے بارہ میں علماء نے لکھا ہے کہ جزیہ اہل ذمہ سے ان کی جان و مال کی حفاظت کا ایک ٹیکس وصول کیا جاتا جس کو جزیہ کہتے ہیں۔ یہ جزیہ صرف ایسے مردوں پر لگایا جاتا ہے جو فوجی خدمت کے قابل ہوں۔ عورتیں، بچے اور نادار اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح بوڑھے، مسکین اور فقیر اور وہ اندھے، لنگڑے اور اپاہج بھی اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں جو مال نہیں رکھتے یعنی نادار اور قلاش اور مذہبی پیشواؤں کو بھی اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ پھر یہ ٹیکس اشخاص کی حیثیت کے لحاظ سے لگایا جاتا ہے۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ جزیہ امان کا بدلہ ہے یعنی انہیں امان دی گئی اور اس کے عوض انہوں نے جزیہ دیا۔ (تفسیر قرطبی جلد ۸ ص ۱۱۴) یہ معاوضہ کس بات کا لیا جاتا ہے اس بارہ میں مختلف اقوال ہیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

(۱) چونکہ ذمی یہ رقم اس امن کے معاوضہ میں دیتے ہیں جو انہیں اسلامی ریاست دیتی ہے۔ اس لیے اس کا نام جزیہ رکھا گیا جیسا کہ امام قرطبیؒ کے حوالہ سے لکھا گیا ہے۔

(۲) چونکہ ان ذمیوں کا خون نہیں بہایا جاتا لہٰذا ان کی جان بخشی کا معاملہ جزیہ

کہلاتا ہے۔ امام راغب اصفہانی بھی اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔

(۳) اہل ذمہ کی حمایت و مدافعت اور انہیں مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں فوجی بھرتی سے معافی دینے کے عوض جزیہ لیا جاتا ہے۔

(۴) جزیہ ذمیوں کو دیئے جانے والے ان حقوق کا معاوضہ ہے جن سے وہ مسلمانوں کے برابر ہو جاتے ہیں اور انہیں جان و مال اور عزت و آبرو اور دین کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔

یہ اقوال تفسیر المنار سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۳۰ کی تفسیر میں دیئے گئے ہیں۔

پھر جزیہ خود سربراہ مملکت عائد کرتا ہے لیکن ان سفارشات کے مطالعہ کے بعد جو فنی ماہرین قابل جزیہ افراد کے حالات کا جائزہ لے کر ارسال کرتے ہیں۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے عثمان بن حنیفؓ کو عراق اسی مطالعہ کے لیے بھیجا تھا اور انہوں نے واپس آکر اپنی تجاویز اور سفارشات سیدنا عمرؓ کو پیش کیں۔ سیدنا عمرؓ نے سواد عراق کے مالداروں پر ۴۸ درہم سالانہ اور ناداروں پر ۱۲ درہم سالانہ جزیہ عائد کیا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد سیدنا عثمان بن حنیفؓ دوبارہ آئے اور انہوں نے سیدنا عمرؓ سے اہل نسطاط کے بارہ میں بات کی اور کہا اللہ کی قسم! اگر فی کس دو درہم بڑھا دیں تو انہیں قطعاً دشوار معلوم نہ ہوگا۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ نے ۴۸ سے ۵۰ درہم سالانہ کر دیئے۔

(سنن کبریٰ بیہقی جلد ۹ ص ۱۹۶)

سیدنا عمرؓ نے اہل شام پر فی کس چار دینار سالانہ اور دو مد گیہوں اور تین قسط روغن زیتون عائد کیا تھا۔ (مصنف عبدالرزاق جلد ۶ ص ۸۵، کتاب الاموال ص ۳۹)

پھر جزیہ میں وہ اشیاء وصول کی جاتیں جن کا دینا ادا کنندگان کے لیے سہل ہوتا کیونکہ سیدنا عمرؓ چاہتے تھے کہ لوگوں کے لیے جزیہ کی ادائیگی میں سہولت پیدا ہو۔ چنانچہ اس علاقے کے لوگوں سے جہاں چاندی کا رواج تھا جزیہ میں چاندی وصول کر لیتے اور سونے والوں سے سونا لے لیتے۔ البتہ غیر مسلموں سے شراب اور خنزیر جزیہ میں لینا جائز

Marfat.com

نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں اشیاء مسلمانوں کے نزدیک مال نہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مصنف عبدالرزاق جلد ۱۰ص ۳۳۹، جلد ۶ ص ۸۷، موطا امام مالک جلد ۱ص ۲۸۹)

جزیہ چونکہ فوجی خدمت سے استثناء کے سبب اور جان و مال کے تحفظ کے لیے وصول کیا جاتا ہے اس لیے اگر ذمی غیر مسلم بھی فوجی خدمت کے لیے آمادہ ہوں اور ریاست ان پر اعتماد کر سکتی ہو تو ان کو جزیہ سے بری کیا جا سکتا ہے۔ (الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ ص ۱۱۱) چنانچہ جب حیرہ کے باشندوں نے جزیہ کی مقررہ رقم ادا کر دی تو انہوں نے اس بات کی خاص طور پر وضاحت کر دی کہ ہم نے یہ رقم اس شرط پر دی ہے کہ مسلمان اور ان کا امیر ہمیں ظالموں کے جور و ستم سے بچائے گا خواہ وہ ظالم مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ (طبری جلد ۲ص ۱۰۴) اور اسی طرح جب سیدنا خالد بن ولیدؓ نے حیرہ کے مضافات کے لوگوں اور قبائل کے ساتھ معاہدہ کیا تو انہوں نے معاہدہ میں لکھا تھا کہ ''اگر ہم تمہاری حفاظت کریں تو تمہیں جزیہ ادا کرنا ہوگا، اور اگر ہم تمہاری حفاظت نہ کر سکے تو اس صورت میں تم پر جزیہ واجب الادا نہ ہوگا۔ (طبری جلد ۲ص ۱۰۱)

جزیہ کی اس شرط کو مسلمان خوب سمجھتے تھے۔ اور ہر معاملہ میں اس کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ اس بات کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو سیدنا فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں پیش آیا۔ ہرقل قیصر روم نے اسلامی فوج کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے ایک بہت بڑا لشکر اکٹھا کیا۔ مسلمانوں نے بھی اطراف و جوانب سے اپنی فوجوں کو جمع کرنا شروع کر دیا تاکہ ہرقل کی فوجوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ چنانچہ سیدنا ابو عبیدہ بن الجراحؓ نے شام کے مفتوحہ شہروں کے حکام کو حکم دیا کہ ان شہروں سے جزیہ کی جو رقوم وصول ہوئی تھیں وہ اہل شہر کو واپس کر دی جائیں اور وہاں کے باشندوں کو لکھ بھیجا کہ جزیہ کی جو رقوم ہم نے تم لوگوں سے لی تھیں ان کو ہم واپس کرتے ہیں، کیونکہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ ایک لشکر جرار ہمارے مقابلہ کے لیے آ رہا ہے۔ ہم میں اور تم میں یہ معاہدہ تھا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے لیکن یہ بات اب ہماری طاقت سے باہر ہے۔ ہم ان

Marfat.com

شہروں کو جنگی مصلحت کے تحت خالی کر رہے ہیں لہٰذا جو کچھ ہم نے تم سے لیا تھا اسے واپس کرتے ہیں۔ اگر ہم فتح یاب ہوئے تو اپنے آپ کو سابقہ عہد نامہ کی شرائط کا پابند سمجھیں گے۔" چنانچہ حسب فرمائش تمام رقوم واپس کر دی گئیں اور عیسائیوں نے اسلامی فوجوں کو دعائیں دیں اور کہا کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو ہم پر حاکم بنائے اور رومیوں پر تم کو فتح ونصرت عطا فرمائے۔ اگر تمہاری جگہ رومی ہوتے تو ہمیں ایک حبہ بھی واپس نہ کرتے بلکہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اس کو بھی چھین لیتے۔ (کتاب الخراج لابی یوسف: ص ۸۱)

اسلام میں جزیہ کی وصولی میں سختی کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ جب شام کے سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے تو راستہ میں ان کا گذر کچھ ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جو دھوپ میں کھڑے کر دیئے گئے تھے اور ان کے سروں پر تیل ڈالا جا رہا تھا۔ آپ نے پوچھا: ان لوگوں نے کیا کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ان کے ذمہ جزیہ ہے جسے انہوں نے ادا نہیں کیا ہے، لہٰذا انہیں یہ سزا دی جا رہی ہے تاکہ وہ اسے ادا کریں۔ سیدنا عمرؓ نے پوچھا: یہ لوگ ادائیگی کے بارہ میں کیا عذر پیش کرتے ہیں؟ جواب دیا: یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ ہم جزیہ ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ آپ نے فرمایا: پھر تم لوگ ان کو چھوڑ دو اور ان پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالو کیونکہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ

"لوگوں کو عذاب نہ دو کیونکہ جو لوگ دنیا میں انسانوں کو عذاب دیتے ہیں ان کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ عذاب دے گا۔"

چنانچہ آپ کے حکم سے ان لوگوں کو چھوڑ دیا گیا۔

(کتاب الخراج لابی یوسف ص ۱۵۰، کتاب الاموال ص ۴۳)

اسلام لانے کی صورت میں جزیہ ساقط بھی ہو جاتا ہے۔ اگر جزیہ دینے والا مسلمان ہو جائے تو جزیہ ساقط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اہل الیس میں سے دو شخص مسلمان ہو گئے تو سیدنا عمرؓ نے ان سے جزیہ ساقط کر دیا۔ (سنن کبریٰ بیہقی جلد ۹ ص ۱۹۹) اسی

Marfat.com

طرح اہل نجران میں سے ایک شخص مسلمان ہو گیا۔ حکومت کے کارندوں نے اس سے جزیہ وصول کرنا چاہا۔ اس نے دینے سے انکار کیا تو سیدنا عمرؓ نے اس سے کہا: ''معلوم ہوتا ہے تم پناہ ڈھونڈ رہے ہو۔'' اس شخص نے کہا کہ اسلام پناہ ہی ہے اگر آپ دینا چاہیں۔'' سیدنا عمرؓ نے فرمایا: بیشک اسلام ہی جائے پناہ ہے اور اسی وقت حکم تحریر فرمایا کہ اس سے جزیہ نہ لیا جائے۔ (مصنف عبدالرزاق جلد ۱۰ص ۳۳۶)

عیسائی اعلیٰ مناصب پر:

یہ مسلمانوں کی رواداری اور بردباری تھی کہ مختلف خلفاء نے اپنے زمانوں میں غیر مسلموں اور عیسائیوں کو اعلیٰ مناصب پر متعین کیا۔ چنانچہ سیدنا معاویہؓ نے عیسائیوں کو بڑی کثرت سے اپنے ہاں ملازمت دی اور اس بارہ میں ان کے خاندان کے دوسرے افراد نے بھی ان کی پیروی میں مختلف عیسائیوں کو کلیدی آسامیوں پر متعین فرمایا مثلاً ایک عیسائی عرب جس کا نام الاخطل تھا، ان کا درباری شاعر تھا اور قدیس یوحنا دمشقی کا باپ خلیفہ عبدالملک بن مروان کا مشیر تھا۔ خلیفہ معتصم کی ملازمت میں دو بھائی تھے جو عیسائی تھے۔ ان میں سے ایک کا نام سلمویہ تھا۔ اس کا عہدہ سیکریٹری آف اسٹیٹ کا تھا یا اس کے برابر تھا۔ اور کوئی شاہی فرمان اس وقت تک مستند تصور نہ ہوتا تھا جب تک اس کے دستخط ثبت نہ ہوتے تھے۔ دوسرے بھائی کا نام ابراہیم تھا جس کی تحویل میں مہر خلافت رہتی تھی۔ وہ بیت المال پر بھی مامور تھا۔ خلیفہ کو اس سے اتنا انس تھا کہ جب وہ بیمار ہو گیا تو خلیفہ خود اس کی عیادت کے لیے گیا اور جب وہ مر گیا تو اس کی موت کا اس قدر رنج ہوا کہ ابراہیم کی تدفین کے دن خلیفہ نے حکم دیا کہ اس کا جنازہ شاہی محل میں لایا جائے اور تمام نصرانی رسوم نہایت متانت سے باضابطہ طور پر ادا کی جائیں۔

ایسے ہی عبدالملک بن مروان نے الرہا کے ایک عیسائی عالم اتاناسیوس کو اپنے بھائی عبدالعزیز بن مروان کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ جب عبدالعزیز مصر کا گورنر مقرر ہوا تو اتاناسیوس بھی اپنے شاگرد کے ساتھ مصر گیا اور وہاں بڑی دولت جمع کی۔ خلیفہ معتضد

Marfat.com

کے عہد میں انبار کا گورنر عمر بن یوسف ایک عیسائی تھا۔ خلیفہ نے اس کی تقرری کی منظوری اس بنا پر دی کہ اگر ایک عیسائی کسی عہدے کے قابل مل جائے تو اسے مامور کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح الموفق جو اپنے بھائی معتمد کے عہد خلافت میں سلطنت کے تمام سیاہ وسفید کا مالک تھا، فوج کا بندوبست ایک عیسائی اسرائیل کے سپرد کر رکھا تھا۔ خلیفہ معتضد کے کاتبوں میں ایک عیسائی مالک بن ولید تھا اور خلیفہ مقتدر کے زمانے میں فوج کا دفتر ایک عیسائی افسر کی تحویل میں تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ جبرائیل جو ہارون الرشید کا طبیب خاص تھا، نسطوری فرقے کا عیسائی تھا۔ آٹھ لاکھ درہم کے علاوہ جو اسے ہر سال اپنی ذاتی جائیداد سے حاصل ہوتے تھے، دو لاکھ اسی ہزار درہم سالانہ اسے خلیفہ کی خدمت کے صلہ میں ملتے تھے۔ دوسرا طبیب بھی عیسائی تھا جس کی سالانہ تنخواہ بائیس ہزار درہم تھی۔

کیا عیسائیوں نے بزور شمشیر عیسائیت ترک کی:

اس رواداری کے ماحول میں وہ تمام لوگ رہ رہے تھے جن کے شہروں پر مسلمان قابض ہو گئے تھے۔ اسلام کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی کسی غیر مسلم پر خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، زیادتی نہیں کی۔ چنانچہ اس آزادی کے پیش نظر جو مسلمانوں نے عیسائیوں اور دوسرے غیر مسلموں کو دی، لوگ اپنا مذہب ترک کر کے اسلام میں جوق در جوق داخل ہونا شروع ہو گئے کیونکہ انہوں نے ایسی آزادی کبھی اپنے ہم مذہبوں کے ہاتھوں نہیں دیکھی تھی۔ وہ مسلمانوں کے اخلاق سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بغیر دعوت کے ہی وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔ پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں کہ

> ''اس عام خیال کو قبول کرنا مشکل ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے اور ہم اس بات پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جبر واکراہ کی بجائے دوسرے اسباب کو تلاش کریں جو ان کے تبدیل مذہب کا موجب بنے۔ بدقسمتی سے اس موضوع سے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں اور ہمیں مجبوراً قیاس ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔''

اور معلومات ملتی بھی کیسے؟ کیونکہ عیسائیت کے ہاں تو کوئی تاریخی ذخیرہ نہیں ہے جس سے اس بارہ میں کوئی پتہ چلایا جا سکے۔ فون کریمر نے کیا ہی اچھا کہا ہے:

''ہم عرب مورخین کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی ان تھک کوششوں سے قدیم اسلامی عہد کے بارہ میں ہمارے لیے سیاسی اور فوجی معلومات کے ذخیرے جمع کر دیئے ہیں جو ایسے جامع اور مکمل ہیں جیسے کہ بارہ سو سال قبل جامع اور مکمل ہو سکتے تھے۔ مگر اس یادگار زمانے کی اندرونی تاریخ کا ہلکا سا خاکہ بھی ہمارے پاس موجود نہیں جس سے اس جنگ کا پتہ چل سکے جو ایک نئے اور ناپختہ مذہب (یعنی اسلام) کی ایک دوسرے قدیم اور ترقی یافتہ مذہب (یعنی عیسائیت) کے ساتھ ہوئی تھی۔''

بہرحال عیسائیت ترک کرنے کے جو اسباب مستشرقین نے لکھے ہیں ان میں ایک سبب بھی وہ نہیں جس کو آج ان الفاظ میں دہرایا جاتا ہے کہ ''اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔'' جو اسباب بتائے گئے ہیں ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

۱۔ آٹھویں صدی عیسوی کے ایران کے وہ زمیندار جو عیسائی کہلاتے تھے، وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام ایک بشر تھے اور خدا کے نبی اور رسول تھے۔ یہ لوگ اپنے عقائد میں عیسائیت کی بہ نسبت اسلام سے زیادہ قریب تھے اور جب عربوں نے ایران کو فتح کیا تو ان کے قبول اسلام سے نومسلموں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہوگا۔

۲۔ ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں مشرقی کلیسا کی اخلاقی اور روحانی پستی سے لوگوں کے دل عیسائیت اور کلیسا سے برگشتہ اور بیزار ہو گئے تھے اور وہ ایک پاکیزہ اور روحانی فضا کی جستجو میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے کیونکہ اسلام کے نظام اخلاق اور روحانیت نے انہیں بہت متاثر کیا۔

۳۔ مشرقی کلیساؤں کے پیروؤں میں اسلام کی اشاعت اس باعث بھی ہوئی کہ عوام ان موشگافیوں سے سراسر تنگ آ گئے تھے جو یونانی طرز فکر نے عیسائیت میں داخل کر

Marfat.com

دی تھیں۔ چنانچہ کبتانی کا بیان ہے کہ ''اہل مشرق صاف اور سادہ تصورات کو پسند کرتے تھے، لہٰذا مذہبی نقطہ نظر سے یونانی تہذیب ان کے لیے ایک آفت اور معصیبت ثابت ہوئی جس نے سیدنا مسیح علیہ السلام کی سادہ اور اعلیٰ تعلیمات کو ایک ایسے انسانی فہم سے بالاتر دین میں تبدیل کر دیا جو شکوک و شبہات سے پر تھا۔ ان شکوک نے لوگوں کے دلوں میں یاس اور نا اُمیدی کو جنم دیا اور عقیدت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسلام کی سادگی نے ان کو متاثر کیا کیونکہ ایک طرف تو وہ مختلف عیسائی فرقوں کی آئے روز کی چپقلش سے بیزار تھے، دوسری طرف عیسائیت کی ناقابل فہم تعلیمات سے وہ تنگ آ چکے تھے۔ چنانچہ اسلام کی قابل فہم تعلیمات اور اس کی سادگی سے متاثر ہو کر وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

۷ اکتوبر ۱۸۸۷ء کو کینن ٹیلر (Canon Taylor) نے انگلستان کے شہر وولورہیمپٹن چرچ کانگرس میں ایک مقالہ پڑھا جس میں اس نے لکھا کہ ''اس بات کا سمجھنا نہایت آسان ہے کہ اسلام جو دراصل یہودی مذہب کی اصلاح شدہ صورت ہے، افریقہ اور ایشاء میں اس قدر سرعت کے ساتھ کیسے پھیلا۔ افریقہ اور شام کے عیسائی علماء نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی جگہ دقیق، دشوار اور فلسفیانہ مسائل پیدا کر دیے تھے۔ اپنے زمانے کی بدکاری کا مقابلہ کرنے کی انہوں نے یوں کوشش کی کہ تجرد کی آسمانی خوبیوں کی تلقین کریں اور کنوارے پن کے ملکوتی وصف کی ستائش کریں۔ ترک دنیا تقدس کی راہ ٹھیری اور میل ملی رہبانوں کا خاصا۔ لوگ عملی طور پر مشرک تھے کیونکہ وہ شہداء، اولیاء اور ملائکہ کے ایک جم غفیر کی پرستش کرتے تھے۔ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقے مردانہ اوصاف کھو بیٹھے تھے اور متوسط طبقے کے لوگ محصولوں کے بار گراں کے نیچے دبے جا رہے تھے۔ باقی رہے غلام، ان کو نہ تو اس دنیا سے کسی فلاح و بہبود کی امید تھی اور نہ ہی آخرت میں۔ اسلام نے گویا ایک خدائی جھاڑو سے ان تمام توہمات اور خرافات کو خس و خاشاک کی طرح صاف کر دیا۔ اسلام کیا تھا؟ خالی خولی مذہبی مباحثات کے خلاف ایک بغاوت تھی اور اس تجرد کے خلاف جسے تقدس کا تاج سمجھا جاتا تھا، ایک

Marfat.com

مردانہ وار احتجاج تھا۔ اسلام نے مذہب کے بنیادی اصولوں کو پیش کیا یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، عظمت، رحمت اور عدالت کا اعلان کیا اور کہا کہ اسی کی ذات اطاعت اور تسلیم و رضا کی مستحق اور سزاوار ہے۔ اسلام نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ اور آخرت میں یوم حساب آنے والا ہے جہاں گنہ گاروں پر سخت عذاب نازل ہوگا۔ اس نے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کو فرض قرار دیا اور مصنوعی قسم کی نیکیوں اور مذہبی دجل و فریب کی سختی کے ساتھ تردید کی، اور بگڑتے ہوئے انسانی جذبات اور مذہبی مناظروں کی لفظی باریکیوں کی مذمت کی۔ اسلام نے رہبانیت کی جگہ مردانگی کو دی۔ غلام کو نجات کی امید دلائی۔ نوع انسانی کو اخوت کا درس دیا اور انسانی فطرت کے بنیادی حقائق کا اعتراف کیا۔"

۴- ترک عیسائیت کا ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ عربی زبان پوری اسلامی مملکت میں رائج ہوگئی۔ اور یہ ایک فطری اصول ہے کہ مفتوح اقوام فاتح قوم کی زبان اور آداب و اطوار بلکہ لباس تک کو اختیار کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتی ہیں۔ جیسا کہ آج دنیا بھر کی مفتوح اقوام انگریزوں کی زبان اور اطوار و آداب اختیار کرنے کو قابل فخر سمجھتی ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں مفتوح اقوام یعنی عیسائیوں اور مشرکین نے فاتحین کی زبان اور اس کے آداب و اطوار بہت جلد اختیار کر لیے اور ان کی قومی زندگی میں گھل مل گئے۔ ان حالات میں اسلام کی خاموش تعلیم سے ذمیوں کی مذہبی، عملی اور اخلاقی زندگی متاثر ہوئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ معتزلہ کی اس عقلی تحریک نے جو قریباً تین سو سال بڑے زور وشور سے جاری رہی، اس نے بھی عیسائی علماء اور دانش وروں کو متاثر کیا ہو اور ان کو ایسے مذہب سے برگشتہ کر دیا ہو جس کے مذہبی عقائد کا اس زمانے میں یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ ناممکن بات کو محض اس لیے واجب الیقین سمجھا جائے کہ وہ ناممکن ہے۔ چنانچہ مورخ مسعودی نے ایک قبطی کے ساتھ اپنی گفتگو کا ذکر کیا ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مشرق کے عیسائی فرقوں کا عام انداز فکر کیا تھا۔ قبطی نے کہا

Marfat.com

"میرے نزدیک عیسوی دین کی صداقت وصحت کی دلیل یہ ہے کہ میں اس کے عقائد کو باہم متناقض پاتا ہوں اور وہ ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں اور انسانی عقل ان کو رد کرتی ہے اور ان کے باہمی اختلاف اور تضاد کی وجہ سے لوگ ان سے بھاگتے ہیں۔ نہ تو غور وفکر سے ان کو تقویت ملتی ہے اور نہ ہی بحث ومباحثہ سے ان کی صحت ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی عقل اور حسی براہین سوچ بچار اور تحقیق کے بعد ان کی تائید کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود میں نے دیکھا ہے کہ بہت سی قوموں اور عظیم الشان بادشاہوں نے جو صائب الرائے تھے، ان کی اتباع اور پیروی کی ہے اور ان پر ایمان لائے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اگر عیسائی عقائد کو ان کے باہمی تناقض کے باوجود قبول کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے معجزات اور کرامات کا مشاہدہ کیا ہے جس سے وہ ان کی اتباع پر مجبور ہو گئے ہیں۔" (مسعودی جلد۲ ص ۳۸۷)

۵- کتابوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو عیسائی اور مسلمان علماء کے باہمی گہرے تعلقات سے براہ راست پیدا ہوئے کیونکہ بعض علماء کے نزدیک اس بات کی صریح شہادت موجود ہے کہ بازنطینی علماء اسلام کے عقائد کی باقاعدہ تشکیل وتدوین پر اثر انداز ہوئے تھے۔ چنانچہ عربی زبان میں اسلامی عقیدے کی جو قدیم ترین صورت اور ترتیب ہے، اس کا یوحنا دمشقی [1] اور دیگر نصرانی علماء کے دینی رسائل سے مقابلہ اور موازنہ ہو سکتا ہے۔ (فون کریمر جلد۲ ص ۸)

[1] یوحنا دمشقی (۶۷۶ء-۷۴۹ء) یہ اموی دور کا ایک نہایت ممتاز عالم تھا۔ دمشق کا مالی انتظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس منصب پر خلیفہ ہشام کے زمانے تک فائز رہا۔ اس نے دیگر کتابوں کے علاوہ ایک رسالہ بھی لکھا تھا جس میں اس نے سیدنا مسیح کی الوہیت اور انسانی مشیت کی آزادی اور خودمختاری سے بحث کی۔ اس رسالہ کی تصنیف کا یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ مناظرہ کرنے میں عیسائیوں کی راہنمائی کی جائے۔

Marfat.com

اسی طرح قدیم ترین عربی تصوف جس کا میلان خالص زہد کی طرف تھا۔ (اور جو زمانۂ مابعد کے اس تصوف سے مختلف تھا جس نے ہمہ اوست کا عقیدہ اختیار کیا) زیادہ تر مسیحی خیالات کے اثر سے پیدا ہوا۔ (فون کریمر جلد ۳ ص ۳۲) اور اس اثر کا پتہ خصوصاً بعض ایسے معتزلی علماء کے مسائل سے بھی چلتا ہے جو بازنطینی علماء کے طریقے پر خدا کی ذات و صفات کی بحث میں منہمک ہو گئے تھے۔ جیسے محمد بن الہذیل کی نسبت جو علماء معتزلہ میں سے تھا اور خلیفہ المامون کا استاذ تھا، کہ اس نے تین ہزار آدمیوں کو مسلمان کیا تھا۔ (کتاب الملل ص ۲۶) یہ صرف اس لیے کہ عیسائی اپنے اور مسلمانوں کے مسائل میں کچھ مماثلت سمجھتے تھے اس وجہ سے انہیں مسلمان ہونے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔ اسلام کے فرقہ قدریہ نے اپنے عقیدہ قدر کو غالباً عیسائیوں ہی کے اس مسلک سے براہ راست اخذ کیا تھا کہ انسان اپنے افعال و اعمال میں خود مختار ہے۔ اسی طرح مرجیہ نے جس نے دائمی عذاب جہنم سے انکار کیا، ان کا یہ عقیدہ بھی جو عام مسلمانوں کے عقیدے کے خلاف تھا، مشرقی کلیسا کی تعلیم کے ساتھ کلی مطابقت رکھتا تھا۔ (فون کریمر جلد ۲ ص ۳)

۶۔ غیر مسلم اقوام کا مسلمان ہونے کا ایک سبب راسخ العقیدہ علماء کا اثر و رسوخ تھا۔ ان کا زہد و تقویٰ اور اور دین اسلام پر استقلال نے غیر مسلم اقوام پر گہرا اثر چھوڑا اور اس وجہ سے انہوں نے نہایت تیزی سے اسلام کو قبول کیا۔ چنانچہ روایات میں ہے کہ جب امام احمد بن حنبلؒ نے انتقال فرمایا تو ان کے ارشاد و ہدایت سے بیس ہزار عیسائی، یہودی اور مجوسی مسلمان ہو چکے تھے۔ (ابن خلکان جلد ۱ ص ۴۵) اور امام ابن جوزیؒ نے جو اپنے زمانے کے ایک مقبول واعظ اور کثیر التصانیف عالم تھے، فخریہ فرمایا کرتے تھے کہ ان کے ہاتھ پر بیس ہزار کے قریب لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

۷۔ مشرقی اقوام کے نزدیک جو ہر بات میں خدا تعالیٰ کا ہاتھ کارفرما سمجھتے تھے، مسلمانوں کی فتوحات عربوں کی فتوحات نہ تھیں بلکہ اسلام کی فتوحات تھیں جو انہیں عیسائیوں اور مجوسیوں کے مقابلہ میں حاصل ہوئیں۔ ان فتوحات نے بھی غیر اقوام کے

Marfat.com

ایمانوں کو متزلزل کر دیا۔جو اہل اسلام کی محکوم بنیں اور جنہوں نے اسلامی فتوحات میں خدا کا ہاتھ کارفرما دیکھا۔ وہ اقوام دنیا کی خوش حالی اور اقبال مندی کو خدا کی مہربانی کا نتیجہ سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ رب الافواج صرف اپنے برگزیدہ لوگوں کو فتح و نصرت عطا فرماتا ہے، لہٰذا مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی میں انہیں اسلام کی حقانیت کی دلیل نظر آئی اس وجہ سے انہوں نے جلدی سے اسلام کو قبول کر لیا۔

۸۔ ان تمام اسباب کے علاوہ ایک اہم سبب اسلام کی متاثر کن تعلیمات بھی تھیں جیسے اسلامی اخوت کی تعلیم، جس کی رو سے تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی تصور کیے جاتے ہیں۔ اسلام کے اس اعلیٰ اصول میں غیر مسلموں میں بے انتہا کشش اور جاذبیت تھی۔ یہ اعلیٰ اصول اور کسی مذہب میں نہ تھا۔ چنانچہ جب غیر مسلم اقوام نے مسلمانوں کو محبت اور اخوت کے جذبہ کے تحت کام کرتے دیکھا تو وہ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔

یہ تھے وہ چند اسباب جن کی وجہ سے غیر مسلم اقوام اسلام کی طرف آئیں اور اسلام پہلی اور دوسری صدی میں خصوصی طور پر جنگل کی آگ کی طرح پھیلا کہ دنیا حیران وششدر رہ گئی۔ اس سرعت رفتاری کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ خراج کی جو آمدنی سیدنا عمرؓ کے عہد خلافت میں دس اور بارہ کروڑ درہم کے درمیان تھی وہ پچاس سال بعد عبدالملک بن مروانؒ کے زمانہ میں صرف چار کروڑ رہ گئی تھی۔ اس کمی کی وجہ عیسائیوں کا کثرت سے اسلام قبول کرنا تھا اور اس طرح سے وہ جزیہ کی ادائیگی سے بھی بری الذمہ ہو گئے تھے۔ (فون کریمر جلد ا ص ۱۷۲)

عمر بن عبدالعزیزؒ اور دعوت اسلام:

عمر بن عبدالعزیزؒ ایک نہایت پاکباز اور نیک طینت خلیفہ راشد تھے۔ ان کے زمانہ میں لوگوں کی ایک کثیر تعداد حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔ آپ نے اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے ایک باقاعدہ تحریک شروع کی اور مفتوحہ اقوام کو اسلام کی ہر طرح

Marfat.com

ترغیب دی۔ بلکہ ان کو مال و دولت بھی عطا کیا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے ایک عیسائی فوجی افسر کو ایک ہزار دینار دیے۔ جو اس زمانہ میں ایک بہت بڑی رقم تھی تاکہ وہ اسلام کی طرف راغب ہو۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۸) علاوہ ازیں انہوں نے ریاست کے تمام گورنروں کو احکام جاری کیے کہ وہ ذمیوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ چنانچہ جراح بن عبداللہ گورنر خراسان نے چار ہزار افراد کو مسلمان کیا۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵۸) بازنطینی شہنشاہ لیوسوم کو بھی ایک مراسلہ کے ذریعہ دین اسلام کی دعوت دی تھی۔ آپ نے یہ حکم بھی جاری فرمایا کہ اگر کوئی ذمی جزیہ کی سالانہ ادائیگی سے ایک روز پہلے اپنے دین کو خیر باد کہہ دے یا عین اس وقت جب اس کی ادا کردہ رقم ترازو میں تل رہی ہو، اسلام قبول کر لے تو اس کے جزیہ کی رقم اس کو واپس لوٹا دی جائے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۶۲) خلیفہ کی اراضی کے مسلمان مالکوں سے خراج کی وصولی بند کر دی گئی اور اس کے بجائے ان پر عشر لگا دیا گیا جو خراج کے مقابلہ میں بہت قلیل تھا۔ اگرچہ مالی اعتبار سے یہ احکام ریاست کے لیے نہایت نقصان دہ تھے لیکن ان کے اجراء کے بعد بہت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

صلیبی جنگیں اور دعوت اسلام:

عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان قریباً دو سو سال تک صلیبی جنگیں ہوتی رہیں۔ ان جنگوں میں بھی مسلمانوں کی زبانی اور خاموش دعوت اپنا کام کرتی رہی اور اس طرح بے شمار لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ گیارہویں صدیِ عیسوی کے اختتام کے قریب شام اور فلسطین کی عیسائی آبادی میں ایک جدید عنصر کا اضافہ ہوا۔ یہ عنصر لاطینی کلیسا کے ان کثیر التعداد صلیبیوں کا تھا جو یروشلم (بیت المقدس) میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان نو آباد عیسائیوں میں سے بعض لوگ کبھی کبھی اسلام قبول کرتے رہے، مثلاً پہلی صلیبی جنگ میں جرمنی اور لمبارڈی (شمالی اٹلی) کے باشندوں کا ایک گروہ، جو ایک سردار رینو کی سرکردگی میں تھا، اصل لشکر سے جدا ہو گیا۔ یہ شخص بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ترکوں کے ہاں جا کر مسلمان ہو گیا۔

Marfat.com

سلطان صلاح الدین ایوبی اور دعوت اسلام:

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ اگرچہ ایک بہادر جرنیل اور سلطان تھا لیکن اسلام کی اشاعت وتبلیغ میں اس نے ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کا معمول یہ تھا کہ وہ اسلام کی ترغیب دیتا تھا۔ سلطان صلاح الدین کی حسن سیرت اور شجاعت نے اس کے عیسائی معاصرین کے دلوں پر ایک عجیب افسوں کیا ہوا تھا اور بعض عیسائی بہادروں کے لیے اس کی شخصیت میں اس قدر کشش اور جاذبیت تھی کہ وہ اپنے مذہب کو چھوڑ کر دین اسلام میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ اس کی مثال ایک انگریز کی ہے جس کا نام رابرٹ (Robert) تھا اور جو سینٹ البنس کا رہنے والا تھا۔ اس نے ۱۱۸۵ء میں عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کر لیا اور بعد ازاں سلطان کی ایک نواسی سے شادی کر لی۔ اسی زمانہ میں سلطان صلاح الدین اور طرابلس الشام کے حاکم ریمنڈ سوم کے مابین ایک معاہدہ ہوا تھا کہ ریمنڈ اپنے ماتحتوں کو مسیحی دین چھوڑ کر اسلام اختیار کرنے کی ترغیب دے گا لیکن ریمنڈ کی اچانک موت کی وجہ سے اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔ (روجر ہوڈن جلد ۲ ص ۳۱۶-۳۲۲)

جب بیت المقدس عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے ارض مقدس کی فتوحات حاصل کیں تو ان باتوں نے اہل یورپ کو تیسری صلیبی جنگ برپا کرنے پر برانگیختہ کیا۔ اس جنگ کا سب سے بڑا واقعہ شہر عکّہ کا محاصرہ ہے جو ۱۱۸۹ء سے لے کر ۱۱۹۱ء تک جاری رہا۔ اس لڑائی میں قحط اور بیماری کی وجہ سے عیسائی لشکر کو جن ہولناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا، ان سے مجبور ہو کر بہت سے عیسائیوں نے اپنے لشکر کو چھوڑ دیا اور فاقہ کشی سے نجات پانے کے لیے مسلمانوں کی لشکر گاہ میں چلے گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد بہت سے لوگ مسیحی لشکر میں واپس آ گئے لیکن بہت سے لوگوں نے اپنی قسمت کو اہل اسلام کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ بعض نے مسلمانوں کی ملازمت اختیار کر لی لیکن وہ اپنے دین پر قائم رہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے نئے آقاؤں سے نہایت خوش تھے۔ اور بعض اسلام قبول کر کے اچھے اور نیک مسلمان ثابت ہوئے۔ اس عہد کے

Marfat.com

بعد جو عیسائی اپنا دین چھوڑ گئے تھے، ان کا ذکر بکثرت ان سیاحوں کی تحریروں میں ملتا ہے جنہوں نے ارض مقدس اور دوسرے مشرقی ملکوں کا سفر کیا تھا۔ جب لوئی شاہ فرانس گرفتار ہو گیا اور اس نے اپنی رہائی کے لیے ۱۲۵۰ء میں زر فدیہ ادا کرنے کا حلف اٹھایا تو اس موقع پر حلفیہ کلمات کے تجویز کرنے والے وہ لوگ تھے جو پہلے پادری تھے مگر اب مسلمان ہو چکے تھے۔

جو عیسائی زائرین ارض مقدس میں جاتے تھے، ان کے مسلمان ہو جانے کا خطرہ اتنا شدید تھا کہ اموری دی لاروش نے، جو فرانس میں نائٹ ٹمپلرز کا سردار تھا، ۱۲۶۶ء کے قریب ایک یادداشت لکھی تھی اور اس میں اس نے پاپائے روم، فرانس اور صقلیہ کے سفیروں سے درخواست کی تھی کہ وہ ایسے لوگوں کو سمندر عبور کر کے فلسطین جانے سے روکیں جو نادار یا بوڑھے ہوں یا ہتھیار اٹھانے کے قابل نہ ہوں، کیونکہ اس قسم کے لوگ یا تو مارے جاتے ہیں یا گرفتار ہو جاتے ہیں یا پھر اپنا دین ترک کر کے مرتد ہو جاتے ہیں (یعنی مسلمان ہو جاتے ہیں۔)

Marfat.com

افریقہ میں دعوتِ اسلام کے اثرات

افریقہ میں اسلام پہلی صدی ہجری ہی میں پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں براعظم افریقہ میں کثرت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔

مصر میں دعوتِ اسلام:

افریقہ میں اسلام کی ابتداء ۱۸ھ میں ہوئی جب مسلمان فوجوں نے سیدنا عمرو بن عاصؓ کی زیر قیادت مصر پر چڑھائی کی۔ جنگ یرموک کی فتح کے بعد سیدنا عمرو بن عاصؓ کے دل میں مصر کی فتح کا خیال انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ ۱۶ھ میں جب سیدنا عمرؓ بیت المقدس کی صلح کے لیے وہاں تشریف لے گئے تو سیدنا عمرو بن عاصؓ نے ان سے وہاں مصر کی فتح کا ذکر کیا۔ اپنی گفتگو میں انہوں نے مصر کی بے شمار نعمتوں کی تصویر بھی کھینچی اور اس کے دوسرے حالات بھی بیان کیے۔ سیدنا عمرؓ نے ان کی باتیں نہایت غور سے سنیں پھر ان پر غور و خوض بھی کیا لیکن حملہ کرنے کی اجازت نہ دی۔ دیکھا یہ گیا کہ سیدنا عمرؓ سے مصر پر حملہ کے لیے جب بھی بات کی گئی تو وہ سوچ میں پڑ جاتے تھے کیونکہ ۱۶ھ کے آخر تک پورا شام مسلمانوں کے زیر اقتدار نہیں آیا تھا۔ یہ صورت حال ۱۷ھ کے آخر تک رہی، اس لیے سیدنا عمرؓ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ مصر میں رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے اپنی فوجیں شام سے مصر بھیج دیں۔ اس لیے آپ کو اس بارہ میں تردد تھا۔ مدینہ

Marfat.com

واپس آ کر سیدنا عمرؓ نے سیدنا عمرو بن عاصؓ کی تجاویز پر غور وفکر شروع کر دیا۔ سیدنا عمرؓ نے ان کی اس تجویز کو اس لیے بھی رد نہ کیا کہ وہ سیدنا عمرو بن عاصؓ کی جنگی مہارت اور سیاسی بصیرت سے بخوبی آشنا تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر سیدنا عمرو بن عاصؓ مصر کی مہم پر روانہ ہوئے تو وہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گے اور واقعات نے ثابت بھی کر دیا کہ آپ کا یہ اندازہ غلط نہ تھا۔ سیدنا عمرو بن عاصؓ بڑے ذہین اور ٹھنڈے دماغ کے آدمی تھے۔ وہ سیدنا خالد بن ولیدؓ کی طرح آتش زار جنگ میں بے دھڑک کود پڑنے کا نام بہادری نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ عجلت و بے صبری کے مقابلہ میں استقلال اور صبر وتحمل کو کامیابی کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ ان کی دلیری، سمجھ بوجھ کی دلیری ہوتی تھی۔ جس وقت سیدنا عمرو بن عاصؓ کے ذہن میں مصر فتح کرنے کا خیال آیا تھا اس وقت ان کی عمر پچاس کے پیٹے میں تھی یا اس سے کچھ زیادہ تھی۔ زمانہ جاہلیت میں بھی وہ ذہین اور فہیم لوگوں میں شمار ہوتے تھے، اسی وجہ سے قریش مکہ نے انہیں اس وفد کا رئیس بنا کر بھیجا تھا جو نجاشی کے دربار میں مسلمانوں کے خلاف گیا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے لیکن انہوں نے نجاشی کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرنے میں قوت استدلال کے زور بیان کا حق ادا کر دیا۔

مدینہ پہنچ کر سیدنا عمرؓ نے اصحاب الرائے کو اکٹھا کیا اور سیدنا عمرو بن عاصؓ کی خواہش اور ان کے دلائل ان کے سامنے رکھے۔ حاضرین نے اختلاف کیا۔ سیدنا عمرؓ کی چونکہ اپنی رائے اب فتح مصر کی تھی اس لیے انہوں نے سیدنا عمرو بن عاصؓ کو مصر جانے کا مشورہ دے دیا اور شریک بن عبدہؓ کے ہاتھ انہیں ایک خط لکھا کہ

"لوگوں کو مصر چلنے کی دعوت دو اور جو تیار ہوں انہیں ساتھ لے کر مصر روانہ ہو جاؤ۔"

سیدنا عمرؓ کی اس ہدایت کے تحت سیدنا عمرو بن عاصؓ نے مصر پر چڑھائی کی۔

تین سال کے بعد بازنطینی فوجیں مصر سے واپس بلا لی گئیں اور ان کی روانگی سے عیسائیوں کی ایک کثیر تعداد مسلمان فاتحین کی محکوم ہو گئی۔ اس مہم میں مسلمان فوجوں نے

Marfat.com

بہت جلد کامیابی حاصل کی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ مقامی عیسائیوں نے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ وہ بازنطینی حکومت سے سخت نفرت کرتے تھے، نہ صرف اس لیے کہ ان کا نظام حکومت جابرانہ اور ظالمانہ تھا بلکہ مذہبی بغض وعناد کی تلخی اور درشتی کو بھی اس میں بہت کچھ دخل تھا۔ عیسائی آبادی کے اکثر لوگ یعقوبی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور یونانی کنیسہ کے پیروکار تھے، جن کا تعلق بازنطینی دربار سے تھا، وہ ان سے بہت سختی سے پیش آتے تھے۔ انہوں نے ان کی اس درجہ توہین وتحقیر کی تھی کہ ان کی اولاد نے ان سختیوں کو ابھی تک فراموش نہیں کیا تھا۔ یعقوبی فرقے کے بعض لوگوں کو سخت اذیتیں دی گئیں اور اس کے بعد ان کو سمندر میں پھینک دیا گیا۔ بہت سے لوگ ان ظالموں کے پنجۂ عذاب سے بچنے کے لیے اپنے بطریق کے ہمراہ اپنا وطن چھوڑ گئے۔ اکثر لوگوں نے اپنے حقیقی عقائد کو چھپایا اور یہ ظاہر کیا کہ ہم مجلس خلقدونہ کے فیصلوں کو تسلیم کرتے ہیں بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ''قیصر یوستینین کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اسکندریہ میں دو لاکھ قبطیوں کو مروا ڈالا تھا اور اس کے جانشینوں کے ظلم وستم سے تنگ آکر بہت سے قبطیوں نے صحرا میں پناہ لے لی تھی۔

(Wansleben: The Present State of Egypt. P.11)

مصر میں اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد قبطیوں کو اپنی مذہبی زندگی میں ایسی آزادی حاصل ہوئی جو ان کو ایک صدی سے نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جزیہ کی وصولی کے بعد سیدنا عمرو بن عاصؓ نے ان کی عبادت گاہوں کو ان کے قبضے میں رہنے دیا اور تمام مذہبی معاملات میں ان کو خود مختار بنا دیا، اور گذشتہ حکومت کی مسلسل دست اندازی سے ان پر جو بار تھا، اس سے ان کو آزاد کر دیا۔ انہوں نے کلیسا کے اوقاف پر ہاتھ نہیں ڈالا اور نہ ہی کسی قسم کی اور غارت گری جائز رکھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومت کے ابتدائی ایام میں قبطیوں کی حالت بہت اچھی تھی۔ اور اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ قبطیوں کا اس کثرت کے ساتھ اسلام میں داخل ہونا مسلمان حکام کے جبر واکراہ یا

ناجائز دباؤ کا نتیجہ تھا۔ ابھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی اور مصر کا دارالحکومت اسکندریہ عرب حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہا تھا کہ اکثر قبطیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ چنانچہ سیدنا عثمانؓ کے عہد خلافت میں مصر کے محاصل کی مقدار ایک کروڑ بیس لاکھ تھی، لیکن مصر کے لوگ اس کثرت سے مسلمان ہوئے کہ چند سال کے بعد سیدنا معاویہؓ کے عہد خلافت میں یہ آمدنی پچاس لاکھ رہ گئی اور سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہد خلافت میں یہ آمدنی اور بھی کم ہوگئی۔ یہاں تک کہ مصر کے گورنر حیان بن شریح نے یہ تجویز پیش کی کہ آئندہ جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوں ان کو جزیہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ نہ کیا جائے، لیکن سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس تجویز کو منظور کرنے سے یک قلم انکار کر دیا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی اسلام بنا کر بھیجا تھا، ٹیکس وصول کرنے کے لیے نہیں بھیجا تھا، (طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۸۳) بعد میں حفص بن ولید نے ۷۴۴ء میں اعلان کیا کہ جو لوگ مسلمان ہو جائیں گے وہ جزیہ کی ادائیگی سے بری الذمہ ہوں گے تو چوبیس ہزار عیسائی دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(تاریخ بطارکۂ اسکندریہ از ساویرس، ص ۱۷۲)

اسلامی عہد کی ابتداء میں مصر میں اسلام جس سرعت اور تیزی کے ساتھ پھیلا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اس کی اشاعت میں کوئی خاص کوشش کی گئی تھی بلکہ اس کا زیادہ تر سبب یہ تھا کہ عیسائی مذہب میں اب وہ کشش اور جاذبیت باقی نہیں رہی تھی جس کی بدولت عیسائی لوگ اپنے مذہب پر ثابت قدم رہ سکتے۔ الٰہیات کے وہ مسائل جن کی بنا پر یعقوبی فرقے کی الگ بنیاد پڑی تھی اور جن کے ساتھ وہ مدت دراز تک بڑی جدوجہد سے قربانیاں دے کر وابستہ رہے تھے، ان مسائل نے اب ایسے عقائد کی صورت اختیار کر لی تھی جو فلسفیانہ نوعیت کے تھے اور نہایت دقیق اور عسیر الفہم تھے، لہٰذا بہت سے لوگوں نے ان غیر متناہی مباحثوں سے پریشان اور ملول ہو کر ایک ایسے دین کی طرف رخ کیا جس کی تعلیم کو خدا کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت جیسے سادہ اور

Marfat.com

آسان کلمے میں مختصراً بیان کر دیا گیا ہے یارہویں صدی عیسوی میں قدلیس انطونی کی خانقاہ میں جو اطفیح میں دریائے نیل کے کنارے پر واقع تھی، ایک راہب گذرا ہے جس کا نام بدوطس تھا۔ یہ شخص عیسائی عقائد کا بڑا عالم تھا اور راہبانہ زندگی کے فرائض اور شریعت کے احکام پر پورا عبور رکھتا تھا، اس کے عقائد ان عقائد سے مختلف ہو گئے جن کو ۳۱۸ علماء کی مجلس نے نیقیہ میں منظور کیا تھا۔ اس نے بہت سے ایسے اشخاص کے خیالات تبدیل کر دیئے جنہوں نے صحیح عقائد کی تعلیم نہیں پائی تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ ہمارا خداوند یسوع مسیح بھی دوسرے پیغمبروں کی طرح ایک پیغمبر تھا۔ وہ اپنی ملت کے رذیل ترین طبقے کے ساتھ میل ملاپ رکھتا تھا۔ اکثر راہب کا لباس پہنتا تھا۔ جب اس سے اس کے مذہب اور عقیدت کے بارہ میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ میں خدا کی وحدانیت کا قائل ہوں۔ اس کے عقائد ایک عرصہ تک شائع رہے جن کا خاتمہ ۱۱۲۳ء میں ہوا جب اس نے وفات پائی تو اس کی یاد ہمیشہ کے لیے فراموش ہو گئی۔

(مصر کے گرجے اور خانقاہیں، از ابو صالح ص ۱۶۳-۱۶۴)

اس کے علاوہ عیسائی زندگی کے ایک ایسے نظریے میں جس کا بلند ترین مظہر ایک نہایت مذموم قسم کی رہبانیت تھی، اسلام کے نظام اخلاق کے مقابلہ میں، جس کی بنیاد اسلامی فطرت پر ہے، لوگوں کے لیے بہت کم کشش اور جاذبیت تھی۔ اس وجہ سے بھی مصر کے لوگ نہایت سرعت کے ساتھ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا عہد:

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے عہد حکومت میں مصر کے عیسائی اس کی رواداری کے باعث بہت خوش تھے۔ جو ٹیکس ان پر لگائے گئے تھے ان میں تخفیف کر دی گئی اور بعض بالکل موقوف کر دیئے گئے۔ سرکاری دفتروں میں کاتبوں، محاسبوں اور محافظوں کے عہدوں پر بکثرت قبطی مقرر ہوئے اور صلاح الدینؒ کے جانشینوں کے زمانے میں قریباً ایک سو سال تک ان کو بدستور مذہبی آزادی اور سلاطین کا لطف وکرم

Marfat.com

میسر رہا۔ ان کو اپنے مذہبی پیشواؤں کی رشوت ستانی اور خرابی کے سوائے اور کوئی شکایت نہ تھی۔ کلیسا کے منصوبوں کو خریدنے اور فروخت کرنے کا دستور اس حد تک عام ہو چکا تھا کہ پادریوں کے عہدے جاہل اور بدکار لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیئے جاتے تھے اور اس مقدس منصب کے جو امیدوار اپنی تقرری سے قبل مطلوبہ رقم ادا نہیں کر سکتے تھے ان کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے باوجود حقارت سے رد کر دیا جاتا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ عیسائیوں کی دینی اور اخلاقی تعلیم و تربیت گلدستہ طاق نسیان ہو گئی، اور ان کی زندگیوں میں افسوس ناک تنزل آ گیا۔ کلیسا کی خرابی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ جب ۱۲۱۶ء میں چوہترواں یعقوبی بطریرک یوحنا انتقال کر گیا اور اس کے جانشین کے انتخاب کی ضرورت پیش آئی تو مخالف فریقین نے جو حریف امیدواروں کی حمایت کر رہے تھے، بڑی تیزی اور تندی کے ساتھ اس جھگڑے کو بیس (۲۰) برس تک جاری رکھا جس کا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ اس تمام عرصہ میں ان کو نہ تو کسی رسوائی کی پروا تھی اور نہ ہی اپنے اس جھگڑے کے مضر نتائج کا کوئی احساس تھا۔ حاکم وقت نے کئی مرتبہ مخالف فریقین کے مابین صلح کرانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے سلطان کو تین ہزار، پانچ ہزار بلکہ دس ہزار اشرفیوں تک رشوت دینی چاہی تاکہ وہ اپنے رعب حکومت سے کام لے کر ان کے امیدوار کو انتخاب میں کامیاب کرائے، لیکن سلطان نے نہ صرف اس رقم کو لینے سے انکار کیا بلکہ وہ نذرانہ بھی معاف کر دیا جو ہر نیا بطریق دستور کے مطابق اپنے انتخاب کے بعد سلطان کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا کیونکہ سلطان چاہتا تھا کہ عیسائی اپنے جھگڑے بالائے طاق رکھ کر آپس میں مصالحت کر لیں، لیکن اس کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اسی اثناء میں پادریوں کے بہت سے عہدے خالی ہو گئے اور جو پادری اس عرصہ میں فوت ہوئے ان کی جگہ دوسرے پادری مقرر نہ ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیس مکاریوں کی خانقاہ میں صرف چار راہب رہ گئے جب کہ گذشتہ پادری کے زمانے میں وہاں اسی (۸۰) سے زیادہ راہب رہتے تھے۔

(انودو: ص ۵۶۷-۵۷۵) مغربی اضلاع کے عیسائیوں کی طرف سے ارباب کلیسا اس حد تک غافل ہوئے کہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔

حبشہ میں دعوتِ اسلام:

حبشہ کے لوگوں نے دو صدی قبل عیسائی مذہب اختیار کیا تھا اور وہ بھی یعقوبی کلیسا کے پیروکار تھے۔ بحر احمر کے مغربی سواحل جو حبشہ کی مملکت میں شامل تھے، ان کی سمت عربوں کی ہجرت ظہور اسلام کے کئی سو سال بعد شروع ہوئی۔ دسویں صدی عیسوی تک صرف چند مسلمان خاندان تھے جو حبشہ کے ساحلی شہروں میں آباد تھے لیکن بارہویں صدی کے اختتام پر وہاں ایک عربی حکمران خاندان برسر اقتدار آیا جس نے چند ساحلی اضلاع مملکت حبشہ کے قبضہ سے نکال لیے۔ ۱۳۰۰ء میں ایک مبلغ ابوعبداللہ نامی حبشہ میں جا پہنچا اور لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ دوسرے سال اس نے دو لاکھ آدمی اپنے گرد اکٹھے کر لیے اور امحرہ کے حاکم کے ساتھ معرکہ آرائی کی۔ (مقریزی جلد ۲ ص ۱۸۳) شاہ سیف ارعاد (۱۳۴۲ء-۱۳۷۰ء) نے اپنی مملکت کے مسلمان باشندوں کے خلاف سخت کارروائی کی۔ جن لوگوں نے عیسائی مذہب اختیار کرنے سے انکار کیا اس نے ان کو مروا ڈالا یا جلا وطن کر دیا۔ چودہویں صدی عیسوی کے خاتمہ پر حبشہ کی خانہ جنگیوں سے ملک میں جو افراتفری اور بدنظمی پیدا ہوئی، اس کی وجہ سے ساحل کی عربی بستیاں تمام ساحلی علاقے کی مالک بن گئیں اور انہوں نے اہل حبشہ کو اندرون ملک دھکیل دیا۔ چنانچہ شاہ بائدہ ماریام (۱۴۶۸ء-۱۴۷۸ء) نے اپنے عہد حکومت کا اکثر و بیشتر حصہ ان مسلمانوں کے ساتھ جنگ و جدل میں گزار دیا جو اس کی مملکت کے مشرقی حصہ میں رہتے تھے۔ (مقریزی جلد ۲ ص ۲۴۷)

حبشہ میں اسلام کے فروغ کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ حبشہ کے عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمان اخلاقی برتری رکھتے تھے۔ چنانچہ جب کسی خالی نشست کے لیے کسی دیانتدار اور قابل اعتماد شخص کو منتخب کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی تھی تو اس کے

لیے ہمیشہ کسی مسلمان کا انتخاب عمل میں آتا تھا کیونکہ عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمان زیادہ دیانت دار، امین اور چست و چالاک تھے۔ اور ہر مسلمان اپنے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتا تھا لیکن اس کے برعکس عیسائی اپنے بچوں کو صرف اسی صورت میں علم سے آشنا کرتے تھے جب ان کو پادری اور راہب بنانا مقصود ہوتا تھا۔

گذشتہ سطور میں جنوبی افریقہ کی فتوحات کا ذکر تھا۔ جنوبی افریقہ کے علاقہ جات خصوصی طور پر مصر کو مسلمانوں نے آسانی سے فتح کر لیا تھا کیونکہ وہاں کے باشندوں نے بازنطینی حکومت کو ختم کرنے میں ان کی اچھی خاصی مدد کی لیکن شمالی افریقہ میں انہیں خون ریز جنگیں لڑنی پڑیں۔ رومیوں اور بربروں نے مدت دراز تک ان کی سخت مزاحمت کی اور ان کی فتوحات کے راستہ میں حائل رہے، لہٰذا نصف صدی گزرنے سے پہلے عرب لوگ افریقہ کے شمالی ساحل پر یعنی مصر سے لے کر بحر اوقیانوس کے کنارے تک پورے طور پر مسلط نہ ہو سکے۔ آخر کار ۶۹۸ء میں قرطاجنہ کی فتح سے افریقہ میں رومی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اور بربروں کو مغلوب کرنے کے بعد مسلمان اس ملک کے قطعی مالک بن گئے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے عیسائی آبادی پر ظلم وستم کر کے ان کو جبراً مسلمان نہیں بنایا اور نہ ہی اسلام کی تعلیمات میں یہ ہے بلکہ اسلام تو کسی پر جبر کرنے کے سخت خلاف ہے۔ لیکن ایک خون ریز اور طویل جنگ کے دوران میں قتل و غارت، تباہی و بربادی اور دیگر آفات ومصائب کی کثرت رہی ہے مگر اس بات کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ محض اختلاف مذہب کی بنا پر کسی پر جور وستم کیا گیا ہو۔ مقامی کلیسا مسلمانوں کی فتوحات کے بعد بھی آٹھ صدی سے زیادہ عرصہ تک باقی رہا۔ اس سے مسلمانوں کی اس رواداری کا ثبوت ملتا ہے جس کے بغیر یہ کلیسا کبھی بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

Marfat.com

اندلس میں دعوتِ اسلام

اندلس جس کو آج کل اسپین (Spain) کہتے ہیں قریباً آٹھ سو سال تک خلافت اسلامیہ کا مرکز رہا۔ مسلمان ۷۱۱ء میں یہاں آئے اور پھر ۱۵۰۲ء میں شاہ فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابیلہ نے ایک فرمان کے ذریعہ سے اپنی مملکت میں دین اسلام کی مکمل طور پر ممانعت کر دی۔ اس دوران جو صدیاں گزریں ان میں مسلمانان اندلس اپنے شاندار سیاسی، علمی اور تمدنی کارناموں کی بدولت یورپ کی قرون وسطیٰ کی تاریخ میں ایک نہایت شاندار اور تابناک باب کا اضافہ کر چکے تھے جس کی کچھ تفصیل ہم نے اپنی کتاب (Islam's Contribution to Civilisation) میں کر دی ہے اس کا اثر جنوبی فرانس کے راستہ سے یورپ کے دوسرے ملکوں تک پہنچا جس سے ایک نئی طرز کی شاعری اور ایک نئی تہذیب عالم وجود میں آئی۔ یورپ کے عیسائی علماء نے یونانی فلسفہ و حکمت اسلامی اندلس ہی سے حاصل کیا تھا جس سے یورپ کی نشاۃ ثانیہ تک ان کی علمی سرگرمیوں اور مساعی کو تحریک ملتی رہی بلکہ یورپ کا صنعتی انقلاب بھی انہی علوم کا مرہون منت ہے جو یورپ نے اسپین سے حاصل کیے۔

ابتداء میں جب مسلمان اسپین میں داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ عیسائیوں کا کیتھولک فرقہ اریوسی عقائد پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد ملک پر پوری مضبوطی سے مسلط ہو چکا تھا۔ طلیطلہ کی چھٹی مجلس نے یہ ضابطہ بنایا تھا کہ تمام حکمرانوں کو یہ حلف

لینا چاہیے کہ وہ سوائے کیتھولک مذہب کے اور کسی مذہب کی پیروی کی اجازت نہیں دیں گے اور ان لوگوں کے خلاف نہایت سختی سے قانون کا نفاذ کریں گے جو دین مسیحی سے انحراف کریں گے۔ اس کے بعد ایک اور قانون وضع ہوا کہ جو شخص مقدس کیتھولک کلیسا یا بائیبل کے احکام، مذہبی پیشواؤں کے ارشادات، کلیسا کے فتاویٰ اور دینی رسومات پر شک یا اعتراض کرے گا اس کی جائیداد مکمل طور پر ضبط کر لی جائے گی اور اسے حبس دوام (عمر قید) کی سزا دی جائے گی۔ ارباب کلیسا نے اپنی جماعت کے لیے امور سلطنت میں بڑا اثر ورسوخ حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ جو قومی مجالس مملکت کے نہایت اہم امور کے انصرام وانتظام کے لیے منعقد ہوتی تھیں، پادری اور کلیسا کے دیگر اعلیٰ عہدیدار ان میں شرکت بھی کرتے تھے۔ مذہبی پیشواہی بادشاہ کے انتخاب کی توثیق کرتے تھے اور یہ دعویٰ کرتے تھے کہ اگر بادشاہ ان کے فیصلوں کی پابندی نہ کرے تو وہ اس کو تخت وتاج سے معزول کرنے کا پورا پورا حق رکھتے ہیں۔

اندلس میں یہودیوں کی ایک بہت بڑی تعداد سکونت پذیر تھی۔ جو لوگ اصطباغ لینے سے انکار کرتے تھے ان کے خلاف وحشیانہ قسم کے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے۔ ان سختیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مسلمانوں نے اندلس پر چڑھائی کی تو یہودیوں نے مسلمانوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ جن شہروں کو عرب فتح کر چکے تھے ان کی حفاظت کے لیے سپاہ کا کام دیا اور جن شہروں کا محاصرہ کیے ہوئے تھے ان کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے۔ (مقریزی جلد۲ ص ۲۸۰-۲۸۲)

اسی طرح غلاموں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد اندلس میں تھی۔ انہوں نے بھی مسلمانوں کا اسی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ قوطی حکومت کے عہد میں ان کی حالت بڑی خستہ تھی اور انہیں عیسائیت کا علم بھی سطحی تھا، اس لیے اپنی قسمت کو مسلمانوں کے ساتھ وابستہ کرنے میں ان کو آزادی کے علاوہ جو اور فوائد حاصل ہوتے تھے، ان کے مقابلے مین ان کے لیے عیسائیت کوئی وقعت اور حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ لہٰذا ان مظلوم

غلاموں نے اندلس میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور ملک میں جو بت پرست آباد تھے، انہوں نے غلاموں کی پیروی کرتے ہوئے اسلام کی آواز پر لبیک کہا اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

بہت سے عیسائی امراء و شرفا بھی، خلوص نیت سے یا کسی دنیوی غرض سے مسلمان ہو گئے اور ادنیٰ اور متوسط طبقوں سے بھی ایک کثیر تعداد اسلام میں داخل ہو گئی۔ وہ لوگ ظاہری طور پر مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ صدق دل اور خلوص نیت کے ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے ایک ایسے مذہب سے روگردانی کی تھی جس کے پیشواؤں اور راہ نماؤں نے ان کو علم دین سے یک قلم بے بہرہ رکھا تھا۔ ان کی طرف سے مکمل طور پر غفلت برتی تھی اور خود وہ دنیوی اغراض کے حصول میں مشغول ہو گئے تھے چنانچہ انہوں نے اپنی ہی ملت کو لوٹا اور اپنے ہی لوگوں کو ستایا اور تاخت و تاراج کیا تھا، اندلس کے یہ لوگ جب مسلمان ہو گئے تو وہ اپنے اس نئے مذہب کے بڑے سخت اور پرجوش پیروکار ثابت ہوئے۔ وہ اور ان کے اخلاف درشت مزاج علماء کی جماعت کے ساتھ وابستہ ہو گئے جن کا مسلک عرب امراء کی عیش و عشرت کی زندگی سے الگ تھا۔ (ڈوزی: تاریخ مسلمانان اندلس جلد ۲ ص ۴۴-۴۶)

عیسائی مورخین کا بیان ہے کہ اسلامی فتوحات کے وقت قوطی قوم کے حکمرانوں کے قدیم اخلاق و اوصاف میں زوال اور انحطاط آچکا تھا اور ان کی جگہ عیش پسندی اور بداعمالی نے لے لی تھی۔ چنانچہ انہوں نے اسلامی حکومت کو گویا ایک قہر خداوندی سمجھا جو گمراہ لوگوں پر بطور عقوبت اور سزا نازل ہوا تھا۔ چنانچہ سینٹ بونی فاس نے ۷۴۵ء میں اپنے مکتوب نمبر ۶۲ میں یوں لکھا ہے:

''پس ایسا ہی ہوا۔ اسپین اور جنوبی فرانس اور برگنڈی کے باشندوں کے حق میں جنہوں نے خدا کی اطاعت سے روگردانی کی تھی، یہاں تک کہ خدائے قادر نے جو ان کے گناہوں کو دیکھ رہا تھا، ان پر عذاب بھیجا اور یہ عذاب

Marfat.com

قانون الٰہی سے لاعلمی کی صورت میں اور عربوں کی شکل میں نازل ہوا، تاکہ ان کو نیست و نابود کردے۔"

وہ پھر مزید لکھتا ہے:

"یہ ہماری گنہ گاری کا نتیجہ ہے کہ اسپین کی حکومت عربوں کے قبضہ میں آ گئی۔"

اسی طرح الوار لکھتا ہے:

"میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ عذاب ہم پر ہمارے ہی قصور کے سبب سے نازل ہوا ہے۔ ہاں بھائیو! یہ ہماری سہل انگاری، ہماری ناپاکی، ہمارے تلون اور ہمارے ہی اخلاق کی خرابی ہے جس نے ہمیں مصائب سے دوچار کیا ہے۔ پس خدا نے جو انصاف کو عزیز رکھتا ہے اور جس کا چہرہ عدل دکھلاتا ہے، ہمیں جانور کے حوالے کر دیا ہے تاکہ وہ ہم کو نگل جائے۔" (ص ۵۳۱)

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ مسلمانان اندلس، ڈوزی جلد ا ص ۱۵-۲۰، جلد ۲ ص ۴۴-۴۶)

یہ ساری خرابیاں وہاں کے لوگوں میں اور خصوصی طور پر عیسائی پادریوں میں میں موجود تھیں۔ اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وقت گزرنے پر بھی یہ خرابیاں ان میں سے ختم نہ ہوئیں بلکہ برابر بڑھتی چلی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی پادری بھی دربار شاہی کی رنگ رلیوں میں شریک ہو گئے اور ان کے ساتھ مل کر دادعیش دینے لگے۔ اسقف اور پادریوں کے عہدے نیلام ہونے لگے۔ اور ایسے لوگ بھی عیسائیوں کے پیشوا اور پادری مقرر ہونے لگے جن پر منکرین خدا ہونے کا گمان تھا۔ پھر انہی لوگوں نے اپنی طرف سے مذہبی عہدے ذلیل اور نااہل لوگوں میں تقسیم کر دیے۔ ان حالات میں نہ صرف البیرہ میں بلکہ دوسرے صوبہ جات میں بھی عیسائیوں نے اس دین سے روگردانی شروع کر دی جس کے پیشواؤں کی فاسقانہ اور فاجرانہ زندگی نے انہیں رسوا کر دیا تھا۔ انہوں نے اس دین سے کنارہ کشی کر کے دائرہ اسلام کی اخلاقی اور روحانی فضا کو اپنے لیے زیادہ سازگار اور

موافق پایا۔ کیونکہ پادریوں کی زندگی اس قدر گندی اور خراب ہو گئی تھی کہ ہلیفرچ (Helfferich) نے لکھا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی کے اختتام پر پوپ باڈرین نے پادری اجیلا کو جنوبی اسپین میں اس مقصد سے بھیجا تھا کہ جو اثر اسلامی خیالات سے عیسائیوں میں پیدا ہو رہا ہے اس کو کوئی سدباب کرے۔ چنانچہ اجیلا نے اسپین کے پادریوں پر الزام لگایا کہ وہ شادی شدہ عورتوں کے ساتھ آشنائی پیدا کرتے ہیں۔

شاہ لوئی کے دور حکومت میں فرانس کے دربار میں بودو نامی ایک پادری تھا جو ۸۳۸ء میں یہودی ہو گیا تاکہ وہ اپنی گنہ گار زندگی کو چھوڑ کر شریعت خداوندی کا سختی کے ساتھ پابند ہو سکے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی رہ کر شریعت خداوندی کا پابند ہونا اس زمانہ میں نہایت مشکل تھا۔

حکومت پر قبضہ کر کے مسلمانوں نے عیسائیوں کے ساتھ جس رواداری کا ثبوت دیا اس کی مثال آپ کو کسی فاتح کے ہاں نہ ملے گی۔ چنانچہ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھا ہے:

''عربی تسلط کے ابتدائی دور میں کسی شخص کو جبراً مسلمان بنانے یا اس پر مذہبی تعصب کی بنا پر تشدد کرنے کا کوئی واقعہ ہمارے علم میں نہیں آیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عربوں نے عیسائی مذہب کے بارہ میں رواداری کی جو روش اختیار کی تھی اس نے ملک گیری میں ان کے لیے بڑی آسانی پیدا کر دی تھی۔ نئے حاکموں سے عیسائیوں کو صرف اس بات کی شکایت ہو سکتی تھی کہ عرب حکام ان سے دیگر رعایا کی بہ نسبت مختلف سلوک کرتے تھے۔ ان کو جزیہ ادا کرنا پڑتا تھا جو امیروں سے ۴۸ درہم، متوسط لوگوں سے ۲۴ درہم اور پیشہ وروں اور مزدوروں سے ۱۲ درہم سالانہ کی شرح سے وصول کیا جاتا تھا۔ چونکہ یہ جزیہ فوجی خدمت کے عوض میں لیا جاتا تھا اس لیے یہ صرف تندرست اور صحیح الجثہ آدمیوں پر عائد ہوتا تھا۔ عورتیں، بچے، راہب، لنگڑے، لولے، اندھے،

Marfat.com

بیمار، فقیر اور غلام اس سے مستثنیٰ تھے۔ یہ جزیہ خود عیسائی عہدیدار جمع کرتے تھے، اس سے عیسائیوں نے اپنی دشواری اور گراں باری میں کسی قدر تخفیف ضرور محسوس کی ہوگی۔" (پریچنگ آف اسلام ص ۱۴۰-۱۴۱ بحوالہ تاریخ مسلمانانِ اندلس، جلد ۲ ص ۴۱)

اندلس میں غیر مسلموں کو مذہبی آزادی:

اندلس میں غیر مسلموں خصوصی طور پر عیسائیوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی تھی۔ سوائے ایسے جرائم کے جو شریعت اسلام کے خلاف سرزد ہوں، عیسائیوں کے کل مقدمات ان ہی کے منصفوں کے سامنے اور ان ہی کے قانون کے مطابق فیصل ہوتے تھے۔ عیسائی اپنے مذہب کی پیروی کے سلسلے میں آزاد تھے۔ کوئی ان کا مزاحم نہیں تھا۔ چنانچہ وہ قربانی دیتے تھے اور اس موقع پر بخور جلاتے تھے۔ ناقوس بجاتے تھے اور اپنے مذہب کی دیگر تمام رسومات ادا کرتے تھے۔ گرجاؤں میں زمزمے گائے جاتے تھے۔ کلیسا کے تمام تہوار حسب معمول منائے جاتے تھے۔ نویں صدی عیسوی تک پادری اور عام دنیادار عیسائی بھی عربوں کا سا لباس پہنتے تھے۔ اکثر عیسائیوں نے عربی نام رکھ لیے تھے اور ظاہری رسم و رواج میں بھی ایک حد تک اپنے مسلمان ہمسایوں کی تقلید کرتے تھے، مثلاً بہت سے عیسائی ختنہ کراتے تھے اور کھانے پینے کے معاملے میں بھی انہوں نے مسلمانوں کی عادات اختیار کر لی تھیں۔ رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے کہ اس قسم کے مناظر اندلس میں اکثر دیکھنے میں آتے تھے کہ

"ایک پادری گرجے میں اتوار کے روز خطبہ دے رہا ہوتا اور اس کی عبا پر قرآنی آیات کاڑھی ہوئی ہوتیں۔" (تشکیل انسانیت ص ۲۴۹)

ایک اور یورپی دانشور دِل ڈیوران لکھتا ہے:

"اندلس پر عربوں کی حکومت اس قدر عادلانہ، عاقلانہ اور مشفقانہ تھی کہ اس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی ...... ان کے جج نہایت قابل تھے۔

Marfat.com

عیسائیوں کے فیصلے عیسائی جج کیا کرتے تھے۔ پولیس کا انتظام بہت اعلیٰ تھا۔ بازار میں ناپ تول کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ عوام کے لیے عربوں کی حکومت روما کے مقابلہ میں ایک نعمت تھی۔ انہوں نے بڑے بڑے زمینداروں کی زمینیں مزارعین میں تقسیم کر دی تھیں۔" (Age of Faith. P.297)

اسپین کے عیسائی جو اندلس کی اسلامی حکومت کے زیر سایہ رہتے تھے اور جنہوں نے عربوں کے رسوم و آداب اختیار کر لیے تھے، مستعرب کہلاتے تھے۔ اس نام سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے عیسائیوں کا میلان طبع کس طرف تھا۔ عربی زبان نے ملک بھر میں بہت جلد لاطینی کی جگہ لے لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس زبان میں عیسائیوں کا علم دین مدون تھا اس کو عیسائی رفتہ رفتہ بھولنے لگے اور اس کی طرف سے غفلت اور اعراض برتنے لگے حتیٰ کہ کلیسا کے بعض بلند مرتبہ عہدے دار بھی صحیح لاطینی سے ایسے نابلد ہو گئے کہ ان پر اہل علم کو ہنسی آتی تھی۔ ان حالات میں عوام الناس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس معاملہ میں وہ ارباب کلیسا سے زیادہ سرگرمی دکھائیں گے۔ چنانچہ ۸۵۴ء میں سپین کے ایک مصنف یعنی قرطبہ کے پادری الوارد نے اپنے عیسائی ہم وطنوں پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اور اسلام اور علوم اسلامیہ کی طرف ان کے میلان پر انہیں ندامت اور عار دلائی ہے اور کہا ہے کہ "جب ہم مسلمانوں کے شرعی احکام کی تحقیق کرتے ہیں اور ان کے حکماء کے مطالعہ کے لیے جمع ہوتے ہیں تو ہم اپنی مقدس کتابوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ اب عیسائیوں میں ایسے ذی علم کہاں ہیں جو مقدس کتابیں پڑھنے میں انہماک رکھتے ہوں اور لاطینی علمائے دین کی کتابوں پر نگاہ ڈالنے کی پروا کرتے ہوں؟ ہمارے عیسائی نوجوان جو اطوار کی شستگی اور چرب زبانی سے متصف ہیں، اپنے لباس اور چال ڈھال کی نمائش کرتے ہیں اور مسلمانوں کے علوم میں شہرت رکھتے ہیں۔ وہ عربی بلاغت کے نشے میں سرشار ہیں اور مسلمانوں کی کتابوں کو اٹھائے پھرتے ہیں اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان پر بحث کرتے ہیں اور ان کی تعریف و

Marfat.com

توصیف میں علم خطابت کے سارے صنائع و بدائع صرف کر دیتے ہیں اور پھر ان کا خوب چرچا کرتے ہیں، لیکن کلیسا کی کتابوں کی خوبیوں سے قطعاً ناآشنا ہیں اور کلیسا کے چشموں کو، جن کا منبع بہشت ہے، حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ افسوس! عیسائی لوگ اپنی شریعت سے ایسے ناآشنا ہیں اور لاطینی لوگ اپنی زبان سے ایسے بے پروا ہو گئے ہیں کہ تمام عیسائی امت میں ہزار اشخاص میں سے بمشکل ایک شخص ایسا ملے گا جو لاطینی زبان میں اپنے کسی دوست کو مزاج پرسی کا ایک خط بھی لکھ سکے۔ البتہ ایسے عیسائی بے شمار ہیں جو عربی زبان کے رنگین جملے بڑے طمطراق سے بولتے ہیں بلکہ وہ عربی بھی لکھ سکتے ہین جس کا ہر شعر ردیف کے ایک ہی حرف پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں اس کے حسن خیال کی اعلیٰ پرواز کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے لکھنے میں وہ عربوں سے بھی بڑھ کر وزن اور بحر کی پابندی کرتے ہیں۔'' فی الواقعہ لاطینی زبان کو سپین کے ایک حصے میں اس قدر تنزل ہوا کہ سپین کے کلیسا کے قدیم قوانین اور بائیبل کو عیسائیوں کے مطالعہ کے لیے عربی میں ترجمہ کرنا پڑا۔

عیسائیوں کا مسلمانوں کے ساتھ اتنا گہرا رابطہ تھا اور وہ ان کے ادب (لٹریچر) کا اس ذوق وشوق اور محنت سے مطالعہ کرتے تھے کہ اسلام کے متعصب دشمن بشپ الوارو کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ قرآن حکیم ایسی بلیغ اور دل کش زبان میں لکھا گیا ہے کہ عیسائی بھی اس کو پڑھ کر اس کی تحسین کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مختصر یہ کہ اسلام نے عیسائیوں کے عقائد، اخلاق اور تہذیب کو کافی حد تک متاثر کیا۔ اور نومسلموں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ یہ تعداد لاکھوں میں پہنچ گئی۔

عیسائیوں کے مسلمانوں پر ظلم وستم:

اندلس میں مسلمانوں کی تاریخ بڑی عجیب وغریب ہے۔ مسلمانوں نے جب اس ملک پر قبضہ کیا تو ایسی رواداری کا ثبوت دیا کہ چشم فلک نے آج تک ایسی رواداری نہیں دیکھی لیکن جب عیسائیوں نے آٹھ سو سال کے بعد دوبارہ اندلس پر قبضہ کیا تو

Marfat.com

مسلمانوں پر وہ ظلم وستم کیے کہ تاریخ کو ان ظلم وستم کے نقل کرنے سے بھی حیا آئی۔ چنانچہ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا کی فوجوں نے ۱۴۸۷ء میں شہر مالقہ پر قبضہ کیا تو شہر میں جتنے مسلمان پائے گئے ان کو تیز نوک دار تیروں سے اذیت دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ پھر دو سال بعد جب شہر برشالہ نے بھی ہتھیار ڈال دیے تو اس موقع پر اس بات کا خاص طور پر وعدہ کیا گیا تھا کہ نومسلموں کو دوبارہ عیسائی ہونے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ (The Moriscos of Spain' H.C. Lea, P. 17-18)

بعض عیسائیوں نے اپنے دین کو ان سزاؤں سے بچنے کے لیے ترک کر دیا جو عدالتوں سے ان کو ملی تھیں، لیکن اکثر عیسائی بلاشبہ دین اسلام کے پرجلال اثر اور رعب و داب سے مسلمان ہوئے کیونکہ ایک شان دار تمدن اپنی پوری دل فریبی کے ساتھ اس مذہب کے جلو میں تھا۔ اس کا ادب، اس کا فلسفہ وحکمت اور اس کا آرٹ، یہ سب اشیاء عقل سلیم کو اپنی طرف کھینچتی تھیں اور لوگوں کے چشم تخیل میں چکا چوند پیدا کرتی تھیں۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کا لٹریچر اور ان کے علوم وفنون مسلمانوں کے علوم وفنون کے مقابلہ میں حقیر تھے۔ ان علوم وفنون سے متاثر ہو کر عیسائیوں نے اسلام کو قبول کیا تھا۔ علاوہ ازیں پرہیزگار اور پارسا طبائع کے لیے اسلام میں یہ کشش بھی تھی کہ مسلمانوں کے درمیان سرگرم اور متقی و پرہیزگار لوگوں کی ایک جماعت موجود تھی جس کے سربراہ راسخ العقیدہ علماء تھے۔ بعض اوقات اس جماعت کو امور سلطنت میں بڑا دخل حاصل ہوتا تھا۔ وہ لوگوں کے مذہب اور اخلاق کی اصلاح کے لیے بڑی جدوجہد کرتی تھی، لیکن جب حکومت پر عیسائیوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو عیسائیوں نے ان مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ ڈالے۔

اسلامی حکومت کے انقراض (۱۴۹۲ء) کے بعد اندلس میں جو مسلمان باقی رہ گئے تھے، اہل سپین کی اصطلاح میں وہ مورسکو (Morisco) کہلاتے تھے۔ عیسائی حکمرانوں نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ سے ان کو عیسائی ہونے پر مجبور کر دیا۔ لیکن

چونکہ وہ صدق دل سے عیسائی نہیں ہوئے تھے اس لیے ان کو ۱۶۱۰ء میں ملک سے جبراً نکال دیا گیا۔ امریکی مصنف ایچ۔ سی۔ لی نے ان کے حالات میں ایک مستقل کتاب "The Moriscos of Spain" (مطبوعہ لندن ۱۹۰۱ء) کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ منشی خلیل الرحمٰن نے کیا تھا جو شائع ہو چکا ہے۔

اسپین کے عیسائی حکمرانوں نے اپنی فتوحات کے بعد مسلمان باشندوں کو عیسائی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، لیکن چونکہ ان لوگوں کا ایمان اور اخلاص مشکوک تھا یعنی انہوں نے پورے طور پر دین اسلام کو نہیں چھوڑا تھا، اس لیے شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا نے ان کے عقائد کی چھان بین کے لیے ایک محکمہ قائم کیا جسے (Inquisition) یعنی محکمہ تفتیش یا احتساب کہتے ہیں۔ تحقیق و تفتیش کے بعد جن لوگوں کا ایمان مشتبہ ثابت ہوتا اسے قید خانے میں ڈال دیتے، طرح طرح کی اذیتیں دیتے بلکہ بعض اوقات جلا ڈالتے تھے۔ اس طرح ہزاروں بے گناہ انسان عیسائیوں کے مذہبی تعصب اور عدم رواداری کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ خود عیسائی لوگ بھی اس محکمہ کی باز پرس سے محفوظ نہ تھے یہاں تک کہ کتابیں بھی اس محکمے کے احتساب میں شامل تھیں۔ یہ محکمہ آخر کار ۱۸۲۰ء میں توڑ دیا گیا۔ امریکی مصنف H.C. Lea نے اس کی تاریخ پانچ جلدوں میں History of The Inquisition of Spain کے عنوان سے لکھی ہے۔ جو ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔

اندلس کے ایک مسلمان نے جو ۱۶۱۰ء میں مورسکو قوم کے آخری اخراج کے وقت اپنے وطن اسپین سے نکالا گیا تھا، محکمۂ احتساب کی سختیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مسلمانوں کی رواداری کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

"کیا ہمارے فتح یاب آباء و اجداد نے جب کہ ان کو پوری قوت حاصل تھی، سپین سے عیسائیت کو نیست و نابود کرنے کی کبھی کوئی کوشش کی تھی؟ کیا انہوں نے تمہارے باپ دادا کو آزادی سے اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی اجازت نہیں دی تھی؟ حالانکہ وہ ان کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ کیا ہمارے

Marfat.com

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ صریح اور واضح حکم نہیں ہے کہ مسلمانوں کی تلوار جس قوم کو مسخر کرے وہ ایک معمولی سا سالانہ جزیہ دے کر اپنے قدیم مذہب پر قائم رہنے کی مجاز ہے خواہ مذہب کیسا ہی مہمل کیوں نہ ہو؟ اور جو مذہب اسے پسند ہو اسے اختیار کرے۔ تم ہمارے درمیان کسی ایسی خون خوار منظم عدالت کی نشان دہی نہیں کر سکتے جو مختلف ملتوں کے دین و ایمان کی تفتیش کرنے کے لیے قائم کی گئی ہو۔ جو تمہاری ملعون انکویزیشن یعنی محکمہ احتساب کے ساتھ ذرا بھی مشابہت رکھتی ہو۔ یہ سچ ہے کہ جو شخص ہمارا دین قبول کرنے کی طرف میلان ظاہر کرے ہم اسے گلے لگانے کے لیے تیار ہیں لیکن ہمارا قرآن حکیم ہمیں دوسروں کے ضمیر پر جبر و تعدی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ ہم نو مسلموں کی ہر ممکن طریق سے حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور وہ جوں ہی خدا کی توحید اور اس کے پیغمبر کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں تو بغیر کسی رکاوٹ کے وہ ہماری برادری میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ ہماری بیٹیاں بیاہ سکتے ہیں اور پر اعتماد، باعزت اور نفع بخش عہدوں پر مقرر کیے جاتے ہیں۔ ہم ان کو صرف اپنا لباس پہننے پر مجبور کرتے ہیں تاکہ وہ ظاہری صورت میں بھی سچے مومن نظر آئیں، لیکن ہم ان کے ضمیروں کو ہرگز نہیں ٹٹولتے، بشرطیکہ وہ علانیہ ہمارے دین کو برا نہ کہیں، لیکن اگر وہ ایسا کریں تو ہم ان کو ان کے قصور کے مطابق سزا دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنا مذہب اپنی رضا مندی سے تبدیل کیا تھا نہ کہ جبر و اکراہ سے۔" (مورگن: جلد۲ص ۲۹۷-۲۹۸)

اگرچہ سقوط غرناطہ کے بعد مسلمان وقتاً فوقتاً اندلس سے ہجرت کرتے رہے تھے پھر بھی ۱۶۱۰ء میں قریباً پانچ لاکھ نفوس ملک سے نکال دیے گئے۔ (مورسکوز ازلی ص ۲۵۹) شہر کے شہر اور گاؤں کے گاؤں یک قلم خالی ہو گئے۔ مکانات کھنڈر ہو گئے کیونکہ ان کو از سر نو تعمیر کرنے کے لیے کوئی متنفس باقی نہیں رہا تھا۔ یہ مورسکوز غالباً اسپین کے اصلی

Marfat.com

باشندوں کی اولاد تھے جن میں عربی خون کم تھا یا بالکل نہ تھا۔ اس بارہ میں ایک خط مرقومہ ۱۳۱۱ء سے ماخوذ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ دو لاکھ مسلمانوں میں سے جو اس وقت غرناطہ میں رہتے تھے، یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اسلامی حکومت کے آخری ایام تک اندلس کے عیسائی اسلام قبول کرتے رہے ہیں کیونکہ ایک مورخ نے ۱۴۹۹ء کے واقعات کے ذیل میں لکھا کہ جب سقوط غرناطہ پر سات برس گزر چکے تھے ان مسلمانوں میں بعض ایسے اشخاص بھی تھے جنہوں نے ابھی پچھلے دنوں میں اسلام قبول کیا تھا۔

......❀......

Marfat.com

سلطنت عثمانیہ اور دعوتِ اسلام

عثمانی ترکوں کا ذکر سب سے پہلے تیرھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں سامنے آتا ہے۔ (اس سے پہلے لوگ ان کے نام سے بالکل ناآشنا تھے۔) جب ان کے پچاس ہزار نفوس تاتاریوں سے بھاگ کر ایشیائے کوچک میں وارد ہوئے اور قونیہ کے سلجوقی سلطان کی مدد کو پہنچے۔ یونانیوں اور تاتاریوں سے مقابلہ کرتے ہوئے جو خدمات انہوں نے انجام دیں ان کے صلے میں سلطان نے ان کو ایشیائے کوچک کے شمال مغرب میں ایک ضلع دے دیا اور یہیں سے سلطنت عثمانیہ کی ابتداء ہوئی۔ پھر جب سلاجقہ روم کی مملکت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی تو عثمانی ترکوں نے ان کو یکے بعد دیگرے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد وہ سمندر کو عبور کر کے یورپ میں داخل ہو گئے اور پھر کئی عیسائی مملکتوں کو یکے بعد دیگرے تسخیر کرتے ہوئے ۱۶۸۲ء میں آسٹریا کے پایۂ تخت ویانا کے دروازوں تک جا پہنچے جہاں ان کے قدم رک گئے۔

سلطان محمد فاتح:

عیسائیوں پر ترکوں کی حکومت تو اسی وقت سے قائم ہوگئی تھی جب ایشیائے کوچک میں انہوں نے اپنی سلطنت کو وسعت دی تھی لیکن جب تک قسطنطنیہ جو مشرقی رومی سلطنت کا پایہ تخت تھا ۱۴۳۵ء میں ان کے قبضہ میں نہ آ گیا اس وقت تک اسلامی حکومت اور کلیسا

کے تعلقات پختہ بنیادوں پر قائم نہ ہو سکے۔ سلطان محمد ثانی جن کو سلطان محمد فاتح بھی کہتے ہیں، نے قسطنطنیہ (جس کو آج کل استنبول کہتے ہیں) پر قبضہ کرنے اور شہر میں امن قائم کر لینے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عیسائیوں کی حمایت اور معاونت حاصل کرنے کے لیے یہ اعلان کیا کہ میں یونانی کلیسا کا محافظ اور سرپرست ہوں۔ عیسائیوں کی ایذا رسانی کی سختی سے ممانعت کر دی گئی اور سلطان نے ایک فرمان جاری کیا جس کے بموجب قسطنطنیہ کے لیے پادریوں اور ان کے جانشینوں کو اور ان تمام اساقفہ کو جو اس کے ماتحت تھے، ان کے تمام قدیم اختیارات اور ذرائع آمدنی جو ان کو گزشتہ حکومت میں حاصل تھے، واپس کر دیے۔ جن قواعد وضوابط سے وہ مستثنیٰ تھے ان سے ان کو بدستور مستثنیٰ رکھا گیا۔ ترکوں کی فتح کے بعد قسطنطنیہ کا پہلا بطریک گنار دیوس تھا۔ جس کو سلطان نے اپنے دست خاص سے وہ عصا عطا فرمایا جو اس کے منصب کا خاص نشان تھا۔ ہزار اشرفیوں کی تھیلی کے علاوہ اسے ایک گھوڑا بھی عنایت کیا۔ جس کا ساز و یراق بڑا پر تکلف تھا اور جس پر سوار ہو کر وہ اپنے خدم وحشم کے ساتھ شہر میں نکل سکتا تھا۔ کلیسا کے پیشوا کا نہ صرف پورا پورا احترام قائم رکھا گیا جیسا کہ عیسائی قیصر ملحوظ خاطر رکھتے تھے، بلکہ اسے وسیع دیوانی اور فوجداری اختیارات بھی دے دیئے گئے، مثلاً اس کی عدالت ان تمام مقدمات کا فیصلہ کرتی تھی جس کے دونوں فریق عیسائی ہوں۔ وہ جرمانے کی سزا دے سکتی تھی اور مجرموں کو اپنے خاص قید خانوں میں مقید کر سکتی تھی اور بعض حالات میں سزائے موت بھی دے سکتی تھی۔ سلطنت کے وزیروں اور افسروں کو ہدایت تھی کہ وہ اس عدالت کے احکام اور فیصلوں کی تعمیل کریں۔ سابقہ بازنطینی حکومت کی روش کے برخلاف ترک حکام کلیسا کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے بلکہ ان تمام کا انتظام و انصرام پورے طور پر بطریک (پادری) کے ہاتھ میں تھا یا پھر اس مجلس کے اختیار میں تھا جس کو وہ جب چاہے بلا سکتا تھا، اور اس کے ذریعہ سے ان تمام مسائل کو جن کا تعلق دین یا عقائد سے تھا، بغیر حکومت کی مداخلت کے طے کر سکتا تھا اور حکومت کے ایک مسلمہ افسر کی حیثیت سے بطریک بے انصاف حکام کے کاموں سے سلطان کو مطلع کر کے مظلوموں کی

Marfat.com

دادرسی کرسکتا تھا۔ صوبہ جات میں جو یونانی اسقف (پادری) تھے ان کی بھی بہت عزت تھی۔ چنانچہ دیوانی معاملات میں ان کو اتنے وسیع اختیارات حاصل تھے کہ موجودہ زمانے تک وہ اپنے حلقوں میں اپنے کام اس طرح انجام دیتے تھے گویا کہ وہ عیسائی آبادی پر ترکی حکام کی حیثیت سے متعین ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کلیسا کے اعلیٰ عہدیدار یونانی پادری کے بجائے ترکی اہل کار کا فریضہ ادا کرتے تھے اور وہ اپنے لوگوں کو ہمیشہ یہ بتایا کرتے تھے کہ سلطان محمد فاتح کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلیسائے یونان کی حفاظت سپرد ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد سلطان کی طرف سے فرمان جاری ہوا کہ آرتھوڈکس (Orthodox) فرقے کے لوگ ان گرجاؤں کو اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں جن کو مساجد کے لیے مخصوص نہیں کیا گیا اور وہ اس بات کے مجاز ہیں کہ اپنی مذہبی رسوم اعلانیہ اپنے قومی دستور کے مطابق ادا کریں۔

(فنلے جلد ۳ ص ۵۲۲، پیزی پس سیکنڈ ے (Pitzipios Seconde) ص ۷۵ موسیو وہوتن جلد ۳ ص ۵۲-۵۴، آرمتجان جلد ۱ ص ۱۶، بحوالہ پریچنگ آف اسلام، آرنلڈ ص ۱۵۳)

عثمانیہ خلافت کی برکات:

جب حکومت اچھی، عدل و انصاف کرنے والی اور دیانت دار ہو تو پھر اللہ تعالیٰ بھی ہر قسم کی برکات سے نوازتے ہیں۔ چنانچہ باوجودیکہ دولت عثمانیہ کے ان صوبجات میں جو یورپ میں واقع تھے، عیسائیوں کی تعداد ترکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی لیکن مذہبی آزادی اور جان و مال کے تحفظ کی وجہ سے جو ان کو بخوبی حاصل تھا، عیسائیوں نے نئے حاکموں کو نہایت خوش دلی سے قبول کر لیا اور انہوں نے سلطان محمد فاتح ؒ کی حکومت کو ہر عیسائی حکومت پر ترجیح دی۔ دراصل ملک کے بہت سے حصوں میں یونانیوں نے فرنگیوں اور وینس والوں کی غارت گری اور ظالمانہ حکومت کے مقابلہ میں ترکوں کو اپنا نجات دہندہ تصور کیا کیونکہ ان لوگوں نے ایک مدت سے یونان کے

بعض حصوں کے لیے بازنطینی حکومت سے تنازعہ کھڑا کر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں یونان میں جاگیرداری نظام جاری کر رکھا تھا جس سے رعایا کی حالت غلاموں کی طرح خراب و خستہ تھی۔ چنانچہ ایک سیاح نے جس نے ۱۵۰۸ء میں قبرص کا سفر کیا تھا، وینس والوں کی جابرانہ حکومت کا ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے:

''قبرص کے تمام باشندے وینس والوں کے غلام ہیں کیونکہ وہ اپنی آمدنی کا تہائی حصہ حکومت کو ادا کرنے پر مجبور ہیں، خواہ وہ آمدنی ان کی اراضی سے حاصل ہو یا غلہ، شراب، نیل، مال مویشی یا کسی اور شکل میں ہو۔ اس کے علاوہ ان میں سے ہر شخص مجبور ہے کہ ہفتے میں دو دن تک سرکاری بیگار میں جہاں اسے مقرر کیا جائے، کام کرے۔ اگر کوئی شخص اپنے ذاتی کام یا بیماری کی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو تو اسے اپنی غیر حاضری کے ایام کے حساب سے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور اس پر سالانہ ٹیکس وغیرہ مستزاد ہیں۔ ان ٹیکسوں کی وجہ سے بیچارے غریب عوام اس قدر پریشان حال اور مظلوم رہتے ہیں کہ ان کو اتنا آزوقہ بھی میسر نہیں جس سے وہ جسم و جان کا باہمی رشتہ قائم رکھ سکیں۔ (سفرنامہ مارٹن بام گارٹن ص ۳۷۳)

رعایا نئے حاکموں سے نہایت خوش تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نئے حاکموں کی تبدیلی سے ان کی حالت بہتر ہونے کا قوی امکان ہے وگرنہ اس وقت ان کی ایسی ابتر حالت تھی کہ اس سے بدتر ہونی ممکن نہ تھی۔ اگرچہ اس کے نجات دہندہ ترک اہل وینس کی طرح ان کے لیے اغیار ہی تھے لیکن وہ کافر ترکوں کو ملحد کیتھولک عیسائیوں پر بدرجہا ترجیح دیتے تھے کیونکہ ترکوں کی حکومت میں ان کو پوری پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ اسی طرح جو یونانی قسطنطنیہ کی حکومت میں رہتے تھے، وہ بھی حکمرانوں کی تبدیلی کو ناپسند نہیں کرتے تھے کیونکہ پالیولوگی خاندان کے عہد حکومت میں جو اخلاقی انحطاط رونما ہوا اور رعایا پر جو ظلم و ستم ڈھائے گئے، ان کے تصور ہی سے دل پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

''علماء کا بددیانت طبقہ، جابر پادریوں کی بے شمار جماعت، غیر فطری قوانین کی سختی، ایک مکروہ جماعت کا استحصال بالجبر، اور اس کے علاوہ حکومت کی اجارہ داریاں، اس کا مالی نظام، ٹیکس اور محصول جمع کرنے والوں کا لشکر، غرض کہ ان سب چیزوں نے مل کر مظلوم رعایا کے حقوق غصب کر لیے تھے اور انہیں ان کے اداروں سے محروم کر دیا تھا۔ ان کے لیے اصلاح حال کی کوئی گنجائش یا تلافی مافات کی کوئی امید باقی نہیں چھوڑی تھی۔'' (یورپی ترکوں کی نسلیں ص ۸۲)

اس زمانے کے مختلف مورخین نے بازنطینی حکومت کی سختیوں اور ان کے ظلم و جبر کو نہایت تفصیل اور وضاحت سے بیان کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمد فاتح ان لوگوں کے لیے ایک نجات دہندہ تھا۔ چنانچہ اس کا ایک ہم عصر مستند مورخ لکھتا ہے کہ وہاں کے عیسائی حکومت پر اس قسم کا الزام لگاتے ہیں:

''جس سلطنت میں قانون کا احترام نہ ہو اس کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو بے لگام ہو۔ قسطنطین اور اس کے اسلاف نے امراء کو عوام پر ظلم و ستم کرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ ان کی عدالتوں سے انصاف اٹھ گیا تھا اور ان کے دل ہمت و حوصلہ سے خالی ہو چکے تھے۔ ججوں نے بے گناہوں کے آنسوؤں اور خون سے خزانے جمع کر لیے تھے۔ یونانی فوجی محض اپنے زرق برق لباس پر ناز کرتے تھے۔ شہری لوگ اپنی بے وفائی اور عذاری پر شرم محسوس نہیں کرتے تھے اور سپاہی میدان جنگ سے فرار ہو کر شرمندہ نہیں ہوتے تھے۔ آخر کار خدا نے ان نالائق حکمرانوں پر اپنا قہر نازل کیا اور سلطان محمد کو پیدا کیا جس کے سپاہی نبرد آزمائی میں خوش رہتے ہیں اور جس کے قاضی اپنی امانت میں خیانت نہیں کرتے۔'' (کرسین: جلد ۵ ص ۴۳۷)

حکومت عثمانیہ کی برکات میں سے ایک برکت تجارتی ترقی کی ہے کہ ترکوں کے زمانے میں ملک کی تجارت نے بھی خوب ترقی کی کیونکہ پہلے سلاطین اپنی رعایا کی

Marfat.com

تجارت کو فروغ دینے پر ہمیشہ مستعد رہے۔ بہت سے بڑے بڑے شہروں کی خوش حالی کا دور اس وقت شروع ہوا جب ان کو ترکی فتوحات کے بعد بازنطینی حکومت کے مالی ظلم وستم سے نجات ملی جس نے ان کی اقتصادی اور معاشی زندگی کو مفلوج کر رکھا تھا۔ ان میں پہلا شہر نیقیہ تھا جس نے ایک طویل محاصرے کے بعد ۱۳۳۰ء میں انتہائی آسان شرائط پر سلطان اُورخان کی اطاعت قبول کر لی۔ قدیم رومیوں کی طرح اس نے بھی بہت سی سڑکیں اور پل بنائے جس سے ملک بھر میں تجارت میں بڑی آسانی پیدا ہوگئی۔ اس کے علاوہ دوسری حکومتیں یونانی تاجروں کو اپنی بندرگاہوں میں داخلے کی اجازت دینے پر مجبور ہوگئیں وگرنہ اس سے قبل بازنطینی قیصروں کے زمانے میں انہیں داخلے کی ممانعت تھی، لیکن عیسائی تاجر اب ترکی جھنڈے تلے سفر کرتے تھے اور انہوں نے ترکوں کا لباس اور طرز زندگی اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح انہوں نے اب مغربی یورپ کی قوموں میں وہ عزت و وقار حاصل کر لیا تھا جس سے آج تک مغرب کے کیتھولک لوگوں نے یونانی کلیسا کے پیروؤں کو محروم کر رکھا تھا۔

ہم نے گذشتہ صفحات میں بازنطینی سلطنت کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ اس لیے لفظ ''بازنطینی'' کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ۳۶۴ عیسوی میں رومیوں کی وسیع و عریض سلطنت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک مغربی حصہ جس کا پایہ تخت رومہ تھا اور دوسرا مشرقی حصہ جس کو مشرقی رومی سلطنت کہتے تھے۔ یہاں قیصر قسطنطین نے جس نے عیسائیت اختیار کر لی تھی، اپنی بساط حکومت بچھائی اور قدیم شہر استنبول کو اپنا دارالحکومت قرار دیا جو اسی کے نام پر قسطنطنیہ کہلایا۔ اس شہر کا قدیم نام ''بیزنطم'' بھی تھا جس کی وجہ سے مورخین نے مشرقی رومی سلطنت کو بیزنطینی سلطنت کہا ہے۔ مختصر ہونے کی وجہ سے مورخین کے ہاں بالعموم یہی نام رائج ہے۔ اس سلطنت کی زبان یونانی تھی، اس وجہ سے بھی اسے رومی کہنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔ یہ سلطنت گیارہ سو سال تک قائم رہی۔ جب سلطان محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کر لیا تو بازنطینی سلطنت بھی ہمیشہ

Marfat.com

کے لیے ختم ہوگئی۔ اور اب اس کا نام صرف کتابوں میں رہ گیا ہے۔

ترکوں کا دعوتی شوق:

ترک سمجھتے تھے کہ سب سے بڑا احسان جو وہ کسی شخص کے ساتھ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کو دائرۂ اسلام کے اندر لا کر اس کی نجات اخروی کا باعث بنیں۔ چنانچہ وہ اس مقصد کے لیے ترغیب اور دعوت کا کوئی طریقہ بغیر آزمائے نہیں چھوڑتے تھے۔ سولھویں صدی کے ایک ولندیزی سیاح نے لکھا ہے کہ جب وہ مسجد ایا صوفیہ میں کھڑا اس کی تعریف کر رہا تھا تو چند ترکوں نے اس کے جمالیاتی ذوق کے ذریعے سے اس کے مذہبی خیالات پر اثر ڈالنا چاہا اور اس نے سے کہا کہ اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو تم یہاں ہر روز آ سکتے ہو۔ قریبا ایک صدی کے بعد ایک اور سیاح کو بھی اسی طرح کا تجربہ ہوا، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

''بعض اوقات ترک مذہبی جوش کے وفور میں عیسائیوں سے بہت اخلاق سے یہ سوال کرتے ہیں جیسا کہ انہوں نے مجھ سے ایک مرتبہ سینٹ صوفیہ کے دروازے میں کیا تھا کہ تم مسلمان ہو کر ہم میں کیوں شامل نہیں ہو جاتے؟ کسی شخص کے مسلمان ہونے پر جو عام خوشیاں منائی جاتی تھیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ترکوں کو لوگوں کی آخرت اور عاقبت بالخیر ہونے کا کس قدر خیال تھا، اور اسی خیال نے ان کو اسلام کا پرجوش داعی بنا دیا تھا۔ نومسلم کو گھوڑے پر سوار کرتے تھے اور اسے شہر کے بازاروں میں ایک جلوس کی شکل میں لے کر نکلتے تھے۔ اس کے بارہ میں اگرچہ یہ معلوم ہوتا کہ یہ شخص سچے دل سے مسلمان ہوا ہے اور اپنی رضامندی سے دائرہ اسلام میں داخل ہوا ہے اور وہ عالی مرتبہ ہے تو اس کی بڑی عزت کرتے تھے اور اس کے گزر اوقات کے لیے مال کا بندوبست بھی کر دیتے تھے۔

عیسائیوں کو مسلمان کرنے کی یہ سرگرم کوششیں عیسائی معاشرہ کے بعض خصوصی حالات کی وجہ سے بھی کامیاب ہوئیں۔ ان اسباب میں سب سے بڑھ کر یونانی کلیسا

Marfat.com

(گریک آرتھوڈوکس چرچ) کی ذلیل حالت تھی۔ کیونکہ بازنطینی سلطنت کے دنیوی استبداد کے علاوہ ایک کلیسائی استبداد بھی پیدا ہو چکا تھا جس نے مذہب اور اخلاق کے بارہ میں ہر قسم کی بحث و تمحیص کو ممنوع قرار دیا تھا اور اپنی ہٹ دھرمی کے بوجھ تلے ملک کی علمی زندگی کو کچل ڈالا تھا۔ اس بے حسی کے عالم میں صرف ایک بات نے حرکت پیدا کر رکھی تھی کہ کیتھولک فرقے کے خلاف بحث و مباحثہ کی ایک سخت جنگ جاری تھی جس میں مذہبی مناظرے کی تلخی اور نسلی منافرت کی شدت بھی شامل تھی۔ عیسائی عوام کا مذہب گرتے گرتے محض ظاہری رسوم کی پابندی میں منحصر ہو کر رہ گیا تھا، اور ان کی ساری دینی سرگرمی اور عقیدت اس بات میں صرف ہوتی تھی، کہ وہ کنواری مریم اور اولیاء اور ان کی تصاویر اور ان کے تبرکات کی پرستش کریں۔ اس لیے بہت سے لوگ اس کلیسا سے روگرداں ہو چکے تھے جس کی روحانی حالت پست ہو چکی تھی کہ روح القدس خدا کی ذات سے نکلا ہے یا مسیح سے، اور عشائے ربانی میں خمیری روٹی کھانی چاہیے یا فطیری، لہٰذا بہت سے عیسائیوں نے جوان باتوں سے بیزار ہو چکے تھے، خدا کے بارہ میں اسلام کی سیدھی سادھی اور قریب الفہم تعلیم کو قبول کر لیا۔ چنانچہ کتابوں میں لکھا ہے کہ بہت سے لوگوں نے اسلام اختیار کر لیا، اور ان میں صرف سادہ مزاج عوام ہی نہ تھے بلکہ ہر درجے اور ہر طبقے کے عالم اور پڑھے لکھے لوگ بھی شامل تھے۔ جن راہبوں اور پادریوں نے دین اسلام اختیار کیا ان کی معاش کے لیے ترکوں نے پہلے سے بہتر بندوبست کر دیا تا کہ ان کی مثال سے دیگر عیسائیوں کو بھی مسلمان ہونے کی ترغیب ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام اس سادہ سے کلمہ کے اقرار کا مطالبہ کرتا ہے: لا الٰہ الاّ اللہ، محمد رسول اللہ، لیکن ایک انگریز دانشور لکھتا ہے کہ ساری مشکل اسی کلمے کے اقرار میں ہے کیونکہ اگر کوئی شخص اس بات کو تسلیم کر لے کہ وہ خدائے وحدہ لاشریک کا پجاری ہے تو اس ضلالت کا زہر دین کے لباس میں اس میں آسانی سے سرایت کر جاتا ہے۔ یہ وہ چٹان ہے جس سے بہت سے لوگوں کا سفینۂ ایمان ٹکرا کر پاش پاش ہو۔

Marfat.com

جاتا ہے بلکہ ہو چکا ہے اور وہ ایسے دام میں گرفتار ہو گئے جو ان کی روحوں کی ہلاکت کا باعث ہوا۔ یہ چکی کا وہ پاٹ ہے جو ان کے گلے کا طوق بنا اور جس نے ان کو مایوسی کے گہرے غار میں گرا دیا۔ کیونکہ جب یہ احمق سنتے ہیں کہ ترک بت پرستی کی مذمت کرتے ہیں اور ہر مورت اور تصویر سے اس طرح کراہت اور نفرت کرتے ہیں گویا وہ نارِ جہنم ہے اور وہ خدائے یکتا کی عبادت اور پرستش کا اس تسلسل کے ساتھ اقرار کرتے ہیں اور وعظ کہتے ہیں تو اس سے ان کے دل و دماغ میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔"

ترکوں کے اس دعوتی شوق میں ان کی کتاب زندگی کے باب اخلاق نے بھی عیسائیوں کو مسلمان کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ سترھویں صدی کے وسط میں دوسرے زمانوں کی بہ نسبت عیسائی کثرت سے مسلمان ہوئے اور اس زمانے میں ایسے پادریوں کا بھی بکثرت ذکر ملتا ہے جنہوں نے اپنا مذہب ترک کر کے اسلام کو قبول کیا بلکہ کلیسا کے بڑے بڑے عہدیدار بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان میں جزیرہ روڈس کا مطران بھی شامل ہے۔ ۱۶۷۵ء میں جب سلطان محمد چہارم کے فرزند مصطفےٰ کا ختنہ ہوا تو اس موقع پر کم از کم دو سو عیسائی مسلمان ہوئے۔ اسی زمانے کے ایک مصنف (۱۶۶۳ء) نے ایسے لوگوں کی ذہنی کیفیت کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "جب تم ترکوں سے روزمرہ کی زندگی میں ملو گے تو دیکھو گے کہ وہ خدا کی عبادت کرتے ہیں یہاں تک کہ داؤد کے مزامیر گاتے ہیں۔ خیرات وصدقات دیتے ہیں اور دوسرے نیک کام کرتے ہیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کا بڑا احترام کرتے ہیں اور بائبل کا ادب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس عیسائیوں میں ایک گدھا بھی بادشاہ کو تحائف دے کر ضلع کا پادری بن سکتا ہے جو تم کو عیسوی دین کی کچھ تعلیم نہیں دے سکے گا، لہٰذا تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو گا کہ ترک اچھے لوگ ہیں اور ان کی بالآخر نجات ہو جائے گی۔ پھر تم سوچو گے کہ اگر تم بھی ان کی طرح مسلمان ہو جاؤ تو شاید تمہاری بھی نجات ہو جائے۔ پس اس خیال کے آتے ہی ثالوث مقدس، خدا کا مطلوب بیٹا اور دین عیسوی کے اور بہت سے اسرار از

Marfat.com

روئے عقل مہمل معلوم ہوں گے جو تمہارے دل و دماغ سے آسانی سے نکل جائیں گے۔ اور عیسائیت غیر محسوس طور پر تمہارے دل سے محو ہو جائے گی۔ پھر تم یہ سمجھو گنے کہ عیسائی ہونا یا مسلمان ہونا ایک ہی بات ہے۔ (شیفلر ص ۵۵)

ٹامس سمتھ نے جو ۱۶۶۹ء میں قسطنطنیہ میں مقیم تھا، اس نے بعض عیسائیوں کا ذکر کیا ہے جو مسلمان ہو گئے تھے لیکن ان کے محرکات کو بہت ذلیل بتایا ہے۔ یہ سب اس کا ذہنی تعصب ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''ان کم بخت لوگوں کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے جو عیسائیت چھوڑ کر کثیر تعداد میں مسلمان ہو گئے ہیں۔ بعض نے محض مایوسی کے عالم میں اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے کیونکہ وہ غلامی کی مصیبت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور کافروں (یعنی مسلمانوں) کی بدزبانی اور توہین سے بچنا چاہتے تھے۔ اور آوارہ مزاج اوباشوں نے اپنا دین بے پروائی سے اس لیے ترک کر دیا تھا کیونکہ وہ اقتدار حاصل کر کے دوسروں پر حکومت کرنا اور ان کو بے عزت کرنا چاہتے تھے۔ بعض ان سزاؤں سے بچنا چاہتے تھے جو ان کے مکروہ جرائم کے بدلہ میں ان کو دی گئی تھیں۔ بعض ان آزادیوں کے مزے لوٹنا چاہتے تھے جن کو بانی اسلام نے اپنی مثال سے جائز کر دیا تھا۔ ان کے ارتداد کے یہی بڑے اسباب و محرکات ہیں یعنی آرام و آسائش، عیش و عشرت اور خوش حالی کی ہوس یا غرور و تکبر اور مجرمانہ ذہنیت۔ کیونکہ ہم یہ گمان نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ترکوں کے مذہب کی حماقتوں اور فریب کاریوں پر صدق دل سے ایمان لا سکتا ہے۔'' (ٹامس اسمتھ: یونانی کلیساؤں کے حالات ص ۱۵-۱۶)

یہ سارے تجزیے جو کچھ ان سیاحوں یا مغربی دانشوروں نے کیے ہیں سب غلط ہیں اصل بات ان عیسائیوں کے کثیر تعداد میں مسلمان ہونے کی یہ تھی کہ یونانی کلیسا میں اس قدر خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں کہ لوگ ان سے تنگ آ چکے تھے مارٹن لوتھر نے جو پروٹسنٹ کی

Marfat.com

تحریک رومن کیتھولک چرچ کے خلاف چلائی تھی اس کا بھی بڑا سبب کلیسا کی خرابیاں اور پوپ کی عیاشیانہ زندگی تھی۔ اسی طرح ترکی، اندلس اور دوسرے تمام علاقوں میں جہاں جہاں بھی لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو رہے تھے، اس کا سب سے بڑا سبب کلیسا کی خرابیاں اور پادریوں کی عیش و عشرت والی زندگی تھی۔ چنانچہ ترکی میں بھی یونانی کلیسا کی مختلف خرابیوں کی وجہ سے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ مذہبی پیشواؤں خصوصاً عہدیداروں کے اخلاق میں فساد اور انحطاط آ چکا تھا۔ مختلف روحانی عہدوں کا نیلام ہوتا تھا چنانچہ اخلاق باختہ پادری زیادہ سے زیادہ بولی لگا کر ان عہدوں کو خریدتے اور ان کے ذریعے ڈھیروں دولت اکٹھی کرتے۔ تمام مذہبی رسومات یعنی بپتسمہ (اصطباغ) اعترافِ گناہ، عشائے ربانی، مغفرت ناموں کے اجزا اور تدفین کے وقت ان سے بھاری رقوم وصول کرتے۔ اس زمانے کے مصنفین نے ارباب کلیسا کے مظالم کے جو چشم دید واقعات لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عیسائیوں کی حالت کلیسا کے ہاتھوں بڑی دردناک تھی۔ ایک نئے بطریرک کے انتخاب کی کیفیت قلم بند کرنے کے بعد تورنفور نے ۱۷۰۰ء میں یوں لکھا ہے کہ "ہمیں اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ نیا بطریرک اپنے عہدے سے خوب فائدہ اٹھائے گا۔ عہدوں کی خرید و فروخت سے لوگوں پر بڑا ظلم و ستم ہوتا ہے۔ بطریرک (پادری) پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے حلقہ کے تمام اسقفوں اور پادریوں کو سلطان کا یہ حکم پہنچاتا ہے کہ اس کی یہ سب سے بڑی کوشش ہونی چاہیے کہ ہر ایک پادری کے حلقے کی آمدنی دریافت کرے۔ اس کے بعد وہ ان پر ٹیکس لگاتا ہے اور پھر دوسرے خط میں ان کو تاکید کرتا ہے کہ مطلوبہ رقم روانہ کی جائے ورنہ ان کے علاقوں پر اور لوگوں کو مقرر کر دیا جائے گا جو ان کے لیے بڑھ کر بولی دیں گے۔ چونکہ اسقف لوگ اس بیوپار سے خوب آشنا ہیں اس لیے وہ اپنے ماتحت قسیسوں سے کچھ رو رعایت نہیں کرتے۔ پھر قسیس اپنے ماتحت پادریوں کو تنگ کرتے ہیں اور پادری عیسائی عوام کی کھال کھینچتے ہیں۔ اصطباغ کے موقع پر مقدس پانی کا ایک قطرہ بھی اس وقت تک نہیں چھڑکتے جب تک ان کو پیشگی نذرانہ نہ دے دیا جائے۔

Marfat.com

سترھویں صدی میں پادری لوگ جس سختی سے یونان کے عیسائیوں سے روپیہ بٹورتے تھے اس کی نظیر ہمیں انیسویں صدی میں بھی ملتی ہے۔ آسٹریا کے قبضہ کرنے سے قبل بوسینیا کے عیسائی اپنے مذہبی پیشواؤں کے ہاتھوں جو تکلیفیں اٹھاتے تھے۔ اس سے تورنفور کے مذکورہ بالا قول کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔ چنانچہ سراجیوو کا مطران اپنے حلقے کی کم نصیب رعایا سے ہر سال دس ہزار کی خطیر رقم وصول کرتا تھا۔ یہ رقم خود ترکی کے گورنر کی تنخواہ سے دوگنی ہوتی تھی۔ اس بھاری رقم کی وصولی کے لیے ان بدقسمت لوگوں پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا جاتا تھا۔ اگر عیسائی اس کی ادائیگی سے انکار کرتے تو ان کے گاؤں کی حالت ایسی ہو جاتی تھی گویا وہ لڑائی میں تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ چنانچہ ایک پادری کا واقعہ میکنزی نے لکھا ہے کہ ترنووا کے مقام میں ایک پادری رہتا تھا جس کا نام یواچم تھا۔ عام عیسائی اس کی بڑی عزت کرتے تھے لیکن اس کے اسقف کو اس سے نفرت اور عداوت تھی۔ ایک روز اسے حکم ملا کہ اسقف کے اصطبل میں جا کر وہاں کا کوڑا کرکٹ صاف کرے۔ اور جب پادری نے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا تو اسقف کے ملازمین اور نوکروں نے لاٹھیوں سے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ لیکن پادری بھی بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بچایا اور پھر اپنا چوغہ اتار کر قاضی کے پاس جا پہنچا اور ابھی آفتاب بھی حجلۂ مغرب میں غروب نہیں ہوا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا۔

عیسائی آبادی کی حفاظت و حمایت کرنے کے بجائے ان کے مذہبی پیشوا بطریرک ان پر ایسا ناقابل برداشت ظلم و ستم کرتے تھے کہ جب کبھی رعایا کو موقع ملتا تھا وہ اعلانیہ بغاوت کر دیتی تھی، لہٰذا یہ بات باعث تعجب نہیں کہ بہت سے عیسائی اس ظلم سے بچنے کے لیے مسلمان ہو گئے۔

•

یہ تو عیسائی پیشواؤں کا ایک اجمالی خاکہ تھا کہ وہ کن کن خرابیوں میں مبتلا ہو چکے تھے اور ان کی زندگی کا مقصد وحید صرف اور صرف مال اکٹھا کرنا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی نفرت انگیز باتیں ان میں پائی جاتی تھیں لیکن اس کے برعکس ترکوں کے اخلاق اور ان

Marfat.com

کی زندگی میں بہت سی خوبیاں تھیں جو لوگوں کو متاثر کرتیں اور اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ عیسائی کلیسا اور معلموں کی اخلاقی پستی اور انحطاط کے مقابلہ میں ترکوں کو جو برتری اور ترفع حاصل تھا اس نے قدرتی طور پر ان دیندار عیسائیوں کو متاثر کیا جو ارباب کلیسا کی خودغرضی، رشوت ستانی، حب مال، حب جاہ اور خیانت سے متنفر ہو چکے تھے۔ عیسائی مصنفوں نے اس زمانے کے ترکوں کی مذہبی اور اخلاقی زندگی کی تعریف و توصیف کی ہے اور ان کی اس لحاظ سے ستائش کی ہے کہ وہ اپنے مذہبی فرائض بڑے جوش عقیدت سے ادا کرتے ہیں۔ ان کے لباس اور طرز زندگی میں سادگی پائی جاتی ہے حتیٰ کہ ان کے اکابر اور صاحب اقتدار لوگوں کی زندگی بھی اتنی سادہ ہے کہ اس میں ظاہری نام و نمود کا کہیں کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔

شہنشاہ لیوپولڈ اول نے ۱۶۶۵ء میں جو سفارت سلطان روم کے دربار میں بھیجی تھی اس کے مورخ نے ترکوں کی دیانت داری اور نماز کی پابندی کی خاص طور پر بہت تعریف کی ہے۔ اس نے یہاں تک لکھا ہے کہ ''اگرچہ یہ امر عیسائیوں کے لیے باعث شرم و ندامت ہے لیکن ہم یہ بات کہنے پر مجبور ہیں کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں ترک اپنے مذہبی فرائض کی بجا آوری میں بڑی سرگرمی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی یہ بات عیسائیوں کی بہ نسبت کہیں بڑھ کر ہے کہ نماز کے دوران میں ان کی توجہ منتشر نہیں ہوتی اور تمہیں کوئی مسلمان ایسا نظر نہیں آئے گا جو عبادت کے وقت عبادت میں ہمہ تن مصروف نہ ہو اور جس کی صورت اور ہیئت سے اپنے خالق کے لیے ادب اور احترام کی وہ تمام علامات ظاہر نہ ہوتی ہوں جن کا اظہار اس کی مخلوق پر واجب ہے۔'' (گالیٹرص ۱۸۰-۱۸۲)

لوگوں نے ترکی فوج کے اخلاق اور چال چلن کی بھی بہت تعریف کی ہے۔ چارلس دوم نے سلطان روم کے پاس جو سفارت بھیجی تھی، اس کے سیکرٹری نے لکھا ہے کہ جب ترکی فوج ملک میں سے گزرتی ہے تو باشندوں کو اس قسم کی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوتی کہ سپاہیوں نے کسی کا مال لوٹا ہو یا کسی عورت کی بے حرمتی کی ہو۔ جس راستے سے فوج کوچ کرتی ہے وہاں کے تمام شراب خانے فوج کی آمد سے دو یا تین روز قبل

Marfat.com

مقفل کر دیے جاتے ہیں۔ کوئی شخص کسی سپاہی کے ہاتھ شراب فروخت کرنے کا مجاز نہیں، وگرنہ وہ سخت سزا کا مستوجب ہوتا ہے۔

ایسے عیسائی مصنفین نے جن کو ترکوں کے ساتھ مطلق کوئی ہمدردی نہ تھی، انہوں نے بھی ان کے اوصاف کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ چنانچہ الیگزینڈر روس جوان کے مذہب کو بہت برا سمجھتا ہے، اس نے بھی ان کے اوصاف کو اس طرح بیان کیا ہے: ''اگر عیسائی مسلمانوں کے قوانین اور ان کی تواریخ کا دقت نگاہ سے مطالعہ کریں تو ان کو یہ دیکھ کر شرم آئے گی کہ مسلمان عبادت گزاری، پرہیز گاری اور خیرات وصدقات دینے کے کس قدر پابند ہیں اور پاکیزگی اور احترام کا ثبوت دیتے ہیں۔ اپنے علمائے دین کی کیسے اطاعت کرتے ہیں حتیٰ کہ سلطان بھی مفتی سے فتویٰ لیے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ اور مسلمان خواہ کہیں ہوں یا کسی کام میں مشغول ہوں، نماز پنجگانہ کے کیسے پابند ہیں اور کس طرح مہینہ بھر صبح سے شام تک روزہ رکھتے ہیں۔ ان میں آپس میں کس قدر محبت اور مروت ہے۔ جو ہسپتال انہوں نے غریبوں اور مسافروں کے لیے بنائے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو غیروں اور اجنبیوں کے ساتھ بھی کس قدر محبت اور ہمدردی ہے۔ اگر ہم ان کے عدل وانصاف، ان کی پرہیز گاری اور فیض رسانی اور ان کے محاسن اخلاق کا خیال کریں تو ہمیں اس بات پر شرم آتی ہے کہ ہم عبادت گزاری اور فیض رسانی میں کس قدر سرد مہری سے کام لیتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ ہم اپنی بے انصافی، بے اعتدالی اور ستم رانی پر خجالت محسوس کرتے ہیں۔ بے شک انصاف کے دن مسلمانوں کا پلہ ہم سے بھاری رہے گا اور ان کی عبادت گزاری، ان کی پرہیز گاری اور رحم دلی یقیناً یہی وہ اسباب ہیں جن سے اسلام کو فروغ حاصل ہوا ہے۔''

Marfat.com

تاتاریوں میں دعوتِ اسلام

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں مسلمانوں کا سیاسی انتشار، اخلاقی کمزوری اور ضعف جب پورے طور پر نمایاں ہوگیا اور اسلام کی طاقت کا وہ مہیب سایہ جو دور سے نظر آتا تھا، اوجھل ہوگیا تو مسلمانوں پر وحشی قوموں اور حریف طاقتوں کا نرغہ ہوا۔ ان وحشیانہ حملوں میں سب سے بڑا حملہ تاتاریوں کا حملہ تھا جو چیونٹیوں کی طرح مشرق سے بڑھے اور ایک قلیل عرصہ میں عالم اسلام پر چھا گئے۔ تاتاری یورش عالم اسلام کے لیے ایک بلائے عظیم تھی جس سے دنیائے اسلام کی چولیں ہل گئیں۔ مسلمان مبہوت و ششدر تھے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہراس اور یاس کا عالم طاری تھا۔

چنگیز خان وسط ایشاء سے ۱۲۱۶ء میں ساٹھ ہزار وحشی انسانوں کو لے کر نکلا۔ یہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اور تیر اور تلوار لیے ہوئے آبادیوں پر ٹوٹ پڑے اور تمام تمدنی نشانات کو برباد اور تہ و بالا کر ڈالا۔ عراق، ایران اور ترکستان ان کے قدموں کے نیچے زیروزبر ہوگئے اور انہوں نے بغداد کی عظیم مسلم سلطنت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

۱۳۵۳ء میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان کی سرکردگی میں یہ طوفان دوبارہ اٹھا اور ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بھی تہس نہس کر ڈالا جو عظیم مسلم خلافت کی بربادی کے بعد ابھرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک مغربی مورخ کے نزدیک یہ واقعہ اتنا ہولناک تھا کہ اس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے:

Marfat.com

''آسمان نے زمین پر گر کر تمام چیزوں کو مٹا دیا۔''

(Chenghiz Khan. Harold Lamp. P.266)

بعض مورخین نے اس کو اس طرح تشبیہ دی ہے کہ جس طرح کسی پہاڑ سے برف کا ایک بھاری تودہ اچانک آ گرتا ہے اسی طرح چنگیز خان کے وحشی لشکر اسلامی تہذیب و تمدن کے مرکزوں پر آن ٹوٹے اور اپنے پیچھے ویران صحرا اور بھیانک کھنڈر چھوڑ گئے حالانکہ ان کی آمد سے پہلے یہاں کبھی شان دار شہروں کے محلات کھڑے تھے اور ان کے گردونواح میں خوش نما باغات اور سرسبز کھیت لہلہاتے تھے۔ جب ہرات کے شہر سے مغلوں کے لشکر نے کوچ کیا تو چالیس تباہ حال آدمی اپنی پناہ گاہوں سے نکلے اور دہشت زدہ نظروں سے اس برباد ویرانے کو دیکھنے لگے جو چند روز قبل ان کا خوب صورت شہر تھا۔ صرف یہی چالیس آدمی تھے جو ایک لاکھ کی آبادی میں سے بچے تھے۔ بخارا جو علمائے اسلام کی بدولت دنیا بھر میں مشہور تھا اور امام بخاری کا مسکن رہا تھا۔ ان مغلوں اور تاتاریوں نے اس کی مسجد کے صحنوں میں اپنے گھوڑے باندھے اور قرآن حکیم کے نسخوں کو پھاڑ پھاڑ کر ان کی بے حرمتی کی۔ جو باشندے ان قصابوں کے ہاتھ سے بچ گئے ان کو غلام بنا کر لے گئے اور ان کے شہروں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ یہی حال سمرقند، بلخ اور وسطی ایشیاء کے دوسرے شہروں کا ہوا جن سے اسلامی تہذیب و تمدن کی شان و شوکت وابستہ تھی اور جو اولیاء کرام کا مسکن اور علم و فضل کا مخزن تھے۔ یہی مصیبت بغداد پر نازل ہوئی جو صدیوں تک دولت عباسیہ کا پایۂ تخت رہ چکا تھا۔

سفاکی اور غارت گری کے ان واقعات کے تصور ہی سے اگر کوئی مسلمان مورخ کانپ اٹھا ہو تو یہ بات کچھ بے جا نہیں ہے۔ ابن اثیر نے جہاں اسلامی ملکوں پر تاتاریوں کے حملوں کا حال لکھا ہے وہاں وہ بیان کرتا ہے: ''میں کئی برس تک اس حادثے کے ذکر سے پہلو تہی کرتا رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں کیونکہ میں اسے ایک حادثہ عظیم سمجھتا تھا اور اس کے ذکر سے کراہت محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ اسی تردد کی حالت

Marfat.com

میں کبھی ایک قدم آگے بڑھاتا اور کبھی ایک قدم پیچھے ہٹاتا تھا کیونکہ ایسا کون شخص ہوگا جس کے لیے اسلام اور مسلمانوں کی خبر مرگ کا لکھنا اور اس کا بیان کرنا آسان ہو۔ کاش کہ میری ماں مجھ کو نہ جنتی اور میں اس سے پہلے ہی مرجاتا اور دنیا مجھ کو بالکل بھول جاتی۔ جب کہ میں اس بارہ میں پس و پیش کر رہا تھا، میرے چند دوستوں نے مجھے اس سانحہ کے قلم بند کرنے پر مجبور کیا۔ پھر میں نے بھی خیال کیا کہ اس حادثے کا ذکر چھوڑ دینے میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اس کے ضمن میں مجھے ایک بڑے حادثے اور ایک مصیبت کا حال لکھنا ہے جس کی نظیر لانے سے لیل و نہار قاصر ہیں۔ یہ مصیبت تمام لوگوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً نازل ہوئی۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جب سے خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ہے اس وقت سے آج تک اہل دنیا ایسی سخت مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئے تو وہ بالکل حق بجانب ہوگا کیونکہ تاریخی کتابوں میں کوئی ایسا حادثہ مذکور نہیں جو دہشت انگیزی اور سنا کی میں اس کے لگ بھگ ہو۔ اس قسم کا سب سے بڑا حادثہ جو تاریخ میں مذکور ہے، یہ ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل کا قتل عام کیا تھا اور بیت المقدس کو برباد کیا تھا، مگر بیت المقدس کو ان شہروں سے کیا نسبت ہے جن کو ان ملعونوں نے تباہ کیا اور جن میں سے ہر شہر بیت المقدس سے کئی گنا بڑا تھا۔ اسی طرح بنی اسرائیل کا ان لوگوں کے مقابلے میں کیا شمار ہے جن کو تاتاریوں نے قتل کیا، یہ تعداد میں بنی اسرائیل سے کہیں زیادہ تھے۔ شاید اہل علم دنیا کے خاتمے تک ایسا عظیم حادثہ نہیں دیکھیں گے۔ ان وحشیوں نے کسی پر رحم نہیں کھایا۔ انہوں نے عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کیا۔ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیے اور پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ولا حول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ یہ حادثہ عالم گیر اور عالم آشوب تھا۔ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے۔" (کامل ابن اثیر جلد ۱۲ص ۲۳۴)

۶۵۶ء میں تاتاری دارالخلافت بغداد میں فاتحانہ داخل ہوئے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ علامہ ابن کثیرؒ بغداد کی تباہی اور تاتاری وحشیوں کی غارت

Marfat.com

گری اور خون آشامی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

''بغداد میں چالیس روز تک قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ چالیس روز کے بعد یہ باغوں کا شہر جو دنیا کا رونق ترین شہر تھا، ایسا ویران اور برباد ہوا کہ شہر میں خال خال لوگ نظر آتے تھے۔ بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح لگے ہوئے تھے کہ دیکھنے والوں کو ٹیلے نظر آتے تھے۔ ان کی لاشوں پر بارشیں ہوئیں تو صورتیں مسخ ہو گئیں اور سارے شہر میں تعفن اور گندگی پھیل گئی جس سے شہر کی ہوا خراب ہوئی، اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر ملک شام تک پہنچا۔ اس متعفن ہوا اور وبا سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق بکثرت مری۔ وبا اور فنا تینوں کا دور دورہ تھا۔'' (البدایہ والنہایہ جلد ۱۳ص)

ان سب حوالوں سے ان وحشی تاتاریوں کی ہلاکت خیز کاروائیوں کا پتہ چلتا ہے اور اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کی خون آشامیوں کے آگے اس وقت کسی حکومت کے بس میں نہ تھا کہ بند باندھ سکے۔ ایسے نازک حالات میں اسلام کی دعوتی قوت ہی تھی جس نے اسلام کے نہ رکنے والے سیلاب سے اسلام اور مسلمانوں کو بچایا یعنی اسلام کے لیے اپنی گذشتہ شان و شوکت کی خاکستر سے دوبارہ جی اٹھنا اور اپنے مبلغوں کی کوشش سے ان وحشی تاتاریوں کو اپنا حلقہ بگوش بنانا مقدر ہو چکا تھا۔ مسلمان مبلغوں کا یہ کام اس وجہ سے اور بھی دشوار تھا کہ اس وقت اسلام کو دو زبردست حریفوں سے مقابلہ درپیش تھا یعنی بدھ مت اور عیسائیت۔ اسلام اور یہ دونوں مذاہب ان وحشی فاتحین کو اپنا معتقد بنانے کی کوشش میں مصروف تھے جنہوں نے ان مذاہب کے ماننے والوں کو پامال کر رکھا تھا۔ ان مذاہب کا باہمی مقابلہ ایک ایسا منظر پیش کرتا ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

چنگیز خان کے جانشین:

چنگیز خان کے مرنے کے بعد تاتاریوں کی سلطنت اس کے چار بیٹوں میں

Marfat.com

منقسم ہو گئی چنگیز خان کا تیسرا بیٹا اوکتائی بطور خاقان (یعنی خان اعظم) اس کا جانشین ہوا اور اس کے حصے میں سلطنت کا مشرقی حصہ آیا جس میں بعد میں قوبلائی خان نے چین بھی شامل کر لیا تھا۔ اس کا دوسرا بیٹا چغتائی خان سلطنت کے وسطی حصے یعنی ترکستان کا مالک بنا۔ چنگیز خان کے بڑے بیٹے جوجی خان کا فرزند باتو خان سلطنت کے مغربی حصے یعنی دشت قبچاق کا حکمران مقرر ہوا اور آلتون اردو کا خان کہلایا۔ چنگیز خان کے چوتھے بیٹے تولوی نے ایران میں اپنی بساط حکومت بچھائی اور اس کے بعد اس کے بیٹے ہلاکو خان نے ایشیائے کوچک کے بڑے حصے کو بھی ایران کی مملکت میں شامل کر لیا اور ایران میں ایلخانی خاندان کی بنیاد رکھی۔

یہ وقت اسلام کے لیے بڑا مشکل تھا۔ مسلمان میدان جنگ کی بازی ہار چکے تھے۔ شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے تھے۔ فوجیں تتر بتر اور ہلاکت کے منہ میں چلی گئی تھیں۔ چنانچہ اس صورت حال کے بارہ میں امریکی یہودی مورخ ہٹی نے لکھا ہے:

''مشرق میں وحشی منگولوں کے تیر اندازوں کی یلغار اور مغرب میں زرہ پوش صلیبی سرداروں کے درمیان تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا، مگر اس صدی کے آخری حصہ میں صورت حال کچھ مختلف ہو چکی تھی۔ آخر صلیبی اس وقت سمندر میں دھکیلا جا چکا تھا۔ گیارہ تاتاری خانوں میں سے ساتویں خان نے جن میں سے اکثر (کے ہاں عیسائی بیویاں تھیں اور) وہ عیسائیت کی طرف مائل تھے۔ بالآخر اسلام کو سرکاری مذہب کے طور پر تسلیم کر لیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مذہب نے وہاں اسلامی تہذیب کی بے رحمانہ تباہی کے بعد نصف صدی سے بھی کم مدت میں اس کا پوتا غازان مسلمان ہو کر تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت اور قوت خرچ کر رہا تھا۔''

(ہسٹری آف عربز، ہٹی، ص ۴۸۸)

اسلام کی اس دعوتی قوت کا اعتراف پروفیسر آرنلڈ نے بھی ان لفظوں میں کیا ہے:

''بعد کے سالوں میں اگرچہ یہ عظیم سلطنت پارہ پارہ ہوگئی اور اسلام کی سیاسی قوت کم ہوگئی مگر اس کی روحانی فتوحات بغیر وقفہ کے برابر جاری رہیں۔ جب ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ اور عباسی خلافت کی شان وشوکت کو خون میں غرق کر دیا گیا، اس وقت اسلام جزیرہ سماٹرا میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور جزائر ملایا میں اپنا فاتحانہ سفر شروع کر رہا تھا۔ اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی نمایاں روحانی فتوحات حاصل کیں۔ دو بڑے مواقع پر کافر قبائل نے اپنے پاؤں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیروؤں کی گردن پر رکھ دیئے تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں سلجوقی ترکوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں (تاتاریوں) نے، مگر ہر بار فاتح نے مفتوح کے مذہب کو قبول کرلیا۔'' (پریچنگ آف اسلام، آرنلڈ ص ۲۲۱)

اندازہ فرمائیں کہ جو کام تیر وسناں اور تیغ وتفنگ سے سرانجام نہ دیا جا سکا وہ خاموش دعوت وتبلیغ سے انجام کو پہنچ گیا۔ علامہ تقی الدین ابن تیمیہؒ نے مصر وشام کے مسلمانوں کو اکٹھا کر کے یہ نعرہ دیا کہ

الحرب انفی للحرب یعنی جنگ کا علاج جنگ ہے

لیکن وہ انتہائی فوجی قوت کے باوجود اسے ختم نہ کر سکے۔ روایات میں ہے کہ ۶۹۹ھ کا نیا سال شروع ہوا تھا کہ متواتر اطلاعات ملیں کہ ایران اور عراق کے تاتاری فرمانروا قازان کی نیت شام پر حملہ کرنے کی ہے اور اس کی فوجوں کا رخ دمشق کی جانب ہے۔ تاتاریوں کے حملہ کے جو تلخ تجربات اسلامی ممالک کو تھے ان کی بنا پر پورے ملک شام میں اس اطلاع سے ایک دہشت اور ہیبت پھیل گئی۔ لوگ حلب اور حماۃ سے دارالسلطنت دمشق کا رخ کرنے لگے یہاں تک کہ حماۃ سے دمشق تک گھوڑے کا کرایہ دو سو درہم ہوگیا۔ چند دنوں کے بعد لوگوں نے سنا کہ سلطان مصر الملک الناصر محمد بن قلاوون افواج شاہی کے ساتھ

Marfat.com

تاتاریوں کے مقابلہ کے لیے آرہے ہیں۔ اس خبر نے لوگوں میں کچھ اطمینان پیدا کر دیا۔ ۸ ربیع الاول ۶۹۹ھ کو مصری افواج دمشق میں داخل ہوئیں۔ اہل شہر نے سخت کیچڑ اور بارش کے باوجود بڑی گرم جوشی سے سلطان اور اس کی افواج کا استقبال کیا۔ شہر کو آراستہ کیا گیا اور مسلمانوں کی فتح و نصرت کے لیے دعائیں مانگیں گئیں۔ ۱۷ ربیع الاول ۶۹۹ھ کو سلطان تاتاریوں کے مقابلہ کے لیے نکلا۔ بڑے بڑے علماء اور اعیان شہر ہم رکاب تھے۔ باقاعدہ فوج، رضا کاروں اور رنگروٹوں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد ساتھ تھی۔ مساجد میں قنوت نازلہ اور دعاؤں کا خاص اہتمام کیا گیا۔ دمشق کے باہر ۲۷ ربیع الاول ۶۹۹ھ کو قازان اور سلطان مصر کی فوجوں کے درمیان معرکہ ہوا۔ مسلمان میدان میں جم کر لڑے اور پوری بہادری سے مقابلہ کیا لیکن قسمت نے ساتھ نہ دیا اور شکست سے دوچار ہوئے۔ سلطانی افواج تو مصر چلی گئیں اور اہل دمشق نے دمشق میں پناہ لی۔ اس شکست سے دمشق میں بدحواسی پھیل گئی۔ بڑے بڑے علماء اور سربرآوردہ حضرات شہر چھوڑ کر مصر کا رخ کرنے لگے۔ کئی نامور علماء حاکم شہر، محتسب اور بڑے بڑے تاجر پہلے ہی شہر چھوڑ چکے تھے۔ تمام انتظامیہ شہر چھوڑ چکی تھی۔ صرف منتظم قلعہ ابھی مقیم تھا۔ مختصر یہ کہ کوئی ذمہ دار شخص شہر میں موجود نہ تھا۔ گرانی اپنی انتہا کو چھو رہی تھی۔ قیدی جیل توڑ کر باہر نکل آئے تھے اور انہوں نے شہر میں قتل و غارت کا ایک سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ باغات جو اہل دمشق کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھے، ان کے دروازے توڑ ڈالے گئے۔ ادھر دمشق میں یہ افراتفری اور طوفان بدتمیزی تھا، ادھر قازان تاتاری کی آمد کا شور تھا جس نے لوگوں کو حواس باختہ کر دیا ہوا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر اعیان شہر اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے مشورہ کیا اور یہ قرار پایا کہ شیخ الاسلامؒ چند علماء اور رفقاء کی معیت میں قازان سے ملاقات کریں اور اہل دمشق کے لیے پروانۂ امن حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ۳ ربیع الثانی ۶۹۹ھ کو مقام نبک میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور تاتاریوں کے بادشاہ قازان کی باہمی ملاقات ہوئی۔ شیخ کمال الدین بن الانجا جو اس وقت ابن تیمیہؒ کے ساتھ دمشق سے اس وفد میں گئے تھے، اس

Marfat.com

ملاقات کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''میں شیخ ابن تیمیہؒ کے ساتھ اس ملاقات میں موجود تھا۔ وہ سلطان قازان (تاتاری) کو عدل وانصاف کی آیات اور احادیث سناتے تھے۔ ان کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی اور وہ برابر سلطان کے قریب ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ قریب تھا کہ ان کے گھٹنے اس کے گھٹنے سے مل جائیں۔ سلطان کو اس سے کچھ ناگواری نہیں ہوئی۔ وہ نہایت توجہ سے کان لگائے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ہمہ تن متوجہ تھا۔ اس پر ان کا رعب ایسا طاری تھا اور وہ ان سے ایسا متاثر تھا کہ اس نے ان لوگوں سے پوچھا یہ عالم کون ہیں؟ میں نے ابھی تک ایسا شخص نہیں دیکھا اور نہ ہی اس شخص سے زیادہ کوئی دلیر اور مضبوط اعصاب والا شخص آج تک دیکھنے میں آیا۔ مجھ پر ابھی تک کسی کا ایسا اثر نہیں پڑا تھا۔ لوگوں نے آپ کا تعارف کرایا اور ان کے علمی اور عملی کمالات و محاسن کا تذکرہ کیا۔ ابن تیمیہؒ نے قازان سے کہا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان [1] ہو اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھ قاضی، امام، شیخ اور موذنین بھی رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود تم نے ہم مسلمانوں پر حملہ کیا حالانکہ تمہارے باپ دادا کافر ہونے کے باوجود ایسے اعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ہر عہد کی پابندی کی اور تم نے ہر عہد کو توڑا اور جو کچھ کہا تھا اس کو پورا نہیں کیا اور بندگان خدا پر ظلم کیا۔'' (الکواکب الدریہ فی مناقب الامام المجتہد شیخ الاسلام ابن تیمیہ، شیخ مرعی بن یوسف ص ۲۵)

[1] قازان کا اسلامی نام محمود ہے۔ یہ چنگیز خان کا پڑپوتا تھا۔ ۶۹۴ھ میں اس نے امیر توزونؒ کی دعوت پر اسلام قبول کر لیا تھا لیکن پانچ سال کے مختصر عرصہ میں اس کی سیرت واخلاق کی یکسر تبدیلی اور اسلامی تعلیم و تربیت کی زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی، باوجود مسلمان ہو جانے کے تاتاریوں کی دہشت انگیزی، غارت گری اور سفاکی میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوا تھا۔

Marfat.com

ہر عہد کی پابندی کی اور تم نے ہر عہد کو توڑا اور جو کچھ کہا تھا اس کو پورا نہیں کیا اور بندگان خدا پر ظلم کیا۔'' (الکواکب الدریہ فی مناقب الامام المجتہد شیخ الاسلام ابن تیمیہ، شیخ مرعی بن یوسف ص ۲۵)

شیخ کمال الدین فرماتے ہیں کہ ایسی تلخ، درشت اور سخت گفتگو کرنے کے باوجود شیخ الاسلامؒ نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ واپس آئے۔ تاتاریوں کے پاس جو مسلمان قید تھے ان کی بڑی تعداد آپ کے حسن سفارش سے چھوڑ دی گئی۔ شیخ الاسلامؒ فرمایا کرتے تھے: ''غیر اللہ سے تو وہ ڈرے گا جس کے دل میں کوئی بیماری ہے۔'' امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے حکام سے اپنے اندیشہ اور خوف کا اظہار کیا۔ فرمایا: ''اگر تم تندرست ہوتے تو کسی سے نہ ڈرتے۔'' (الکواکب الدریہ ص ۲۵)

اہل دمشق کو اگرچہ تاتاری سلطان کی طرف سے پروانہ امن مل گیا تھا اور دمشق میں اس کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا لیکن دمشق کے اطراف میں تاتاریوں کی غارت گری جاری تھی اور شہر پناہ سے باہر ایک اودھم سا مچا ہوا تھا۔ شہر میں ضروریات زندگی کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ ادھر تاتاریوں کا یہ مطالبہ تھا کہ حکومت سابقہ کے جتنے گھوڑے، ہتھیار اور نقد لوگوں کے پاس چھپا ہوا ہے وہ سب تاتاریوں کے حوالے کر دیا جائے۔ تاتاریوں نے ایک تاتاری نومسلم سیف الدین کو اپنی طرف سے حاکم شہر مقرر کیا اور اس نے اہل شہر پر سختی شروع کی۔ شہر پر تاتاریوں کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ صرف قلعہ، قلعہ دار جواش نے ان کے حوالے نہیں کیا تھا اور صاف انکار کر دیا تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ اس کے محرک شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ تھے۔ انہوں نے قلعہ دار کو قلعہ حوالے کرنے سے روکا تھا اور قلعہ دار نے آخر وقت تک ان کے اس حکم پر عمل کیا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۴ ص ۱۷) اب تاتاریوں نے شہر میں قتل وغارت شروع کر دی۔ شریف خاندان اور علماء کے گھرانوں کے لڑکے اور لڑکیاں غلام اور باندیاں بنا لی گئیں۔ کتب خانے لوٹ لیے گئے۔ ان حالات میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے قازان کو دوبارہ

Marfat.com

ملنا چاہا لیکن انہیں قازان کے حواریوں نے نہ ملنے دیا۔ اب یہ خبر مشہور ہو گئی کہ جو تاتاری شہر سے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں وہ اب شہر میں داخل ہوا چاہتے ہیں۔ اس خبر نے شہر میں ایک کھلبلی مچا دی اور لوگوں کے رہے سہے ہوش و حواس جاتے رہے۔ تاتاریوں نے قلعہ کا قبضہ لینے کے لیے منجنیقیں نصب کر دیں اور دوسری تمام تیاریاں بھی مکمل کر دیں۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

"راستوں اور سڑکوں پر سناٹا تھا۔ اکا دکا کوئی شخص نظر آتا تھا۔ جامع مسجد میں نمازیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ جمعہ کی نماز میں جامع اموی میں بڑی مشکل سے ایک صف پوری ہوتی تھی۔ اور کچھ آدمی پیچھے ہوتے۔ جو شخص کسی ضرورت سے نکلتا بھی تو وہ تاتاریوں کا بھیس بدل کر نکلتا اور پھر فوراً واپس آ جاتا۔ پھر بھی یہ کھٹکا لگا رہتا کہ شاید واپس آنا نصیب نہ ہو۔" (البدایہ والنہایہ جلد ۱۴ ص ۹)

۲۹ جمادی الاولیٰ کو قازان تو عراق کی طرف چلا گیا لیکن وہ اپنا نائب اور کثیر فوج پیچھے چھوڑ گیا۔ اس فوج نے اردگرد کی بستیوں میں لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ اب ابن تیمیہؒ سے نہ رہا گیا۔ وہ ۸ رجب المرجب کو بولائی کی لشکر گاہ میں جا کر اس سے ملے اور قیدیوں کی رہائی اور دوسرے کئی امور پر اس سے بات چیت کی۔ ۹ رجب کو اطلاع ملی کہ سلطان محمد بن قلاوؤن اور مصری افواج دمشق کے استخلاص کے لیے مصر سے روانہ ہو گئی ہیں۔ اب قلعہ دار جواش نے اعلان کرایا کہ اہل شہر، شہر پناہ اور دروازوں کی حفاظت کریں۔ لوگوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ حافظ ابن کثیرؒ کا بیان ہے کہ "ابن تیمیہؒ کا ان دنوں معمول تھا کہ رات بھر شہر پناہ کا گشت کرتے تھے اور لوگوں کو جہاد اور رباط فی سبیل اللہ کی آیات واحادیث سنا کر صبر و قتال کی ترغیب دیتے تھے۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۱۴ ص ۱۱)

ربیع الثانی ۷۰۰ھ میں پھر تاتاریوں کی آمد کی خبر گرم ہوئی۔ اب ابن تیمیہؒ نے نائب الشام سے ملاقات کی۔ نائب الشام اور اعیان سلطنت نے آپ سے

Marfat.com

استدعا کی کہ آپ خود مصر جائیں اور سلطان محمد بن قلاووں کو شام کی حفاظت اور تاتاریوں سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کریں۔ چنانچہ وہ ڈاک کی سواری سے مصر روانہ ہوئے اور وہاں جا کر سلطان ابن قلاووں کو اپنی ایمان افروز اور یقین آفرین باتوں سے غیرت دلائی اور شام کی حفاظت کے لیے آمادہ کیا۔ چنانچہ سلطان آپ کے کہنے پر مصری افواج کے ساتھ دمشق کی طرف روانہ ہوگا۔ شیخ ابن تیمیہؒ نے واپس آ کر دمشق کے لوگوں کو خوشخبری سنائی اور انہیں جہاد کی ترغیب دی۔ آخر ۲ رمضان المبارک ۷۰۰ھ کو شحب کے میدان میں مصری اور تاتاری فوجوں میں سخت مقابلہ ہوا۔ سلطان محمد بن قلاووں نے بڑی ثابت قدمی دکھائی۔ اس نے اپنے گھوڑے کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں کہ بھاگنے نہ پائے۔ بڑے بڑے ترکی امراء کام آئے اور بالآخر ایک گھمسان کی جنگ کے بعد تاتاریوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بکثرت تاتاری قتل ہوئے۔ ۴ رمضان المبارک کو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ دمشق میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے ان کا شاندار استقبال کیا اور ان کو مبارک باد کے ساتھ دعائیں بھی دیں۔ ۵ رمضان کو سلطان اور اعیان سلطنت مظفر و منصور شہر دمشق میں داخل ہوئے۔

تاتاریوں کا قبول اسلام:

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ کا ذکر تو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں اس لیے آ گیا کہ قارئین کو یہ بتایا جا سکے کہ تاتاری مسلمان ہونے کے باوجود بھی کس قدر سفاک اور غارتگر تھے۔ بہرحال تاتاریوں نے تمام اسلامی علاقوں میں ایک اودھم مچا رکھا تھا، شہر ویران اور حکومتیں نابود ہو چکی تھیں۔ لوگ ایک نہایت کش مکش کی زندگی اور ماحول میں تھے، لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود تاتاریوں اور دیگر وحشی قبائل نے جو ان کے ہمراہ تھے، بالآخر انہی مسلمانوں کے مذہب کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جن کو انہوں نے بے دردی سے پامال اور تباہ حال کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ تاریخ اس تبلیغی تحریک پر بہت کم روشنی ڈالتی ہے۔ اور ہمیں صرف چند سر برآوردہ لوگوں کے قبول اسلام

Marfat.com

کے متعلق چند تفصیلات ملتی ہیں۔ تاتاری سلطنت کے طول وعرض میں مختلف مقامات پر بہت سے ایسے مسلمان موجود ہوں گے جو کافروں کو مسلمان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اوکتائی خان (۱۲۲۹ء تا ۱۲۴۱ء) کے عہد حکومت میں فارس کا ایک گورنر کرگز تھا، وہ پہلے بدھ مت کا پیروکار تھا لیکن جب وہاں روحانی اطمینان حاصل نہ ہوا تو بدھ مت کو ترک کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ تیمور خان (۱۳۲۳ء تا ۱۳۲۸ء) کے عہد میں آنندا جو قبلائی خان کا پوتا اور صوبہ کانسو کا حاکم تھا، ایک پرجوش مسلمان ثابت ہوا۔ چنانچہ اس نے تان گوت میں بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا اور جو لشکر اس کے زیر فرمان تھا اس کی ایک کثیر تعداد نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس کو دربار میں طلب کیا گیا اور اس بات کی پوری پوری کوشش کی گئی کہ وہ بدھ مت اختیار کرے جب اس نے اسلام کو ترک کرنے سے انکار کیا تو اسے پس دیوار زندان کر دیا گیا، لیکن پھر اسے جلدی ہی رہا کر دیا گیا کیونکہ اس بات کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ تنکوت کے باشندے جو اس کے ساتھ بہت عقیدت رکھتے تھے، بغاوت کر دیں گے۔

منتخب التواریخ کے مصنف کا بیان ہے کہ آنندا نے خان بالغ (چین کے دارالحکومت پیکنگ کو تاتاری ''خان بالغ'' کہتے تھے جس کے معنی ہیں ''خان کا شہر'') چار مسجدیں تعمیر کروائی تھیں جن میں جمعہ کے روز دس لاکھ افراد نماز ادا کر سکتے تھے، لیکن چین میں اسلام کی اشاعت کے بارہ میں اس قسم کی جو روایات اس مصنف نے بیان کی ہیں ان کو معتبر نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ اس نے آنندا کو تیمور خان کا جانشین بتایا ہے۔ لیکن ان کو سراسر غلط بھی نہیں کہا جا سکتا۔

تاتاریوں کا پہلا فرمانروا جو مسلمان ہوا وہ ''برکہ خان'' تھا جو آلتون اردو کا حکمران تھا جس نے ۱۲۵۶ء سے ۱۲۶۷ء تک حکومت کی تھی۔ ابو الغازی کا بیان ہے کہ ''برکہ خان'' نے اپنی تخت نشینی کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ روایت میں ہے کہ ایک روز وہ ایک قافلہ میں گیا جو بخارا سے آیا تھا اور اس میں دو تاجروں کو الگ لے گیا اور ان سے

Marfat.com

اسلام کے بارہ میں کچھ سوالات کیے۔ انہوں نے اسلام کے عقائد اس خوبی سے اس کے سامنے بیان کیے کہ ''برکہ خان'' صدق دل اور خلوص نیت سے مسلمان ہو گیا۔ اس نے اس کا ذکر سب سے پہلے اپنے چھوٹے بھائی سے کیا اور اسے بھی اسلام لانے کی ترغیب دی۔ اس کے بعد اس نے اپنے مسلمان ہونے برملا اعلان کر دیا، لیکن جوز جانی کی روایت یہ ہے کہ برکہ خان کی تربیت بچپن ہی سے ایک مسلمان کی طرح ہوئی تھی اور جب وہ بڑا ہو کر لکھنے پڑھنے کے قابل ہوا تو خواس خجند کے ایک عالم سے قرآن حکیم پڑھا۔ (جوز جانی ص ۴۴۷) اسی مصنف نے لکھا ہے کہ اس کا تمام لشکر مسلمان تھا۔ معتبر اشخاص نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کی فوج کے ہر ایک سوار کے پاس ایک سجادہ (مصلیٰ) ہوتا تھا کہ جب نماز کا وقت آئے تو وہ نماز پڑھ سکے۔ اس کی ساری فوج میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو شراب پیتا ہو۔ بڑے جلیل القدر علماء یعنی مفسر، محدث، فقیہ اور مناظر اس کی صحبت میں رہتے تھے۔ اس کے دربار میں ہمیشہ دینی مسائل پر بحث ہوتی تھی۔ اور بحیثیت مسلمان وہ اپنے مذہب میں بڑا پختہ اور صحیح العقیدہ تھا۔

(تاریخ جوز جانی ص ۱۲۸۵-۱۲۸۶)

برکہ خان نے مصر کے مملوک سلطان رکن الدین بیبرس[1] کے ساتھ باہمی اتحاد کا معاہدہ کیا تھا۔ اس اتحاد کی تحریک سلطان مصر نے کی تھی جس نے آلتون اردو کے دو سو سپاہیوں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ یہ لشکری اس سے قبل ہلاکو خان کی فوج میں شامل تھے،

---

[1] الملک الظاہر بیبرس سلطان صلاح الدین کے بعد پہلا طاقتور مسلمان بادشاہ تھا جس نے دشمنان اسلام کو پے در پے شکستیں دیں۔ حافظ ابن کثیرؒ اس کے بارہ لکھتے ہیں: ''بیبرس بیدار مغز، بلند حوصلہ اور بہادر بادشاہ تھا۔ دشمنوں سے کسی وقت غافل نہیں ہوتا تھا۔ ان کے مقابلہ میں برابر کمربستہ اور صف آرا رہتا تھا۔ اس نے اسلام کی پراگندگی دور کی اور مسلمانوں کے منتشر شیرازہ کو اکٹھا کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو آخر زمانہ میں اسلام اور اہل اسلام کی مدد اور تقویت کے لیے مقرر کیا تھا۔ فرنگی، تاتاری اور مشرکین کی نظر میں وہ کانٹے کی طرح چبھتا تھا۔ اس نے شراب کی بندش کی، فاسقوں اور جرائم پیشہ لوگوں کو ملک بدر کیا۔ وہ جس خرابی اور فساد کو دیکھتا اسے دور کیے بغیر چین سے نہ بیٹھتا۔ (البدایہ والنہایہ جلد ۱۳ ص ۲۶۷)

Marfat.com

لیکن جب ان کے آقا اور ہلاکو خان میں عداوت بڑھی تو وہ بھاگ کر شام چلے گئے۔ اس کے بعد وہ عزت کے ساتھ قاہرہ میں بیبرس کے دربار میں پہنچے جہاں سلطان نے انہیں اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی۔ (مقریزی جلد ۲ ص ۱۸۰-۱۸۱، ص ۱۸۷) خود بیبرس ہلاکو سے برسر پیکار تھا اور اسے حال ہی میں شکست دے کر شام سے نکال چکا تھا۔ اس نے ان تاتاری لشکریوں میں دو آدمیوں کے ہمراہ اپنے چند اور سفیر بھیجے اور برکہ خان کے نام ایک خط روانہ کیا۔ جب یہ سفیر واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ برکہ خان کے دربار میں ہر ایک شاہزادی اور ہر ایک امیر کے ہاں ایک ایک امام اور ایک ایک موذن مقرر ہے۔ اور مدرسوں میں بچوں کو قرآن حکیم پڑھایا جاتا ہے (مقریزی جلد ۲ ص ۲۱۵-۲۲۲) غرض کہ بیبرس اور برکہ خان کے درمیان جب دوستانہ تعلقات بڑھے تو آلتون اردو کے بہت سے تاتاری مصر میں آئے جہاں وہ مسلمان ہو گئے۔

ایران میں دعوت اسلام:

ایران میں جہاں ہلاکو خان نے ایلخانی خاندان کی بنیاد ڈالی تھی، وہاں تاتاریوں کے ہاں دعوت و اشاعت اسلام کی رفتار نسبتاً سست رہی۔ برکہ خان اور سلطان مصر کے حملوں سے بچنے کے لیے ہلاکو خان نے مشرق کی عیسائی حکومتوں یعنی شاہ ارمینیہ اور صلیبیوں سے اتحاد پیدا کیا۔ اس کی چہیتی بیگم عیسائی تھی جس نے اپنے شوہر کو عیسائیوں کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ اس کے بیٹے اباقا خان نے قسطنطنیہ کے عیسائی قیصر کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اگرچہ اباقا خان نے خود عیسوی مذہب قبول نہ کیا تاہم اس کا دربار عیسائی پادریوں سے بھرا ہوا تھا اور اس نے یورپ کے متعدد بادشاہوں مثلاً سینٹ لوئی شاہ فرانس، چارلس شاہ صقلیہ اور جیمز شاہ ارغون کے پاس سفیر روانہ کیے اور ان سے مسلمانوں کے خلاف اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بڑے لوگوں نے عیسوی مذہب قبول کر لیا۔ عیسائی اباقا خان سے بھی بڑی امیدیں لگائے بیٹھے تھے لیکن ان کی یہ امیدیں پوری نہ ہو سکیں۔

Marfat.com

اباقاخان کا بھائی تکودار جو اس کا جانشین ہوا، ایلخانی خاندان کا پہلا حکمران تھا جس نے اسلام قبول کیا۔ اس کی تعلیم و تربیت عیسوی مذہب کے مطابق ہوئی تھی، لیکن جب وہ بڑا ہوا تو وہ مسلمانوں کے اثر صحبت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا، مسلمان ہو گیا۔ عیسوی مذہب کو ترک کر کے اس نے اپنا نام محمد خان رکھا۔ حتیٰ المقدور اس بات کی کوشش کی کہ تمام تاتاری دین اسلام کو قبول کر لیں، اور جب انہوں نے سرکشی اختیار کی اور اسے بھی ان کو مجبور کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تو اس نے ان کا اعزاز بڑھا کر اور ان کو انعام و اکرام اور تحائف دے کر ان کا مذہب تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کے عہد میں بہت سے تاتاریوں نے مسلمانوں کا دین اختیار کر لیا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد تکودار نے سلطان مصر کے نام ایک مراسلہ ارسال کیا اور اس میں ان کو اپنے قبول اسلام سے مطلع کیا۔ اس خط کا عربی متن تو ''تاریخ وصاف'' میں درج ہے۔ (ملاحظہ: تاریخ وصاف ص ۱۱۳-۱۱۵) اور ترجمہ حسب ذیل ہے:

''اللہ تعالیٰ نے اپنی نوازش اور نور ہدایت سے ہم کو عہد جوانی ہی میں اپنی ربوبیت کے اقرار اور اپنی وحدانیت کے اعتراف کی طرف راہ نمائی کی تھی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کی شہادت دینے اور خدا کے اولیاء اور اس کے نیک اور صالح بندوں کے ساتھ حسن اعتقاد رکھنے کی طرف رہبری کی تھی۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ پس ہم دین اسلام کا بول بالا کرنے اور اسلام اور اہل اسلام کے معاملات کی اصلاح کرنے کی طرف مائل رہے، یہاں تک کہ ہمارے والد بزرگوار اور برادر کلاں کے بعد بادشاہت ہمیں ملی اور خداوند کریم نے ہم کو اپنے لطف و کرم سے نوازا اور ہماری امیدوں کو پورا کیا اور عروس مملکت کی نقاب کشائی کی اور اس سے ہم کو ہم کنار کیا۔ پھر ہمارے ہاں ایک قوریلتای منعقد ہوئی اور اس مجلس میں ہمارے تمام بھائی،

Marfat.com

فرزند، امرائے کبار، سپہ سالار اور فوج کے دوسرے بڑے بڑے افسر جمع ہوئے۔ تمام حاضرین اس رائے پر متفق ہوئے کہ ہمارے برادر کلاں کے سابقہ حکم کے مطابق مملکت کے تمام عساکر کے جم عفیر کو لشکر کشی کے لیے جمع کیا جائے جن کی کثرت کے سامنے روئے زمین تنگ ہے، جن کی صولت و سطوت کا رعب لوگوں کے دلوں پر چھایا ہوا ہے۔ جن کی ہمت اور شجاعت کے سامنے پہاڑوں کے سر جھک جاتے ہیں اور جن کے عزم و ارادہ کے سامنے سخت پتھروں کا زہرہ بھی گداز ہو جاتا ہے۔ پس ہم نے ان کی تجویز پر غور و خوض کیا جس پر سب نے اتفاق رائے کیا تھا۔ اور جس کے ماحصل کو اپنے مافی الضمیر کے خلاف پایا، کیونکہ ہم تو عوام کی بھلائی چاہتے ہیں اور شعائر اسلام کی تقویت کے خواہاں ہیں۔ ہم حتیٰ الامکان صرف ایسے احکام اور فرمان صادر کرنا چاہتے ہیں جن سے خون ریزی بند ہو اور رعیت کو امن و سکون حاصل ہو۔ امن و امان کی بادنسیم تمام ملکوں میں چلے اور تمام ملکوں کے سلاطین شفقت اور احسان کے گہوارے میں راحت و آرام کی زندگی بسر کریں، کیونکہ ہم خدا کے حکم کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کی مخلوق پر شفقت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ ہم جنگ و جدال کی آگ کو بجھائیں اور فتنہ و فساد کو دبائیں۔ جن لوگوں نے لشکر کشی کا مشورہ دیا ہے ان کو بتا دیں کہ ہمارے لیے خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم دنیا والوں کو ان کی بیماریوں سے شفا دیں اور جنگ آزمائی سے سب سے آخر میں کام لیں۔ ہم کو معرکہ آرائی اور تیر اندازی کی طرف سبقت نہیں کرنی چاہیے تاوقتیکہ ہم اتمام حجت نہ کر لیں اور حق کا اظہار نہ کر دیں اور اس کی دلیل نہ پیش کر لیں۔ امن و امان اور فلاح و صلاح ہماری جو رائے قرار پائی ہے اس کی تحریک و تائید شیخ الاسلام قدوۃ العارفین کے وعظ و تذکیر سے ہوئی

Marfat.com

ہے جو دینی امور میں ہمارے بڑے اچھے مشیر اور مددگار ہیں۔ چنانچہ ہم نے یہ مراسلہ صادر کیا ہے۔ اور قاضی القضاۃ قطب الدین اور اتابیگ بہاؤ الدین کو آپ کی طرف بھیجا ہے جو ہمارے ارکانِ دولت میں سے ہیں تاکہ وہ آپ کو ہمارے طریقے اور نیک نیتی سے مطلع کریں اور آپ کو بتائیں کہ ہم تمام مسلمانوں کی بھلائی چاہتے ہیں، اور آپ کو آگاہ کریں کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بصیرت حاصل ہے کہ اسلام نے تمام گذشتہ باتوں کو مٹا دیا ہے۔ خداوند کریم نے ہمارے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ ہم حق اور اہل حق کی پیروی کریں۔ اگر کوئی شخص ہماری بات کی دلیل و حجت طلب کرے تو اس کو چاہیے کہ ہماری کارکردگی کا مشاہدہ کرے جو دنیا میں مشہور ہو چکی ہے، کیونکہ ہم نے توفیق الٰہی سے دین کے نشانوں کو بلند کیا ہے اور ہر ایک بات میں اور ہر ایک حکم میں اس کو پیش نظر رکھا ہے۔ ہم نے شریعت نبوی کے قوانین کو نافذ کیا ہے جیسا کہ عدل محمدی کا تقاضا تھا، چنانچہ اس طرح سے ہم نے جمہور کے دلوں کو مسرور کر دیا ہے۔ اور جن لوگوں سے کوئی برائی یا خطا پہلے سرزد ہو چکی ہے ہم نے ان سب کو یہ کہہ کر معاف کر دیا ہے کہ خدا تعالیٰ تمہاری پہلی خطاؤں کو معاف فرمائے۔ پھر ہم مسلمانوں کے اوقاف کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن میں ان کی مساجد، زیارت گاہیں اور مدارس شامل ہیں، اور خانقاہیں اور سرائیں جن کے نشان مٹ گئے تھے، ان کو آباد کیا ہے۔ اوقاف کی آمدنی کو قدیم دستور کے مطابق اور واقفین کی شرائط کے مطابق مستحق لوگوں تک پہنچا دیا ہے۔ ہم نے حکم دیا ہے کہ حاجیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ ان کے لیے سامانِ سفر مہیا کیا جائے اور جن راستوں سے وہ سفر کرتے ہیں ان کو محفوظ بنایا جائے۔ ہم نے سوداگروں کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کی کامل آزادی دی ہے اور وہ جہاں چاہیں آمدورفت کر سکتے ہیں۔ ہم نے اپنی

Marfat.com

فوج اور پولیس کو ان کی آمد و رفت میں مداخلت کرنے سے سختی سے روک دیا ہے۔ ہم سلطان مصر کے ساتھ اتحاد چاہتے ہیں تاکہ وہ دیار و امصار پھر آباد ہو جائیں اور فتنہ و فساد فرد ہو جائے۔ تلواریں نیام میں آ جائیں اور تمام لوگ آرام و آسائش سے زندگی بسر کریں اور مسلمانوں کی گردنیں ذلت و خواری کے طوق سے آزاد ہو جائیں۔" (تاریخ وصاف ص ۲۳۱-۲۳۴)

خط کے ایک ایک لفظ سے احمد تکودار کی خلوص نیت، پاکیزگی قلب، حلیمی اور خیر اندیشی کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ جب تاتاریوں نے دیکھا کہ ان کا خان تکودار مسلمان ہو گیا ہے تو وہ اس سے ناراض ہو گئے چنانچہ انہوں نے قوبلائی خان سے تکودار کی شکایت کی اور اس پر الزام لگایا کہ اس نے اپنے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ تکودار کے خلاف بغاوت برپا ہو گئی جس کا سرغنہ اس کا بھتیجا ارغون تھا۔ ارغون نے اسے مروا ڈالا اور تاج و تخت پر قبضہ کر لیا۔ اور اس نے مسلمانوں پر سختیاں شروع کر دیں۔

غازان خان کو دعوتِ اسلام:

تکودار کے تمام جانشین کافر تھے، لیکن ۱۲۹۵ء میں غازان خان جو ایلخانی خاندان کا ساتواں اور سب سے بڑا فرماں روا تھا، مسلمان ہو گیا اور اس نے اسلام کو ایران کا حکومتی مذہب قرار دیا۔ تین گذشتہ حکمرانوں کے زمانے میں عیسائیوں کو بڑی امید تھی کہ ایران کا شاہی خاندان عیسائی ہو جائے گا کیونکہ انہوں نے عیسائیوں پر بڑی مہربانیاں کی تھیں اور حکومت کے مناصب جلیلہ ان کے سپرد کیے تھے۔ غازان خان کا پیشرو بایدو خان جو ۱۲۹۵ء میں صرف چند ماہ تک تخت شاہی پر قابض رہا، عیسائیت کی طرف اس حد تک مائل تھا کہ اس نے تاتاریوں میں اشاعت اسلام کو قطعی طور پر بند کرنے کی کوشش کی اور حکم دیا کہ کوئی شخص تاتاریوں کے درمیان اسلام کی تبلیغ نہ کرنے پائے۔

مسلمان ہونے سے قبل غازان خان کی تعلیم و تربیت بدھ مت کے اصولوں کے مطابق ہوئی تھی اور اس نے خراسان میں بدھوؤں کے لیے کئی مندر بھی تعمیر کیے

تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مذہب کے ساتھ بڑا لگاؤ تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اپنے زمانے کے مختلف مذاہب کے عقائد کا مطالعہ کیا تھا اور وہ ہر مذہب کے عالموں کے ساتھ مذہبی مباحثے کیا کرتا تھے۔ رشید الدین جو غازان خان کا فاضل وزیر اور اس کے عہد کا ممتاز مورخ تھا، یہ رائے رکھتا تھا کہ غازان خان نے نہایت صدق دل سے اسلام قبول کیا تھا۔ (سی۔ ڈی۔ آکسن جلد۴ ص ۳۶۵) جس کے احکام کی اس نے اپنے تمام عہد حکومت میں سرگرمی اور خلوص کے ساتھ پابندی کی۔ غازان کے بعض ہم عصروں کا خیال تھا کہ اس نے چند امیروں اور مشائخ کی استدعا پر اسلام اختیار کیا تھا۔ بہرحال غازان خان کے مسلمان ہوتے ہی ایرانیوں کے دل اس کے قبضے میں آ گئے۔ چنانچہ جب وہ بایدو خان کے ساتھ تخت ایران کے لیے برسر پیکار تھا تو اس کے حریف کے لشکر میں جو تاتاری مسلمان تھے وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر غازان خان کی امداد کے لیے چلے آئے۔ اسی قسم کی دور اندیشی سے کام لے کر ایک مسلمان امیر نوروز بیگ نے جو غازان خان کا حامی اور طرف دار تھا، اس پر اسلام قبول کرنے کے لیے زور ڈالا تھا۔ اس نے غازان سے کہا کہ ایک پیش گوئی کے مطابق تم ہی وہ بادشاہ ہو جو اس زمانے کے قریب ظہور کرنے والا ہے تاکہ وہ دین اسلام کی حفاظت وحمایت کرے اور اس کی گذشتہ شان وشوکت کو بحال کرے۔ اگر اس نے اسلام قبول کر لیا تو وہ تمام ایران کا فرماں روا ہو جائے گا۔ اور تمام مسلمان اس کے حامی ہو جائیں گے۔ اور خداوند کریم اسے فتح وظفر عطا کرے گا۔ چنانچہ کسی قدر تامل کے بعد غازان خان نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور اس کے افسروں اور لشکریوں نے بھی اس کی اس بارہ میں پیروی کی۔ اس نے عالموں اور دین دار لوگوں میں خیرات تقسیم کی اور مسجدوں میں حاضری دی۔

غازان خان کے بعد اس کا بھائی الجائتو محمد خدابندہ کے نام سے ۱۳۰۴ میں اس کا جانشین ہوا۔ اس کی والدہ عیسائی تھی، چنانچہ اس کی تربیت بھی عیسائی طریقہ پر ہوئی تھی۔ لیکن اپنی والدہ کی وفات کے بعد جب کہ وہ ابھی نوجوان تھا، اپنی بیوی کی

Marfat.com

ترغیب سے مسلمان ہو گیا۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ اس کے اسلام سے تا تاری بہت متاثر ہوئے اور اس زمانے سے ایلخانی مملکت میں اسلام تمام مذاہب پر غالب آ گیا۔ (ابن بطوطہ جلد ۲ ص ۵۷)

چغتائی خاندان میں دعوتِ اسلام:

تا تاریوں کی درمیانی مملکت چغتائی اور اس کے جانشینوں کے حصہ میں آئی۔ اس میں اسلام کی دعوت واشاعت کیسے ہوئی؟ اس بارہ میں یوں کہا جاتا ہے کہ چغتائی نے مسلمانوں پر ایسی پابندیاں عائد کر دی تھیں جو ان کے لیے تکلیف و آزار کا باعث تھیں۔ جوز جانی کا بیان ہے کہ تمام تا تاری حکمرانوں میں چغتائی اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا اور اس کے سامنے کوئی شخص اسلام کا نام بغیر تحقیر اور مذمت کے نہیں لے سکتا تھا۔ (جوز جانی: ص ۳۸۱، ص ۳۹۷) لیکن اس کے پوتے اور جانشین قرا ہلاکو کی بیگم ارغنہ نے اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت اسلامی طریقے پر کی تھی اور اس نے ۱۲۶۴ء میں مبارک شاہ کے نام سے چغتائی مملکت کے تخت کا دعویٰ کیا تھا لیکن اس کے چچازاد بھائی براق خان نے اسے جلد ہی تخت و تاج سے محروم کر دیا۔ لیکن اس براق خان کو اپنی وفات (۱۲۷۰ء) سے چند روز قبل نور اسلام حاصل کرنے کی توفیق نصیب ہوئی تھی اور اس نے سلطان غیاث الدین کا نام اختیار کیا تھا۔ (ابو الغازی جلد ۲ ص ۱۵۹) لیکن اس کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقے پر نہیں بلکہ تا تاریوں کے قدیم دستور کے مطابق ہوئی تھی۔ جو تا تاری اس کے عہد میں مسلمان ہوئے تھے، اس کی وفات کے بعد وہ قدیم مذہب کی طرف لوٹ گئے۔

تو قلق خان اور دعوتِ اسلام:

چغتائی مملکت کے زوال کے بعد کاشغر کے جس پہلے مسلمان حکمران نے ایک الگ مملکت قائم کی، تاریخ میں اس کا نام تو قلق تیمور خان تھا۔ اس نے بخارا کے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کی دعوت و تبلیغ سے اسلام قبول کیا تھا۔ روایت میں ہے کہ یہ شیخ چند مسافروں کے ساتھ نادانستہ طور پر تو قلق تیمور کی چراگاہ میں داخل ہو گیا اور خان نے

حکم دیا کہ اس کی مشکیں باندھ کر اس کے سامنے حاضر کیا جائے۔ جب اسے حاضر کیا گیا تو توقلق خان نے ان سے غضب ناک ہو کر پوچھا کہ تم لوگوں نے ہمارے شکار میں خلل ڈالنے کی کیسے جرأت کی؟ شیخ جمال الدین نے جواب دیا کہ ہم بالکل اجنبی ہیں اور اس بات سے مطلق نا آشنا تھے کہ ہم ایک ممنوعہ قطعۂ زمین میں داخل ہو رہے ہیں۔ جب توقلق خان کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایک ایرانی سے تو ایک کتا بھی بہتر ہوتا ہے۔ شیخ نے جواب دیا کہ ہاں، یہ سچ ہے، اگر ہم دین برحق پر نہ ہوتے تو اس صورت میں ہم یقیناً کتوں سے بھی بدتر تھے۔ شیخ کے اس جواب سے خان بہت متاثر ہوا اور اس نے حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو اس جرأت مند ایرانی کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ چنانچہ خان نے شیخ کو الگ لے جا کر پوچھا: کہ دین برحق کیا شے ہے؟ اور اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟ یہ سن کر شیخ نے اسلام کے عقائد ایسے دینی ولولے سے بیان کیے کہ توقلق خان کا دل جو پتھر کی طرح سخت تھا، موم کی مانند پگھل گیا۔ پھر شیخ نے حالت کفر کا ایسا ہیبت ناک نقشہ کھینچا کہ خان کو اپنے گمراہ اور بے بصیرت ہونے کا مکمل یقین ہو گیا، لیکن اس نے کہا کہ اگر میں اس وقت دین اسلام کا اظہار کروں تو میں اپنی رعایا کو راہ راست پر نہ لاسکوں گا۔ لہٰذا تم ابھی صبر و تحمل سے کام لو۔ جب میں اپنے باپ دادا کی سلطنت کا مالک بنوں تو اس وقت میرے پاس پھر آنا۔

اسی زمانے میں چغتائی سلطنت پارہ پارہ ہو کر چند چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو چکی تھی اور کئی برسوں کے بعد توقلق تیمور تمام سلطنت کو اکٹھا کرنے اور اس پر اپنی حکمرانی قائم کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس اثنا میں شیخ جمال الدین اپنے ملک کو واپس جا چکے تھے۔ وطن پہنچ کر وہ سخت بیمار ہو گئے۔ اور جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے رشید الدین کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا: ''توقلق تیمور ایک روز بڑا بادشاہ بننے والا ہے۔ اس وقت اس کے پاس ضرور جانا اور اس کو میرا اسلام پہنچانا اور اسے بے خوف و خطر وہ وعدہ یاد دلانا جو اس نے مجھ سے کیا تھا۔''

Marfat.com

چند سالوں کے بعد جب تو قلق تیمور اپنے باپ دادا کے تخت و تاج کا وارث بنا تو رشید الدین اپنے باپ شیخ جمال الدین کی وصیت کے مطابق تو قلق خان کے لشکر میں جا پہنچا، لیکن اپنی تمام کوششوں کے باوجود وہ خان کے دربار میں باریاب نہ ہو سکا۔ آخر کار مجبور ہو کر اس نے یہ تدبیر کی کہ ایک روز صبح سویرے اس نے خان کے خیمے کے پاس اذان کہنی شروع کر دی۔ جب اس طرح تو قلق خان کی نیند خراب ہوئی تو اس نے غضب ناک ہو کر رشید الدین کو اپنے پاس بلایا۔ رشید الدین نے خان کے سامنے حاضر ہو کر اسے اپنے باپ کا پیغام پہنچایا۔ تو قلق شیخ جمال الدین سے اپنا وعدہ بھولا نہیں تھا، چنانچہ اس نے کہا کہ جب سے میں تخت پر بیٹھا ہوں، جو وعدہ میں نے کیا تھا وہ میرے کو ذہن میں محفوظ تھا، لیکن جس شخص سے میں نے کیا تھا وہ میرے ذہن میں نہیں تھا کیونکہ وہ پھر کبھی نہ آیا۔ بہر حال اب میں تمہارا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس کے بعد تو قلق خان نے کلمۂ شہادت پڑھا اور مشرف با سلام ہوا اور بقول ابو الغازی: ''اس صبح آفتاب اقبال نے توفیق الٰہی کے افق سے طلوع کیا اور کفر کی شب دیجور کافور ہو گئی........ اس کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ تبلیغ اسلام کے لیے مغل شہزادوں سے فرداً فرداً گفتگو کرنی چاہیے۔ جو لوگ اسلام قبول کریں تو یہ بات ان کے حق میں اچھی ہو گی۔

جس شخص سے سب سے پہلے پوچھا گیا وہ امیر تو لک تھا۔ خان نے اس سے پوچھا: ''کیا تم اسلام قبول کرو گے؟'' اس پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور کہنے لگا کہ تین سال ہوئے جب کاشغر کے چند مقدس لوگوں نے میرے سامنے اسلام کی تبلیغ کی تھی اور اس سے متاثر ہو کر میں دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا، لیکن آپ کے خوف سے میں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ سن کر تو قلق خان اٹھا اور اس کو گلے لگا لیا اور پھر تینوں اکٹھے بیٹھ گئے۔ اسی طرح سے انہوں نے سب شہزادوں سے یکے بعد دیگرے گفتگو کی اور ان سب نے اسلام قبول کر لیا سوائے ایک شخص کے جس کا نام جراس تھا۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ شیخ اور اس کے ملازم کے مابین زور آزمائی کا مقابلہ ہونا

Marfat.com

چاہیے۔ اس کا ملازم ایک بڑا قد آور کافر تھا۔ وہ اس قدر طاقتور تھا کہ دو سال کے اونٹ کو اٹھا سکتا تھا۔ شیخ رشید الدین نے اس مقابلے کو منظور کر لیا اور اس سے کہا کہ اگر میں تمہارے ملازم کو گرا نہ سکا تو میں تمہیں مسلمان ہونے کے لیے نہ کہوں گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ مرضی ہے کہ مغل لوگ مشرف باسلام ہوں تو وہ مجھے بے شک اس آدمی کو مغلوب کرنے کے لیے کافی طاقت بخشے گا۔ تو تغلق خان اور دوسرے مسلمانوں نے شیخ کو سمجھانے اور باز رکھنے کی بڑی کوشش کی لیکن شیخ اپنے ارادے میں پختہ رہے۔ اس مقابلہ کو دیکھنے کے لیے ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا اور اس کافر ملازم کو مقابلے کے لیے اندر لے آئے۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ ملازم جسے اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا، بڑے پرغرور انداز میں آگے بڑھا۔ شیخ اس کے سامنے بہت چھوٹا اور کمزور دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ ایک دوسرے کو گھونسے مارنے لگے تو شیخ نے اس ملازم کے سینہ پر اس زور سے ضرب لگائی کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ہوش میں آیا تو وہ اٹھا اور شیخ کے قدموں پر گر کر کلمۂ شہادت پڑھنے لگا۔ لوگوں نے آفرین اور ستائش کے نعرے بلند کیے اور اس روز ایک لاکھ ساٹھ ہزار تاتاریوں نے اپنے سروں کی بودیاں کٹوا دیں اور مسلمان ہو گئے۔ خان کا ختنہ ہوا اور نور اسلام کی برکت سے تاریکیاں دور ہو گئیں۔ (ابو الغازی جلد۲ ص ۱۸۶-۱۸۸) اس وقت سے اسلام ان تمام شہروں میں مضبوطی سے قائم ہو گیا جو چغتائی خان کے جانشینوں کے زیر نگین تھے۔

اسی طرح مغلوں کو مسلمان بنانے کے لیے اور بھی بہت سے لوگوں نے اپنا دعوتی فریضہ جاری رکھا۔ مارٹن ہارٹمین نے لکھا ہے کہ عبدالکریم خان کے عہد میں جو ۹۸۳ھ سے لے کر ۱۰۰۳ھ تک کاشغر کا حکمران رہا، اس وقت بھی ایک مرد درویش جس کا نام اسحاق ولی تھا، کاشغر، یارقند اور ختن میں دعوتِ اسلام میں مصروف رہا۔ وہ ان تمام شہروں میں بارہ برس تک اسلام پھیلاتا رہا۔ اس نے قرغیز اور قزاق قبائل میں بھی تبلیغ کی اور ایک سو اسی آدمیوں کو مسلمان کیا اور اٹھارہ بت خانے ویران کیے۔ (مارٹن ہارٹمان: جلد ۱ ص ۲۰۲)

Marfat.com

یہ تھے وہ ذرائع و وسائل جن سے مسلمانوں نے ان وحشی قبائل کو حلقہ بگوش اسلام کیا جنہوں نے ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کے مرکزوں کو تباہ و برباد کیا تھا۔ اس طرح سے اسلام اپنے گذشتہ عروج کے کھنڈرات سے دوبارہ آہستہ آہستہ ابھرنا شروع ہوا اور اس نے ایک صدی کی افسردگی اور پژمردگی کے بعد دوبارہ ایک غالب مذہب کا مقام حاصل کر لیا۔

تاتاریوں کو مسلمان کرنے میں جو تبلیغی اور دعوتی عناصر کارفرما تھے، ان میں پیروں اور ان کے مریدوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ تاتاریوں کے سیلاب کے بعد مسلمان بہت شکستہ دل ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس افسردگی اور پژمردگی کے عالم میں انہوں نے سب سے پہلے تصوف کے دامن میں پناہ لی۔ پیروں نے اور ان کے طریقوں نے ملت سلامی میں ایک نئی روح پھونک دی اور اس میں ایک تازہ ولولہ پیدا کیا، مثال کے طور پر آٹھویں صدی ہجری میں نقشبندی سلسلے میں ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ایک فرانسیسی مورخ ''کاہون'' (Cahan) لکھتا ہے کہ

> ''پیر اور ان کے مریدوں کے ہاتھ میں ایشیاء کا مسلمان ایک ایسا کارکن تھا جو پہلے تو بے خبر اور سست رو تھا، لیکن بعد ازاں وہ ایک پارٹی کا رکن بن گیا یعنی قومی مذہب کی پارٹی کا جو تاتاریوں کی حکومت کی مخالف تھی، کیونکہ یہ حکومت غیر ملکی ہونے کے علاوہ وحشی اور بے دین بھی تھی۔''

آلتون اردو اور دعوتِ اسلام:

آلتون اردو[1] کے تاتاریوں کی اس شاخ کی سب سے بڑی چراگاہیں اس گھاس دار

---

[1] تاتاریوں کی وہ شاخ جس نے بلادروس میں دریائے والگا کی وادی میں اپنی بساط حکومت بچھائی، تاریخ میں ''آلتون اردو'' کے نام سے مشہور ہے جس کے معنی سنہری لشکر کے ہیں۔ روسیوں نے اسے (Zolotaya Orda) اور انگریزوں نے (Golden Horde) کہا ہے۔ جس وادی میں وہ آباد تھے، مسلمان مورخوں نے اسے ''دشت قپچاق'' لکھا ہے۔

Marfat.com

میدان میں واقع تھیں جس کو دریائے والگا سیراب کرتا ہے۔ انہوں نے اپنا دارالحکومت بھی اسی دریا کے کنارے آباد کیا تھا۔ جب برکہ خان نے اسلام قبول کرلیا اور اس کے بعد سلطان مصر سے اس کے گہرے تعلقات استوار ہو گئے تو ان وجوہات سے بھی اسلام نے بڑی ترقی کی۔ بعدازاں اوزبک خان جو ۱۳۱۳ء سے لے کر ۱۳۴۰ء تک آلتون اردو کا حاکم رہا، اپنی دعوتی کوششوں کے سبب سے بڑی شہرت پائی۔ اس کے تاتاری سرداروں نے اس سے کہا کہ تم کو صرف ہماری اطاعت اور فرمان برداری پر اکتفا کرنا چاہیے۔ تمہیں ہمارے مذہب سے کیا واسطہ؟ ہم چنگیز خان کا مذہب چھوڑ کر عربوں کا دین کیوں اختیار کریں؟ تاہم اوزبک خان بہت سے لوگوں کو مسلمان کرنے میں کامیاب رہا۔ (ابوالغازی جلد ۲ ص ۱۸۴) وہ اسلام کا پرجوش حامی تھا۔ چنانچہ اس کی کوششوں سے اسلام اس کی مملکت میں خوب راسخ ہو گیا۔ اسی کے اثر سے وسطی ایشیاء کے اوزبک قبائل معرض وجود میں آئے اور یہ قبائل انہی کے نام پر اوزبک کہلائے، اور غالباً اسی کے عہد میں مسلمان ہوئے تھے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ اوزبک خان اپنے مذہب کو پھیلانے میں بڑا سرگرم اور پرجوش تھا تاہم وہ اپنی عیسائی رعایا کے ساتھ بڑی رواداری کا سلوک کرتا تھا۔ وہ اپنے مذہب کی پیروی میں بالکل آزاد تھے بلکہ اس نے ان کو اپنی مملکت میں اپنے مذہب کے پرچار کی بھی اجازت دے رکھی تھی۔ اوزبک خان نے ۱۳۱۳ء میں مطران پیٹر کے حق میں جو فرمان جاری کیا تھا اس کا شمار ان اہم دستاویزات میں ہوتا ہے جن سے مسلمانوں کی رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔ اس فرمان کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''خدائے بزرگ و برتر کی مشیت، قدرت، عظمت اور رحمت کے ساتھ، اوزبک خان کا یہ فرمان ہمارے تمام چھوٹے بڑے امیروں کے نام ہے۔ کوئی شخص مطران کے کلیسا کی جس کا پیٹر سربراہ ہے، توہین نہ کرے اور اس کے خادموں اور کلیسا کے پادریوں کی بے عزتی نہ کرے۔ کوئی شخص ان کی

جائداد یا مال ومتاع یا ان کے آدمیوں پر قبضہ نہ کرے اور ان کے کلیسا کے معاملات میں دست اندازی نہ کرے کیونکہ یہ چیزیں مقدس ہیں۔ جو شخص ان کے معاملات میں بے جا دخل دے گا اور ہمارے فرمان سے تجاوز کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں گناہ گار ہوگا اور اس کے غضب کا سزاوار ہوگا، اور ہماری طرف سے اسے موت کی سزا ملے گی۔ مطران امن وامان میں رہے گا لہٰذا اس کو یا اس کے نائب کو چاہیے کہ عدل وانصاف کے ساتھ کلیسا کے تمام معاملات کا انتظام وانصرام کرے۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ نہ ہم خود، نہ ہماری اولاد، نہ ہماری مملکت کے امراء نہ ہمارے صوبہ جات کے حاکم کلیسا اور مطران کے معاملات میں کسی طرح کی مداخلت کریں گے اور نہ ہی ان کے شہروں، ضلعوں، دیہات، شکارگاہوں، مچھلی پکڑنے کے مقامات، ان کے شہد کے چھتوں، اراضی، مرغزاروں اور جنگلوں سے تعرض کریں گے، نہ ان کے تاکستانوں، چکیوں، ان کے مویشی کے استھانوں یا کلیسا کی جائداد، مال واسباب اور ان مقامات میں جو ان کے کارندوں کی نگرانی میں ہیں، دست اندازی کریں گے۔ مطران امن وامان کے ساتھ پریشانی سے دور رہے تاکہ وہ اطمینان قلب کے ساتھ ہمارے لیے اور ہماری اولاد اور قوم کے لیے خدا سے دعائے خیر کرسکے۔ جو شخص کلیسا کی کسی مقدس چیز پر ہاتھ ڈالے گا وہ گناہ گار قرار دیا جائے گا، خدا کے غضب کا مستحق ہوگا اور سزائے موت کا مستوجب ہوگا تاکہ دوسرے لوگ اس سے عبرت پکڑیں۔ جب خراج یا دوسرے محصول از قسم چونگی یا ہل کا ٹیکس لگائے جائیں یا ڈاک کے لیے گھوڑے طلب کیے جائیں یا فوج کے لیے ہم رعایا سے آدمی بھرتی کریں تو جو گرجے پیٹر کے قبضے میں ہیں، ان سے یا اس کے پادریوں سے کوئی شی وصول نہیں کی جائے گی۔ اگر کوئی شخص پادریوں سے جبراً کوئی رقم لے گا تو

اسے تلنی رقم واپس کرنا ہو گی۔ ان کے آئین و قوانین، ان کے گرجوں اور خانقاہوں کا احترام کیا جائے گا۔ جو شخص اس دین کی مذمت کرے گا یا اسے برا کہے گا، اسے کسی حیلے یا بہانے سے بے قصور نہیں کیا جائے گا، بلکہ اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ پادریوں کے بھائیوں اور بیٹوں کو بھی جو ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے اور ایک ہی گھر میں رہتے ہوں، ویسے ہی حقوق حاصل ہوں گے۔''

اوزبک کا یہ فرمان بغور پڑھیں۔ اس فرمان کے ایک ایک لفظ سے عیسائیوں کے لیے امن و امان کے جذبات ٹپکتے ہیں، لیکن پوری تاریخ عالم میں آپ کو کسی عیسائی بادشاہ کا کوئی فرمان ایسا نہیں ملے گا جس میں اس نے مسلمانوں کو اس طرح امن کا پروانہ دیا ہو بلکہ جب بھی موقع ملا انہوں نے اسلام اور اہل اسلام کو پامال اور تاخت و تاراج کیا۔ اسپین کی تاریخ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ عیسائیوں نے اپنے معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس ملک سے جس میں مسلمانوں نے آٹھ سو سال خلافت اسلامیہ کو چلایا، مسلمانوں سے وہ سلوک کیا کہ نہ صرف انہیں بلکہ ان کی مسجدوں اور ان تمام نشانات کو جن سے اسلام کی یاد تازہ ہوتی تھی نیست و نابود کر دیا۔ اور ملک کے وسیع و عریض رقبہ میں کوئی اسلام کا نام لینے والا باقی نہ رہا۔ اس کے برعکس اوزبک خان کا یہ فرمان جس میں عیسائیوں کو مذہبی آزادی کا پروانہ دیا گیا تھا وہ فی الواقع عیسائیوں کو حاصل تھی۔ اس حقیقت کا اندازہ اس مراسلہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو ۱۳۱۸ء میں پوپ جان بست و دوم نے خان کے نام بھیجا تھا اور جس میں اس نے اس مسلمان فرماں روا کا شکریہ ادا کیا تھا کہ وہ اپنی عیسائی رعایا پر لطف و کرم کرتا ہے اور ان کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا سلوک کرتا ہے۔

روس میں دعوتِ اسلام کی ناکامی:

تاتاریوں سے کئی برس پہلے ایک اور قوم نے روسیوں کو مسلمان کرنے کی

Marfat.com

کوشش کی لیکن وہ ناکام رہی۔ یہ قوم بلغاری مسلمان تھے جو دسویں صدی عیسوی میں دریائے والگا کے کنارے آباد تھے اور جو غالباً مسلمان تاجروں کے میل ملاپ سے مسلمان ہوئے تھے جو سمور اور شمالی ملکوں کی دوسری اشیاء کی تجارت کے سلسلہ میں ان کے ہاں آمدورفت رکھتے تھے۔ بلغاری لوگ ۹۲۱ء سے قبل مسلمان ہوئے ہوں گے کیونکہ اس سن میں خلیفہ المقتدر عباسی نے ان کے ہاں اپنا سفیر بھیجا تھا تاکہ انہیں اسلام کے احکام اور عقائد کی تعلیم دے اور ان کے ایمان کو پختہ اور راسخ کرے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو یاقوت حموی کی کتاب معجم البلدان بذیل ''بلغار'') ان بلغاری مسلمانوں نے روس کے بادشاہ والادیمیر کو اسلام کی دعوت دی لیکن وہ تہی قسمت ہونے کے باعث اسلام کو قبول کرنے سے قاصر رہا کیونکہ ختنے کی رسم اور شراب کی ممانعت کو روسی لوگ پسند نہیں کرتے تھے اس لیے کہ شراب ان کی زندگی کا پر مسرت مشغلہ تھا۔ اور اس نے ۹۸۸ء میں اپنا قدیم مذہب چھوڑ کر عیسائی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک فرمان جاری کیا کہ تمام روسی لوگ خواہ آقا ہوں یا غلام، امیر ہوں یا فقیر عیسوی مذہب میں داخل ہونے کے لیے بپتسمہ لیں۔ اس طریقہ سے دین عیسوی روسیوں کا سرکاری اور قومی مذہب قرار پایا۔ اور دوسرے تمام مذاہب کی اشاعت و تبلیغ قانوناً بند کر دی گئی۔ چنانچہ جب تک زار روس نے ۱۹۰۵ء میں ایک فرمان کے ذریعہ تمام روسی سلطنت میں مذہبی آزادی کا اعلان نہیں کیا تھا اور جب تک وہاں اسلام کی دعوت عملی طور پر شروع نہیں ہوئی تھی، اس وقت تک روسیوں کے اسلام قبول کرنے کے واقعات دیکھنے میں نہیں آئے۔ جو روسی مسلمان ہوئے ہیں ان کے قبول اسلام کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ ان کو تاتاریوں نے مالی امداد دی تھی، اس کے علاوہ مسلمانوں کی اخلاقی قوت نے بھی اپنا اثر دکھایا،

بہرحال جب ۱۹۰۵ء میں روس میں زار کی طرف سے مذہبی آزادی کا اعلان ہوا، تاتاریوں کے گروہ کے گروہ مسلمان ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں اتوموا

Marfat.com

کے گاؤں کے اکانوے (۹۱) خاندانوں نے اسلام قبول کیا۔ اور ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک کے درمیانی عرصہ میں ترپن ہزار آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اتنی کثیر تعداد میں لوگوں کا اسلام قبول کرنے کا بیشتر سبب یہ تھا کہ اسلامی معاشرے کا اخلاقی درجہ انتہائی بلند تھا اور اس میں اتفاق و اتحاد کا جذبہ بھی قوی تر تھا۔ اس کے علاوہ عیسائی پادریوں نے روسی حکومت کی مدد سے عیسائی تاتاریوں کو راسخ العقیدہ بنانے کے لیے جو طریقے اختیار کیے تھے۔ اس سے الٹا نقصان ہوا اور تاتاری عیسائیت سے متنفر ہو گئے۔ اس کے برعکس اسلام کی تبلیغ بڑے جوش و خروش سے جاری تھی اور بقول روسی دانشور اور مصنف بابرونکوف کے ہر ایک سیدھا سادہ ان پڑھ مسلمان بھی اپنے دین کا داعی اور مبلغ تھا اور غیر مسلم مبلغین ان مبلغوں کی قوت ایمانی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ عیسائیوں کے دیہات سے بہت سے لوگ موسم سرما میں درزی کا کام کرنے کے لیے مسلمانوں کے قصبوں میں چلے جاتے اور وہاں جا کر مسلمان ہو جاتے اور واپس آ کر بڑے جوش و خروش سے ان عقائد کو اپنے گھروں اور گردو پیش میں پھیلاتے رہتے۔

اسی طرح جواش قوم جن کی تعداد اس زمانہ میں دس لاکھ تھی وہ بھی تبدریج مسلمان ہوتی رہی۔ اور جب کسی گاؤں کے چند خاندان مسلمان ہو جاتے تو وہ مل کر ایک مسجد اور ایک مدرسہ ضرور قائم کرتے۔ سائبیریا میں بھی بخارا، ترکستان کے دوسرے شہروں کے علمائے دین اور قازان کے مسلمان تاجر مسلسل اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور وہاں لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد انیسویں صدی کی ابتداء تک دائرہ اسلام میں داخل ہو چکی تھی۔

Marfat.com

(۱)

برصغیر پاک و ہند میں دعوتِ اسلام

یہ عجیب بات ہے کہ مورخین نے مسلمانوں کی جنگوں کا حال تو بڑی تفصیل سے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے لیکن کسی مورخ نے آج تک یہ کوشش نہیں کی کہ مسلمانوں کی ملکی فتوحات اور سیاسی وملکی نظم ونسق سے قطع نظر کرتے ہوئے اس ملک میں اسلام کی اشاعت اور دعوت کے بارہ میں بھی لکھتا۔ عام تاریخوں کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دعوتی کوشش اس صورت میں ظاہر ہوئیں کہ محمود غزنوی اور دیگر بادشاہوں نے ہندوؤں کا وحشیانہ طریقہ سے قتل عام کیا اور اورنگ زیب، حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے ہندوؤں پر ظلم و جبر کیا اوران کو زبردستی مسلمان بنایا۔ حالانکہ حقیقت حال اس کے بالکل خلاف ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے ۲۸ کروڑ مسلمانوں میں سے اکثر و بیشتر تو مسلم ہیں یا تو مسلموں کی اولاد ہیں جن کے مسلمان کرنے میں کسی طرح کے جبر و تشدد سے کام نہیں لیا گیا بلکہ انہوں نے اپنی مرضی سے اسلام کے پر امن مبلغوں کی محض تعلیم وتلقین سے اسلام قبول کیا تھا۔ اس قسم کے نومسلموں کی جماعت ان لوگوں سے بالکل الگ نظر آتی ہے جو زبردستی مسلمان بنائے گئے تھے یا ہندوستان کی مختلف نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ غیر ملکی لوگ جو اس ملک میں اپنا مذہب اپنے ساتھ لائے اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو

مختلف زمانوں میں مختلف قسم کی ترغیبوں سے اپنا قدیم مذہب ترک کر کے مسلمان ہوئے۔ پھر برصغیر پاک و ہند کے غیر ملکی مسلمان تین بڑی جماعتوں پر مشتمل ہیں:

۱- اول وہ جماعت جو اپنی تعداد کے لحاظ سے سب سے اہم ہے، ان لوگوں کی ہے جو شمال مغربی سرحد کے پار سے نقل مکانی کر کے ہندوستان میں آباد ہوئے۔ وہ اب بیشتر پنجاب اور سندھ میں پائے جاتے ہیں۔

۲- دوسری جماعت ان لوگوں کی ہے جو مختلف مسلمان حکمرانوں کے درباریوں اور لشکریوں کی اولاد ہیں اور اب بیشتر شمالی ہند اور کسی قدر دکن میں آباد ہیں۔

۳- تیسری قسم میں ہندوستان کے مغربی ساحل کی وہ مسلم آبادیاں ہیں جو غالباً عربی النسل ہیں اور جن کے اصلی بانی ہندوستان میں سمندر کے راستہ سے آئے تھے، لیکن غیر ملکوں کے مسلمان خاندانوں کی تعداد جو ہندوستان میں آکر آباد ہوئے ہیں سوائے پنجاب اور اس کے قرب و جوار کے کہیں بھی زیادہ نہیں ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں سے نصف سے زیادہ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے غیر ملکی القاب مثلاً شیخ، بیگ، خان بلکہ قریشی اور سید وغیرہ بھی اختیار کر رکھے ہیں لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر لوگ دراصل مقامی نومسلم ہیں یا ان نومسلموں کی اولاد ہیں جنہوں نے ان ممتاز لوگوں کے القاب لے لیے ہیں جن کے ذریعہ سے وہ مسلمان ہوئے تھے۔ بعض اوقات انہوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے اعلیٰ طبقوں کے ساتھ اس سے بھی کم معقول وجوہات کی بنا پر وابستہ کیا ہے۔

برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں کا دوسرا حصہ مقامی لوگوں کا ہے جو مسلمان ہو چکے ہیں۔ ان میں سے بعض نے ہو سکتا ہے کہ کسی مجبوری یا حاکموں کے دباؤ اور جبر کے تحت اسلام قبول کیا ہو لیکن ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو اپنی خوشی اور رضا و رغبت سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ مورخین نے اشاعت اسلام اور اس کی دعوت کی تاریخ اور معاشرتی اثرات کی طرف بہت کم توجہ دی ہے جن کی وجہ سے لوگوں نے اسلام

Marfat.com

قبول کیا تھا۔ متداول تاریخ کی کتابوں میں خواہ وہ غیر ملکی مورخین یا ملکی مورخین نے لکھی ہیں صرف لڑائیوں کا حال یا بادشاہوں کی جنگوں اور ان کی فتوحات کا تذکرہ بڑے شدومد سے کیا ہے، لیکن ان میں اسلامی عہد کے مذہبی حالات کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ مسلمان اولیائے کرام کے تذکروں اور دعوت اسلام کے لیے ان کی کوششوں کا کوئی ذکر ان میں نہیں ہے۔ البتہ مختلف کتابوں میں ان کے کہیں کہیں حالات ملتے ہیں جن کو اکٹھا کرنا ایسا ہی ہے جیسے چیونٹیوں کے منہ سے دانہ دانہ جمع کر کے ایک خرمن تیار کرنا۔

مسلمان حکمران اور اشاعت اسلام:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریباً پندرہ سال بعد عربوں نے سندھ میں ایک فوجی مہم بھیجی تھی۔ اس کے بعد حجاج بن یوسف ثقفی نے اپنے داماد محمد بن قاسم کو راجہ داہر سے اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے بھیجا اور اس وقت سے لے کر کئی صدیوں تک مسلمان کشور کشاؤں کا ایک طویل سلسلہ ہے جنہوں نے شمال مغربی سرحد کی جانب سے برصغیر پاک و ہند پر چڑھائی کی۔ ان میں سے بعض نے بڑی بڑی مملکتوں کی بنیاد ڈالی۔ بعض منچلے لوگ تھے جو محض طالع آزمائی کے لیے اس ملک میں وارد ہوئے تھے۔ بعض حملہ آور لوٹ مار کے لیے آئے تھے اور وہ ڈھیروں مال غنیمت سمیٹ کر واپس چلے گئے، اور بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے یہاں آباد ہو کر بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں جن کے اثرات اتنے پائیدار تھے جو آج تک محسوس ہو رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی فاتح کے بارہ میں تاریخ کے اوراق میں یہ موجود نہیں کہ اس کے ساتھ اسلام کے مبلغ اور واعظ بھی دینی دعوت کے لیے آئے ہوں۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ وہ لوگ اپنے مذہب سے بے پروا اور غافل تھے یا انہیں دین کی تبلیغ و اشاعت کی پروا نہ تھی بلکہ اگر تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں سے اکثر نے برصغیر پاک و ہند کی لشکر کشی کو جہاد تصور کیا تھا۔

سیدنا عمرؓ کے زمانے میں تو جہاں بھی مسلمان فوجیں گئیں، ان کے تین ہی

مطالبے ہوتے تھے یا تو اسلام قبول کرلو، یا پھر ہمیں جزیہ ادا کرو ورگرنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اسی جذبہ کے تحت خلفائے راشدین کے زمانوں میں جہاد ہوا۔ ہر مسلمان فوجی ایک خاموش مبلغ تھا اور اس کی زندگی کا مقصد ہی تبلیغ اسلام اور دعوت اسلام تھی۔ سب سے پہلے مسلمان حملہ آور محمد بن قاسم تھے۔ انہوں نے ہندو راجاؤں کو قبول اسلام کی دعوت دی تھی۔ (ایلیٹ: جلد اص ۱۷۵، ص ۲۰۷)

مسلمانوں کی ہندو پاک میں آمد:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بھی عرب اور برصغیر پاک و ہند کے باہمی تعلقات تھے۔ عرب ملاح اور تاجر اپنی کشتیاں لے کر ہندوستان اور لنکا کے سواحل پر آتے جاتے تھے، لیکن اسلامی عرب اور برصغیر پاک و ہند کا پہلا تعلق سیدنا عمرؓ کے زمانے میں قائم ہوا جس کو ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔ اس حملہ میں مسلمان مکران تک پہنچ گئے تھے، مکران کا علاقہ ایک بہت بڑا علاقہ ہے۔ آج کل مکران کا نصف حصہ بلوچستان کہلاتا ہے۔ اگرچہ بلاذری فاروقی فتوحات کی حد سندھ کے شہر دیبل (موجودہ کراچی) تک لکھتا ہے لیکن طبری نے آخری حد مکران لکھی ہے۔ مکران کی اس مہم پر سیدنا حکم بن عمرو تغلبیؓ سیدنا عمرؓ کی طرف سے مامور تھے۔ چنانچہ سیدنا عمرؓ کی خلافت کے آخری ایام ۲۳ھ میں وہ اس مہم کو سر کرنے کے لیے روانہ ہوئے اور نہر مکران کے اس طرف فوجیں اتار دیں۔ مکران کا بادشاہ جس کا نام راسل تھا خود نہر کے پار آیا اور صف آرائی کی، لیکن ایک شدید جنگ کے بعد شکست کھائی اور مسلمانوں کا مکران پر قبضہ ہو گیا۔ صمار عبدی فتح کی نوید لے کر دربار خلافت میں گئے۔ سیدنا عمرؓ نے ان سے مکران کا حال پوچھا، انہوں نے کہا:

ارض سهلها جبل، وماؤها وشل، وثمرها دقل، وعدوها بطل،
خيرها قليل وشرها طويل والكثير بها قليل۔

سیدنا عمرؓ نے فرمایا کہ واقعات کے بیان کرنے میں یہ قافیہ بندی کیوں؟

Marfat.com

انہوں نے جواب دیا کہ میں نے حقیقت حال کو بیان کیا ہے۔ یہ سن کر سیدنا عمرؓ نے حکم بن عمرو تغلبیؓ کو لکھ بھیجا کہ فوجیں جہاں تک پہنچ گئی ہیں وہیں رک جائیں۔ چنانچہ طبری کے بیان کے مطابق فتوحات فاروقی کی حد یہی مکران ہے۔ بعد میں کسی مسلمان خلیفہ نے مکران سے آگے کا رخ نہ کیا۔ اس دوران سندھ کی سرحد پر مکران کے مسلمانوں اور سندھ کے راجوں میں گاہے گاہے کچھ سرحدی جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد تک ہندوستان پر کوئی باقاعدہ حملہ نہیں کیا گیا۔

ولید بن عبدالملک کے زمانے میں عراق کا گورنر حجاج بن یوسف ثقفی تھا جو اپنی بہادری اور انتظامی قابلیت میں بہت مشہور تھا۔ اگرچہ اس کے سیاہ کارنامے بھی تاریخ کے اوراق میں کثرت سے ملتے ہیں لیکن اس میں جرأت و بہادری کے اوصاف بھی موجود تھے۔ اسی وجہ سے اسلامی مملکت کی توسیع میں اس کا ایک خاص حصہ ہے چنانچہ ترک اور تاتار حکومت اسلامی کے زیر نگین لانے میں اس کا بہت بڑا دخل ہے۔ جب حجاج عراق کا گورنر تھا اس زمانہ میں راجہ داہر سندھ کا حکمران تھا۔ داہر نے ان عربوں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی جنہوں نے مکران کے گورنر سعید بن اسلم کو قتل کیا تھا۔ گویا داہر کی عرب حکومت سے مخالفت کی یہ پہلی بنیاد تھی۔ لیکن خلیفہ وقت نے پھر بھی سندھ پر حملہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ اس واقعہ کے چند سال بعد کچھ جہاز ران لنکا سے تحائف لے کر جو لنکا کے حکمران نے حجاج کو بھیجے تھے، آرہے تھے۔ ان جہازوں میں کچھ مسلمان اُپنے بیوی بچوں کے ساتھ حج کے ارادہ سے سوار تھے۔ باد مخالف ان جہازوں کو دیبل کے ساحل پر لے گئی جو اس وقت مملکت سندھ کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ یہاں دیبل کے ڈاکوؤں نے ان جہازوں کے مال و اسباب اور ان تحائف کو لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے اندرون سندھ لے گئے۔ حجاج بن یوسف کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ غصہ میں آ گیا۔ اس نے راجہ داہر کے پاس ایک سفیر بھیجا تا کہ وہ تحائف کی واپسی اور گرفتار شدہ عورتوں اور مردوں کی رہائی کا بندوبست کرائے۔ لیکن

Marfat.com

راجہ نے اس بارہ میں کوئی تعاون نہ کیا بلکہ سفیر کو یہ جواب دیا کہ ان بحری ڈاکوؤں پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ داہر کا یہ جواب غیر تسلی بخش تھا۔ چنانچہ حجاج بن یوسف نے راجا داہر کو قرار واقعی سبق سکھانے کے لیے سندھ پر حملے کا فیصلہ کیا۔ پہلے عبداللہ اور بدیل کی زیر قیادت مکران سے لشکر بھیجے گئے لیکن راجا داہر کے بیٹے جے سنگھ کے ہاتھوں انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ حجاج کو ان شکستوں کا سخت رنج ہوا خصوصی طور پر بدیل کی شہادت نے اسے بہت متاثر کیا۔ چنانچہ حجاج نے خلیفہ ولید بن عبدالملک سے سندھ پر حملہ کرنے کی خاص اجازت لی اور پھر پورے انتظامات کے ساتھ ایک خاص انتقامی لشکر اپنے داماد اور بچپازاد بھائی (بعض روایات میں بھتیجا ہے) عماد الدین محمد بن قاسم کی زیر قیادت روانہ کیا۔ محمد بن قاسم کی عمر اس وقت صرف سترہ سال تھی۔ محمد بن قاسم چھ ہزار سوار لے کر خشکی کے راستے ۷۱۱ء کے موسم خزاں میں دیبل پہنچا اور آتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ کئی روز کے محاصرے کے بعد جب شہر فتح نہ ہوا تو آخر کار العروس نامی ایک بڑی منجنیق کی مدد سے جس کو پانچ سو آدمی چلاتے تھے شہر پر گولہ باری کی گئی جس کے نتیجہ میں شہر فتح ہو گیا، اور محمد بن قاسم نے شہر پر قبضہ کر کے ان تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جو لنکا کے جہازوں سے ڈاکوؤں نے گرفتار کیے تھے۔ دیبل سے محمد بن قاسم موجودہ حیدر آباد کے قریب ایک شہر نیرون گیا جہاں کے حاکم نے لڑائی کے بغیر ہتھیار ڈال دیے۔ پھر اس نے سیوان کا رخ کیا۔ یہاں کا حاکم راجہ داہر کا بھتیجا تھا۔ شہر کے لوگوں نے اس کے خلاف بغاوت کر کے محمد بن قاسم کی اطاعت قبول کر لی۔ پھر ابن قاسم نے برہمن آباد کا رخ کیا۔ برہمن آباد اور راد کے مقامات پر راجا داہر اور اس کے بیٹے جے سنگھ کو شکست فاش دی۔ پھر وہ ملتان کی طرف بڑھا اور ۷۱۳ء کو یہ مقام بھی فتح کر لیا۔ سندھ سے ملتان تک کی ساری فتوحات دو سال کے قلیل عرصہ میں ہوئیں۔ اس کے بعد اس سپہ سالار کو واپس بلا لیا گیا۔ چچ نامہ کے بیان کے مطابق محمد بن قاسم کی فوجیں شمالی پنجاب کے اس مقام تک پہنچیں جہاں دریائے جہلم میدانی علاقہ میں داخل ہوتا ہے اور جہاں

راجہ داہر کے مقبوضات اور کشمیر کی سرحدیں ملتی تھیں۔ محمد بن قاسم کا ارادہ مشرقی جانب بڑھنے کا تھا۔ چنانچہ اس نے قنوج کے راجہ کو جس کی حکومت مغرب میں اجمیر اور وسطی پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی، جنگ کا پیغام دیا لیکن محمد بن قاسم کے یہ منصوبے پورے نہ ہوئے کیونکہ ۷۱۴ء کے وسط میں اس کے خسر حجاج بن یوسف کی وفات ہوگئی۔ اس سے اگلے سال کے شروع میں خلیفہ ولید بن عبدالملک چل بسا۔ ولید کا جانشین اس کا بھائی سلیمان ہوا۔ اس نے محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس بلالیا اور اسے اور اس کے عزیزوں کو سزائیں دے کر مروا ڈالا۔ اس طرح سے مسلمان فوجوں کی پیش قدمی رک گئی۔

محمد بن قاسم ہندوستان میں قریباً چار سال رہا۔ اس دوران میں اس نے نہ صرف ملکی فتوحات کیں بلکہ جتنا علاقہ اس نے فتح کیا اس کے انتظامات اور نظم ونسق کی طرف بھی خصوصی توجہ دی۔ محمد بن قاسم اور اس کے ساتھیوں کے اخلاق حسنہ، مذہبی اعتقادات اور ملکی نظم ونسق نے یہاں کے ہندوؤں کو بہت متاثر کیا۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ محمد بن قاسم کا ملکی نظم ونسق ترکوں اور افغانوں کی بہ نسبت زیادہ رواداری اور رعیت پروری پر مبنی تھا۔

محمد بن قاسم سے قبل داہر کے باپ راجہ چچ نے جو کہ ایک متعصب ہندو تھا، اپنی رعایا کے لیے نہایت سخت قوانین بنائے ہوئے تھے۔ انہیں ہتھیار رکھنے، ریشمی کپڑے پہننے، گھوڑوں پر زین ڈال کر سوار ہونے کی سخت ممانعت کر دی ہوئی تھی اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر اور کتوں کو ساتھ لے کر چلا کریں۔ (مختصر تاریخ اہل ہند، ڈاکٹر تارا چند (انگریزی) ص ۱۱۲) اس کے برعکس محمد بن قاسم نے اپنے مفتوحوں کے ساتھ نہایت عقل مندی اور فیاضی کا سلوک کیا۔ مال گذاری کا پرانا نظام قائم رہنے دیا اور قدیمی ملازموں کو ان کی ملازمتوں پر برقرار رکھا۔ ہندو پجاریوں، پروہتوں اور برہمنوں کو اپنے مندروں میں پوجا کی پوری پوری اجازت دی۔ ان پر ایک خفیف سا ٹیکس عائد کیا جو آمدنی کے مطابق ادا کرنا پڑتا تھا۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کو اجازت دی گئی کہ وہ مندروں اور برہمنوں کو پرانا ٹیکس دیتے رہیں۔ (مختصر تاریخ اہل ہند ۱۲۲-۱۲۳)

Marfat.com

محمد بن قاسم نے ان لوگوں کے ساتھ جو اچھا سلوک کیا اس سے ہندو بہت متاثر ہوئے چنانچہ ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد حلقہ اسلام میں داخل ہو گئی۔ سلیمان بن عبدالملک کے انتقال کے بعد عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو ان کے ایما پر سندھ کے عرب گورنر نے اعلان کیا کہ اگر سندھ کے لوگ مسلمان ہو جائیں تو انہیں عرب حکمرانوں کے برابر حقوق ملیں گے۔ چنانچہ کئی سندھی قبائل اور ان کے سربرآوردہ لوگ جن میں راجا داہر کا بیٹا جے سنگھ بھی تھا مسلمان ہو گئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جے سنگھ صرف دکھاوے کے لیے مسلمان ہوا تھا (تاریخ سندھ از عبدالحلیم شرر) لیکن دوسرے مورخین اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ (تاریخ سندھ مولوی ابوظفر ندوی ص ۱۲۷) بہر حال اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ محمد بن قاسم کے ہندوستان کے چار سالہ قیام میں ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد دل و جان سے مسلمان ہوئی۔ جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ محمد بن قاسم اپنے ساتھ صرف چھ ہزار سوار لے کر آیا لیکن جب چار سال کے بعد وہ واپس گیا تو اس کے فوجیوں کی تعداد تیس ہزار سے زائد تھی۔ یہ سب یہیں کے نو مسلم تھے۔ تاریخ کے اوراق میں ہے کہ محمد بن قاسم کے اعلیٰ اخلاق، رواداری اور عدل و انصاف کی وجہ سے جب وہ گرفتار ہو کر عراق واپس گیا تو یہاں کے لوگ زار و قطار روتے تھے اور علاقہ "کچھ" کے لوگوں نے تو اس کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اس کا مجسمہ بنایا۔

(فتوح البلدان ص ۱۴۵)

- اسلامی فتوحات کے ابتدائی دور میں جب محمد بن قاسم نے ۷۱۲ء میں سندھ میں اسلامی حکومت قائم کی تو ملتان عالم اسلام کا ایک سرحدی شہر تھا کیونکہ مسلمانوں کی فتح کے وقت سندھ کے ہندو راجا کی عملداری شمال میں ملتان تک پہنچتی تھی لیکن اب ملتان سندھ میں شامل تھی۔ عربوں کے دور حکومت میں جو تین سو سال تک جاری رہا، بہت سے لوگوں نے قدرتی طور پر فاتحین کا مذہب اختیار کر لیا۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی دعوت پر سندھ کے کئی ہندو شہزادے بھی مسلمان ہو گئے۔ (فتوح البلدان، بلاذری: ص ۱۴۴) ساوندری

کے لوگوں نے جب محمد بن قاسم کی اطاعت اختیار کی تو ان کو اس شرط پر امن وامان دیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی مہمان داری کریں گے اور ان کے لیے رہبر مہیا کریں گے۔ چنانچہ اس واقعہ کے ایک سو سال بعد بلاذری نے لکھا ہے کہ اس کے زمانے میں یہ لوگ مسلمان تھے اور محمد بن قاسم کے مراسلات میں بھی ہندوؤں کے مسلمان ہونے کا اکثر ذکر آیا ہے۔

مسلمانوں نے سندھ پر اپنے پہلے حملے کے بعد اپنی بت پرست رعایا کو مکمل مذہبی آزادی دی۔ آزادی کی اس فضا میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ بیشتر اپنی مرضی سے مسلمان ہوئے تھے، مثلاً برہمن آباد کے باشندوں کو جن کا شہر بزور شمشیر فتح ہوا تھا، اپنے شہر کے مندر کو مرمت کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی کیونکہ اس کے برہمنوں کی روزی اسی مندر کی آمدنی پر موقوف تھی۔ رعایا کے کسی شخص کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے کی ممانعت نہ تھی۔ اور جب کسی مقام کے باشندے اطاعت اختیار کرتے تو ان کو فوری امان دے دی جاتی تھی۔ اور ان کو اپنے دین اور دستور کی پیروی کی عام اجازت تھی۔

سندھ میں چونکہ عربوں کی حکومت کافی دیر تک برقرار رہی، اس لیے بعض شہروں میں ان کی نو آبادیاں قائم ہو گئیں جن میں علماء اور فضلاء کی ایک اچھی خاصی تعداد تھی۔ ان علماء کی تبلیغ سے سندھ کی بیشتر آبادی کا تبدیل مذہب تیزی سے تو نہیں، آہستہ آہستہ اور کئی تدریجی منزلوں سے گزرنے کے بعد ہوا۔ مختلف تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دیبل اور دوسری جگہوں پر عربوں کی جو نو آبادیاں تھیں، وہاں علماء کی بھی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ چنانچہ قاضی عبدالکریم سمعانیؒ نے ان محدثین کا ذکر کیا ہے جو دیبل اور اس کے نواح میں گزرے ہیں۔ اس میں سندھ، دیبل، منصورہ اور لاہور وغیرہ کے کئی علماء اور بزرگوں کے حالات اجمالی طور پر ذکر کیے ہیں مثلاً ابو معشر نجیح سندھی جو نو مسلم تھے اور مدینہ منورہ میں ایک مدت تک رہنے کی وجہ سے مدنی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ یہ اپنے زمانے میں فن سیر و مغازی کے امام تھے اور یہ وہ شخصیت تھے جو فن سیر و مغازی کو اولاً قید تحریر میں لائے تھے۔ آپ کا انتقال سنہ ۱۷۰ھ میں ہوا اور آپ کی

Marfat.com

شہرت کی وجہ سے خلیفہ ہارون الرشید عباسی نے خود ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

ایک اور نومسلم محدث کا ذکر بھی اس کتاب میں موجود ہے جن کو رجاء سندھی کہتے تھے۔ ایران میں مدت تک قیام کرنے کی وجہ سے اسفرائنی کہلانے لگے۔ مورخین نے انہیں "رکن من ارکان الحدیث" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ سن ۳۲۱ھ میں وفات پائی اس کے بیٹے بھی ایک بہت بڑے محدث تھے اور بغداد میں حدیث کا درس دیا کرتے تھے۔

کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سندھ کے مسلمانوں کو علم حدیث سے خاص دل چسپی تھی۔ چنانچہ ایک عرب سیاح ابوالقاسم نے سندھ کا دورہ کرنے کے بعد لکھا ہے "اکثر هم اصحاب الحدیث" سندھ کے اکثر لوگ اصحاب الحدیث تھے۔ قاضی عبدالکریم سمعانی نے اپنی کتاب الانساب میں متعدد محدثین اور علماء کا ذکر کیا ہے جو سندھ کے مختلف شہروں میں آباد تھے۔ بایزید بسطامیؒ کے ایک استاذ ابوعلی سندھی بھی تھے۔ ایک اور عرب سیاح مقدسی نے اپنے سفرنامہ میں منصورہ کی بابت لکھا ہے کہ یہاں میں نے قاضی ابومحمد منصوری کو دیکھا جو ظاہری مذہب (امام داؤد ظاہری کے پیروکار) کے امام تھے اور ان کی بہت سی تصنیفات بھی ہیں۔ مقدسی نے سندھی مسلمانوں کی بھی بہت تعریف کی ہے کہ "ان کے ہاں علم اور اہل علم کی وجہ سے اسلام کو تازگی حاصل ہے۔" منصورہ کی قابل ذکر شخصیات میں ایک عرب نوجوان کا ذکر ملتا ہے جس نے روہڑی کے ہندو راجا کی استدعا پر قرآن حکیم کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ مقدسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے اس شہر کو علم و فضل کی وجہ سے ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور اس کی ایک وجہ یہاں کثرت سے عربوں کا موجود ہونا بھی ہے۔

محمد بن قاسم کے بعد جو مسلمان بادشاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوئے ان میں سے بعض کا طریقہ تاریخ کے اوراق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اللہ کا نام لے کر بتوں کو توڑ پھینکا، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہندوؤں پر حملہ

Marfat.com

کرنے سے قبل ان کو اسلام کی دعوت دی جاتی تھی۔ (ایلیٹ جلد ۱ص ۱۷۵) بعض اوقات ہندولوگ خوف کے مارے اسلام کی اس دعوت کو قبول کر کے مسلمان ہو جاتے، لیکن اسلامی فتوحات کے ابتدائی دور میں جو ہندو اس طرح مجبوراً اسلام لاتے تھے، وہ حملہ آوروں کے رخصت ہونے کے بعد اسلام ترک کر دیتے تھے۔ چنانچہ بلند شہر کے راجا ہروت کے واقعہ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس راجا نے محمود غزنوی کی جس طرح اطاعت قبول کی اس کا حال سلطان محمود کے وزیر نے اس کی فتوحات کے ضمن میں یوں لکھا ہے کہ ''آخر کار سلطان محمود ۱۰۱۹ء کے قریب بربا (بلند شہر) کے قلعے پر پہنچا جو ہروت کی عمل داری میں تھا۔ جب ہروت نے اس چڑھائی کا حال سنا جس میں خدا کے مظفر و منصور غازی سمندر کی موجوں کی طرح بڑھتے چلے آتے تھے اور فرشتے ان کے گرد تھے، تو وہ نہایت پریشان ہوا۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے اور اس پر اپنی جان کا خوف طاری ہو گیا، اس لیے اس نے سوچا کہ اس کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اسلام قبول کرے، کیونکہ اللہ کی تلوار نیام سے نکل چکی تھی اور سزا کا تازیانہ بلند ہو چکا تھا۔ پس وہ دس ہزار آدمیوں کے ساتھ قلعے سے باہر آیا اور قبول اسلام کا اعلان کیا اور بتوں کی پوجا ترک کر دی۔ حملہ آوروں کے واپس جاتے ہی یہ نومسلم غالباً اسلام سے منحرف ہو گئے۔ اس طرح کے طرز عمل کے بارے میں برصغیر پاک و ہند کے قدیم مسلمان مورخین نے مسلسل طور پر شکایت کی ہے۔ چنانچہ ۱۱۹۳ء میں جب سلطان قطب الدین ایبک نے برن پر حملہ کیا تو وہاں کے راجا چندرسین نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ یہ راجا ہروت کی اولاد میں سے تھا اور وہ ہندو مذہب کا بڑی سختی سے پابند تھا۔ اس کے علاوہ چندرسین کی رعایا میں بھی کسی مسلمان کا ذکر نہیں ملتا۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے ان مسلمان فاتحین میں لوگوں کو مسلمان کر کے ان کی اخروی بھلائی چاہنے کا جذبہ بہت کم تھا جو ایک سچے مبلغ کے دل و دماغ میں موجزن ہوتا ہے اور جس کی بدولت اسلام کو بڑی شان دار روحانی

Marfat.com

فتوحات حاصل ہوئی ہیں۔ خلجی خاندان (۱۲۹۰ء تا ۱۳۲۰ء) تغلق خاندان (۱۳۲۰ء تا ۱۴۱۲) اور لودھی خاندان (۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء) کے حکمران لڑائیوں میں عموماً ایسے مصروف و مشغول رہے کہ انہیں دین اسلام کے مفاد کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ یا پھر ان کو تبلیغ کی جگہ اپنی رعایا سے خراج اور جزیہ وصول کرنے کا زیادہ خیال رہا۔ ان حکمرانوں کے دل مذہبی جوش سے یک قلم خالی نہ تھے، مثلاً شمالی پنجاب کے پہاڑی اضلاع میں گکھڑوں کی وحشی قوم آباد تھی جنہوں نے پہلے مسلمان حملہ آوروں کو بہت تنگ کیے رکھا۔ ان کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ بارھویں صدی عیسوی کے خاتمہ پر سلطان محمد غوری کے اثر سے مسلمان ہوئے تھے۔ سلطان نے ان کے سردار کو قید کر لیا تھا اور اسے مسلمان ہونے کی ترغیب دی تھی۔ جب یہ سردار مسلمان ہو گیا تو سلطان نے اسے گکھڑ قوم کی سرداری پر مستقل کر دیا اور اسے اس کی قوم کی طرف واپس بھیج دیا تا کہ وہ ان کو مسلمان کرے۔ چونکہ گکھڑوں کا مذہب خود کچھ قوی اور مضبوط نہ تھا اس لیے وہ آسانی سے مسلمان ہو گئے۔ (تاریخ فرشتہ جلد ۱ ص ۱۸۴)

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ خلجی خاندان کے حکمران اشاعت اسلام کی ایک حد تک اس طریق سے حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ ان کے ہاں یہ دستور تھا کہ نومسلم بادشاہ کے حضور میں باریاب ہوتا تھا اور بادشاہ اسے خلعت فاخرہ پہناتا تھا۔ اس کے رتبے کے مطابق اسے طلائی طوق اور کنگن عطا کرتا تھا (یہ گویا اس کی تالیف قلبی ہوتی تھی) لیکن پہلے مسلمان خاندانوں کے حکمرانوں نے عموماً تبلیغ اسلام میں بہت کم دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) نے اپنے خودنوشت حالات میں اپنے شوق تبلیغ کے بارہ میں حسب ذیل جملہ لکھا ہے جو برصغیر پاک و ہند کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ میں عدیم النظیر ہے:

''میں نے اپنی کافر رعایا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب قبول کرنے کی حوصلہ افزائی کی اور میں نے اعلان کیا کہ جو شخص کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جائے گا وہ جزیہ کی ادائیگی سے بری الذمہ سمجھا جائے گا۔ جب یہ خبر عوام کے

Marfat.com

کانوں تک پہنچی تو بہت سے ہندو مشرف با سلام ہوئے۔ پس روزانہ ہر طرف سے لوگ آتے تھے اور اسلام قبول کر کے جزیہ سے معافی پاتے تھے۔ انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر واپس جاتے تھے۔" (رحلۃ ابن بطوطہ: جلد۳ص ۱۹۷)

اس بارہ میں سر الفریڈ لائل کے خیالات بھی سن لیں۔ وہ لکھتا ہے:

"جن مسلمان فاتحین نے شمالی ہندوستان اور دکن میں سلطنتوں کی بنیاد ڈالی، ان کی روحانی اور مذہبی معاملات کی طرف بہت کم توجہ تھی۔ وہ ملکی فتوحات یا خانہ جنگیوں میں اس قدر مصروف تھے کہ ان کو مذہب کی دعوت و تبلیغ کی مطلق فرصت نہ تھی۔ یہ لوگ بالعموم وحشی تاتاری یا مغل تھے جن کو خود دین محمدی کا بہت کم علم تھا۔ وہ اس جذبے سے عاری تھے جو اسلام کے پہلے علم برداروں کے سینوں میں موجزن تھا۔ جو سلطنت انہوں نے قائم کی وہ خالصتاً فوجی نوعیت کی تھی۔ اور اس کی یہ نوعیت بدستور قائم رہی کیونکہ ان کی ملکی فتوحات کبھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچیں۔ ان کی روحانی فتح (یعنی دعوت و اشاعت اسلام) بھی نسبتاً ناکام رہی۔ تاہم ان میں اتنی قوت ضرور تھی کہ انہوں نے ہندوؤں کے مذہبی اتحاد کو روک دیا اور منتشر قبیلوں کو ایک قوم نہ بننے دیا۔ ہندوستان کے لوگوں کو مسلمان بنانا تو بڑی بات تھی، مسلمان خود بھی حکومت کے تمام اعلیٰ عہدوں پر بلا شرکت غیرے قابض نہ ہو سکے۔" (سر الفریڈ لائل: ایشیاٹک سٹڈیز)

یہ تو لودھی، تغلق اور خلجی خاندانوں کا تجزیہ تھا، لیکن مغلیہ دور حکومت میں جب کہ مسلمانوں کی حکومت بہت مستحکم تھی تو اس سے قدرتی طور پر اسلام کے دینی اثرات میں بھی استحکام اور استقلال پیدا ہو گیا۔ پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں ہندوؤں کے ہاں جو مذہبی تحریکیں پیدا ہوئیں، ان میں یقیناً اسلامی اثرات نظر آتے ہیں۔ بشپ لافرائے کا خیال ہے کہ اسلام کی مثبت تعلیم نے بہت سے ایسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا جو "ہمہ اوست" کے مبہم مسئلے سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

Marfat.com

''مسلمان خدا کی ہستی پر کامل اور مضبوط یقین رکھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک صداقت اور حقانیت ایک مستحکم حقیقت ہے، لہٰذا جب یہ اسلامی عقیدہ ہندوستان میں ''ہمہ اوست'' جیسے مبہم مسئلے کے ساتھ متصادم ہوا تو اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اسلام اس معرکہ میں نہ صرف غالب رہا بلکہ شمالی ہند کی زندگی اور اس کے انداز فکر کے لیے باعث تقویت ثابت ہوا اور اس نے بہت سے لوگوں میں ایک نئی جان ڈال دی اور ان کو تازہ قوت بخشی۔'' (Mankind and Church, P.286 London)

اسلام قبول کرنے کی سب سے بڑی ترغیب اور تحریص اس وقت ہوئی جب لوگوں کی بت پرستی اسلامی درباروں میں اعزاز پانے کے راستے میں حائل ہوئی، حالانکہ ہندوؤں کے ساتھ مسلمان حکمرانوں کا سلوک نہایت رواداری اور مصالحت کا تھا۔ ہندو مندروں کے شاہی اوقاف کا پورا پورا احترام کیا جاتا تھا۔ اور مسلمان حکمران ان کے مذہب میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کرتے تھے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بہت سے ہندو دنیوی فوائد حاصل کرنے کے خیال سے مسلمان ہو گئے۔ چنانچہ بہت سے راجپوتوں نے اسی طرح سے اسلام قبول کیا اور ان کی اولاد آج تک دولت مند زمینداروں اور جاگیرداروں میں شمار ہوتی ہے۔ ان راجپوتوں میں غالباً سب سے اہم اور معزز بچگوتی قبیلے کا مسلمان خاندان ہے جس کا سربراہ اودھ کا سب سے بڑا رئیس ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کے مورث اعلیٰ تلوک چند کو بابر بادشاہ نے قید کر لیا تھا اور اس نے قید سے رہائی پانے کے لیے اسلام قبول کر لیا تھا۔ (خطابات اودھ کی فہرست ص ۷۸) لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ یہ واقعہ ہمایوں کے عہد میں ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب ہمایوں نے تلوک چند کی بیوی کے حسن و جمال کا شہرہ سنا تو اس نے اسے ایک میلے سے پکڑ منگوایا، لیکن وہ جونہی بادشاہ کے سامنے حاضر ہوئی تو بادشاہ کے ضمیر نے اسے ملامت کی اور اس نے تلوک چند کو طلب کیا۔ تلوک چند جو اپنی بیوی کی صورت دوبارہ دیکھنے سے

Marfat.com

قطعاً مایوس ہو چکا تھا، بادشاہ کے حسن سلوک اور پاکیزہ اخلاق سے نہایت متاثر ہوا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے شکرانے کے طور پر دین اسلام کو قبول کر لیا جس نے بادشاہ کو ایسے فیاضانہ اور پاکیزہ سلوک کی تلقین کی تھی۔''

جنوبی ہند میں دعوتِ اسلام:

جنوبی ہندوستان میں اسلام کا آغاز آٹھویں صدی عیسوی یعنی دوسری صدی ہجری سے ہوا، جب پناہ گزینوں کی ایک جماعت جن کے ساتھ ماپلا[1] قوم کے لوگ اپنا نسب ملاتے ہیں۔عراق سے آ کر اس ملک میں آباد ہوئی۔ گرم مصالحوں، ہاتھی دانت اور جواہرات وغیرہ کی جو تجارت سینکڑوں برس سے ہندوستان اور یورپ کے درمیان عربوں اور ایرانیوں کے ذریعوں سے رائج تھی، اس کی وجہ سے جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر اسلام کا اثر مسلسل طور پر جاری رہا۔ باہر کے لوگوں کی اس مسلسل آمد سے وہاں کے تجارتی شہروں میں ایک مخلوط آبادی پیدا ہو گئی، جو آدھی ہندو اور آدھی عربی یا ایرانی تھی۔ ان مسلمان تاجروں اور وہاں کے ہندو راجاؤں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم تھے۔ چنانچہ یہ حکمران مسلمان تاجروں کی حفاظت اور سرپرستی کرتے تھے، کیونکہ انہی کے دم قدم سے ان کے ہاں تجارت کا بازار گرم رہتا تھا جس پر ان کے ملک کی خوش حالی موقوف تھی۔ یہ راجے اسلام کی اشاعت میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالتے تھے بلکہ جو مقامی لوگ مسلمان ہو جاتے تھے ان کی غیر ملکی تاجروں کی طرح عزت کرتے تھے اگرچہ اسلام لانے سے قبل یہ نومسلم معاشرہ اور سماج کی نیچ ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ (تحفۃ المجاہدین: زین الدین معبری ص ۳۶)

---

[1] ماپیلا یا موپلا جنوبی ہند کے مغربی ساحل (مالابار) کی مخلوط نسل کی ایک مسلمان قوم ہے جس کی آبادی ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق گیارہ لاکھ کے قریب تھی۔ یہ لوگ مذہباً سنی (شافعی) یا شیعہ ہیں۔ ان میں بعض تاجر ہیں اور بعض کاشتکار۔ ان کی زبان ملیالم ہے جس کو عربی حروف میں لکھتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا مرکز پونانی کا شہر ہے جہاں ان کی جامع مسجد اور ایک دینی مدرسہ ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد ۳ ص ۲۶۰ بذیل ماپلا Mapillas)

Marfat.com

شیخ زین الدین معبری (متوفی ۹۹۱ھ) لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے مغربی ساحل کی بندگاہوں میں مختلف ملکوں سے تاجر بکثرت آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی نئے شہر آباد ہو گئے ہیں اور مسلمانوں کی تجارت سے ان کی آبادی بڑھ گئی ہے اور مکانات کثرت سے تعمیر ہو گئے ہیں۔ یہاں کے راجے اور سردار مسلمانوں پر سختی کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ راجے اور ان کی سپاہ اور افواج بت پرست ہے لیکن وہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کی رسوم کا بہت پاس اور لحاظ کرتے ہیں، سوائے ایسے موقعوں کے جب غیر معمولی اشتعال ہو وہ مسلمانوں پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہونے دیتے۔ بت پرستوں اور مسلمانوں کا یہ اتحاد اس لحاظ سے اور بھی تعجب انگیز ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔ میں یہ بات سمجھانا چاہتا ہوں کہ قدیم زمانے میں ملابار کے مسلمان نہایت امن و عافیت میں رہتے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ اس ملک کے باشندوں کے ساتھ وہ کسی طرح کی زیادتی نہیں کرتے تھے۔ ہندوؤں کے رسم و رواج کا لحاظ رکھتے تھے اور بلا قید مذہب امن و آشتی کے تعلقات ان میں چلے آتے تھے۔ چونکہ ملابار کے مسلمانوں میں کوئی امیر ایسا نہیں جس کو مسلمانوں پر حکومت کرنے کے لیے کافی قدرت حاصل ہو اس لیے اہل اسلام بت پرست راجاؤں کے محکوم ہیں۔ وہ ایمان داری سے مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں اور ان سے عدل و انصاف کرتے ہیں۔ ان کو ایسے حقوق دیتے ہیں جن سے مسلمانوں کو نفع پہنچتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اپنے ہی جرم اور قصور سے سزا پانے کا مستحق ہو تو مجبوری ہے، ورنہ ملابار کے ہندو حکمرانوں کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ عزت اور مہربانی کا ہے کیونکہ ان کے شہروں کی آبادی اور خوش حالی ان ہی مسلمان تاجروں کی بود و باش کا نتیجہ ہے۔''

(تحفۃ المجاہدین: شیخ زین الدین ص ۳۶)

مالا بار میں دعوتِ اسلام:

سولھویں صدی عیسوی یعنی دسویں صدی ہجری کے ایک مسلمان مورخ شیخ زین الدین معبری جن کا تذکرہ گذشتہ سطور میں کیا گیا ہے، ایک عالم دین تھے جن کا والد عبدالعزیز اپنے زمانے میں مالا بار کا قاضی تھا اور مسلک کے لحاظ سے شافعی تھا۔ زین الدین نے اپنی کتاب تحفۃ المجاہدین میں اسلام کی اشاعت کی تاریخ لکھی ہے اور پھر اس ملک میں پرتگالیوں کے حملوں اور جنگوں کا حال قلم بند کیا ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۲۳ء میں زیور طباعت سے مزین ہوا اور پھر پروفیسر ڈیوڈ لوپیس نے اس کے عربی متن کو پرتگالی ترجمے کے ساتھ لزبن سے ۱۸۹۸ء میں شائع کرایا، اس معتبر اور قابل اعتماد کتاب میں مصنف نے مالا بار میں اسلام کے آغاز کی کیفیت یوں بیان کی ہے کہ اس ملک میں سب سے پہلے جن لوگوں نے اسلام کی تبلیغ کی وہ زائرین کی ایک جماعت تھی جو لنکا کی طرف حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نشان قدم کی زیارت کے لیے جا رہی تھی۔ جب وہ کرنگ نور میں پہنچی تو وہاں کے راجہ نے ان کو بلا بھیجا۔ اس جماعت کا سربراہ شیخ شرف بن مالکؒ تھا اور اس کے ہمراہ اس کا بھائی مالک بن دینار اور اس کا بھتیجا مالک بن حبیب بھی تھا۔ شرف بن مالکؒ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور راجا کے سامنے اسلام کی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو پیش کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی صداقت کو راجا کے دل میں اتار دیا اور وہ ان پر ایمان لے آیا۔ اس نے شیخ شرف بن مالک اور ان کے ساتھیوں سے کہا کہ جب آپ حضرات سیدنا آدم علیہ السلام کے نشان قدم سے واپس آئیں تو مجھ سے دوبارہ ملاقات کریں۔ جب یہ زائرین لنکا سے واپس تشریف لائے تو راجا چپکے سے جہاز پر سوار ہو کر جو ساحل عرب کو جا رہا تھا، ان کے ساتھ روانہ ہو گیا اور اپنی مملکت کا انتظام ایک نائب کے سپرد کر گیا۔ وہ بلاد عرب میں کچھ عرصہ ٹھیرا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وطن واپس پہنچ کر مسجدیں تعمیر کرے اور دین اسلام

Marfat.com

کی لوگوں کو دعوت دے، لیکن جب وہ وطن واپسی کے لیے تیاری کر رہا تھا تو اچانک بیمار ہو کر انتقال کر گیا، لیکن اس نے مرنے سے قبل اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کو تاکیداً وصیت کی کہ اس نے مالابار میں دعوت اسلام کا جو قصد کر رکھا ہے، اس کو ہرگز ترک نہ کریں۔ اس کام میں امداد دینے کی غرض سے راجا نے ان کو اپنے نائبوں کے نام چند خطوط دیے اور ان سے کہا: کہ ان سے اس کی وفات کی خبر پوشیدہ رکھیں۔

شیخ شرف بن مالکؒ اور ان کے ساتھی یہ خطوط لے کر کرنگ نور کی طرف روانہ ہو گئے اور ان کو راجا کے سامنے پیش کیا۔ نائب ان سے بہت مہربانی سے پیش آیا اور راجا کی ہدایات کے مطابق جو مراسلے میں درج تھیں، اس نے ان کو ایک قطعہ اراضی عطا کیا جس پر انہوں نے ایک شاندار مسجد تعمیر کی۔ مالک بن دینارؒ نے وہاں آباد ہونے کا فیصلہ کیا، لیکن مالک بن حبیبؒ ایک دعوتی دورہ پر روانہ ہو گئے تاکہ تمام مالابار میں مساجد تعمیر کریں۔ مالک بن حبیبؒ اپنے بیوی بچوں اور کچھ اسباب کے ساتھ کولم شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ایک مسجد تعمیر کی پھر انہوں نے اپنے اہل وعیال کو وہیں چھوڑ کر ہیلی مارادی کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر بھی ایک مسجد تعمیر کی۔ پھر شیخ زین الدینؒ سات دیگر مقامات کا ذکر بھی کرتے ہیں جہاں اس نے مساجد تعمیر کیں اور آخر کار وہ کرنگ نور واپس پہنچ گئے۔ بعد ازاں وہ ان تمام مقامات میں دوبارہ گئے اور وہاں ہر ایک مسجد میں نماز ادا کی۔ واپس آ کر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے دین اسلام کو ایک ایسے ملک میں پھیلایا ہے جو کافروں اور بت پرستوں سے بھرا پڑا ہے۔ (تحفۃ المجاہدین ۲۳۰-۲۵۰)

اس واقعہ سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ مالابار کے ساحل پر اسلام کے حق میں جو تبلیغی کوششیں کئی سو سال تک جاری وساری رہیں، ان کی نوعیت پر امن تھی۔ اس کام کو انجام دینے والے بیشتر عرب تاجر تھے، لیکن ابن بطوطہ اور بھی بہت سے علمائے دین کا ذکر کرتا ہے جو یہاں بلاد عرب یا دوسرے ملکوں سے آئے تھے، اور جن

سے وہ مالابار کے مختلف شہروں میں ملتا تھا۔ کالی کٹ کا راجہ زمورن عرب تاجروں کا بڑا سرپرست تھا۔ اس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ قبول اسلام کی حوصلہ افزائی کرتا تھا تاکہ اسے ان جنگی جہازوں کے لیے آدمی مل سکیں جن پر اس کی عظمت و طاقت کا انحصار تھا۔ لہٰذا اس نے حکم دے رکھا تھا کہ اس کی مملکت میں ماہی گیروں کے ہر گھرانے میں سے ایک یا دو لڑکوں کی تربیت اسلامی طریقے پر کی جائے۔

(رحلۃ ابن بطوطہ جلد ۴ ص ۸۲-۸۸، ص ۱۹۰)

سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں موپلہ قوم کے نومسلم مالابار کی آبادی کا پانچواں حصہ تھے۔ ان کی زبان وہی تھی جو وہاں کے ہندوؤں کی تھی اور ان کو صرف لمبی داڑھی اور سر کے مخصوص لباس سے پہچانا جا سکتا تھا۔ اگر پرتگیزی ہندوستان میں نہ پہنچتے تو اس ساحل کے تمام لوگ مسلمان ہو جاتے کیونکہ وہ کثرت سے اسلام قبول کر رہے تھے۔ گجرات اور دکھن کے علاوہ بلاد عرب اور ایران کے مسلمان تاجر بھی ان پر اپنا قوی اثر ڈال رہے تھے۔

بعض مصنفین کا خیال ہے کہ اگر پرتگالی لنکا میں نہ آتے تو وہاں ایک اسلامی حکومت قائم ہو جاتی کیونکہ بحر ہند میں پرتگال کے جنگی جہازوں کے آنے سے قبل یہاں کی تمام تجارت عربوں کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے صدہا سال پہلے تجارتی کوٹھیاں قائم کر رکھی تھیں اور عرب تاجر ہر بندرگاہ اور ہر شہر میں موجود تھے۔ تجارتی سہولتوں کی بدولت مالابار کے شہروں سے بھی مسلمان تاجر لنکا میں آتے تھے۔ دیگر مقامات کی طرح یہاں بھی مسلمان تاجروں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کر لیں اور لنکا کے ساحل پر اپنے دین کو پھیلا دیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہاں عملی طور پر کوئی تبلیغی اور دعوتی تحریک جاری نہ ہوئی تھی یا وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے لیے رغبت اور رضامندی کا اظہار نہیں کیا، کیونکہ جس قدر مسلمان آج کل اس جزیرے میں ہیں وہ اکثر و بیشتر عربوں کی نسلوں سے ہیں۔ (سر جیمس ایمرسن ٹینٹ، لنکا،

Marfat.com

جلد اص ۶۳۱-۶۳۳، لندن) آج کل مسلمانوں کی تعداد لنکا میں لاکھوں میں ہے۔

اس دعوت و تبلیغ میں کن کن حضرات نے حصہ لیا، تاریخ اس معاملہ میں کوئی زیادہ وضاحت نہیں کرتی سوائے عبدالرزاق سمرقندیؒ کے جس نے اپنی کتاب مطلع السعدین میں زمورن کے دربار میں اپنی ناکام سفارت کا حال لکھا ہے۔ کالی کٹ کے حکمران زمورن نے تیموری خاندان کے فرماں روا شاہ رخ کے پاس ایک سفیر بھیجا تھا۔ چنانچہ اس کے جواب میں شاہ رخ نے بھی ۱۴۴۱ء میں عبدالرزاق سمرقندی کو زمورن کے دربار میں سفیر بنا کر روانہ کیا۔ زمورن کا سفیر مسلمان تھا۔ اس نے سلطان شاہ رخ سے کہا کہ یہ بڑا کار ثواب ہوگا اگر زمورن کے پاس ایک خاص قاصد بھیجا جائے جو اس کو بنحو آیۂ کریمہ "ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ" اسلام کی دعوت دے اور اس ظلمت وضلالت کو دور کرے جو اس کے تاریک دل پر چھائی ہوئی ہے تاکہ علم دین کا آفتاب اس کی روح کے روزن کو روشن کرے۔ اس کام کے لیے عبدالرزاق سمرقندی کا انتخاب ہوا اور وہ ایک جان جوکھوں کے سفر کے بعد کالی کٹ پہنچا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ راجا زمورن اس کے ساتھ نہایت سرد مہری سے پیش آیا، اور وہاں چھ ماہ قیام کرنے کے بعد عبدالرزاق سمرقندی نے بالآخر اپنے اصلی مقصد کو خیر باد کہا اور واپس خراسان کا راستہ لیا۔ اس سفارت کے سلسلہ میں وہ اپنے وطن سے تین سال تک غیر حاضر رہا تھا۔ (مطلع السعدین، عبدالرزاق سمرقندی ص ۱۷۳)

اسی سلسلہ میں ایک اور بزرگ سید ابراہیم شہید بھی قابل ذکر ہیں جن کی قبر اروڈی میں ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کی پیدائش بارہویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی۔ وہ ایک جنگ جو مجاہد تھے جو پانڈین کی مملکت پر چڑھائی کر کے اس پر بارہ سال تک قابض رہے لیکن آخر کار شہید ہو گئے۔ تاہم لوگوں نے ان کے صاحبزادے کی جان بخش دی کیونکہ اس کے باپ نے اپنے عہد حکومت میں ان کے ساتھ بھلائی کی تھی۔ بلکہ اسے ایک قطعۂ زمین بطور جاگیر دے دیا گیا جو ان کی اولاد کی ملکیت میں ہے۔

Marfat.com

ان اولیائے کرامؒ میں سے سب سے آخری بزرگ شاہ حمید (۱۵۳۲ء-۱۶۰۰ء) ہیں جو شمالی ہند میں مانک پور میں پیدا ہوئے تھے اور جنہوں نے اپنی عمر عزیز کا اکثر و بیشتر حصہ جنوبی ہند کی زیارت گاہوں پر حاضری دینے اور تبلیغی اور دعوتی دوروں پر صرف کیا تھا۔ انہوں نے آخر کار ناگور میں سکونت اختیار کی جہاں ان کے لے پالک (متبنیٰ) بیٹے کی اولاد آج کل ان کی قبر کی متولی ہے۔

جنوبی ہند کے مسلمانوں کی ایک اور قوم "دودکلد" ہے جن کا پیشہ کپاس صاف کرنا اور موٹے موٹے کپڑے بننا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ بابا فخر الدین کی تبلیغ اور دعوت سے مسلمان ہوئے تھے جو پینو کنڈا میں مدفون ہیں اور جن کی قبر کا وہ بہت زیادہ احترام کرتے ہیں۔ ان کے بارہ میں یہ روایت مشہور ہے کہ وہ ابتداء میں سیستان کے بادشاہ تھے، لیکن بعد ازاں انہوں نے تاج وتخت اپنے بھائی کے حوالے کر کے درویشی اختیار کر لی۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کے بعد انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں برصغیر پاک و ہند جانے کی ہدایت فرمائی یہاں ان کی ترچنا پلی کے بزرگ نثار شاہ سے ملاقات ہوئی اور وہ نثار شاہ کے مرید ہو گئے نثار شاہ نے انہیں دو سو درویشوں کے ساتھ دعوت و تبلیغ اسلام کے لیے باہر روانہ کیا۔ اور ان لوگوں نے آخر کار پینو کنڈا میں ایک ہندو مندر کے پاس سکونت اختیار کر لی۔ وہاں کا راجا ان لوگوں کی موجودگی کو پسند نہیں کرتا تھا، لیکن اس نے جبر سے کام لینے کے بجائے مختلف طریقوں سے اس بات کی آزمائش کی کہ مسلمان ولی اور اس کے اپنے پروہت میں کون سا شخص اپنے تقدس اور روحانی طاقت کی بنا پر اس مندر کی ملکیت کا زیادہ اہل ہے۔ اس نے آخری آزمائش یہ کی کہ دونوں کو بوریوں میں بند کر دیا اور ان میں چونا بھر کر حوض میں پھینک دیا۔ ہندو پروہت تو ایسا غرق ہوا کہ پھر کبھی ابھر نہ سکا لیکن بابا فخر الدین نے دین کی برتری کا یوں ثبوت دیا کہ معجزانہ طور پر شہر سے باہر ایک پہاڑی پر جا نکلا۔ یہ کرامت دیکھ کر راجا مسلمان ہو گیا اور قرب و جوار کے بہت سے باسیوں نے بھی اس کی پیروی کی اور مندر مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ (قادر حسن خان: ص ۳۹-۴۰، ضلع مدراس گزٹیئر، اننت پور جلد اص ۱۹۳)

دکن میں دعوتِ اسلام:

دکن میں اسلام کا نام لینے والے جو افراد آپ کو ملیں گے وہ بھی مسلمان داعیین اور مبلغوں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر قدیم زمانے سے عرب تاجروں کی آمد ورفت رہی ہے۔ چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں عرب لوگ کونکن کے بہت سے شہروں میں بکثرت آباد تھے اور وہاں کی عورتوں سے شادیاں کر کے اپنے دین و آئین کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے۔ بہمنی خاندان (۱۳۴۷ء تا ۱۴۹۰ء) اور بیجاپور کے حکمرانوں (۱۴۸۹ء تا ۱۶۸۶ء) کے عہد میں عربوں میں دکن میں آباد ہونے کی تازہ تحریک ہوئی۔ چنانچہ تاجروں اور سیاحوں کے ساتھ مسلمان مبلغ بھی دکن میں وارد ہوئے تا کہ اس ملک میں اسلام کی دعوت دیں اور جو لوگ منکر ہیں ان کو اپنے وعظ و نصیحت اور اپنی ذاتی مثال اور اعلیٰ اخلاق سے مسلمان کریں۔ جہاں تک جبر و اکراہ کا تعلق ہے اس کا دکن کی اسلامی ریاستوں میں کہیں ذکر نہیں ملتا کیونکہ مذہبی رواداری ان کے اصول حکومت کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔

ان عرب مبلغین میں سے ایک مبلغ کا نام پیر مہابیر کھمدایت تھا۔ وہ ۱۳۰۴ء میں دکن میں اسلام کی نشر واشاعت کے لیے آیا۔ بیجاپور کے مسلمان کاشت کاروں میں اب تک جین مت کے ان لوگوں کی اولاد موجود ہے جن کو اس نے مسلمان کیا تھا۔ اسی صدی کے خاتمے کے قریب گلبرگہ کے ایک مشہور بزرگ سید محمد گیسو دراز (بعض اوقات آپ کو سید مخدوم گیسو دراز کہا گیا ہے) نے ضلع پونا کے بعض ہندوؤں کو مسلمان کیا اور بیس (۲۰) برس کے بعد بلگام میں بھی ان کی دعوتی کوششوں کو ویسی ہی کامیابی نصیب ہوئی۔ دبانو میں شیخ بابا کی اولاد اب تک موجود ہے۔ یہ بزرگ اسلام کے ایک بہت بڑے ولی یعنی سید عبدالقادر جیلانیؒ کے قرابت دار تھے۔ وہ مغربی ہند میں قریباً پندرھویں صدی عیسوی میں وارد ہوئے اور کونکن میں بہت سے لوگوں کو مسلمان کرنے کے بعد فوت ہو گئے اور دبانو میں مدفون ہوئے۔ دھاردار کے ضلع میں بہت سے باشندے آباد ہیں جن کے بابا دادا کو ہاشم

Marfat.com

پیر گجراتی نے مسلمان کیا تھا۔ ہاشم پیر بیجاپور کے بادشاہ ثانی کے مرشد تھے جو سولھویں صدی کے اخیر میں گزرا ہے۔ یہ مسلمان بافندے (جولاہے) اب تک اپنے پیر کا بہت احترام کرتے ہیں اور ان کی اولاد کے ساتھ بہت ادب واحترام سے پیش آتے ہیں۔

ایک اور بزرگ شاہ محمد صادق سرمست حسینی کی اولاد اب تک ناسک میں پائی جاتی ہے۔ ان کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمان مبلغوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہے۔ وہ ۱۵۶۸ء میں مدینہ منورہ سے تشریف لائے اور مغربی ہندوستان کے اکثر مقامات کا سفر کر کے آخر کار ناسک میں مقیم ہو گئے۔ اسی ضلع میں ان سے قریباً پچاس سال پہلے ایک اور کامیاب مبلغ خواجہ خوند میر حسینی اسلام کی تبلیغ شروع کر چکے تھے۔ اسی سلسلہ میں دو اور عرب مبلغ یعنی سید محمد بن سید علی اور سید عمر عیدروس باشیبان قابل ذکر ہیں جو ضلع بلگام میں اسلام کی نشر واشاعت میں مصروف رہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی علاقہ میں خواہ کیسا ہی سیاسی انحطاط ہو پھر بھی اسلام دعوتی میدان میں فتوحات حاصل کرتا رہا۔ چنانچہ بلاذری نے عسیفان کے راجا کے قبول اسلام کے بارہ میں لکھا ہے۔ عسیفان کا ملک بلاذری کے مطابق کشمیر، ملتان اور کابل کے درمیان واقع تھا۔ اتفاقاً راجا کا بیٹا بیمار ہو گیا اور اس نے مندر کے پجاریوں اور پروہتوں سے درخواست کی کہ وہ اپنے دیوتا کے حضور میں اس کے بیٹے کی شفایابی کے لیے دعا کریں۔ وہ پروہت کچھ عرصے کے لیے چلے گئے اور پھر واپس آ کر انہوں نے راجا سے کہا کہ ہم نے اپنے دیوتا سے دعا کی ہے اور اس نے ہماری دعا کو قبول کر لیا ہے، لیکن کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ راجا کا بیٹا مر گیا۔ اس پر راجا نے مندر پر حملہ کر کے اس کو تباہ کر دیا۔ بت کو توڑ دیا اور پروہتوں کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد اس نے مسلمان تاجروں کی ایک جماعت کو بلایا اور انہوں نے اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی توحید پیش کی۔ راجا توحید و رسالت پر ایمان لا کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ اس کے ساتھ اس کی رعایا بھی مسلمان ہو گئی۔ (فتوح البلدان بلاذری ص ۴۴۶)

Marfat.com

مسلمان تاجر اور دعوتِ اسلام:

جس طرح اولیائے کرامؒ اور مبلغین نے اسلام کی دعوت کو عام کیا اور اسلام کی نشر و اشاعت میں حصہ لیا اسی طرح تاجر حضرات نے بھی اپنی تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغی کوششوں کو جاری و ساری رکھا۔ وہ اپنے مال کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت کو بھی پاک و ہند کے مختلف شہروں میں لے جاتے تھے۔ دسویں اور بارہویں صدی عیسوی کے عربی جغرافیہ نگاروں (اصطخری اور ابن حوقل وغیرہ) نے ساحل ہند اور اندرون ملک کے بہت سے ایسے شہروں کے نام لکھے ہیں جہاں مسلمانوں نے اپنی مسجدیں بنا رکھی تھیں اور وہ مقامی راجاؤں کی حفاظت اور سرپرستی میں رہتے تھے بلکہ ان راجاؤں نے ان کو اپنی شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی باہمی اجازت دے رکھی تھی۔ اس زمانہ میں سندھ، ہند اور دنیا کے باقی ملکوں کی باہمی تجارت کا سلسلہ عرب تاجروں ہی کے دم سے قائم تھا۔ وہ چین اور لنکا کی پیداوار سندھ کی بندگاہوں میں لاتے تھے اور وہاں سے براستہ ملتان، ترکستان اور خراسان میں لے جاتے تھے۔ (مسعودی جلد ا ص ۲۰۷)

یہ امر باعث تعجب ہوتا اگر یہ مسلمان تاجر جو بت پرستوں کے شہروں میں جا بجا پھیلے ہوئے تھے، تبلیغ اسلام میں ویسی ہی سرگرمی اور ہمت نہ دکھلاتے جو مسلمان تاجروں نے دوسرے ملکوں میں دکھلائی تھی۔ غالباً ایسے ہی تاجروں کی تلقین سے سمہ قوم کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا جو سندھ پر ۱۳۵۱ء سے لے کر ۱۵۲۱ء تک حکمران رہے۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ نندا کے عہد حکومت کے بارہ میں خاص طور پر کہا گیا ہے کہ اس کا زمانہ ایسے امن و امان کا تھا کہ اسے نہ تو کبھی سوار ہو کر میدان جنگ میں جانا پڑا اور نہ ہی کوئی دشمن اس کے خلاف کبھی صف آرا ہوا۔ اس کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا عہد حکومت عدل و انصاف اور اسلام کے فروغ کے اعتبار سے بھی ممتاز تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہ فروغ صرف پرامن تبلیغی وسائل ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس عہد کے مبلغین اور داعیوں میں سب سے زیادہ مشہور سید یوسف الدینؒ تھے جو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

Marfat.com

کی اولاد میں سے تھے۔ ان کو خواب میں حکم ہوا کہ بغداد چھوڑ کر ہندوستان جائیں اور وہاں کے لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام بنائیں۔ چنانچہ وہ ۱۴۲۲ء میں سندھ آئے اور وہاں دس برس تک تبلیغ اسلام کرتے رہے حتیٰ کہ لوہانہ قوم کے ساتھ سو گھرانوں کو مسلمان کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اول اس قوم کے دو آدمی سندر جی اور ہنس راج سید صاحب کی کرامات دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ قبول اسلام کے بعد ان کا نام آدم جی اور تاج محمد رکھا گیا۔ آدم جی کا پوتا لوہانہ کا سردار تھا۔ اس کی سرکردگی میں یہ لوگ سندھ سے اٹھ کر کچھ میں آباد ہو گئے اور کچھ کے لوہانوں کے اسلام لانے سے بھی ان کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

بنگال میں دعوتِ اسلام:

برصغیر پاک و ہند میں مسلمان مبلغوں اور داعیوں نے سب سے زیادہ کامیابی بنگال میں حاصل کی۔ یہاں نومسلموں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ محمد بختیار خلجی نے سب سے پہلے یہاں بارھویں صدی عیسوی کے اختتام پر ایک اسلامی مملکت قائم کی۔ بہار اور بنگال کو فتح کر کے گور کو بنگال کا دارالحکومت مقرر کیا۔ یہاں مدت دراز تک اسلامی حکومت قائم رہی۔ اور اس سے قدرتی طور پر اسلام کی اشاعت میں بہت مدد ملی۔ اگرچہ ہندو راج دس سال کے بعد راجا کانس کے عہد میں دوبارہ بحال ہو گیا تھا جو اپنی رواداری کی وجہ سے اپنی مسلمان رعایا میں بھی ہر دل عزیز تھا، لیکن اس کے بیٹے جٹ مل نے ہندومت ترک کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اس کا باپ مر گیا تو اس نے ۱۴۱۴ء میں اپنی سلطنت کے تمام امراء کو بلایا اور ان کو بتایا کہ وہ اسلام اختیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ اگر وہ اس کی تخت نشینی پر رضا مند نہ ہوں تو وہ اپنے بھائی کے حق میں دست بردار ہو جائے گا۔ یہ سن کر سرداروں نے کہا کہ راجہ خواہ کوئی مذہب اختیار کرے ہم اسے بدستور اپنا بادشاہ تسلیم کریں گے۔ چنانچہ راجہ نے چند علمائے اسلام کو طلب کیا تا کہ وہ جب ہندومت ترک کر کے اسلام قبول کرے تو وہ اس واقعہ کی شہادت دینے کے لیے موجود ہوں۔ راجہ نے اپنا نام جلال الدین محمد شاہ رکھا

Marfat.com

اور روایت ہے کہ اس کے عہد میں اور بھی بہت سے ہندو مسلمان ہوئے تھے۔ مشرقی بنگال میں اسلامی حکومت ساڑھے پانچ سو سال تک قائم رہی لیکن اس طویل عرصے میں جلال الدین کا زمانہ رعایا کے لیے ایک سنہری زمانہ تھا اور اسلام کی تعلیمات کو بھی اس زمانہ میں بہت فروغ حاصل ہوا اور غیر مسلموں کی ایک کثیر تعداد اس دور میں حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔

مرشد قلی خان ایک نو مسلم برہمن کا بیٹا تھا جس کو شہنشاہ اورنگ زیب نے اٹھارویں صدی کے آغاز میں بنگال کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس کے زمانے میں یہ عام دستور تھا کہ جب کوئی ہندو اپنے دھرم کی ریت رسم توڑنے سے اپنی ذات پات کھو بیٹھتا تو یہ اسلامی حکومت کے واسطے اپنی ذات کو دوبارہ حاصل کر سکتا تھا، لیکن اگر حاکم اس معاملہ میں دخل دینے سے انکار کر دیتا تو اس شخص کے لیے ہندو برادری میں دوبارہ جگہ پانے کی کوئی صورت باقی نہ رہتی اور اسے مسلمان ہونے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا۔

بنگال کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے سر ولیم ہنٹر لکھتا ہے کہ ''ان مفلس لوگوں کے لیے جن میں ماہی گیر، شکاری، سمندری ڈاکو اور نیچ ذات کے کاشت کار شامل تھے، اسلام ایک نعمت عظمیٰ تھی جو ان پر عرش بریں سے اتری۔ اسلام حکمران قوم کا مذہب تھا اور اس کے پرجوش مبلغ اور داعی خدا کی توحید اور انسانی مساوات کا مژدہ لے کر ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جس کو سب لوگ حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے اور جس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ قبول اسلام کی ابتدائی رسم سے ان کے لیے ارتداد ناممکن ہو جاتا، اور نو مسلم اور ان کی اولاد ہمیشہ کے لیے مومن صادق بن جاتے تھے۔ اس طرح اسلام ہندوستان کے سب سے زیادہ شاداب اور سرسبز صوبے میں مضبوطی سے قائم ہو گیا جو ایک انتہائی گنجان اور روز افزوں آبادی کی پرورش کے قابل تھا۔ جنوبی بنگال میں اسلام کو جو مستقل اور پائدار کامیابی حاصل ہوئی اس کا سبب جبر و اکراہ نہیں ہے۔ اسلام میں لوگوں کے لیے کشش تھی اور اس کو بیشتر ماننے والے غریب اور نادار طبقے سے ملے۔ اسلام نے ان کو خدا کی ذات کا ایک اعلیٰ تصور دیا۔ انسانی اخوت اور مساوات کے ایک اشرف تخیل

سے آشنا کیا۔ بنگال میں نیچ ذاتوں کے لاکھوں آدمی صدیوں سے ہندو سماج کے رحم و کرم پر ذلت و خواری کے دن کاٹ رہے تھے بلکہ اس سے قریباً خارج تھے لیکن اسلام نے ان کے لیے ایک نئے معاشرے اور سماج میں داخل ہونے کا راستہ کھول دیا۔

خاص خاص حضرات کے مذہبی جوش اور ولولے کے بارہ میں بنگال کے عوام میں جو قصے مشہور ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک میں اسلام کی اشاعت کے لیے خاص کوششیں کی گئی تھیں۔ ان داعیوں میں سے بعض کے مزاروں کا لوگ آج تک احترام کرتے ہیں اور ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں ان پر حاضری دیتے ہیں۔ ان قدیم مبلغوں اور داعیوں میں شیخ جلال الدین تبریزیؒ شامل ہیں جن کا ۱۲۴۴ء میں انتقال ہوا تھا۔ وہ ولی بزرگ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید تھے۔ اپنے تبلیغی سفر کے دوران میں وہ بنگال پہنچے جہاں ان کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کی گئی اور اس کے ساتھ ایک بڑی جائداد بھی وقف کر دی گئی، لیکن ان کے مدفن کا صحیح مقام معلوم نہیں۔ لوگ ان کی بہت سی کرامات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک کرامت یہ ہے کہ انہوں نے ایک ہندو گھرانے کو ایک ہی نگاہ سے مسلمان کر دیا تھا۔

اسی طرح ایک اور بزرگ قابل ذکر ہیں۔ ان کا نام بھی شیخ جلال الدین تھا۔ وہ وطن کے لحاظ سے ایرانی تھے۔ وہ چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے اور انہوں نے جنوبی آسام میں سلہٹ کے مقام پر سکونت اختیار کی تاکہ وہاں کے لوگوں کو مسلمان کریں۔ ان کے زہد و تقدس کا بڑا شہرہ ہوا اور ان کو اپنی تبلیغ اور دعوت میں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ انیسویں صدی میں بنگال میں دین اسلام میں ایک نئی زندگی آئی اور وہاں وہابی اصلاحی تحریک کے اثر سے کئی فرقے ظہور میں آئے۔ ان فرقوں نے اپنے مبلغ تمام صوبوں میں بھیجے تاکہ ہندوانہ توہمات کو دور کریں، مذہبی ولولے اور جذبے کو بیدار کریں اور غیر مسلموں میں اسلام کو پھیلائیں۔

Marfat.com

اولیائے کرامؒ اور دعوتِ اسلام

سندھ اور ملتان کے بعد ہدایت کا سرچشمہ سب سے پہلے پنجاب کے شہر لاہور میں پھوٹا۔ اس کی وجہ سے لاہور کو جلد ہی ان علاقوں پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ چنانچہ لاہور میں کئی بزرگوں نے آ کر اپنا ڈیرہ جمایا جس کی وجہ سے لاہور دینی ہدایت کا مرکز بن گیا۔

شیخ اسماعیل لاہوریؒ:

لاہور میں سب سے پہلے جو بزرگ وارد ہوئے اور انہوں نے اسلام کی دعوت کو پھیلانا شروع کیا وہ شیخ اسماعیلؒ تھے۔ یہ اس زمانہ میں لاہور میں داخل ہوئے جب یہاں ایک ہندو راجا حکمران تھا جو سلطان محمود غزنوی کو خراج دیتا تھا۔ یہ بزرگ بخارا کے سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور دینی اور باطنی علوم میں اعلیٰ دست گاہ رکھتے تھے۔ ان کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے مبلغ اسلام تھے جو ۳۹۵ھ (مطابق ۱۰۰۵ء) لاہور میں وارد ہوئے اور یہاں اسلام کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ ان کی مجلس میں لوگوں کا ایک ہجوم ہوتا تھا اور ہر روز سینکڑوں لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جو شخص ایک مرتبہ ان کے وعظ میں آ جاتا تھا وہ اسلام قبول کیے بغیر واپس نہ جاتا تھا۔ ان کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ ان کا شمار محدثین اور مفسرین میں سے ہوتا تھا اور لاہور میں علم تفسیر اور علم حدیث کو لانے والے یہ سب سے پہلے شخص تھے۔ خزینۃ الاصفیاء میں مرقوم ہے کہ جب شیخ اسماعیل لاہور میں وارد ہوئے تو جمعہ کے روز ایک ہزار افراد حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔

Marfat.com

شیخ علی ہجویری عرف داتا گنج بخش لاہوریؒ:

جن بزرگوں نے اسلامی دور کی ابتداء میں پنجاب میں اسلام کی اشاعت کی ان میں ایک ابوالحسن علی بن عثمان ہجویریؒ خاص طور پر مشہور ہیں جو عام طور پر داتا گنج بخش کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، آپ ۱۰۰۹ء کے قریب غزنی میں پیدا ہوئے اور مختلف اسلامی ممالک کے سفر کے بعد مسلمان بادشاہ مسعود ابن محمود غزنوی کے عہد حکومت کے آخر میں دو ساتھیوں کے ہمراہ لاہور تشریف لائے۔ آپ نے مختلف ملکوں کی سیاحت کے دوران وہاں کے علماء و مشائخ سے فیض حاصل کیا اور پھر لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہاں آپ نے ایک مسجد تعمیر کروائی اور ہر وقت درس و تدریس اور وعظ و نصیحت اور دعوت دین میں مصروف رہتے تھے۔ پھر کچھ عرصہ تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، اگرچہ پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی لیکن ہندوؤں کے دل اسلام دشمنی سے لبریز تھے اور وہ مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے تھے، اس لیے ان کو اسلام کی دعوت دینا ایک بڑا کٹھن اور مشکل کام تھا۔ لیکن آپ کی دعوتِ دین سے بے شمار لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے جن میں رائے راجو جو سلطان مودود بن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا نائب تھا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مسلمان کرنے کے بعد آپ نے اس کا عرف ''شیخ ہندی'' رکھا اور اس کی نسل سے لوگ ان کے مزار کے مجاور چلے آ رہے ہیں۔

جب حضرت سید علی ہجویریؒ لاہور تشریف لائے اس زمانے میں تصوف میں مختلف قسم کی بدعات اور غیر اسلامی چیزوں کا جھاڑ جھنکار تھا۔ منصور حلاج، ذوالنون مصری، اور بایزید بسطامی وغیرہ نے بعض غیر اسلامی چیزوں کو یا ان کے نام سے دوسرے لوگوں نے غیر اسلامی چیزوں کو تصوف میں گھسیڑ دیا ہوا تھا۔ حضرت علی ہجویریؒ نے ان تمام باتوں کو تصوف سے نکالا اور اس کو ہر قسم کے جھاڑ جھنکار سے صاف کیا۔ چنانچہ اپنی کتاب کشف المحجوب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

Marfat.com

"میں نہیں جانتا کہ فارسی (منصور حلاج) اور ابو سلمان کون ہیں اور انہوں نے کیا کیا اور کیا کہا۔ جو شخص تحقیق اور توحید کے خلاف چلتا ہے اس کو دین میں کچھ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اور جب دین جو اصل ہے مضبوط نہ ہو تو تصوف جو اس کی شاخ ہے، کس طرح مفید ہو سکتی ہے۔"

آپ نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں جن میں کشف المحجوب، کشف الاسرار اور منہاج الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ کی کتابوں میں متاخرین صوفیہ کا لغو اور غلط خیالات کا طومار بالکل نہیں ہے۔ کشف المحجوب کا انگریزی ترجمہ پروفیسر نکلسن نے کیا ہے اس سے بھی اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اہل تصوف کے ہاں اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ دارا شکوہ کا بیان ہے کہ

"کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچ کس را براں سخن نیست و مرشدے است کامل۔ در کتب تصوف بہ خوبی آں در زبان فارسی تصنیف نہ شدہ"

(سفینۃ الاولیاء ص ۱۶۴)

کشف المحجوب ایک مشہور و معروف کتاب ہے اور کسی شخص کو اس پر بات کرنے کا یارا نہیں اور یہ کتاب ایک مرشد کامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور تصوف کی کتابوں میں فارسی زبان میں ان خوبیوں کی اور کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی ہے۔

اپنی ان خوبیوں کی وجہ سے یہ کتاب مذہبی حلقوں میں ہمیشہ سے مقبول و متداول رہی ہے۔ عام روایت کے مطابق آپ نے ۴۶۵ھ میں لاہور میں وفات پائی، لیکن بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا حقیقی سن وفات اس سے متاخر ہے۔ آپ لاہور میں مدفون ہوئے جہاں آپ کی مرقد پر ہمیشہ زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔ اور ۲۰ صفر کو ان کا عرس بڑے اہتمام سے منعقد ہوتا ہے۔

امام حسن صنعانی لاہوریؒ:

ابو الفضائل حسن صنعانی لاہوریؒ کا مقام محدثین میں اتنا ہی بڑا ہے جتنا سید

Marfat.com

علی ہجویریؒ کا صوفیائے کرام میں۔ آپ لاہور میں ۵۷۷ھ میں پیدا ہوئے اور یہیں آپ نے نشو ونما پائی۔ آپ کے والد ماوراء النہر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تھے۔ مختلف اساتذہ سے علوم ظاہری اور باطنی کی تحصیل کی اور حدیث آپ کا خصوصی شغل تھا۔ مولانا سید عبدالحی ندویؒ نے لکھا ہے کہ ''سلطان قطب الدین ایبک نے ان کو لاہور کی قضاۃ پیش کی لیکن انہوں نے اس کو قبول نہ کیا اور مزید علوم کے حصول کے لیے بیرون وطن چلے گئے۔ پہلے غزنی آئے پھر عراق گئے جہاں مختلف علوم وفنون کی تکمیل کی اور حدیث اور لغت عرب کے امام قرار پائے۔ بغداد میں آپ نے خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے لیے مشارق الانوار کے نام سے حدیث کی ایک کتاب مرتب کی جس کے صلہ میں آپ کو خلعت فاخرہ عطا ہوئی۔ پھر آپ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ جب واپس بغداد آئے تو عباسی خلیفہ نے آپ کو سلطان شمس الدین ایلتمش کے نام ایک اہم خط دے کر بھیجا جس میں سلطان کی حکومت اور خود مختاری کو تسلیم کیا گیا تھا۔ آپ ایک عرصہ ہندوستان میں رہے پھر حج کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ وہاں سے بغداد آ کر درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔ پھر خلیفہ بغداد کی طرف سے سفیر بن کر ہندوستان آئے اور کچھ عرصہ قیام کے بعد واپس بغداد چلے گئے اور وہیں ۶۵۰ھ میں وفات پائی۔

آپ نے حدیث، لغت اور فقہ میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں بعض نہایت ضخیم ہیں۔ چنانچہ فن لغت میں ایک کتاب بیس (۲۰) جلدوں میں لکھی اور دوسری بارہ جلدوں میں۔ حدیث میں آپ کی کتاب مشارق الانوار نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ یہ کافی عرصہ تک ہندوستان میں پڑھائی جاتی رہی اور بڑے بڑے لوگوں نے اس کتاب کو پڑھا۔ اور ممتاز علماء نے اس کی شروح اور حواشی لکھے۔

ان بزرگوں کے علاوہ اور بھی کئی علماء اور مشائخ کے نام ملتے ہیں جنہوں نے لاہور میں ظاہری اور باطنی علوم کا پرچار کیا اور اسلام کی نشرواشاعت میں اہم رول ادا کیا۔ ان میں ایک شیخ فخرالدین زنجانیؒ تھے۔ آپ ترکستان سے لاہور تشریف لائے۔ اس

Marfat.com

زمانے میں لاہور کا حاکم طغرل تھا وہ آپ کا بہت بڑا معتقد تھا۔ آپ کے بہت مرید تھے۔ اور اسلام کی اشاعت میں ان کا ایک خاص حصہ ہے۔ آپ کی وفات ۶۰۲ھ میں ہوئی۔ ایک اور بزرگ سید احمد توختہ ترمذی تھے۔ آپ کا وطن ترمذ تھا لیکن وہاں سے ترک وطن کر کے لاہور محلہ چہل بیبیاں میں اقامت اختیار کی۔ آپ نے بھی ہزار ہا لوگوں کو اسلام سے روشناس کرا کر حلقہ اسلام میں داخل کیا۔ اسی سلسلہ میں ایک اور بزرگ شیخ عزیز الدین مکی لاہوریؒ تھے جن کو "پیر مکی" کہتے ہیں۔ یہ ۵۷۴ھ میں لاہور تشریف لائے۔ اس زمانہ میں لاہور میں غزنویوں کی حکومت تھی، لیکن سلطان محمد غوری پنجاب میں آ گیا تھا اور لاہور کا محاصرہ کر رہا تھا۔ لاہور کے غزنوی حاکم خسرو ملک نے آپ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا ابھی چند سال تمہیں امان ہے۔ اس کے بعد لاہور میں غوریوں کی حکومت ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ سلطان شہاب الدین غوری لاہور کا محاصرہ ترک کر کے سیالکوٹ کی طرف متوجہ ہوا اور چھ سال کے بعد پھر لاہور آ کر اس کو فتح کیا۔

شیخ عزیز الدین مکیؒ ۳۶ سال لوگوں کو اسلام کے چشمہ صافی سے فیض یاب کرتے رہے اور ایک خلقت عظیم اسلام کی تعلیمات سے روشناس ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئی۔ آپ نے لاہور میں ۶۱۲ھ میں انتقال فرمایا اور آج آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی حضرات یہاں باہر سے تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ اور اہل لاہور کو اپنے فیوض و برکات سے سیراب کرتے رہے۔

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ:

سطور بالا میں جن بزرگوں کا ذکر کیا گیا ان کے علوم سے صرف لاہور کے لوگ مستفید اور فیض یاب ہوئے، لیکن اولیائے کرامؒ میں سے کچھ حضرات ایسے تھے جن کے علوم ظاہری اور باطنی سے پورا ہندوستان فیض یاب ہوا، ان میں سے ایک سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ بھی ہیں۔ حضرت سید علی ہجویری عرف

Marfat.com

داتا گنج بخش لاہوریؒ اگر برصغیر پاک و ہند کے اولیاء کبار میں سے ہیں، اور ان سے اور ان کی کتابوں سے لاکھوں نفوس مستفید ہوئے اور آج بھی ان کی تصانیف اہل علم کے لیے چشمۂ صافی کی حیثیت رکھتی ہیں جن سے ہر زمانہ کے لوگ سیراب ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، لیکن ہندوستان کے اولیاء کرامؒ میں جو مرتبہ حضرت خواجہ اجمیریؒ کو حاصل ہوا وہ اور کسی کو کم ہی حاصل ہوا ہے۔ اور جس علم وعمل کی انہوں نے تخم ریزی کی وہ اس طرح بارآور ہوا کہ برصغیر پاک و ہند بلکہ بیرون ہند بھی اس کی شاخیں پھیل گئیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سلسلۂ صابریہ چشتیہ میں بڑے بڑے نامور عالم و عارف گزرے ہیں اور علمائے دیوبند نے اسی سلسلے کو چار دانگ عالم میں شہرت دی اور ان کے قریباً سارے اکابر شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، قطب الارشاد مولانا رشد احمد گنگوہیؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ وغیرہم اسی خانقاہ چشتیہ کی شاخیں اور کڑیاں ہیں۔

ان اولیائے کرامؒ نے اس زمانے میں ہندوستان کی سرزمین کو اپنی جائے قیام بنایا اور مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے یہ حضرات سرزمین پاک و ہند میں تشریف لائے تاکہ اپنے فیوض و برکات سے یہاں کے لوگوں کو مستنیر کریں۔ وجہ ان حضرات کے آنے کی یہ تھی کہ تمام اسلامی دنیا تاتاریوں کے حملے کی وجہ سے درہم برہم ہو چکی تھی۔ لوگ پریشان حال تھے۔ ہر شخص کسی ملجاء و مامن کی تلاش میں تھا، لہٰذا تمام اسلامی دنیا کے علماء و مشائخ اپنی جان بچا کر جوق در جوق سرزمین پاک و ہند میں پناہ گزین ہوئے۔ چنانچہ اگر تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں قریباً تمام مشائخ اور علماء ان علاقوں سے سرزمین پاک و ہند میں وارد ہوئے جہاں تاتاریوں نے ان کا جینا دوبھر کر دیا ہوا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر

تاتاریوں اور منگولوں کے حملوں سے باہر کے اسلامی ممالک کو بے انتہا نقصان ہوا تو برصغیر پاک و ہند کو اتنا ہی فائدہ ہوا کہ یہ بزرگ اور کبار علماء و اولیائے کرام ان علاقوں کو خیر باد کہہ کر ہندوستان تشریف لے آئے اور یہاں مختلف علاقوں میں مستقل رہائش اختیار فرمائی۔ سرزمین پاک و ہند میں ان حضرات کی آمد سے ایک نئی مذہبی اور روحانی زندگی کا آغاز ہوا اور ان کی مساعی جلیلہ سے نہ صرف تاتاری حلقہ بگوش اسلام ہوئے بلکہ ہندوستان کے ہندو اور دوسرے غیر مسلم بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ سرزمین پاک و ہند میں اسلام زیادہ تر صوفیائے عظام اور اولیائے کرام نے پھیلایا۔ لیکن ان کا مقصد زندگی صرف غیر مسلموں کو مسلمان کرنا نہیں تھا، بلکہ ان کے دروازے ہر مسلم اور غیر مسلم، امیر اور غریب، چھوٹے اور بڑے سب کے لیے کھلے تھے۔ وہ جہاں غیر مسلموں کو مسلمان بناتے وہاں مسلمانوں کو صحیح معنوں میں اسلام کا پابند بھی کرتے۔ بلکہ ان کے ہاں ایک غیر مسلم کے قبول اسلام سے جتنی خوشی اور مسرت ہوتی اس سے کہیں زیادہ خوشی انہیں ایک مسلمان کے ترک گناہ سے ہوتی۔ چنانچہ ان حضرات کے اسی نقطۂ نظر کو شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے ذکر کے سلسلہ میں ان کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ

"لوگوں کی رشد و ہدایت میں کفر سے ایمان کی طرف، گناہ سے عبادت کی طرف اور نفسانیت سے روحانیت کی طرف ان کا بڑا مرتبہ تھا۔"

(اخبار الاخیار ص ۲۷)

ہر شیخ کا اس بارہ میں یہی نظریہ تھا جو حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا تھا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہو جائے تو غیر مسلم خود بخود اسلام کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ اور اہل کفر ایک مسلمان کی پاکیزہ اور بے عیب زندگی دیکھ کر خود ہی اسلام کی طرف راغب ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفیائے کرامؒ کا نقطۂ نظر اسلام کی اشاعت نہیں بلکہ حقیقی اسلام کی توسیع ہے جس کی

Marfat.com

ضرورت صرف غیر مسلموں کو نہیں بلکہ مسلمانوں کو بھی ہے۔ چنانچہ مختلف صوفیاء نے اپنے اس نظریہ کو اپنی کتابوں میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء قدس سرہ کے بارہ میں ہے کہ انہوں نے ایک دو دفعہ ہندوؤں کے مسلمان نہ ہونے پر افسوس کا اظہار فرمایا تو اس سے زیادہ مرتبہ مسلمانوں کے حق مسلمانی کو پورا نہ کرنے اور ترک گناہ نہ کرنے پر رنج وغم کے آنسو بہائے۔ (فوائد الفواد ص ۱۸۴)

خزینۃ الاصفیاء میں شیخ ابو اسحاق ازروئی کے حالات زندگی میں لکھا ہے کہ

"نقل است کہ بست و چہار ہزار کس بردست شیخ مسلمان شدند و قریب صد ہزار اہل اسلام پیش شیخ تائب گشتہ درحلقۂ ارادت شیخ آمدہ اند"

بیان کیا جاتا ہے کہ چوبیس (۲۴) ہزار کافر آپ کے دست حق پرست پر مسلمان ہوئے اور قریباً ایک لاکھ مسلمان اپنے گناہوں سے تائب ہو کر شیخ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔

اگرچہ صوفیاء کرام کا مقصد وحید اشاعت اسلام نہ تھا لیکن اس مقصد میں ایک اہم وجہ یہ تھی کہ ہندو مذہب ایک مشنری مذہب نہیں۔ آریہ سماج کے آغاز سے قبل ان کی یہ خواہش نہ ہوتی تھی کہ وہ دوسروں میں یا غیر قوموں میں اپنے مذہب کی نشر واشاعت کریں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جو شخص ہندوازم کو قبول نہیں کرتا اس میں اس کا اپنا نقصان ہے مذہب کا اس میں کوئی نقصان نہیں۔ اس نقطۂ نظر نے اشاعت اسلام کو بہت زیادہ کامیابی عطاء کی، خصوصی طور پر ہندوؤں میں نیچ ذات کے لوگوں میں جن کو وہ شودر کہتے ہیں اور جو ان کے نزدیک بھگوان کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا اس سوسائٹی میں کوئی مقام نہ تھا۔ ہر شخص ان کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا۔ عام ہندوؤں کے مندروں میں وہ داخل نہیں ہو سکتے تھے ان کے کنوؤں سے وہ پانی نہیں بھر سکتے تھے بلکہ یہاں تک کہا جاتا تھا کہ اگر کوئی شودر وید مقدس کے منتر سن لے تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے۔ ان حالات میں ان لوگوں نے جب دین حق کی آواز سنی تو

Marfat.com

فوراً لبیک کہہ کر اس میں داخل ہو گئے اور صوفیائے کرام نے فوراً انہیں اپنے دامن شفقت کے نیچے جگہ دی۔ ان کے اس صلح کل طریقے کو لوگوں نے نظر استحسان سے دیکھا اور کسی گوشہ سے اس کی مخالفت نہ ہوئی بلکہ ہندوؤں نے بھی ان صوفیائے کرام کو احترام کی نگاہ سے دیکھا حالانکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندو ہر روز ہزاروں کی تعداد میں ترک مذہب کر کے حلقہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ جو ہر روز ہندوؤں کو دعوت اسلام دے کر حلقۂ اسلام میں لا رہے تھے لیکن ان کے بارہ میں ہندوؤں کا جو نقطۂ نظر تھا اس کے بارہ میں داراشکوہ لکھتا ہے:

"کثیری از کفار بہ برکت قدوم ایشاں مسلمان شدند و جماعۃ کہ مسلمان نہ شدہ بود، فتوح دینار بخدمت ایشاں می فرستادند و ہنوز کفارے کہ دراں نواحی اند بہ زیارت ایشاں می آیند و مبلغ ہا بہ مجاوران روضۂ منورہ میگزرانند۔"

(سفینۃ الاولیاء ص ۹۳)

کفار کی ایک بہت بڑے تعداد ان کے قدموں کی برکت سے مسلمان ہوگئی اور جو لوگ مسلمان نہ ہوئے وہ بھی بہت سے دینار اور مال ومتاع آپ کی خدمت میں بھیجتے۔ جو کافر وہاں (اجمیر کے) اردگرد اور نواح و اطراف میں رہتے ہیں وہ ان کے مرقد کی زیارت کے لیے آتے ہیں اور ان کے مرقد کے مجاوروں کو نذرانے کے طور پر بہت سا مال دیتے ہیں۔

یہ سب کچھ ان کی صلح پسند طرز عمل کا نتیجہ تھا کہ ہندو ان کا اس قدر احترام کرتے تھے۔ دوسری وجہ ہندوؤں کا ذات پات کا معاملہ تھا۔ برہمن اپنے کو اعلیٰ سمجھتے ہوئے شودروں اور دوسرے نیچ ذات کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرتے۔ دوسری طرف اسلام کی مساوات اور ان کی معاشرتی ہم آہنگی کو دیکھ کر قدرتی طور پر ان کا دل اسلام کی طرف کھنچتا اور وہ اپنے معاشرہ اور سماج سے بغاوت کر کے اسلام کے دامن میں پناہ لینے میں فخر محسوس کرتے۔

Marfat.com

یہ تھے وہ حالات جن میں یہ بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام دوسرے ملکوں سے سرزمین پاک و ہند میں وارد ہوئے اور اسلام کی اشاعت کے لیے وہ کام کیا جو سلاطین وملوک نہ کر سکے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں بتایا گیا ہے کہ چھٹی صدی ہجری اور بارہویں صدی عیسوی اسلامی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس صدی کے اوائل میں وحشی تاتاریوں نے عالم اسلام پر مورو ملخ کی طرح یورش کی، نامی گرامی شہروں کو جو کبھی علم و تہذیب کے علم بردار تھے، تاخت و تاراج کر دیا، شہروں کا امن وسکون، زندگی کا نظم و نسق اور شرفاء کی عزت و ناموس کو خاک میں ملا دیا۔ چھوٹے بڑے شہر اس فتنہ کی لپیٹ میں آئے اور بالآخر اسلامی خلافت کا مرکز بغداد بھی اس فتنۂ جہاں سوز کی لپیٹ میں آ گیا اور تہذیب و تمدن کا مدفن بن گیا۔ اس فتنہ نے جہاں اسلامی دنیا کی چولیں ہلا کر رکھ دیں وہاں پورے عالم اسلام پر سیاسی، علمی، فکری، تمدنی اضمحلال کے سیاہ بادل چھا گئے۔ اس پورے عالم اسلام میں صرف ہندوستان ایک ایسا ملک تھا جو اس فتنہ عالم آشوب اور جہاں سوز سے محفوظ رہ گیا۔ تاتاری بار بار برصغیر پاک و ہند پر حملہ کرتے رہے لیکن یہاں کے بادشاہوں کی ایمانی قوت اور جنگی طاقت نے ان کو اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ صرف علاؤ الدین خلجی کے عہد حکومت میں تاتاریوں نے پانچ بار ہندوستان پر حملہ کیا لیکن ہر بار تاتاریوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ چنانچہ تواریخ میں لکھا ہے کہ ”اس روز سے مغلوں کی ہندوستان کی ہوس سرد پڑ گئی اور ان کے حرص و آز کے دانت ہمیشہ کے لیے کھٹے ہو گئے۔“ (منتخب التواریخ ص ۱۸۶)

ہندوستان کی اس فوجی طاقت اور ایمانی قوت کو دیکھ کر عالم اسلام کے بہترین لوگ اس جدید دارالامن کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ اور لائق ترین لوگوں کا سیلاب ایران، ترکستان اور عراق وغیرہ سے اس طرف امنڈنا شروع ہوا۔ اس وجہ سے دہلی ایک بین الاقوامی شہر بن گیا جو بغداد و قرطبہ کا مقابلہ کرنے لگا۔ جب یہ شریف و نجیب

Marfat.com

خاندان، نامدار و قابل ترین اساتذۂ کرام اور صوفیائے عظام یہاں تشریف لائے تو یہ اس ملک کی زیب و زینت کا باعث بنے اور ان لوگوں کی فکری اور روحانی قوت نے یہاں کے لوگوں میں فکری اور روحانی انقلاب برپا کر دیا۔ اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ہندوستان کی فتح کا سہرا سلطان محمود غزنوی (۴۲۱ھ) کے سر، اور مستحکم و مستقل اسلامی حکومت کے قیام کی سعادت سلطان شہاب الدین محمد غوری (۶۰۲ھ) کے حصہ میں تھی اور اس کی روحانی تسخیر اور اخلاقی اور ایمانی فتح حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے لیے مقدر ہو چکی تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ سجستان میں پیدا ہوئے لیکن آپ کی تعلیم و تربیت خراسان میں ہوئی۔ سجستان میں پیدا ہونے کی وجہ سے سجزی کہا جانے لگا جن کو کاتبوں نے غلط فہمی سے سنجری بنا دیا۔ قدیم جغرافیہ نویس عام طور پر اس کو خراسان کا ایک حصہ مانتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں اس کا اکثر حصہ ایران میں ہے اور باقی افغانستان میں۔ پندرہ سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ باپ نے ایک باغ اور ایک پن چکی ورثہ میں چھوڑی تھی جس کی آمدنی سے آپ کی گزر اوقات ہوتی تھی۔ عنفوان شباب میں ایک مرد قلندر شیخ ابراہیم قندوزی نے خواجہ کی مہمان نوازی کے عوض ایک شی آپ کو کھانے کے لیے دی۔ اس کے کھاتے ہی آپ کے قلب میں انوار الٰہی اجاگر ہو گئے۔ چنانچہ جائداد منقولہ و غیر منقولہ فروخت کر کے سمرقند کا رخ کیا اور وہاں تحصیل علم کی اور قرآن حکیم حفظ کیا۔ اس کے بعد عراق کا رخ کیا۔ راستے میں قصبہ ''ہرون'' میں جو نیشاپور کے نواح میں ہے حضرت خواجہ عثمان ہرونی چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کمال مجاہدہ اور ریاضت شاقہ کے بعد ان سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ عراق اور دوسرے مقامات مقدسہ میں پھر پھرا کر ہندوستان تشریف لائے۔ بلاد اسلامیہ کی سیر و سیاحت کے دوران صدہا اولیاء اللہ سے ملاقات کی۔ اور سیر العارفین کے مصنف کے بیان کے مطابق آپ ستاون (۵۷) روز تک حضرت شیخ عبدالقادر

Marfat.com

جیلانی قدس سرہ کے ساتھ ایک حجرے میں مقیم رہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور سہروردی سلسلہ کے بانی شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب سہروردیؒ سے بھی آپ کا ربط رہا۔ حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ، خواجہ اوحد الدین کرمانیؒ وغیرہ سے بھی آپ کی ملاقاتوں کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے بلکہ شیخ اوحد الدین کرمانیؒ نے حضرت خواجہ صاحبؒ سے خرقہ خلافت بھی حاصل کیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اصفہان میں آپ کی ملاقات حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ہوئی جو ان دنوں کسی مرشد کامل کی تلاش میں وہاں پھر رہے تھے۔ وہیں حضرت بختیار کاکیؒ نے حضرت خواجہ صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت ارادت کی۔ پھر ان ایام میں جب حضرت خواجہ صاحبؒ نے اجمیر میں مستقل اقامت فرمائی تو خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے دہلی کو اپنا مسکن بنا کر اپنے فیضان باطنی کا سلسلہ جاری کیا۔

بغداد، ہرات، اصفہان، تبریز اور بلخ وغیرہ شہروں سے ہوتے ہوئے حضرت خواجہ اجمیریؒ غزنی کے راستہ ہندوستان میں وارد ہوئے۔ پہلے لاہور پہنچے اور مشہور ہے کہ یہاں آپ نے حضرت سید علی ہجویریؒ یعنی داتا گنج بخش کے مزار پر چلاکشی کی۔ لاہور سے آپ ملتان تشریف لے گئے اور یہاں طویل قیام کر کے ہندوستانی زبان میں مہارت تامہ حاصل کی۔ بعد ازیں آپ دہلی آئے اور تھوڑا عرصہ یہاں قیام کر کے اجمیر کا رخ کیا اور وہاں سکونت پذیر ہو گئے۔

قاضی منہاج الدین عثمان جوزجانی اور دوسرے قدیم مورخین کا بیان ہے کہ حضرت خواجہؒ سلطان شہاب الدین غوری کے اس لشکر کے ساتھ تھے جس نے راجا پرتھوی راج کو شکست دی اور ہندوستان کی فتح کی تکمیل کی۔ اس فتح میں ان کی دعاؤں، توجہات اور روحانیت کا بہت بڑا حصہ ہے۔

(طبقات ناصری ص ۴۰، منتخب التواریخ ص ۵۰، تاریخ فرشتہ ص ۵۷)

لیکن بعد کے مورخین کا بیان ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے سلطان شہاب الدین غوری کے حملوں کے ابتدائی سالوں میں اجمیر میں جو اس وقت

راجپوت حکومت اور طاقت کا ایک بہت بڑا مرکز تھا قیام اختیار کیا۔ ابھی شہاب الدین، غوری کے حملوں نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور اس کی ترکتازیاں شمال مغربی ہندوستان تک محدود تھیں، اس دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ پرتھوی راج (جس کو رائے پتھورا بھی کہتے تھے) کے پاس حضرت خواجہؒ کے ملنے والوں میں سے ایک شخص ملازم تھا، رائے پتھورا نے اس کو ایذا رسانی شروع کی۔ اس نے حضرت خواجہؒ سے اس کی شکایت کی۔ خواجہ صاحبؒ نے رائے پتھورا سے اس کی سفارش کی۔ پتھورا نہایت متکبرانہ اور توہین آمیز لہجے میں جواب دیا کہ یہ شخص باہر سے آیا ہوا ہے اور اتنی اونچی اونچی باتیں کرتا ہے، جب حضرت خواجہؒ کو اس کی یہ باتیں پہنچیں تو جوش میں آ کر ان کی زبان سے نکلا: ''ما پتھورا را زندہ گرفتیم (و بمحمد غوری را) دادیم'' یعنی ہم نے پتھورا کو زندہ گرفتار کیا اور محمد غوری کو دے دیا۔ ان دنوں محمد غوری کا لشکر دوسری مرتبہ غزنی سے ہندوستان پہنچا۔ رائے پتھورا نے اس کا مقابلہ کیا اور زندہ گرفتار ہوا۔ (سیر الاولیاء ص ۴۷)

اجمیر میں حضرت خواجہؒ کے قیام کے بارہ میں سیر العارفین نے لکھا ہے:

''بیشتر کفار نامدار ازاں دیار بہ برکت آثار آن زبدۃ الابرار بہ تشریف ایمان مشرف شدند، و بیشتر یکہ ایمان نیاوردند، نذر و فتوح بے حد و عد بحضرت ایشاں می فرستادند۔''

مختصر یہ کہ حضرت خواجہ اجمیریؒ نے اجمیر میں مستقل قیام فرمایا۔ صاحب سیر الاولیاء نے لکھا ہے کہ ''ہندوستان اپنے آخری مشرقی کنارے تک کفر و شرک کی بستی تھی۔ اہل تمرد ''انا ربکم الاعلیٰ'' کی صدا لگا رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں دوسری ہستیوں کو شریک کرتے تھے اور اینٹ، پتھر، درخت، جانور، گائے اور گوبر کو سجدہ کرتے تھے۔ کفر کی ظلمت سے ان کے دل شب دیجور کی طرح تاریک اور مقفل تھے۔ سب دین و شریعت کے احکام سے غافل، خدا و پیغمبر خدا سے ناآشنا و بے خبر، نہ کسی نے

Marfat.com

کبھی قبلہ کی سمت پہچانی، نہ کسی نے اللہ اکبر کی صدا سنی۔ آفتاب اہل یقین حضرت خواجہ معین الدینؒ کے مبارک قدموں کا اس ملک میں پہنچنا تھا کہ اس ملک کی ظلمت نور اسلام سے مبدل ہو گئی۔ ان کی کوشش و تاثیر سے جہاں شعائر شرک تھے وہاں مسجد و محراب اور منبر نظر آنے لگے۔ جو فضا شرک کی صداؤں سے معمور تھی وہ نعرہ اللہ اکبر سے گونجنے لگی۔ اس ملک میں جس کو دولت اسلامی ملی اور قیامت تک جو بھی اس دولت سے مشرف ہو گا نہ صرف وہ بلکہ اس کی اولاد در اولاد، نسل در نسل سب ان کے نامۂ اعمال میں ہوں گے اور اس میں قیامت تک جو بھی اضافہ ہوتا رہے گا، اور دائرہ اسلام وسیع ہوتا رہے گا، قیامت تک اس کا ثواب شیخ الاسلام معین الدین اجمیریؒ کی روح کو پہنچتا رہے گا۔ انشاء اللہ العزیز (سیر الاولیاء ص ۴۷)

اس طرح برصغیر پاک و ہند میں جو کچھ خدا کا نام لیا گیا اور خدا کا کام کیا گیا وہ سب چشتیوں اور ان کے مخلص و عالی ہمت بانی سلسلہ حضرت خواجہ اجمیریؒ کے حسنات اور کارناموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اور اس بارہ میں مولانا غلام علی آزادؒ نے بالکل درست اور صحیح کہا:

لاشک بزرگان چشت عنبر سرشت راحقی است قدیم بر ولایت ہند

(ماثر الکرام ص ۷)

اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ بزرگان سلسلہ چشتیہ کا ملک ہندوستان پر قدیم حق ہے۔

اور سیر الاقطاب کے مصنف کا یہ قول بھی صحیح ہے۔

"بہ ہندوستان بہ یمن قدوم میمنت لزومش طریقہ اسلام ظاہر گشت و سیاہی کفر و شرک از عرصۂ روزگار بر زدد۔" (سیر الاقطاب ص ۱۰۱)

ہندوستان میں ان کے دم قدم کی برکت سے اسلام کی نشر و اشاعت ہوئی اور کفر و ظلمت یہاں سے کافور ہوئی۔

Marfat.com

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں آ کر آپ کا قیام اکثر و بیشتر اجمیر میں رہا۔ دہلی جو ہندوستان کا دارالسلطنت تھا وہاں چشتی سلسلہ کا کام آپ کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ کو سونپ رکھا تھا جو نہایت خوش اسلوبی اور بڑی خوبی سے اس کام کو انجام دے رہے تھے۔ صرف ایک دفعہ آپ کے سفر دہلی کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کے پاس اجمیر کے اطراف و نواح میں ایک گاؤں بطور جاگیر حاصل تھا۔ مقامی حکام نے تقاضا کیا کہ اس جاگیر کے لیے باقاعدہ شاہی فرمان حاصل کیا جائے اور شیخ کے صاحبزادوں نے انہیں مجبور کیا کہ وہ دہلی جا کر بادشاہ سے فرمان لائیں (فرزندان شیخ رابرآں آوردند کہ درشہر برود و از بادشاہ مقرر داشت بیارد) چنانچہ شیخ کو اس وجہ سے اجمیر سے دہلی جانا پڑا۔ دہلی میں وہ شیخ قطب الدین بختیارؒ کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ شیخ قطب الدین نے آپ کو کہا کہ آپ کو بادشاہ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ فرمان میں لے آتا ہوں۔ چنانچہ شیخ قطب الدین سلطان شمس الدین ایلتمش کے ہاں تشریف لے گئے۔ بادشاہ انہیں دربار میں دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ اس سے قبل وہ سلطان کے پاس کبھی نہ گئے تھے۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے خود انہیں ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ سلطان نے اسی وقت جاگیر کا وہ فرمان جاری کر دیا اور اشرفیوں کے توڑوں کے ساتھ انہیں وہ فرمان دیا۔ شیخ قطب الدین وہ فرمان اور دوسری تمام چیزیں لے کر خواجہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیں۔ خواجہ معین الدینؒ نے جب شیخ قطب الدین کی شہرت اور ان کے بارہ میں لوگوں کا اعتقاد دیکھا تو انہیں نصیحت فرمائی کہ ''عزلت میں پوشیدہ رہنا بہتر ہے۔'' (سیر الاولیاء ص ۹۰)

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ بندگانِ خدا کی ایک کثیر تعداد نے آپ سے ایمان و احسان کی دولت پائی اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے۔ چنانچہ ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے:

Marfat.com

عزلت گزین باجمیر شد وفراواں چراغ برافروخت، واز دم کبرائی او گردہا مردم بہرہ برگرفتند۔ (آئین اکبری ص ۲۷)

اجمیر میں عزلت گزین ہوئے اور اسلام کا چراغ بڑی آب و تاب سے روشن کیا اوران کے انفاس قدسیہ سے جوق در جوق انسانوں نے ایمان کی دولت پائی۔

اجمیر میں قریباً نصف صدی ارشاد و تلقین اسلام کی اشاعت اور اہل قلوب کی تعلیم و تربیت میں مشغول رہ کر ۹۰ سال کی عمر میں ۶۲۷ھ میں اس وقت رحلت فرمائی جب ان کے ہاتھ کا لگایا ہوا پودا برصغیر پاک و ہند میں جڑ پکڑ چکا تھا اور دہلی میں ان کا جانشین خواجہ قطب الدین بختیار ؒ ارشاد و ہدایت میں مشغول و منہمک تھا۔ اور ان کا حلقہ بگوش اور عقیدت مند سلطان شمس الدین التمش اسلامی حکومت کی توسیع، اسلامی اقدار کے فروغ اور عدل گستری اور خلق پروری میں نام پیدا کر چکا تھا۔

ایک روایت یہ ہے کہ آپ کی وفات ۶۳۳ھ میں ہوئی اور آپ کو اسی حجرے میں دفن کر دیا گیا جس میں آپ عبادت کیا کرتے تھے۔ بعد ازاں مالوہ کے ایک بادشاہ نے آپ کے مدفن پر ایک پختہ عمارت بنوا دی اور شاہان مغلیہ اس میں مسلسل اضافہ کرتے رہے۔ شاہ جہان نے مزار کا شاندار گنبد تعمیر کروایا اور اس کے پاس سنگ مرمر کی ایک خوبصورت مسجد بھی تعمیر کروائی۔ آج کل آپ کا مرقد برصغیر پاک و ہند کی ایک بہت بڑی زیارت گاہ ہے جہاں بے شمار ارادت مند حاضری دیتے ہیں۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ:

آپ فرغانہ کے نواح کے ایک شہر اوش (ماوراء النہر) میں پیدا ہوئے۔ ڈیڑھ سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والدہ نے تربیت کی۔ پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے۔ پھر بغداد کا سفر کیا اور وہاں اس خضر طریقت سے ملاقات ہوئی جس کی رہبری میں کمال و تکمیل کے درجات تک پہنچنا مقدر تھا اور جس کی شرکت سے اسلام کا ہندوستان میں "چشمۂ حیوان" جاری ہونا تھا۔ فقیہ ابواللیث سمرقندیؒ کی بابرکت

مسجد میں جلیل القدر علماء اور شیوخ کی موجودگی میں خرقۂ خلافت عطا ہوا۔ پھر برصغیر پاک و ہند تشریف لائے۔ جب بغداد سے ہندوستان وارد ہوئے تو پہلے ملتان پہنچے اور شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے کچھ روز مہمان رہ کر دہلی آئے۔ اس کے بعد آپ نے حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش کا اظہار کیا، لیکن حضرت خواجہ اجمیریؒ کا جواب تھا کہ قرب روحانی کے سامنے بُعد مکانی کی کوئی حیثیت نہیں۔ (سیر العارفین ص ۲۱) تمہیں دہلی ہی میں قیام کرنا چاہیے چنانچہ آپ دہلی ہی میں رہے جو نوخیز اور وسعت پذیر اسلامی سلطنت کا دارالحکومت تھا اور جو علماء، شرفاء اور اہل فضل و کمال کا ملجاء و ماویٰ تھا۔ جب سلطان شمس الدین التمش نے خواجہ قطب الدین بختیارؒ کی دہلی تشریف لانے کی خبر پائی تو بہت خوش ہوا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ چنانچہ سلطان نے شایان شان پذیرائی کی۔ سلطان نے حضرت سے دہلی شہر کے اندر قیام کرنے کی درخواست کی لیکن حضرت خواجہؒ نے اس کو قبول نہ کیا۔ لیکن دوسرے موقعوں پر جب آپ اندرون شہر تشریف لائے تو سلطان نے نہایت شاندار طریقے سے استقبال کیا جس سے باہمی مراسم پیدا ہو گئے۔ (سیر العارفین ص ۲۰-۲۱) بعض حضرات کا خیال ہے کہ دہلی کا قطب مینار اسی ہستی کی یادگار میں سلطان نے تعمیر کروایا تھا۔

بعض مواقع پر سلطان شمس الدین نے جاگیر وغیرہ کی پیش کش کی لیکن آپ نے ہر مرتبہ اس قسم کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ چنانچہ آپ ملک عزالدین کی مسجد میں فقیرانہ اور درویشانہ زندگی گزارنے لگے۔ (سیر الاولیاء ص ۵۴) سلطان برابر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور اس کی عقیدت برابر ترقی کرتی رہی۔ اہل شہر کا ان کی طرف کچھ ایسا رجوع ہوا کہ لوگ جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر رشد و ہدایت کے موتی چنتے رہے۔ ایک مرتبہ حضرت خواجہ معین الدینؒ دہلی تشریف لائے تو شیخ الاسلام نجم الدین صغریٰ نے حضرت خواجہ اجمیریؒ سے شکایت کی۔ حضرت خواجہؒ نے قطب الدین بختیارؒ سے فرمایا:

Marfat.com

''بابا بختیار! اتنی جلدی ایسے مشہور ہو گئے کہ بندگانِ خدا کو تم سے شکایت پیدا ہونے لگی۔ یہاں سے اٹھو اور اجمیر آؤ (از این جا بر خیز و در اجمیر بیا) وہاں قیام اختیار کرو۔ میں تمہارے سامنے (خادمانہ) کھڑا رہوں گا۔ (سیر الاولیاء ص ۵۴)

یہ دراصل ایک لطیف طریقہ سے ایک شیخ نے اپنے مرید کو تنبیہ فرمائی تھی اور یہ بھی بتا دیا کہ یہاں کے اہل فضل و کمال تمہاری قدر و منزلت اور مقام و مرتبہ سے آشنا نہیں۔ میں تو واقف ہوں کہ تم کس مرتبہ کے شخص ہو۔ خواجہ معین الدین نے اپنے شیخ کی بات کو سن کر جو جواب دیا وہ بھی نہایت اعلیٰ اور درست تھا۔ عرض کیا

''مخدوما! میں تو آپ کے سامنے کھڑے ہونے کا بھی اہل نہیں، بیٹھنے کی کیا مجال ہے؟'' (سیر الاولیاء ص ۵۴)

شیخ کا حکم تھا کہ اجمیر چلو اور مرید باصفا چلنے کے لیے فوراً تیار ہو گیا۔ اس بارہ میں داراشکوہ نے لکھا ہے کہ

''خواجہ قطب الدینؒ اپنے شیخ (خواجہ معین الدین اجمیریؒ) کے ساتھ اجمیر روانہ ہوئے۔ جب دہلی والوں کو شیخ کے اجمیر جانے کا پتہ چلا تو شہر میں ایک شور برپا ہو گیا اہل شہر مع سلطان شمس الدین التمش شہر سے نکل کر آپ کے پیچھے ہو لیے۔ جہاں خواجہ قطب الدین کا پاؤں پڑتا تھا لوگ خاک پا کو تبرک سمجھ کر اٹھا لیتے تھے (و ہر جا شیخ قطب الدین قدم می گذاشت خلائق خاک آں زمین بہ تبرک برمی داشت) لوگ بڑے بیقرار اور آہ و زاری میں مصروف تھے۔'' (سیر الاولیاء ص ۵۴)

حضرت خواجہ معین الدینؒ نے جب لوگوں کا ہجوم آتے دیکھا جس میں سلطان شمس الدین بھی پیادہ پا آرہا تھا تو مرید کو اجمیر لے جانے کا ارادہ فسخ کر دیا اور فرمایا:

''بابا بختیار! تم یہیں رہو، اس لیے کہ خدا کی اتنی مخلوق تمہارے باہر جانے سے تباہ حال اور مضطرب ہے۔ میں اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ اتنے دل

Marfat.com

دکھائے اور رلائے جائیں۔ جاؤ، ہم نے اس شہر کو تمہاری پناہ میں چھوڑا (برو، ایں شہر را در پناہ تو گذاشتیم) (سیر الاولیاء ص ۵۵)

سلطان نے شیخ اجمیری کا شکریہ ادا کیا۔ خواجہ قطب الدین دہلی واپس آ گئے اور خواجہ معین الدین اکیلے واپس اجمیر تشریف لے گئے، شیخ قطب الدین دہلی واپس آ کر بوریائے فقر پر بیٹھ کر خلق خدا کی رشد و ہدایت میں مصروف ہو گئے اور فقر و استغنا کے ساتھ ''دربار'' سے دور رہ کر عوام و خواص اور شاہ و گدا کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔

سلطان شمس الدین ہفتہ میں دو بار آپ کی خدمت میں نہایت اخلاص و عقیدت سے حاضری دیتا۔ (تاریخ فرشتہ ص ۱۹) آپ کو دہلی میں کام کرنے کا کوئی زیادہ وقت نہیں ملا۔ اپنے شیخ کی وفات کے بعد تو مشکل سے چار پانچ دن زندہ رہے لیکن ان کی ذات سے ہندوستان میں سلسلہ چشتیہ کی بنیاد پڑ گئی اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ نے جس مقصد کے لیے ہندوستان کو اپنے قیام کے لیے منتخب فرمایا تھا وہ صدیوں کے لیے محفوظ ہو گیا۔ پچاس (۵۰) سال کی عمر تھی کہ ۶۳۳ھ میں آپ اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو انتقال فرما گئے۔ جب آپ کی وفات ہوئی تو اس وقت حضرت فرید الدین گنج شکر ہانسی میں تھے۔ وہ حضرت خواجہ قطب الدینؒ کی خدمت میں دو ہفتے کے بعد حاضر ہوتے تھے لیکن قاضی حمید الدین ناگوری اور شیخ بدر الدین غزنویؒ تو ہر روز موجود رہتے تھے۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ خلافت ہمیں ملے گی لیکن خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے انتقال سے قبل فرمایا: ''میرا جامہ، عصا، مصلا اور لکڑی کی نعلین شیخ فرید الدینؒ کو دے دینا۔'' چنانچہ وہی حضرت خواجہ قطب الدینؒ کے جانشین ہوئے۔

(فوائد الفواد جلد ۱۸۷)

حضرت فرید الدین گنج شکرؒ:

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کا انتقال ۲۷ دسمبر ۱۲۳۵ء (مطابق ۶۳۳ھ) میں ہوا۔ جس طرح حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ برصغیر پاک و ہند میں سلسلہ چشتیہ

Marfat.com

کے مؤسس اور بانی ہیں خواجہ فرید الدین گنج شکر اس کے مجدد اور آدم ثانی ہیں۔ حضرت بابا فرید الدینؒ کے آباء واجداد کابل میں بلند مرتبہ رکھتے تھے اور چنگیزی فتنہ کے دوران میں وہاں سے ہجرت کر کے سرزمین پاک وہند میں تشریف لائے۔ آپ کے دادا ملتان کے نزدیک کھوتوال میں قاضی مقرر ہوئے۔ اور یہیں حضرت بابا فرید الدینؒ جن کا اصلی نام مسعود تھا پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش ۵۶۹ھ میں ہوئی۔ آپ نسباً فاروقی ہیں۔ بچپن آپ نے ملتان میں گزارا۔ ملتان اس زمانے میں برصغیر پاک وہند کا ایک بہت بڑا علمی مرکز تھا اس وجہ سے آپ نے یہیں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کی جن میں مولانا منہاج الدین ترمذی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سے آپ نے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ۵۸۵ھ میں خواجہ قطب الدینؒ سے آپ کی ملاقات ہوئی اور ان سے بیعت کا شرف حاصل ہوا۔ شیخ فرید الدین خواجہ قطب الدینؒ کے کچھ ایسے گرویدہ وشیفتہ ہوئے کہ تعلیم چھوڑ چھاڑ کر آپ کے ہمراہ دہلی جانے کا عزم کیا، لیکن آپ نے بابا فریدؒ سے فرمایا کہ پہلے علوم ظاہری کی تکمیل کر لیں اور پھر ان کے پاس دہلی آئیں۔ آپ نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور قندھار میں جا کر علوم ظاہری کی پانچ سالوں میں تکمیل کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ نے ان کے قیام کے لیے غزنین دروازہ کے پاس ایک جگہ منتخب فرمائی جہاں وہ ریاضت ومجاہدہ میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں شیخ نے روحانی نعمتوں سے مالا مال کر دیا اور لوگوں کا ایک ہجوم آپ کے گرد جمع ہو گیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ دہلی میں لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے یکسوئی میسر نہیں ہوتی تو شیخ طریقت کی اجازت سے ہانسی تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے دہلی آتے جاتے رہے۔ ایک دفعہ حضرت شیخ معین الدین اجمیریؒ دہلی آئے ہوئے تھے تو آپ کی توجہ سے بھی فیض یاب ہوئے۔ حضرت خواجہ اجمیریؒ حضرت بابا فریدؒ کے ذوق وشوق اور روحانی استعداد سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار سے فرمایا:

"بابا بختیار! شہباز عظیم بصید آوردۂ کہ جز بہ سدرۃ المنتہیٰ آشیاں نگیرد۔ ایں فرید شمعیست کہ خانوادہ درویشان منور سازد۔" (سیر العارفین ص ۲۳)

بابا بختیار! تو نے ایک بہت بڑا شہباز شکار کیا ہے جو سوائے سدرۃ المنتہیٰ کے اور کہیں آشیانہ بناتا ہی نہیں۔ یہ فرید ایک ایسی شمع ہے جو درویشوں کے خانوادہ کو منور کردے گی۔

مرشد کی وفات کے بعد آپ تیسرے روز دہلی پہنچے۔ مزار شیخ" پر فاتحہ پڑھی۔ قاضی حمید الدین ناگوریؒ نے شیخ کی وصیت کے مطابق ان کا خرقہ اور دوسری امانتیں سپرد کیں۔ یہ گویا جانشینی کا اعلان تھا۔ شیخ" نے دوگانہ پڑھ کر اس کو زیب تن کیا اور شیخ کی جگہ پر بیٹھے۔ چند روز بعد آپ نے اپنے دوستوں سے فرمایا کہ میں واپس ہانسی جاؤں گا۔ حاضرین نے عرض کیا کہ حضرت شیخ قطب الدین بختیارؒ نے تو آپ کو اس جگہ بٹھایا ہے۔ آپ اب کہاں جاتے ہیں؟ فرمایا: "مرشد نے اپنی امانت سپرد کر دی۔ اب شہر میں رہوں یا بیابان میں وہ ساتھ ہے۔" (سیر الاولیاء ص۷۲)

ہانسی کا قیام اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہاں سکون اور گم نامی رہے گی۔ یہاں خواجہ قطب الدینؒ کے ایک مرید مولانا نور ترک کی وجہ سے آپ کی شہرت ہو گئی اور خلق خدا نے ہجوم کیا اور آپ اس شہرت اور ہجوم سے پریشان ہو جاتے تھے۔ اس وجہ سے کھتوال جو ملتان سے قریب تھا، رخ کیا۔ وہاں بھی آپ کی شہرت و عظمت کا ڈنکا دور دور بجنے لگا۔ بالآخر آپ پاک پٹن جو ان دنوں اجودھن کہلاتا تھا، اپنی وفات تک یعنی ۱۲۶۵ء تک وہیں رہے۔ اجودھن کو اس لیے منتخب فرمایا کہ وہاں کے لوگ ناآشنا تھے اور وہ جگہ بھی ایک غیر معروف تھی لیکن یہاں بھی آپ کی شہرت ہو گئی۔ اور لوگوں نے ہر طرف سے ہجوم کیا۔ آپ کی عظمت و شہرت کے آفتاب کی شعائیں دور دور تک پہنچ رہی تھیں اور طالبین خدا اس سے مستفید ہو رہے تھے۔ تھوڑے دنوں تک یہ سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ آدھی رات تک بھی آنے والوں کا سلسلہ ختم نہ ہوتا تھا۔

آپ کو بادشاہوں کے درباروں اور شہری جھگڑوں سے سخت نفرت تھی کیونکہ آپ یہ سمجھتے تھے کہ درباروں کے قرب سے فقراء کو کن کن معاملات سے واسطہ پڑتا ہے۔ آپ جنگل میں رہتے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنتے۔ اس وجہ سے پاک پٹن کے قیام کی ابتداء میں آپ نے ایک عرصہ تک نہایت عسرت اور فقر و فاقہ کے ساتھ زندگی گزاری۔ آپ پیلو کے پھل ابال لیتے اور ان میں کچھ نمک ڈال کر فقراء میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ جب آپ پاک پٹن تشریف لے گئے تو آپ نے اپنے بھائی شیخ نجیب الدین متوکل کو کھیبوال (کھوتوال) بھیجا تا کہ آپ کی والدہ ماجدہ کو وہاں سے لائیں۔ شیخ نجیب الدین نے اپنی بوڑھی ماں کو ایک گھوڑی پر سوار کیا اور خود ان کے ساتھ پیادہ پا پاک پٹن کو چلے۔ راستے میں ایک بڑا جنگل تھا جس میں درندے اور وحشی جانور کثرت سے رہتے تھے۔ آدھے راستے میں پہنچ کر والدہ کو پیاس لگی تو شیخ نجیب الدین نے انہیں ایک درخت کے نیچے بٹھایا اور خود گھوڑی پر سوار ہو کر پانی کی تلاش میں نکلے۔ بہت دیر کے بعد پانی لے کر آئے تو دیکھا کہ والدہ ماجدہ اس جگہ سے غائب ہیں جہاں ان کو بٹھا کر گئے تھے۔ ہر طرف تلاش کرنے کے بعد ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ناچارا کیلے پاک پٹن گئے اور جب وہاں سے کچھ آدمی لے کر والدہ کو پھر تلاش کیا تو فقط ان کی ہڈیاں ملیں اور درندے ان کے گوشت کو کھا چکے تھے۔ (فوائد الفواد: ص ۱۲۲)

پاک پٹن اس زمانے میں بچھوؤں اور سانپوں کا مسکن تھا اور ہر طرف درویشوں اور فقراء کے اردگرد یہ خوفناک چیزیں رینگتی پھرتی تھیں۔ وہاں کے لوگ بھی کج طبع اور درشت خو اور بداعتقاد تھے۔ انہوں نے حضرت بابا فریدؒ کی کوئی پروا نہ کی۔ لوگوں کی بے توجہی کو دیکھ کر بابا صاحبؒ کو یہ جگہ پسند آئی اور آپ نے یہاں ڈیرے ڈال دیے کیونکہ آپ یہ سمجھتے تھے کہ یہاں نہایت اطمینان اور فراغ دلی کے ساتھ اللہ کی عبادت ہو سکتی ہے۔ (سیر العارفین: ص ۳۳) چنانچہ قصبہ سے باہر درختوں کے نیچے بوریا ڈال کر ذکر و فکر الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ بعض روایات میں ہے کہ یہاں آپ کا عجیب طرز زندگی تھا جس کا

Marfat.com

تحمل ہر ایک کے لیے آسان نہیں۔ آپ ہر آشنا اور ناآشنا کے ساتھ یکساں لطف و مہربانی کے ساتھ پیش آتے۔ مولانا بدرالدین اسحاق فرماتے ہیں کہ میں آپ کا خادم خاص تھا۔ آپ کو جو بات کہنی ہوتی منہ سے فرماتے۔ ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہ تھا۔ برسوں خدمت کرنے اور ساتھ رہنے کے باوجود کوئی تفاوت نہ دیکھا۔ (سیر الاولیاء: ص ۶۵)

خلق خدا سے دور رہنے کے باوجود آپ کی شہرت و عظمت دور دور تک پھیل گئی اور جلد ہی لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ لیکن آپ اس ہجوم کو پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ سلطان ناصر الدین محمود اپنے لشکر سمیت جو اوچ اور ملتان کے سفر میں بادشاہ کا ہم رکاب تھا، بابا صاحبؒ کی زیارت کے لیے پاک پٹن حاضر ہونے کی خواہش کا اظہار بذریعہ نائب السلطنت الغ خان جو بعد میں سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سے دہلی کا بادشاہ بنا، کیا۔ ساتھ ہی زر نقد اور چار دیہات کا جاگیر نامہ تھا، سلطان غیاث الدین نے یہ چیزیں حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیں۔ انہوں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ غیاث الدین نے جواب دیا: خانقاہ کے درویشوں کے لیے کچھ نقدی ہے اور آپ کے لیے جاگیر کا فرمانِ سلطانی۔ اگر آپ یہ قبول فرمالیں تو ہماری انتہائی خوش قسمتی ہوگی۔ شیخؒ نے تبسم فرمایا اور کہا: ''نقدی تو درویشوں کے لیے ہے، ان میں تقسیم کر دیں اور فرمانِ سلطانی واپس لے جائیں کیونکہ اس کے لینے والے بہت ہیں۔''

(سیر الاولیاء ص ۷۹، فوائد الفواد: ص ۹۹)

سلطان غیاث الدین بلبن کو حضرت بابا صاحبؒ سے نہایت گہرا معتقدانہ تعلق تھا۔ وہ دہلی کی سلطنت کا حصول بھی بابا صاحبؒ کی دعا سے سمجھتا تھا۔ اور خدام کی خدمت کو اپنی سعادت تصور کرتا تھا۔ حضرتؒ نے ایک مرتبہ ایک شخص کے اصرار سے ایک سفارشی رقعہ لکھا جو سفارش و بے نیازی کا عجیب مجموعہ ہے۔ لکھتے ہیں:

''میں اس شخص کا معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ اس کو کچھ دیں گے تو حقیقی عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہوگا

Marfat.com

اور آپ مشکور ہوں گے۔ اور اگر آپ نہ دیں گے تو اس کا مانع اللہ تعالیٰ ہوگا
اور آپ معذور ہوں گے۔"

ارباب ثروت اور اصحاب دولت اور اہل دول سے پوری زندگی کنارہ کشی اختیار فرمائی۔ چنانچہ آپ نے شیخ بدرالدین غزنویؒ کو جو آپ کے پیر بھائی بھی تھے، ہدایت فرمائی اور دہلی میں ملک نظام الدین خریطہ دار نے ان کے لیے ایک خانقاہ بنوائی اور ان کے آرام و آسائش کے لیے ہر سامان مہیا کیا۔ کچھ روز کے بعد کچھ ایسا انقلاب روزگار آیا کہ وہ غبن کے سلسلہ میں ماخوذ ہوا۔ اس سے شیخ بدرالدین کو بھی زحمت و کلفت پیش آئی۔ آپ نے حضرت بابا فریدؒ سے ایک خط کے ذریعہ دعا کی درخواست کی۔ آپ نے جواب میں لکھا:

"جو شخص بزرگوں کی روش کو چھوڑ کر اپنی روش پر چلے گا وہ ضرور ایسی حالت میں گرفتار ہوگا جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ بے چین اور پریشان رہے گا۔ آخر کار ہمارے پیران عظام میں سے کون تھا جس نے اپنے لیے ایسی خانقاہ بنوائی۔ آپ نے ان کی روش کے خلاف ایسی خانقاہ کیوں بنوائی اور اس میں کیوں بیٹھے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کا تو یہ طریقہ اور روش نہ تھی کہ اپنے لیے خانقاہ بنوا کر دوکان جمائیں ان کا شیوہ تو گمنامی اور بے نشانی کا تھا۔" (سیر العارفین ص ۸۵، فوائد الفواد ص ۷۹)

آپ نے شاہان وقت اور ارباب ثروت اور دوسرے لاتعداد لوگوں کی عقیدت کے باوجود آخر عمر تک زہد و ریاضت میں زندگی گزاری، چنانچہ داراشکوہ نے لکھا ہے:

"سلطان المشائخ (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ) فرماتے ہیں کہ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس سرہ آخر عمر میں نہایت تنگ روزی ہو گئے، خصوصاً جب آپ کی رحلت کا موقع آیا۔ چنانچہ میں ماہ رمضان میں وہاں گیا تو دیکھا کہ افطار کے وقت تھوڑا سا کھانا لایا جاتا جو حاضرین کے لیے کافی نہ ہوتا۔ ان دنوں میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھاتا۔" (سیر الاولیاء ص ۶۰)

Marfat.com

مزید یہ لکھا ہے کہ:

''آپ کا سامان بھی جو دیکھنے میں آتا تھا بہت معمولی اور برائے نام تھا۔ میں جب رخصت ہونے لگا تو حضرتؒ نے خرچ کے لیے ایک سلطانی عطا فرمایا۔ (غالباً سلطانی اس زمانے کا ایک روپیہ تھا) اس روز مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے ذریعہ پیغام ملا کہ آج توقف کریں کل جائیں۔ جب افطار کا وقت ہوا تو میں شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضرتؒ کی بارگاہ سے مجھے ایک سلطانی عطا ہوا تھا اجازت ہو تو اس سے کچھ کھانے کا انتظام کرلیا جائے۔ حضرت نے اجازت مرحمت فرمادی اور بڑی دعائیں دیں۔ (سیر الاولیاء ص ٦٠)

مورخین اور تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق اشاعت اسلام میں جتنی کامیابی آپ کو ہوئی اتنی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو شاید ہی ہوئی ہو۔ مغربی پنجاب کے بڑے بڑے قبیلے سیال، راجپوت، وٹو وغیرہ آپ ہی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ مغربی پنجاب میں کامیاب اشاعت اسلام کے علاوہ آپ نے بڑے بڑے صاحب سطوت بزرگوں کی بھی تربیت کی۔ اگرچہ دہلی میں سلسلہ چشتیہ کو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے رونق دی لیکن برصغیر پاک و ہند میں اس سلسلہ کو اصل وسعت اور استحکام حضرت بابا فرید الدین گنج شکر قدس سرہ کی ذات سے نصیب ہوا۔ لہٰذا اس سرزمین پاک و ہند میں آپ کو سلسلۂ چشتیہ کا موسس ثانی کہا جاسکتا ہے۔ اور یہ جو ہم نے گذشتہ سطور میں حضرت خواجہ اجمیریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت قطب الدینؒ سے بابا صاحبؒ کی نسبت فرمایا تھا کہ ''فرید ایک شمع ہے جس کی وجہ سے خانوادۂ درویشاں منور ہوگا۔'' ان کا یہ قول بالکل درست اور صحیح نکلا۔ چشتیہ سلسلے کی دو بڑی شاخیں صابریہ اور نظامیہ ہے ان دونوں کے موسس حضرت بابا فریدؒ کے مرید تھے یعنی خواجہ علاء الدین صابرؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ۔

صاحب سیر الاولیاء نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی روایت سے آپ

کی وفات کا حال یوں بیان کیا ہے کہ:

''محرم کی پانچ کو بیماری میں شدت ہوئی۔عشاء کی نماز جماعت سے ادا کی بعد میں بیہوشی طاری ہوگئی۔ایک گھڑی کے بعد ہوش آیا تو دریافت فرمایا کہ''کیا میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی ہے؟''لوگوں نے عرض کیا کہ پڑھ لی ہے۔فرمایا:''دوبارہ پڑھ لوں کیا خبر کیا ہو؟''دوبارہ نماز پڑھی اور پھر بیہوش ہوگئے۔اس مرتبہ بے ہوشی زیادہ سخت اور طویل تھی۔پھر ہوش آیا تو پھر پوچھا کہ''میں نے عشاء کی نماز پڑھ لی؟''عرض کیا گیا کہ دوبار پڑھ چکے۔فرمایا ایک بار اور پڑھ لوں،کون جانے کیا ہو؟ چنانچہ تیسری مرتبہ پھر پڑھی۔اس کے بعد واصل بحق ہوئے۔'' (سیر الاولیاء ص ۸۹)

چنانچہ تاریخ وفات ۵ محرم الحرام ۶۶۴ھ بروز سہ شنبہ ہے۔ پاک پٹن (اجودھن) میں مدفون ہوئے۔بعد میں سلطان محمد تغلق نے مزار پر گنبد تعمیر کروایا۔

حضرت بابا فریدؒ کے پانچ فرزند اور تین صاحبزادیاں تھیں۔صاحبزادگان کے نام یہ ہیں: (۱) شیخ نصر الدین نصر اللہ (۲) شیخ شہاب الدین (۳) شیخ بدرالدین سلیمان، (۴) خواجہ نظام الدین اور (۵) شیخ محمد یعقوب۔اور صاحبزادیوں کے نام یہ ہیں: بی بی ستورہ، بی بی فاطمہ اور بی بی شریفہ۔

آپ کی وفات کے بعد تیسرے صاحبزادے شیخ بدرالدین سلیمان باپ کے سجادہ پر بیٹھے۔ان کے فرزند سجادہ نشین شیخ علاء الدین تقدس واتقا میں مشہور تھے۔محمد تغلق شہنشاہ ہندوستان بھی ان کے مریدین میں سے تھا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد کو بھی بڑی برکت عطاء فرمائی۔مختلف حصوں میں یہ خاندان آباد ہے اور فریدی کہلاتا ہے۔

حضرت خواجہ فریدالدین گنج شکر قدس سرہ کے خلفاء میں پانچ حضرات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔(۱) شیخ جمال الدین ہانسویؒ (۲) شیخ بدرالدین اسحاقؒ (۳) شیخ نظام الدین اولیاء (۴) شیخ علی احمد صابرؒ اور شیخ عارفؒ۔حضرت امام علی الحقؒ سیالکوٹی

Marfat.com

جنہیں حضرت بابا فریدؒ نے تعلیم و تربیت اور خلعت خرقہ عطا کرنے کے بعد سیالکوٹ بھیجا۔ آپ نے وہاں برسوں ارشاد و ہدایت کی شمع روشن کی اور ہزار ہا لوگ مسلم اور غیر مسلم آپ سے فیض یاب ہوئے۔ آپ کی وفات ۶۸۶ھ مطابق ۱۲۸۷ء میں ہوئی۔ آپ کا مزار سیالکوٹ میں سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔

حضرت شیخ علاء الدین صابرؒ:

حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابرؒ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے حقیقی بھانجے تھے۔ یہ موضع کھوتوال میں ۱۱۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت حضرت بابا فریدؒ نے بڑی محنت اور محبت سے کی۔ سلسلہ صابریہ چشتیہ جس میں بڑے نامور مشائخ، عارف اور محقق و مصلح پیدا ہوئے مثلاً حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولویؒ جن کو اہل حق نے نویں صدی کا مجدد بھی شمار کیا ہے، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے شاگردان اور مریدین جن میں تبلیغی جماعت والے حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ بھی ہیں، آپ ہی سے شروع ہوا۔ آپ نے نہایت ترک و تجرید اور زہد و مجاہدہ کی زندگی بسر کی۔ پیران کلیر میں عرصہ تک عبادات و افادہ میں مشغول و مصروف رہے۔ ۱۳ ربیع الاول ۶۸۹ھ یا ۶۹۰ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی آپ ہی کے خلیفہ تھے۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ:

حضرت نظام الدین اولیاءؒ سلسلۂ چشتیہ میں سب سے زیادہ بااثر تھے۔ ۱۹ اکتوبر ۱۲۳۸ء مطابق ۶۳۶ھ میں آپ کی ولادت بدایوں میں ہوئی۔ آپ کا نام محمد، نظام الدین لقب و عرف، والد ماجد کا نام احمد بن علی سادات حسینی میں سے تھے۔ آپ کے ننہال بھی سادات میں سے تھے۔ دادا علی اور نانا خواجہ عرب دونوں ہم جد تھے۔ دونوں چنگیزی فتنہ کے دوران بخارا سے لاہور آئے۔ یہیں آپ کی والدہ اور والد پیدا ہوئے۔

Marfat.com

لاہور میں کچھ عرصہ مقیم رہنے کے بعد دونوں خاندان بدایوں میں جا کر مقیم ہو گئے۔ خواجہ نظام الدین کی عمر ۵ سال تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی والدہ بی بی زلیخا بڑی سمجھ دار اور باہمت خاتون تھی۔ باپ کے فوت ہونے کے بعد گھر میں غربت ناچنے لگی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں کہ والدہ کا معمول تھا کہ جس روز ہمارے گھر کھانے کو کچھ نہ ہوتا تو فرماتیں کہ آج ہم سب خدا کے مہمان ہیں۔ مجھے یہ بات سن کر بڑا مزا آتا۔ ایک روز کوئی خدا کا بندہ ہمارے گھر میں ایک تنکہ غلہ دے گیا۔ اس وجہ سے چند روز متواتر روٹی ملتی رہی۔ میں تنگ آ گیا اور یہ آرزو کرتا رہا کہ والدہ صاحبہ کب فرمائیں کہ ہم سب خدا کے مہمان ہیں۔ آخر ایک روز وہ غلہ ختم ہو گیا اور والدہ صاحبہ نے حسب معمول فرمایا کہ ہم آج سب خدا کے مہمان ہیں۔ مجھے ان کے منہ سے یہ الفاظ سن کر ایسا مزہ اور سرور آیا کہ میں اس کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا۔'' (سیر الاولیاء ص ۱۱۳)

غربت اور افلاس کے باوجود آپ کی والدہ صاحبہ نے آپ کو مکمل تعلیم دلوائی۔ ابتدائی تعلیم تو آپ کے وطن مالوف بدایوں میں ہوئی جو اس زمانہ میں علم و فضل کا مرکز تھا۔ یہاں سے فراغت کے بعد آپ والدہ کے ساتھ دہلی تشریف لائے اور خواجہ شمس الدین خوارزمیؒ جو بعد میں سلطان غیاث الدین بلبن کے وزیر ہو گئے، آپ نے ان سے مقامات حریری پڑھی جو عربی ادب کی بہت بڑی کتاب ہے۔ اور مولانا کمال الدین محدثؒ سے کتاب مشارق الانوار پڑھی اور حدیث کی سند لی۔

آپ اگرچہ پورے انہماک کے ساتھ علم کے حصول میں مشغول تھے، لیکن دل شروع ہی سے کسی اور کو ڈھونڈتا اور تلاش کرتا تھا۔ ان ظاہری علوم سے ان کی طبیعت متوحش تھی۔ اس لیے آپ اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے فرمایا کرتے تھے کہ میں ہمیشہ تمہارے درمیان نہیں رہوں گا۔ میں چند روز تمہارے یہاں مہمان ہوں۔ یہ سب باتیں حضرت بابا فریدالدینؒ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے کی ہیں۔

دہلی کے قیام میں آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ جب بھی کبھی اپنی

Marfat.com

والدہ ماجدہ کا ذکر فرماتے تو گریہ طاری ہو جاتا تھا کیونکہ آپ کی والدہ نے آپ کا باپ اور ماں دونوں بن کر تعلیم و تربیت کی تھی۔ پھر انتقال سے کچھ عرصہ قبل جب ایک مرتبہ آپ نے والدہ کی قدم بوسی کی تو والدہ نے فرمایا کہ آئندہ مہینے کے چاند کے موقعہ پر کس کی قدم بوسی کرو گے؟ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ انتقال کا وقت قریب ہے۔ میں نے روتے ہوئے عرض کیا: ''مخدومہ! مجھ غریب کو آپ کس کے سپرد کرتی ہیں؟ فرمایا: اس کا جواب کل دوں گی۔ دوسرے روز والدہ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ''اے اللہ! اس کو تیرے سپرد کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر آپ تو راہی ملک بقا ہو گئیں۔ شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے والدہ کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنے دل میں کہا: اگر والدہ سونے اور موتیوں سے بھرا ہوا گھر چھوڑ جاتیں تو مجھے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ (سیر الاولیاء ص ۱۵۱)

دہلی کے قیام کے دوران آپ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے حقیقی بھائی خواجہ نجیب الدین متوکل سے متعارف ہو چکے تھے۔ ان کی صحبت اور گفتگو نے حضرت باباؒ کے ساتھ محبت و الفت کی چنگاری مشتعل کر دی۔ چنانچہ آپ نے حضرت فرید الدینؒ کی خدمت میں حاضری کا عزم کر لیا اور بالآخر آپ حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت بابا صاحبؒ نے آپ کو دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا۔

اے آتش فراقت دل ہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جاں ہا خراب کردہ

حضرت محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ایسے معلوم ہوا کہ میری قوت گویائی سلب ہو گئی ہے۔ حضرتؒ نے جب میری یہ حالت دیکھی تو فرمایا: ''لکل داخل دهشة'' یعنی ہر نئے آنے والے پر رعب ہوتا ہی ہے۔ (فوائد الفواد ص ۳۱)

حضرت بابا فریدؒ نے حضرت خواجہ صاحبؒ کی بڑی خاطر و مدارت کی اور اسی ملاقات میں حضرت خواجہؒ بابا صاحبؒ سے بیعت ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر بیس (۲۰) سال کی تھی۔ (سیر الاولیاء ص ۱۶) حضرت بابا صاحبؒ نے آپ کو بعض کتابیں بھی پڑھائیں

Marfat.com

جن میں عوارف المعارف اور ابوشکور سلمی کی التمہید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مزید برآں تجوید کی تعلیم بھی دی اور قرآن حکیم کے چھ پارے مکمل تجوید کے ساتھ پڑھائے۔

(سیر الاولیاء ص ۱۰۶)

حضرت خواجہ نظام الدینؒ تین بار اجودھن حاضر ہوئے۔ ایک حاضری میں حضرتؒ نے خلافت سے مشرف فرمایا۔ تذکروں میں اس کی صراحت نہیں کہ کس حاضری میں خرقۂ خلافت عطا فرمایا تھا۔ (فوائد الفواد ص ۴۲) ایک حاضری میں نماز جمعہ کے بعد طلبی ہوئی۔ حضرت شیخ نے اپنا لعاب دہن حضرت خواجہ صاحب کے دہن میں ڈالا۔ اور قرآن حکیم کے حفظ کی وصیت فرمائی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا تم کو دی۔ یہاں سب کچھ یہی ہے۔ یہ فرما کر آپ کو دہلی کی طرف روانہ کیا اور فرمایا: ''برو ملک ہند گیر، نظرة منک تکفینی'' (سیر الاولیاء ص ۱۲۳) کچھ اور وصیتیں بھی فرمائیں۔ سیر الاولیاء میں ہے کہ خلافت نامہ لکھ کر دیا اور یہ ہدایت فرمائی کہ یہ مولانا جمال الدین کو ہانسی میں اور قاضی منتخب کو دہلی میں دکھا دینا۔ ارشاد فرمایا کہ تم ایک سایہ دار درخت ہو گے جس کے سایہ میں اللہ کی مخلوق آرام پائے گی۔ استعداد کی ترقی کے لیے مجاہدہ کرتے رہنا۔ حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں کہ ہانسی میں شیخ جمال الدین کو جب خلافت نامہ دکھایا تو بڑا اظہارِ مسرت فرمایا اور یہ شعر پڑھا۔

خدائے جہاں را ہزاراں سپاس
کہ گوہر سپردہ بگوہر شناس

حضرت خواجہؒ جب بابا صاحبؒ کے ہاں سے تشریف لا رہے تھے تو ایک دعا کی درخواست کی کہ ''خلق کے دربدر نہ پھرنا پڑے۔'' آپ نے درخواست قبول کر کے دعا فرمائی۔ (سیر الاولیاء ص ۱۲۳)

ایک موقع پر حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے اللہ سے تمہارے لیے تھوڑی سی دنیا بھی مانگ لی ہے خواجہ فرماتے ہیں کہ میں یہ سن کر متفکر ہوا کہ بڑے

Marfat.com

بڑے لوگ دنیا کی وجہ سے فتنہ میں پڑ گئے۔ میرا کیا حال ہوگا۔ شیخ نے فوراً فرمایا: تم فتنہ میں نہیں پڑو گے۔" اب مجھے اطمینان ہوا۔ (سیر الاولیاء ص ۱۳۲)

خواجہ نظام الدینؒ اپنے مرشد سے خرقہ خلافت حاصل کر کے اور ان کی دعاؤں سے دامن بھر کر اجودھن سے دہلی کی طرف اس شان سے روانہ ہوئے کہ اخلاص، اعتماد علی اللہ اور استغنا عن الخلق کے سوا آپ کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے آپ کی اس آمد کو اپنے لفظوں میں یوں بیان فرمایا ہے:

"ہندگیری کی مہم پر اجودھن سے ہند کے دارالسلطنت دہلی کی طرف روانہ ہوتے ہیں جہاں نیچے سے اوپر تک بے شمار جھوٹے الٰہ پر اجمائے بیٹھے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جن کی زبان کی معمولی حرکت لوگوں کے تن سر سے جدا کر دیتی ہے، وہ بھی ہیں جن کی نیاز مندی خاک سے اٹھا کر لوگوں کو امارت و دولت کے افلاک تک پہنچا رہی ہے۔ گلی گلی میں عزت تقسیم ہو رہی ہے۔ مناصب بٹ رہے ہیں، روپے لوٹائے جا رہے ہیں، گودیں بھر رہی ہیں اور جن جن ذرائع سے یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں سلطان المشائخ سب سے لیس ہیں۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ اجودھن جانے سے پہلے دہلی کی علمی محفلوں کی محفل شکنی میں ان کی عام شہرت ہو چکی ہے۔ کچھ نہیں تو قضا کے عہدے سے لے کر شیخ الاسلامی وصدر جہانی کی خدمات تک کی ساری راہیں اپنے سامنے کھلی پا رہے ہیں لیکن اب خالق کی صورت میں جو الٰہ ان کو مل چکا ہے، سینہ اسی کے وزن سے معمور تھا کہ کسی مخلوق کی گنجائش ان کے قلب میں باقی نہ تھی۔ قلب کی اسی کیفیت کی تعبیر تھی جس کا اظہار وہی کبھی کبھی ان مشہور تیز الفاظ میں فرمایا کرتے تھے:

ایمان کس تمام نشود تا ہمہ خلق
در نزدیکی او ہم چو پشک شتر نماید

مجلس مبارک میں دمشق کے ایک شخص کا ذکر ہو رہا تھا جو شیخ الاسلامی کی خدمت کے لیے ساری رات نماز پڑھتا تھا۔ اپنی انہیں نمازوں کو نگاہ خلق میں حصولِ عزت کا ذریعہ بنا رہا تھا۔ جامع ملفوظات راوی ہیں کہ

دریں میان خواجہ ذکر اللہ بالخیر چشم بر آب کردہ برلب مبارک راند بسوز اول شیخ الاسلامی را، پس خانقاہ را، بعدازاں خودرا۔ (فوائد الفواد ص ۲۳)	یہ سن کر حضرت خواجہؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا کہ پہلے شیخ الاسلامی کو جلاؤ، پھر خانقاہ کو آگ لگاؤ، پھر اپنی خودی کو جلا کر خاک کر دو۔

الغرض اس شان کے ساتھ سب کچھ جلا کر بھسم کر کے وہ اجودھن سے روانہ ہوئے اور جس علاقہ کی ولایت آپ کے سپرد ہوئی تھی اسی کے پایہ تخت میں آپ پہنچ گئے۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد ص ۱۵۰)

دہلی میں فقر و فاقہ کی زندگی کا وہ دور شروع ہوا جو اکثر سالکوں کو پیش آتا ہے، لیکن آپ نے صبر و شکر کے ساتھ اس دور کو گذارا۔ اسی اثناء میں حضرت بابا فریدؒ کا انتقال ہو گیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ انتقال کے وقت مجھے یاد فرمایا۔ یہ بھی فرمایا کہ میں بھی اپنے شیخ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی رحلت کے وقت حاضر نہ تھا۔ ہانسی میں تھا۔ فوائد الفواد میں ہے کہ تذکرہ کرتے وقت آپ پر گریہ طاری ہوا کہ تمام حاضرین کے دل متاثر ہوئے اور آنکھیں نمناک۔

کچھ عرصہ کے لیے آپ غیاث پور تشریف لے گئے۔ غیاث پور کے قیام کے دوران خلق خدا اور طالبین کا رجوع شروع ہوا۔ اور یہ رجوع ایسا عام تھا کہ اس کے سامنے سلاطین دہلی کے درباروں کی عظمت ماند پڑ گئی اور امیر خسروؒ کے ان اشعار کی تصویر نظر آنے لگی۔

در حجرہ فقر پادشاہے　　درعالم دل جہاں پناہے
شاہنشہے بے سریر و بے تاج　　شاہانش بہ خاک پائے محتاج

Marfat.com

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ فرماتے ہیں:

"اب فتوحات کا یہ حال تھا کہ دولت کا دریا دروازے کے آگے بہتا تھا۔ کوئی دن فتوحات سے خالی نہ ہوتا۔ صبح سے شام تک لوگ آتے بلکہ عشاء تک، مگر لینے والے لانے والوں سے زیادہ ہوا کرتے۔ اور جو کچھ کوئی لاتا اس سے زیادہ حضرت کی عنایت سے پاتا۔" (سراج المجالس ص ۲۰۲، ملفوظات حضرت چراغ دہلویؒ)

اب حالت یہ تھی کہ خود تو دائم الصائم تھے لیکن دونوں وقت شاہی دسترخوان لگتا اور انواع واقسام کے کھانے وافر مقدار میں چنے جاتے۔ امیر وغریب، شاہ وگدا شہری و پردیسی، صالح اور گنہ گار بلا کسی تفریق کے ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ بڑے بڑے امراء و داعیان کو بھی اس دسترخوان پر حاضری کی آرزو ہوتی تھی۔ اور اس کھانے کی لذت انہیں مہینوں یاد رہتی تھی۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی قدس سرہ نے اس خوان سلطانی کے بارہ میں لکھا ہے:

"آج جن چیزوں پر ایوانِ نعمت کے قصوں کے ساتھ غریبوں کا دکھڑا رویا جاتا ہے، گویا یہ بھی ایک قسم کی حدیث المائدہ (ٹیبل ٹاک) اور ہضم کرنے کا چورن ہے۔ ان کو کیا معلوم کہ اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیۂ اسلام کی یہی خانقاہیں درمیانی لکڑی کا کام دیتی تھیں۔ ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے۔ خود سلطان المشائخ کا کیا حال تھا؟ گذر چکا کہ ولی عہد سلطنت خضر خان تک اسی دربار کا حلقہ بگوش تھا۔ علاء الدین جو سارے ہندوستان سے خراج وصول کرتا تھا، لیکن ایک خزانہ وہ بھی تھا جس میں اسے بھی مال گزاری داخل کرنی پڑتی تھی۔"

(مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ص ۱۵۰)

ایک اور مقام پر حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ فرماتے ہیں:

"غربت وامارت کا یہ سنگم یعنی صوفیہ صافیہ کا یہ طبقہ جہاں امراء وغرباء دونوں

Marfat.com

ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے، اس سے غریب اور حاجت مند مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ اور ان دنوں ہندوستان کا شاید ہی کوئی صوبہ اور کوئی علاقہ ایسا ہو گا جہاں

تو خذمن اغنیائھم و ترد الیٰ فقرائھم

ان کے دولت مندوں سے لیا جائے اور ان کے ضرورت مندوں کو پہنچا دیا جائے۔

کے فرمان نبوی کی تعمیل میں ارباب صدق و صفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا، خصوصاً جن بزرگوں کا کسی خاص وجہ سے امراء اور ارباب ثروت پر اثر قائم ہو جاتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ غرباء کی قسمت جاگ اٹھتی تھی۔''

(مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ص ۲۲۰)

چند صفحات آگے مولانا گیلانیؒ فرماتے ہیں:

''اسلام کے ان اکابر کا حال پڑھیئے اور ان پر غور کیجئے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ امراء اور غرباء کے درمیان ان بزرگوں کا وجود باجود حلقۂ اتصال بنا ہوا تھا...... اور میرا خیال ہے کہ ان خانقاہوں کے لنگر خانے جہاں اپنے اندر دوسری اغراض رکھتے تھے، ایک بڑا کام ان سے یہ بھی نکلتا تھا کہ ملک کے غریبوں، بے وسیلوں کی پناہ گاہ یہ خانقاہیں بنی ہوئی تھیں، بلکہ ان ہی کے ذریعہ سے غریبوں تک بھی وہ نعمتیں پہنچ جاتی تھیں جن کا نام بھی اس زمانہ کے غریبوں نے شاید نہ سنا ہو۔'' (مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ص ۲۲۸)

دستر خوان پر بیٹھنے کی ترتیب اور قاعدہ یہ تھا کہ سب سے آگے مخدوم زادگان (یعنی مرشد سے نسبت قرابت رکھنے والے) ہوتے تھے۔ پھر علماء، پھر رؤسا و اشراف۔

(سیر الاولیاء ص ۲۰۲)

لیکن ان سب باتوں کے باوجود آپ کو سلاطین عہد سے بے تعلقی تھی۔

حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ سے لے کر خواجہ نظام الدین اولیاءؒ تک یہ ایک مسلمہ

Marfat.com

حقیقت تھی کہ ان کو دربار میں جانا ہے اور نہ سلاطین وقت سے ملاقات کرنی ہے۔ اس اصول پر یہ سب حضرات سختی سے کاربند رہے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ خارزار سیاست میں ان کا پاؤں کبھی نہیں الجھا اور انقلابات سلطنت کا ان روحانی مرکزوں اور ان کی سرگرمیوں پر کبھی کوئی اثر نہیں پڑا۔ ان کا اخلاص، ان کی بے غرضی اور بے لوثی سیاست اختلافات کے باوجود مسلم رہی اور یہ بات بھی اسی کا نتیجہ تھی کہ اس سلسلہ کو قبول عام اور بقائے دوام حاصل ہوا۔ جلال الدین خلجی جو ہرشناس اور ارباب فضل وکمال کا قدردان تھا۔ اس نے کئی بار آپ کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت چاہی کبھی منظور نہ ہوئی۔ لیکن جب ایک دفعہ امیر خسرو کے ساتھ بلا اطلاع آنے کا منصوبہ بنایا تو حضرتؒ کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ آپ مرشد کی قبر کی زیارت کی نیت سے اجودھن روانہ ہوگئے۔

سلطان علاء الدین خلجی ہندوستان کا ایک باجبروت اور اقبال مند بادشاہ تھا۔ اس نے امتحاناً ایک عریضہ آپ کی خدمت میں ولی عہد سلطنت خضر خان کے ہاتھ بھیجا جس میں آپ سے انتظام سلطنت کے بارہ میں کچھ مشورے طلب کیے۔ جب خضر خان وہ خط لے کر حاضر خدمت ہوا تو آپ نے وہ خط لے کر اس کا مضمون نہیں پڑھا اور حاضرین سے فرمایا: ہم دعا کرتے ہیں۔ پھر ارشاد فرمایا: درویشوں کا بادشاہوں سے کیا کام؟ میں ایک فقیر اور درویش آدمی ہوں۔ شہر کا ایک گوشہ اختیار کر رکھا ہے۔ بادشاہ اور مسلمانوں کے لیے دعا گوئی میں مصروف ہوں۔ اگر بادشاہ کو یہ پسند نہیں تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ بادشاہ اس جواب سے بہت خوش ہوا اور کہا میں جانتا تھا کہ حضرت کو امور سلطنت و سیاست سے کوئی سروکار نہیں، لیکن بدخواہ چاہتے ہیں کہ مجھے مردان خدا سے لڑوا کر ملک تباہ کروا دیں۔'' اس کے بعد بادشاہ نے معذرت کے ساتھ قدم بوسی کے لیے حاضری کی اجازت چاہی۔ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا ''آنے کی بالکل اجازت نہیں۔ میں آپ کے لیے غائبانہ دعا کرتا ہوں اور غائبانہ دعا بڑی موثر ہوتی ہے۔ سلطان علاء الدین نے اس کے بعد بھی ملاقات کے لیے بڑا اصرار

کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا: ''اس فقیر کے گھر کے دو دروازے ہیں۔ بادشاہ ایک دروازے سے آئے گا اور فقیر دوسرے دروازے سے باہر چلا جائے گا۔'' (سیر الاولیاء ص ۱۳۵)

قاضی ضیاء الدین کا بیان ہے کہ اپنے پورے عہد حکومت میں سلطان کی زبان سے آپ کے بارے میں کوئی خلاف شان بات نہیں نکلی اور اس کو حضرتؒ سے غایت درجہ اخلاص و اعتقاد تھا لیکن اس سب کے باوجود کبھی حضرتؒ سے ملاقات کی نوبت نہ آئی۔

سلطان علاء الدین خلجی کے بعد اس کا دوسرا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ ولی عہد سلطنت خضر خان کو تخت و تاج سے محروم کر کے غاصبانہ تخت سلطنت پر جا بیٹھا۔ خضر خان چونکہ حضرتؒ کا مرید تھا اس وجہ سے قطب الدین حضرتؒ سے بھی ناراض رہتا تھا۔ اس نے ایک نئی جامع مسجد بنوائی۔ اور تمام مشائخ و علماء کو حکم دیا کہ اس مسجد میں آ کر نماز جمعہ ادا کریں۔ سلطان المشائخ نے جواب دیا: ''مسجد نزدیک داریم وایں احق است ہمیں جا خواہیم گذار'' (ہمارے قریب ایک مسجد ہے اس کا حق زیادہ ہے، ہم اس میں نماز پڑھیں گے۔) چنانچہ وہ اس نئی مسجد میں نہیں گئے۔ نوچندی کی ایک تقریب میں آپ کو بلایا گیا آپ اس میں بھی تشریف نہ لے گئے۔ بادشاہ شیخ کے اس وطیرہ سے سخت برہم ہوا۔ اس نے اپنے تمام امراء اور وزراء کو حکم دیا کہ ''کسے بزیارت شیخ غیاث پور نرود۔'' (کوئی شیخ کی زیارت کے لیے غیاث پور نہ جائے) امیر خسروؒ نے لکھا ہے کہ ''بارہا می گفت کہ ہر کہ سر شیخ برد ہزار تنکا اورا دہم'' (کئی دفعہ کہا کہ جو شیخ کا سر لائے گا اس کو ہزار تنکہ دوں گا) بات یہاں تک بڑھ چکی تھی۔ سلطان پریشان تھا کہ اس کے حکم کی تعمیل نہیں ہو رہی تھی۔ سلاطین کے لیے یہ بڑی ہیٹھی کی بات ہوتی ہے اگر ان کے حکم کی تعمیل نہ ہو۔ چنانچہ اب قطب الدین نے بھرے دربار میں یہ دھمکی دی: ''اگر در غرۂ ماہ آئندہ نیامد بیاریم چنانکہ داریم'' گویا کہ یہ ایک دھمکی تھی کہ اب بھی اگر وہ نوچندی کو نہ آئے تو حکومت کے زور سے دربار میں گھسٹوا کر لاؤں گا۔ حضرت سلطان جیؒ کو جب

Marfat.com

بادشاہ نے اس جملہ کی خبر پہنچی تو خاموش ہو گئے۔ کچھ نہ بولے۔ مہینہ ختم ہو رہا تھا اور لوگوں کی تشویش میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ قطب الدین فیصلہ کیے ہوئے ہے کہ "اگر نیامد بیاریم چنانکہ داریم۔" دہلی میں ہر شخص مضطرب اور پریشان تھا کہ دنیا و دین کے دو بادشاہوں کا کل معرکہ ہے اور صرف ایک رات درمیان میں ہے۔ لیکن دیکھا یہ گیا کہ رات گذرنے بھی نہ پائی تھی کہ اسی شب ماہ میں بادشاہ قطب الدین کی جان پر آفت آسمانی نازل ہوئی۔ وہ یہ کہ خسرو خان نے بادشاہ کے سر کے بال پکڑے، دونوں باہم دست و گریبان ہوئے۔ خسرو خان نے سلطان کے پہلو کو خنجر سے چیر کر زمین پر ڈال دیا اور پھر اس کے سر کو تن سے جدا کر دیا کہ بام ہزار ستون سے نیچے زمین پر پھینک دیا۔

ایک بار اسی سلطان قطب الدین کو کسی بداندیش اور بدخواہ نے کہا کہ شیخ ہماری فتوحات قبول نہیں کرتے اور امراء اور سرداروں کی لائی ہوئی فتوحات قبول کرتے ہیں۔ آخر وہ بھی تو یہ سب کچھ آپ ہی کے یہاں سے لے جاتے ہیں۔ سلطان قطب الدین نے یہ سن کر حکم دیا کہ کوئی امیر یا سردار شیخ کے ہاں نہ جائے۔ اور جاسوسوں سے کہا جا کر دیکھو کہ لوگوں کی اس قدر دعوت کہاں سے کرتے ہیں۔ اور جو امیر یا سردار وہاں جائے اس کی بھی مجھے اطلاع کریں۔ حضرت شیخؒ کو جب بادشاہ کی اس بات کا علم ہوا تو فرمایا: آج سے کھانا دگنا پکایا جائے۔ کئی مہینوں کے بعد سلطان نے جاسوسوں سے پوچھا: شیخ کا کیا حال ہے؟ اس کا لنگر بند ہوا ہے کہ نہیں؟ انہوں نے عرض کی: جہاں پناہ! شیخ کے ہاں جس قدر پہلے پکتا ہے اب اس سے دگنا پکتا ہے۔ سلطان نے یہ سنا تو سخت نادم ہوا۔ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے کہا: آپ کا معاملہ عالم غیب سے ہے۔ (خیر المجالس ص ۲۰۳)

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان المشائخ کو بادشاہ کے قرب سے سخت نفرت تھی، اور اہل اللہ کو ہونی بھی چاہیے کیونکہ حدیث میں آتا ہے:

العلماء امناء الدین اذلم یخالطوا الامراء، واذا خالطوهم فهم لصوص الدین۔

Marfat.com

علماء دین کے امین ہیں جب تک وہ امراء اور سربراہان مملکت سے نہ ملیں یعنی ان کا قرب حاصل نہ کریں اور جب وہ ان کا قرب حاصل کرلیں گے تو پھر یہ دین کے چور ہیں۔

وفات سے چالیس روز قبل استغراق وتحیر کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ جمعہ کا دن تھا۔ شیخ پر ایک عجیب کیفیت تھی۔ نماز کے اندر بار بار سجدہ فرماتے تھے۔ اسی عالم تحیر میں مکان تشریف لائے۔ گریہ میں ترقی ہوگئی۔ حالت استغراق میں یہی فرماتے کہ آج جمعہ کا دن ہے۔ دوست کو دوست کا وعدہ یاد آتا ہے اور وہ اس کیفیت میں غرق ہو جاتا ہے۔ بس ہر روز یہی کیفیت تھی۔ غذا بالکل ترک فرمادی تھی۔ کھانے کی خوشبو بھی گوارا نہ تھی۔ گریہ اس شدت سے تھا کہ آنسو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ تھمتے تھے۔

گر نہ بنی گریہ زارم ندانی فرق کرد
کاب چشم است اینکہ پیشت می رود یا آب جو

چالیس روز سے جس طرح کھانا نہیں کھایا تھا اسی طرح بات بھی بہت کم کی تھی۔ آخر چہار شنبہ کے روز ۱۸ ربیع الاول ۷۲۵ھ کو طلوع آفتاب کے بعد زہد وعبادت اور ارشاد وہدایت کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

نماز جنازہ شیخ الاسلام رکن الدین نبیرہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی نے پڑھائی۔ نماز کے بعد شیخ الاسلام رکن الدین نے فرمایا کہ

''اب معلوم ہوا کہ مجھے چار سال تک دہلی میں اس لیے رکھا گیا کہ مجھے اس نماز جنازہ کی امامت کا شرف حاصل ہو۔'' (سیر الاولیاء ص ۱۵۲-۱۵۵)

ساری عمر تجرد میں گزری اس لیے نسبی اولاد کوئی نہ تھی البتہ روحانی سلسلہ سارے ہندوستان میں پھیلا اور ابھی تک جاری ہے۔

حضرت سلطان المشائخ کے مختصر اور اجمالی حالات گذشتہ صفحات میں ذکر کیے

Marfat.com

گئے لیکن اسلام کی اشاعت میں یہ اپنے مرشد حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے پیچھے ہیں۔ بعض تواریخ میں ہے کہ ان کے ہاتھ پر فقط ایک آدمی مسلمان ہوا، اور وہ تلنگانہ کا ایک ہندو تھا جس کا نام کنو تھا۔ وہ خواجہ جہاں ملک احمد ایاز کے ہمراہ آپ کی مجلس میں آنے جانے لگا۔ پھر ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوا اور بالآخر خان جہاں کے نام سے سلطان فیروز تغلق کا وزیر اعظم بنا۔ فوائد الفواد میں ہے کہ ایک دفعہ خواجہ صاحبؒ نے نمناک آنکھوں سے اس امر کا افسوس کیا کہ "ہندوؤں پر کسی کے کہنے کا اثر نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کسی مرد صالح کی صحبت میں آیا جایا کریں تو شاید اس کی برکت سے مسلمان ہو جائیں۔" (ص ۱۸۲) اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ کئی ہندو اسلام کی حقانیت کے قائل تھے لیکن بعض موانع (مثلاً برادری کی مخالفت وغیرہ) کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا کہ "بعض ہندوؤں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اسلام سچا دین ہے لیکن پھر بھی مسلمان نہیں ہوتے۔" (فوائد الفواد ص ۱۳۵) حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے مرشد بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے حالات سے ان دونوں کے درمیان ایک لطیف فرق نظر آتا ہے۔ خواجہ صاحبؒ اصلاح خیالات کے لیے مرد صالح کی صحبت و مجلس کو بڑی اہمیت دیتے تھے جب کہ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ اشاعت مذہب اور تبدیل عقائد میں اظہار کرامت کو دخیل سمجھتے تھے، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت گنج شکرؒ کو جن لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا وہ سادہ اور ضعیف الاعتقاد تھے۔ ان پر کرامات کا بڑا اثر ہوتا تھا، لیکن جو لوگ دارالخلافہ میں رہتے تھے وہ اس قدر سادہ اور ضعیف الاعتقاد نہ تھے۔ ان کے عقائد کو تبدیل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ اس کے لیے ایک عرصہ کا اختلاط ضروری تھا۔

اگرچہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدینؒ غیر مسلموں میں اس طرح اشاعت اسلام نہ کر سکے جس طرح ان کے مرشد نے کیا، تو یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے خود مسلمانوں کی اصلاح خیالات اور تہذیب نفس کی وسیع پیمانے پر کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک ایسا نظام قائم کر دیا جس کے ماتحت ملک

Marfat.com

کے مختلف حصوں میں اشاعت اسلام کا کام انجام پاتا رہا۔ گجرات، دکن اور بنگال میں جو بزرگ اسلام کا سندیسہ لے کر گئے ان میں حسام الدین ملتانی، مولانا کمال الدین، شیخ برہان الدین غریبؒ اور مولانا سراج الدین عثمانؒ خاص طور پر ممتاز ہیں۔ یہ سارے بزرگ حضرت سلطان المشائخ کے خلفائے کبار میں سے تھے۔ یہ سارے بزرگ حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے تربیت یافتہ تھے جو ملک کے مختلف حصوں میں خود رشد و ہدایت بن سکتے تھے اور بنے بھی۔ ان حضرات کے بارہ میں حضرت امیر خسروؒ فرماتے ہیں ؎

واں مریدانِ رہروانِ یقین | ہر یکے والئے ولایت دین
ہمہ شیطان کش فرشتہ خدم | در رہش بر ہوا نہادہ قدم
زندہ دارِ شب ازدم تسبیح | غلغل افگندہ در رواق مسیح
ہر سوار آستینِ شرع ساختہ تاج | دل شاں عرش وسجدہ شاں معراج

چنانچہ ضیاء الدین برنی حضرت خواجہ صاحبؒ کے نیک اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شیخ کے مبارک وجود، ان کے انفاس پاک کی برکت اور ان کی مستجاب دعاؤں کی وجہ سے اس ملک کے اکثر مسلمان عبادت اور زہد کی طرف اور شیخ کی ارادت کی طرف مائل ہو گئے۔ سلطان علاء الدین (خلجی) اپنے تمام گھر والوں کے ساتھ شیخ کا معتقد اور مخلص ہو گیا تھا۔ خواص وعوام کے دلوں نے نیکی اختیار کر لی تھی۔ سلطان علاء الدین کے عہد حکومت کے آخری چند سالوں میں شراب و شاہد، فسق و فجور، قمار بازی، فحاشی، لواطت کے نام بھی لوگوں کی زبانوں پر نہیں آنے پائے۔ کبیرہ گناہ لوگوں کو کفر کے مشابہ معلوم ہونے لگے۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے سود خوری اور ذخیرہ اندوزی کے برملا مرتکب نہ ہو سکتے تھے۔ اور خوف کے مارے دکان داروں سے جھوٹ، کم تولنے اور آمیزش کا رواج اٹھ گیا تھا۔ اکثر طالب علموں اور بڑے بڑے لوگوں

Marfat.com

کی رغبت جو شیخ کی خدمت میں رہتے تھے تصوف اور احکام طریقت کی کتابوں کے مطالعہ کی طرف ہوئی تھی ...... اور کوئی پگڑی ایسی نہ تھی جس میں مسواک اور کنگھی نہ لٹکی ہو اور اہل تصوف کی کثرت خرید کے باعث چمڑے کے طشت اور لوٹے مہنگے ہو گئے تھے۔" (تاریخ فیروز شاہی ص ۱۴۵-۱۴۶)

شیخ شرف الدین بو علی قلندرؒ:

شیخ شرف الدین بو علی قلندر قطب جمال ہانسویؒ کے خالہ زاد بھائی تھے اور حضرت خواجہ نظام الدین کے ہم عصر تھے۔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد ایک فقیر کے اثر سے درس و تدریس چھوڑ کر جنگل میں نکل گئے اور قلندروں کے آزادانہ طریقے اختیار کر لیے۔ آپ کی بیشتر عمر استغراق اور جذب کی حالت میں گزری۔ اور جب رمضان المبارک ۱۳۲۴ء میں وفات پائی تو آپ کے پاس کوئی نہ تھا۔ تین روز تک کسی کو ان کی رحلت کا پتہ نہ چلا۔ تیسرے روز چند لکڑ ہارے آئے جنہوں نے آپ کی نعش مبارک دیکھی اور آپ کی تدفین کی۔ آپ کا مزار پانی پت میں ہے۔

پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ پانی پت کے علاقے میں جو مسلمان راجپوت ہیں وہ آپ ہی کی بدولت مسلمان ہوئے اور ان کا مورث اعلیٰ امر سنگھ آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ:

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے دادا مکہ مکرمہ سے پہلے خوارزم اور وہاں سے مضافات ملتان میں تشریف لائے اور آپ کے نانا منگولوں کے حملے میں وطن چھوڑ کر ہندوستان آئے اور کوٹ کروڑ میں آباد ہو گئے۔ شیخ بہاء الدین یہیں ۱۱۷۲ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد آپ خراسان چلے گئے اور وہاں سات برس تک علوم ظاہری اور باطنی کی تکمیل کی۔ پھر بخارا میں اس سلسلہ کو جاری و ساری رکھا۔ بعد ازیں حج کے لیے تشریف لے گئے اور مدینہ

Marfat.com

منورہ میں پانچ برس تک روضہ رسولؐ کی مجاوری کی اور شیخ کمال الدین محمد یمنی سے جو اپنے زمانے کے ایک بہت بڑے محدث تھے، حدیث کی سند لی۔ پھر بغداد تشریف لائے اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ (سیر العارفین ص ۱۰۳) مرشد کی خدمت میں سترہ روز رہے تھے کہ ان کی باطنی حالت کی بلندی کو دیکھ کر انہوں نے خرقہ خلافت سے نواز دیا۔ خرقہ خلافت سے سرفراز ہونے کے بعد مرشد کے حکم کے مطابق آپ ملتان تشریف لائے اور پھر یہیں مستقل طور پر قیام فرمالیا۔ (سیر العارفین ص ۱۰۹)

ملتان آ کر آپ نے جلد ہی بڑا اقتدار و اعتبار حاصل کر لیا بلکہ ملتان، سندھ اور بلوچستان کو آپ کی روحانی سلطنت سمجھا جاتا تھا۔

حضرت بہاء الدین زکریاؒ کے مواعظ بڑے موثر ہوتے تھے، چنانچہ آپ کے مواعظ سن کر سندھ، ملتان اور لاہور کے ہندوؤں میں سے بھی بے شمار لوگ جن میں شامل تاجر اور بعض والیان ملک بھی تھے، حلقہ اسلام میں داخل ہوئے اور آپ کے حلقہ ارادت میں بھی شامل ہو گئے۔ عامۂ خلائق کو فائدہ پہنچانے کے لیے حضرتؒ نے زراعت اور تجارت کے کام کو آہستہ آہستہ آگے بڑھایا۔ ملتان کے ارد گرد کئی افتادہ زمینوں کو آباد کیا۔ کنویں اور نہریں کھدوائیں اور تجارت کی طرف بہت توجہ فرمائی۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے جو ملتان سے تھوڑے فاصلہ پر اجودھن میں مقیم تھے، آپ کے دوستانہ تعلقات تھے۔ بعض روایات کے مطابق یہ دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی تھے۔ آپ کے بے شمار مرید تھے اس وجہ سے آپ سے سلسلہ سہروردیہ کو ہندوستان میں ایک اہم مقام حاصل ہو گیا۔ ان کے زمانہ میں شیخ الاسلام سید نور الدین مبارک غزنویؒ اور شاہ ترکمان بیابانیؒ بھی سہروردی سلسلہ سے منسلک تھے، لیکن ان سے یہ سلسلہ زیادہ چلا نہیں۔ اور ہندوستان میں سہروردی سلسلہ کا مورث اعلیٰ شیخ بہاء الدین ہی کو سمجھنا چاہیے۔

ان دنوں ملتان کا گورنر سلطان محمد غوری کا غلام ناصر الدین قباچہ تھا۔ سلطان

Marfat.com

قطب الدین ایبک کی وفات تک تو وہ سلطان دہلی کا وفادار صوبیدار رہا لیکن جب ایبک کی وفات کے بعد اس کا غلام شمس الدین التمش بادشاہ بنا تو قباچہ نے خود مختاری کا ارادہ کیا۔ شیخ بہاء الدین اس کے اس ارادہ کو بھانپ گئے، چنانچہ انہوں نے اور قاضی شرف الدین قاضی ملتان نے خط کے ذریعہ قباچہ کے اس ارادے کی سلطان شمس الدین التمش کو اطلاع دینی چاہی۔ لیکن اتفاقاً دونوں کے خطوط قباچہ کے ہاتھ جا لگے۔ قاضی شرف الدین کو تو اس نے فوراً قتل کرا دیا، لیکن شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے عقیدت مند چونکہ بہت زیادہ تھے، اس لیے ان کو قتل کرانے کی تو قباچہ کو جرأت نہ ہوئی اس وجہ سے شیخؒ سے باز پرس ہوئی کہ یہ خط آپ نے لکھا ہے؟ اور کیوں لکھا ہے؟ شیخ زکریاؒ نے فرمایا: کہ یہ خط میں نے لکھا ہے اور ارشاد الٰہی کے مطابق لکھا ہے کیونکہ تمہاری اس خود مختاری سے سوائے مسلمانوں کا خون بہنے کے اور کچھ نہ ہوگا۔ چنانچہ شیخ کے ملتان میں اثر ورسوخ اور لوگوں کی عقیدت کو دیکھ کر انہیں آزار پہنچانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر کار اس نے التمش کے خلاف بغاوت کر دی اور جب التمش نے اس کا تعاقب کیا تو وہ دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گیا۔ ملتان میں آپ کے اثر ورسوخ اور لوگوں کی ان سے عقیدت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ ۱۲۵۷ء میں منگول ملتان میں داخل ہو گئے اور وہ شہر میں قتل وغارت اور تاخت وتاراج شروع کرنے کو تھے تو حضرت شیخ بہاء الدین زکریا قدس سرہ ایک لاکھ درہم نقد لے کر پہنچے اور مغلوں کو یہ رقم ادا کر کے شہر کو قتل وغارت اور تباہی سے بچالیا۔

شیخ بہاء الدینؒ نے ۶۶۱ھ مطابق ۱۲۶۲ء میں ملتان میں وفات پائی اور ان کی مرقد ملتان کی سب سے بڑی زیارت گاہ ہے۔ آپ کے خلفاء میں فارسی کے مشہور شاعر عراقی ہیں جو آپ کے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے بھانجے اور آپ کے داماد تھے۔ عراقی کے علاوہ امیر حسینی، اور آپ کے صاحبزادے شیخ صدر الدین عارف اور پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتحؒ اور اُچہ کے بخاری سیدوں کے موسس اعلیٰ سید جلال الدین منیر شاہ میر سرخ بخاری اور سندھ کے لال شہباز قلندر قابل ذکر ہیں۔

آپ کے پوتے شیخ رکن الدین ابوالفتح" بھی ملتان کے بہت بڑے اولیاء کرام میں سے شمار ہوتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی آپ کا بڑا معتقد تھا۔ آپ اس کی زندگی میں دو دفعہ دہلی آئے۔ بادشاہ نے بڑی عقیدت سے ان کا استقبال کیا اور رخصت کے وقت کئی لاکھ تنکے نذر کیے۔ آپ نے وہ سب رقم مستحقین میں تقسیم فرما دی۔ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین نے انتقال فرمایا تو اس وقت آپ دہلی میں تھے اور ان کی نماز جنازہ آپ ہی نے پڑھائی۔ آپ کی وفات ۱۳۳۴ء عیسوی میں ہوئی۔ اور ملتان میں دفن ہوئے۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ نے افغانوں میں جن میں اکثر و بیشتر غیر مسلم تھے، اسلام کی دعوت دی اور انہیں مسلمان کیا۔

سید جلال الدین بخاریؒ:

پنجاب میں ملتان کے بعد اشاعت اسلام کا دوسرا بڑا مرکز اُچہ تھا جو پنج ند یعنی پانچ دریاؤں کا سنگم ہے، کے قریب واقع ہے۔ اچہ کے دو حصے ہیں۔ ایک گیلانیہ اور دوسرا محلہ بخاریاں۔ سب سے پہلے جس سہروردی بزرگ نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے اچہ کو امتیاز بخشا وہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے خلیفہ سید جلال الدین منیر شاہ میر سرخ بخاریؒ تھے۔ اس زمانے میں اچہ کو دیوگڑھ کہتے تھے اور یہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ آپ جب اچہ تشریف لائے تو اسلام کو رونق ہوئی۔ اچہ کے راجہ نے آپ کی مخالفت کی لیکن آخر کار اسے اپنی ریاست سے ہاتھ دھونے پڑے اور یہ شہر اشاعت اسلام کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا۔ پنجاب میں آپ نے شہر جھنگ آباد کیا اور ایک مدت تک مغربی پنجاب میں اشاعت اسلام کی۔ راجپوتوں کے کئی قبائل نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا جس کی فہرست ریاست بہاول پور کے سرکاری گزٹیئر میں درج ہے۔ ہندوستان کے بخاری سیدوں کا سلسلہ آپ پر ختم ہوتا ہے۔ آپ نے ۹۵ برس کی عمر میں ۱۲۹۱ء میں وفات پائی اور اچہ ہی میں آپ کا مزار ہے۔

Marfat.com

شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے ایک اور خلیفہ حضرت موسیٰ نوابؒ نے بھی اس علاقہ میں تبلیغ اسلام کی۔ ان کے دادا کیچ مکران کے نواب تھے۔ ان کے ہاتھ پر دو قبیلے مسلمان ہوئے۔

اچہ کے ایک اور صاحب سطوت بزرگ شیخ جمال الدین اچویؒ تھے۔ وہ بھی شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے مرید تھے۔ ان کی وفات ۱۳۰۰ عیسوی میں اچہ میں ہوئی اور وہیں ان کا مزار ہے۔ ان سب حضرات نے ان علاقوں میں اسلام کی خوب نشرو اشاعت کی۔ بعض حضرات نے ان کی تبلیغی کوششوں کے کامیاب ہونے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ علاء الدین خلجی کی فتوحات سے کئی قوموں نے جن میں راجپوتانہ کے راجپوت بھی تھے، نقل مکانی کی۔ اس خانہ بدوشی اور بے سروسامانی کی حالت میں انہیں ان بزرگوں کا پیام اسلام آب حیات ثابت ہوا۔ ان علاقوں میں جس قدر مسلمان آباد ہیں ان کی غالب اکثریت انہی کی تبلیغی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ:

اچہ کی جس شخصیت نے حضرت سید جلال الدین بخاریؒ سے بھی زیادہ نام پایا، وہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ تھے۔ ان کا پورا نام سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت ہے۔ آپ سید جلال الدین بخاریؒ کے پوتے تھے۔ آپ کا زیادہ زمانہ سیرو سیاحت میں گذرا اس لیے آپ کو مخدوم جہانیاں جہاں گشت کہتے ہیں۔ آپ نے اندرون اور بیرون ہند بہت سیاحت کی اور اس دوران ۳۶ حج بھی کیے اور متعدد بزرگوں سے استفادہ فرمایا۔ سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا شیخ صدر الدین سے خرقہ خلافت حاصل کیا، پھر ملتان جا کر شیخ الاسلام رکن الدین ابوالفتحؒ کے پاس علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کی۔ آپ حضرت چراغ دہلی کے بھی مرید تھے۔ مکہ مکرمہ میں آپ نے اپنا بہت سا وقت امام عبداللہ یافعیؒ کی صحبت میں گذارا۔ اور مدینہ منورہ میں دو سال قیام کر کے سند المحدثین شیخ عفیف الدین عبداللہ المطریؒ سے عوارف المعارف اور سلوک

Marfat.com

کی دوسری کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں اور ان سے باطنی نعمتوں سے مالا مال ہوئے۔ ان کے بارہ میں یہ مشہور ہے کہ آپ کو چودہ خانوادوں سے بیعت کی اجازت تھی۔

سلطان محمد تغلق نے اپنے عہد حکومت میں آپ کو شیخ الاسلام کا منصب اور سیوستان میں خانقاہ محمدی اور مضافات کی سند عطا کی تھی۔ فیروز تغلق بھی آپ کا بڑا ادب کرتا تھا۔ فیروز تغلق اگرچہ شیخ الاسلام شیخ علاء الدین اجودھنی نبیرہ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کا مرید تھا لیکن حضرت مخدوم جہانیاںؒ کا وہ جس طرح ادب اور پاس کرتا تھا اس کے بارہ میں ضیاء الدین نے تاریخ فیروز شاہی میں تفصیل سے لکھا ہے۔

الدر المنظوم میں بعض جگہ حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے ہاتھ پر ہندوؤں کے مسلمان ہونے کا ذکر ہے اور ایک جگہ گجرات کے ایک راجپوت مولی الاسلام کا ذکر ہے جو حضرت مخدومؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا اور جسے آپ نے تعلیم دے کر گجرات اس لیے بھیجا کہ اپنے گھر والوں اور قوم کو مسلمان کرے۔ (ص ۳۲) پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھا ہے کہ مخدوم جہانیاں نے گجرات میں اشاعت اسلام کا کام کیا۔ حضرت قطب عالم اور حضرت شاہ عالم جن کے مزار احمد آباد گجرات میں مرجع خلائق ہیں، آپ کے پوتے اور پڑپوتے تھے۔

مغربی پنجاب کے جن قبائل نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، بہاول پور کے سرکاری گزٹیئر میں اس کی فہرست درج ہے۔ ان قبائل کی تعداد آٹھ ہے اور ان میں کھرل راجپوتوں کا مشہور اور بڑا قبیلہ بھی شامل ہے۔ آپ کا فیض پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ کی وفات ۷۷ برس کی عمر میں ۱۳۸۴ء میں ہوئی۔

سید راجو قتالؒ:

سید صدر الدین جو راجو قتال کے نام سے معروف تھے، حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے بھائی تھے۔ یہ ان کے بعد آبائی مسند پر بیٹھے۔ یہ نہایت با اثر بزرگ تھے۔ انہیں بڑی بڑی ریاضتوں اور مجاہدوں کی وجہ سے قتال یعنی قتال نفس کہتے ہیں۔ حضرت شیخ

Marfat.com

عبدالحق محدث دہلوی ان کے بارہ میں لکھتے ہیں: "پیوستہ در عالم استغراق بودو با خلق انبساط وانبساط نہ کردے۔" ان کی طبیعت میں اسلام کی تبلیغ کا بڑا جوش اور جذبہ تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے جو ایک ہندو نواہون نامی کے بارہ میں پیش آیا جسے مسلمان بنانے یا مسلمان ثابت کرنے کے لیے آپ نے اچہ سے دہلی کا سفر کیا۔ تفصیل اس کی کتابوں میں کچھ یوں ہے کہ جب حضرت مخدوم جہانیاںؒ مرض الموت میں تھے تو وہاں کا ہندو تحصیل دار نواہون نامی حضرت کی بیمار پرسی کے لیے آیا۔ اور گفتگو کے دوران کہنے لگا: جس طرح اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ختم الانبیاء بنایا تھا اسی طرح حضرت مخدوم جہانیاں ختم الاولیاء ہیں۔ نواہون کے اس جملہ پر سید راجو قتالؒ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی ماننے کی وجہ سے تم مسلمان ہو گئے اب اسلام کے احکام کی بجا آوری تم پر لازم ہے، وگرنہ تم مرتد سمجھے جاؤ گے اور مرتد کی سزا اسلام میں قتل ہے۔ نواہون مسلمان ہونے یا مسلمان کہلوانے پر راضی نہ تھا چنانچہ وہ بھاگ کر دہلی چلا گیا اور فیروز تغلق بادشاہ دہلی کی خدمت میں ساری بات عرض کر دی۔ ادھر حضرت سید راجو قتالؒ اپنے بھائی حضرت مخدوم جہانیاںؒ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب فیروز تغلق نے یہ بات سنی تو اس نے علماء سے اس بارہ میں استصواب کیا۔ انہوں نے نواہون کو مسلمان ہونے کے بارہ میں کہا لیکن وہ کسی صورت نہ مانا۔ اب بادشاہ سخت مخمصے کی حالت میں تھا۔ وہ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈنا چاہتا تھا کہ سید راجو قتالؒ بھی ناراض نہ ہوں اور نواہون پر بھی ناجائز جبر نہ ہونے پائے۔ حاضرین دربار میں سے شیخ محمد جو قاضی عبدالمقتدر کا ذہین اور تیز طبیعت لڑکا تھا اس نے بادشاہ سے کہا کہ جب سید راجوؒ تشریف لائیں تو آپ ان سے کہیں کہ کیا آپ نواہون کا فر کا قضیہ فیصلہ کرنے آئے ہیں؟ یقین ہے کہ وہ "ہاں" کہیں گے۔ پھر ان کے لیے نواہون کو مسلمان کہنا مشکل ہو جائے گا۔ بادشاہ کو یہ بات پسند آئی۔ چنانچہ جب سید صاحب تشریف لائے تو بادشاہ نے ان سے یہی کہا، لیکن سید صاحب نے فوراً جواب دیا، میں تو نواہون مسلمان کا، جس نے میرے اور

معتبر گواہوں کے سامنے اپنے اسلام کا اقرار کیا ہے فیصلہ کرنے آیا ہوں۔ اس پر شیخ محمد نے کہا اس نے دل سے اسلام کا اقرار نہیں کیا اور شریعت میں اس کا اسلام ثابت نہیں۔ آپ اسے کس طرح مسلمان کہتے ہیں۔ اس پر سید راجو قتالؒ کو جوش آ گیا۔ انہوں نے غصے سے لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ اسی وقت درد شکم سے تڑپنے لگا اور تھوڑی دیر بعد مر گیا۔ بادشاہ نے جب یہ واقعہ دیکھا تو پریشان ہو گیا اور چپ چاپ نواہون کو سید راجو قتالؒ کے سپرد کر دیا۔ آپ نے اسے مسلمان ہونے کے لیے کہا لیکن وہ پھر بھی نہ مانا۔ اس پر آپ نے ارتداد کا جرم ثابت کر کے اس کو قتل کر دیا۔ (سیر العارفین ص ۱۵۹-۱۶۰)

یہ تو ایک واقعہ ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہیں اسلام سے کس قدر محبت تھی اور وہ اشاعت اسلام کے لیے کس قدر کوشاں تھے۔ آپ کا اصل کام بھی اچہ میں اشاعت اسلام اور گجرات وغیرہ کے صاحب ہمت بزرگوں کی تربیت ہے۔ جنہیں آپ نے علوم باطنی سے مالا مال کر کے گجرات کے علاقہ میں اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ آپ کا انتقال ۸۲۷ھ میں ہوا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اچہ میں ملتان، لاہور اور دہلی کی طرح کسی بزرگ کی قبر پر عالی شان عمارت نہیں ہے لیکن پھر بھی اچہ کی زمین میں ایک خاص کشش اور جاذبیت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں۔

گویند زمین اچہ وصحرائے اور کیفیتے وحالتے دارد کہ در زمین ہائے دیگر نیست

کہتے ہیں کہ اچہ کی سرزمین اور اس کے صحرا میں ایک ایسی کیفیت ہے جو دوسری کسی سرزمین میں نہیں ہے۔

پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ ”اچہ کے مشرق میں قریباً ایک میل کے فاصلے پر حسن کبیر الدین کا مزار ہے جو سید صدرالدین کے بیٹے تھے اور سید صدرالدین سید جلال الدین کے ہم عصر تھے۔ کہتے ہیں کہ سید صدرالدین اور ان کے صاحبزادے دونوں نے بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا تھا۔ حسن کبیر الدین کی قوت تاثیر کے متعلق

مشہور ہے کہ جونہی ان کی نگاہ کسی ہندو پر پڑتی تھی وہ فوراً اسلام قبول کر لیتا تھا۔

دعوت اسلام میں صوفیائے کرام کا حصہ:

لاہور، ملتان اور اچہ کے بزرگوں کے تذکرہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب میں اسلام بادشاہوں کی تلوار سے نہیں بلکہ اہل اللہ اور صوفیائے کرام کی تبلیغ، دعوت اور ان کے فیض و برکت سے اشاعت پذیر ہوا۔ چنانچہ مختلف اضلاع اور علاقوں کے گزٹیئر جو گورنمنٹ نے مرتب کرائے ان میں مقامی باشندوں کی مذہبی سرگزشت کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ ان سے بھی ہماری اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ ضلع ملتان کا گزٹیئر سر ایڈورڈ میکلیگن نے مرتب کیا تھا۔ یہ ایک زمانہ میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے نائب صدر تھے اور اہل علم میں اپنی تاریخی تصانیف کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی رپورٹ میں علاقے کی مذہبی تاریخ پر ان الفاظ سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''خراسان اور مغربی ایران کی تباہی سے ایک لحاظ سے ہندوستان کے اس حصہ (مغربی پنجاب) کو بہت فائدہ ہوا کیونکہ ان کی وجہ سے علماء اور صلحاء کی ایک بہت بڑی تعداد ترک وطن کر کے یہاں آ گئی۔ جن میں سے بعض تو دارالحکومت دہلی کی طرف چلے گئے لیکن بہت سے ملتان کے علاقے میں بھی آباد ہو گئے۔ غور افغانوں کی ابتدائی بل چل کے زمانے میں ہی گردیزی سیدوں کا ایک خاندان اس ضلع میں آباد ہوا تھا۔ اور اس سے کچھ عرصہ بعد لیہ ضلع ڈیرہ غازی خان کے قریب کوٹ کروڑ میں خوارزم سے ترک وطن کر کے قریشوں کا ایک خاندان آباد ہوا جس میں شیخ بہاء الدین زکریا بہاء الحق پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تمام دنیا کی سیر و سیاحت کے بعد ملتان کو اپنا وطن اور مستقر بنایا۔ اسی زمانے میں سبزوار سے پیر شمس تبریز اور کاشان سے قاضی قطب الدین ملتان وارد ہوئے۔ اور پاک پٹن میں بابا فرید گنج شکرؒ اور دہلی میں (ملتان کے راستہ سے) خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ رونق افروز

Marfat.com

ہوئے۔ اچہ میں سید جلال بخاریؒ جو ملتان، مظفر گڑھ اور بہاول پور کے کئی خانوادوں کے مورث اعلیٰ ہیں، اسی زمانہ میں تشریف لائے۔ اور انہی ایام کے قریب قریب سلطان سخی سرورؒ نے فروغ پایا جن کے والد بخارا سے آکر ضلع ملتان کے شہر سکوٹ میں آباد ہوئے تھے۔ ان مقدس ہستیوں اور ان کے بے شمار رفقائے کار نے اس علاقے کے ہندوؤں میں اسلام پھیلانے اور ان کو دعوت اسلام دینے کا بیڑا اٹھایا۔ اور یہ ان بزرگوں کی تلقین اور ان کے اثر کا، نہ کہ کسی بادشاہ یا سلطان کی تیغ آزمائی کا نتیجہ ہے کہ اب مغربی پنجاب کے اکثر و بیشتر باشندے مسلمان ہیں۔ ابتداء میں مسلمانوں نے اشاعت اسلام کے بارہ میں جو سرد مہری برتی تھی، وہ اس مذہبی جوش کی وجہ سے جو منگولوں اور مسلمانوں کی کشمکش میں پیدا ہوا، جاتی رہی۔ اب ایک بادشاہ کے مقبرے میں ایک دینی بزرگ (شیخ رکن عالم) کو جگہ ملی اور اس زمانے میں ملتان کی ان مقدس ہستیوں اور مقدس مقامات کا آغاز ہوا جن کی بدولت ملتان کو تمام اسلامی دنیا میں ایک غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔''

پھر اسی گزٹیئر میں سرایڈورڈ میکلیگن نے مختلف قبائل کا ذکر کرتے ہوئے بعض مشہور قبائل کے قبول اسلام کی تاریخ بھی لکھی ہے، مثلاً راجپوتوں میں سیال ایک مشہور قبیلہ ہے، جو ملتان، ساہیوال، اور جھنگ میں کثرت سے آباد ہے۔ یہ قبیلہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا۔ نون مخدوم جہانیاںؒ کے ہاتھ پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے اور جویہ راجپوتوں کو شیخ رکن عالمؒ نے مسلمان کیا تھا۔ اسی طرح کھرل راجپوتوں نے حضرت مخدوم جہانیاںؒ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اور اچہ سے یہ قبیلہ بڑھتا بڑھتا دریائے راوی کے دونوں طرف پھیل گیا۔ اسی طرح وٹو قبیلہ کو جو ستلج کے دونوں بازوؤں پر ساٹھ میل تک اور علاقہ گوگیرہ میں آباد تھا، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے مسلمان کیا۔ سیال بھی ۱۲۵۸ء میں حضرت بابا فرید کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

......❀......

اکبری فتنہ اور اس کے برگ و بار

دسویں صدی ہجری میں سرزمین ہند میں ایک بہت بڑا فتنہ رونما ہوا جس نے ذہنوں میں انتشار، عقائد میں عظیم تزلزل دین کی صحیح تعلیم اور کتاب وسنت کے علم سے نہ صرف غفلت و جہالت بلکہ وحشت و نفرت پیدا ہوگئی۔ اہل یونان کے علوم کو عقل انسانی کی آخری منزل قرار دیا جانے لگا اور اسی کو حکمت، علوم دانشمندی اور انسانی علوم کا نقطہ کمال کہا جانے لگا۔ علوم نبوت، صحف آسمانی، وحی و تنزیل اور نصوص قرآنی کی تضحیک و تحقیر کی جانے لگی، اور ان پر ایمان لانے کو جہل، کورانہ تقلید اور عقل دشمنی قرار دیا جانے لگا۔ پھر اس کے ساتھ اس وقت کی حکومت اور سیاسی نظاموں سے بیزاری بھی بغاوت و اشتعال کی حد تک پہنچ گئی۔ دسویں صدی کے نصف آخر میں عالم اسلام کے مختلف حصوں میں خاص طور پر اس کے سب سے بے چین، طباع اور تخلیقی و اختراعی صلاحیت رکھنے والے خطہ ایران میں جس کو بہت سی مماثلتوں کی وجہ سے مشرق کا یونان کہنا صحیح ہوگا، اس خیال کے عکس نظر آتے ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ایک ہزار سال پورے ہو رہے تھے اور دوسرا ہزار شروع ہو رہا تھا۔ ہر صدی کے سرے پر مجدد کا ظاہر ہونا حدیث سے ثابت ہوتا ہے اور تاریخ اسلامی بھی اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے، اس لیے بعض ذہین لوگ مجدد سے زیادہ دین جدید کے موسس و بانی اور عالم کے نئے دور کے فاتح کے ظہور کے خواب

دیکھنے لگے تھے اور ان میں سے منچلے لوگوں نے اپنا نام اس منصب کے امیدواروں میں لکھانے کی کوشش بھی شروع کر دی۔ اور بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ: ''ایران میں صفوی حکومت کے قیام کے بعد جس نے شیعیت کو حکومت کی طاقت اور اقبال سے سارے ایران کا مذہب بنا دیا تھا، اور اگرچہ اس سلطنت کے بانیوں کے مورث اعلیٰ شیخ صفی الدین مسلکاً و ذوقاً صوفی تھے، لیکن شیعیت کو چونکہ تصوف سے بیر ہے، ان کے دور اقتدار میں اس ایران میں جس نے امام غزالی طوسی۔ شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری، مولانا جلال الدین رومی (جو اصلاً بلخ واقع خراسان کے رہنے والے تھے حال واقع افغانستان) اور مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ جیسے عارف و محقق پیدا کیے تھے اور جس سے بغداد و دہلی و اجمیر کو پیران پیر سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ، خواجۂ بزرگ شیخ معین الدین چشتیؒ اور شہید عشق خواجہ قطب الدین کعکیؒ اوشی میسر آئے تھے، تصوف کا چراغ بالکل گل ہو گیا۔ دوسری طرف کتاب و سنت کا وہ علم اور فن حدیث جس کا ایران بڑا مرکز رہ چکا تھا اور جس نے تاریخ اسلام کو مسلم بن الحجاج القشیری نیشاپوریؒ، ابوعیسیٰ ترمذیؒ، ابو داؤد سجستانی، ابن ماجہ قزوینی اور حافظ عبدالرحمٰن نسائی جیسے امام حدیث اور مصنفین صحاح عطا کیے، وہ اب کتاب و سنت اور علوم حدیث سے بالکل بیگانہ اور تہی دامن تھا۔ اب اس کے علم کا تمام سرمایہ اور اس کے امتیاز و تفوق کا میدان یونانی علوم و حکمت (فلسفہ و منطق) تھے۔ اس انقلاب نے جس نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ اور ان کی سنت و احادیث سے اس مردم خیز اسلامی ملک کا رشتہ پہلے ہی کاٹ دیا تھا، ملک کے ذہین اور طباع طبقہ کا رابطہ نبوت محمدی، عقیدۂ ختم نبوت اور دین اسلام کے خلود و بقا کے عقیدہ سے اگر منقطع نہیں کیا تو کمزور ضرور کر دیا۔ اور اگر اہل بیت کرام سے (شیعیت کی بنیاد پر) عقیدت و نسبت نہ ہوتی تو اس ملک کا مجوسیت، ماقبل اسلام کی تہذیب اور شاہنامۂ فردوسی کے رستم و اسفندیار کے دور کی طرف واپس چلے جانے کا خطرہ تھا۔''

اس دسویں صدی میں اگرچہ عالم اسلام کی سیاسی، دینی، روحانی اور علمی

Marfat.com

حالت کوئی خاص خراب نہ تھی لیکن یہ بھی نہیں کہ زندگی کے دریا میں جو ہزاروں میل کی مسافت میں بہہ رہا تھا، کامل سکون تھا جس میں دین کی نشر و اشاعت، اس کی تعلیم و تربیت اور اخلاق و روحانیت کی ترقی کی کشتی پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ چلائی جا سکتی تھی، اور اس کو کسی بھنور اور تلاطم کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ لیکن معاملہ ایسا نہ تھا بلکہ ہندوستان کے اسلام کے دینی اور ثقافتی مرکز حجاز مقدس سے دور ہونے، اسلام کے یہاں ایران اور ترکستان کا پھیر کاٹ کر پہنچنے، عربی زبان کے رائج نہ ہونے، علم حدیث کی عدم اشاعت جس سے دین کی تشخیص روح، سنت و بدعت کا فرق اور صحیح دینی احتساب کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، حج اور طلب علم کے لیے بیرونی ملکوں کے سفر کی دشواریوں اور مسلمانوں کا غیر مسلموں کی اکثریت میں گھرے رہنے نے (جو اپنے مذہب میں نہایت سخت اور راسخ الاعتقاد، غیر اسلامی رسم و رواج کی سختی سے پابند اور حد درجہ توہم پرست تھی) ہندوستان کے مسلمانوں کی تشتت و انتشار پسند دعوتوں، اور طالع آزما مذہبی پیشہ وروں کی آسان چراگاہ بنا دیا تھا۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی تشیع کی وہ غالی اور جارحانہ شکل تھی جو ایرانیوں کے اثر سے جنوبی ہند کے بعض مقامات اور کشمیر میں پیدا ہوئی۔ تاریخ فرشتہ وغیرہ میں ہے کہ دسویں صدی کے وسط میں احمد نگر کے والی سلطنت برہان نظام شاہ نے شیخ طاہر بن رضی اسماعیلی قزوینی کے اثر سے جو ایران سے شاہ اسماعیل صفوی کے ظلم و ستم کے خوف سے بھاگ کر احمد نگر آ گئے تھے، تشیع قبول کر لیا اور اس میں بڑا مبالغہ کیا یہاں تک کہ مسجدوں، خانقاہوں، بازاروں اور سڑکوں پر خلفائے ثلاثہ (سیدنا ابوبکرؓ، سیدنا عمرؓ اور سیدنا عثمانؓ) پر علی الاعلان تبرا کرنے کا حکم دیا۔ اس خدمت کے انجام دینے والوں کے بڑے بڑے مشاہرے مقرر کیے۔ اہل سنت میں سے بہت سے لوگوں کو قتل اور گرفتار کیا۔ دوسری طرف میر شمس الدین عراقی کی کوششوں سے کشمیر میں تشیع پھیلا۔ انہوں نے اپنے اس مذہب کی اشاعت میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ کہتے ہیں کہ ۲۴ ہزار ہندو شیعہ ہو گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک جدید مذہب بھی ایجاد کیا جس کا نام نور بخشی تھا۔ اس مذہب کے مسائل نہ تو اہل سنت کے مطابق تھے

اور نہ فرقہ امامیہ کے مسائل کے مطابق تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں اس نور بخشی فرقہ کا عقیدہ یہ تھا کہ سید محمد نور بخش مہدی موعود تھے۔

شیر شاہ سوری سے شکست فاش کھا کر ۹۵۰ھ میں فوجی امداد اور سلطنت ایران کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ہمایوں ایران گیا۔ اس وقت ایران میں اسماعیل صفوی جیسے متعصب اور ظالم بادشاہ کا بیٹا طہماسپ تخت نشین تھا۔ طہماسپ نے ہمایوں سے مذہب تشیع قبول کرنے کی شرط لگائی کہ فوجی مدد اس صورت میں کی جائے گی جب ہمایوں مذہب شیعہ قبول کرے گا۔ ہمایوں نے کہا کہ ایک پرچہ پر تمام معتقدات لکھ دیے جائیں۔ بادشاہ نے بطریق نقل اس کو پڑھ دیا۔ (منتخب التواریخ جلد اص ۴۴۵) بادشاہ کے تبدیلی مذہب کی اگرچہ کوئی مستند شہادت نہیں ہے لیکن اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ایران کے قیام کے دوران میں شاہ ایران کی فیاضانہ میزبانی اور مسافر نوازی کے لیے وہ نرم گوشہ ضرور پیدا ہو گیا ہو گا جو اس کے راسخ الاعتقاد تیموری آباء و اجداد کے دل میں (جو راسخ الاعتقاد سنی حنفی تھے) پایا نہیں جاتا تھا۔ ہمایوں کی مدد کے لیے ایران سے امرائے قزلباش آئے تھے اور پھر اس کے ساتھ شیعہ علماء اور مجتہدین کا برصغیر پاک و ہند میں ایک تانتا لگ گیا۔ ہمایوں بذات خود نیک دل، شائستہ اور مہذب انسان تھا۔ ہر وقت باوضو رہتا تھا اور اللہ رسول کا نام بغیر طہارت کے نہیں لیتا تھا۔ اس کے امرائے خاص اور ارکان سلطنت میں ایک اہم مقام کا حامل بیرم خان تھا۔ یہ اگرچہ بڑی خوبیوں اور کمالات کا سردار تھا، جمعہ و جماعت کا پابند، مشائخ کا قدردان لیکن شیعہ تھا۔ اس کا ایک مشہور شعر ہے ۔

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسر او
اگر غلام علی نیست خاک برسر او

میر شریف آملی علوم حکمت میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ وہ اکبر کے عہد میں ہندوستان آیا۔ اکبر نے اس کی بڑی پذیرائی کی۔ وہ ملحدانہ خیالات رکھتا تھا۔ تصوف کو فلسفہ سے مخلوط کیا اور وہ عینیت کا قائل تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی تحریکیں ملک میں

جاری تھیں جو سخت انتشار انگیز، دین کے لیے خطرناک اور باعث تخریب تھیں۔ جیسے ذکری فرقہ اور دوسرا فرقہ روشنائیہ تیسری تحریک مہدویت جس کو مورخین اس عہد کی زلزلہ انگیز تحریک کہتے ہیں۔ اس کا بانی سید محمد جونپوری تھا۔ ان تحریکوں کے پیدا ہونے کے کئی اسباب ومحرکات تھے جن کا بیان کرنا یہاں ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھا ہے:

''مسلمانوں کی عام سماجی اور اخلاقی حالت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہی تھی۔ افسانۂ شاہاں اور تاریخ داؤدی میں جن قصوں کو عجائب روزگار بنا کر پیش کیا گیا ہے، وہ اخلاقی پستی اور اعتقاد کی زبوں حالی کے آئینہ دار ہیں۔ فقیروں کی عیاشانہ زندگی، طالب علموں کی بے راہ روی، تعویذ گنڈوں میں بے جا اعتقاد، جنوں اور دیوؤں کے قصے، چراغ سلیمان کی داستانیں، کسی مضبوط معاشرہ یا محکم اخلاقی نظام میں اس طرح عام نہیں ہو سکتی تھیں۔ حقیقت میں مہدوی تحریک اس ذہنی انحطاط اور مذہبی جمود کو دور کرانے کی ایک کوشش تھی۔

(سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ص ۴۵۱)

اکبری حکومت کے دو دور:

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ اکبر جب تخت نشین ہوا تو وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اسے پختہ یقین تھا۔ بدعقیدگی اور خلاف جمہور عقائد پر وہ سخت سزا دیتا تھا، علماء اور صلحاء کی صحبت میں وقت گزارتا تھا اور اولیاء اللہ کے مزارات پر بھی عقیدت کے پھول نچھاور کرتا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی اور دوسرے اس زمانہ کے تمام مورخین نے ان چیزوں کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی کتاب منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ

۱- شہزادہ سلیم کی ولادت کے شکرانہ میں اکبر نے اجمیر کا پاپیادہ سفر کیا اور واپسی میں دہلی میں اولیائے دہلی کے مزارات کی زیارت کی۔

Marfat.com

۲- پاک پٹن جا کر حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے مزار کی زیارت کی۔

۳- اوائل شعبان میں اجمیر کا سفر کیا اور سات کوس سے پیادہ پا مزار پر حاضری دی۔

۴- عبادت خانہ میں ہر جمعہ کی رات سادات و مشائخ اور علماء و امراء کی طلبی ہوتی۔ بادشاہ وہاں خود بیٹھ کر مسائل کی تحقیق کرتا۔

۵- جب خان زمان نے اکبر کے خلاف بغاوت کی تو اس کے مقابلہ پر نکلنے سے پہلے اکبر دہلی کے تمام اولیائے کرام کے مزارات پر بغرض دعا حاضر ہوا۔ اس سے اس کی اولیاء اللہ سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

۶- شیخ سلیم چشتیؒ کے ساتھ اکبر کو خاص عقیدت تھی۔ ان کا مزار بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا اور اس عقیدت و محبت کی بنا پر جہانگیر کا جو کہا جاتا ہے کہ ان کی دعا سے پیدا ہوا، سلیم نام رکھا۔ بادشاہ نے سلیم کی ولادت سے قبل رانی جودھا بائی کو شیخ کے گھر بھیج دیا تھا تاکہ ان کی توجہ اور دعا رانی کے شامل حال رہے۔

۷- اسی طرح شہزادہ مراد کی ولادت بھی شیخ ہی کے گھر میں ہوئی تھی۔

۸- شہزادہ سلیم کی رسم تسمیہ خوانی اس زمانے کے مشہور محدث مولانا میر کلاں ہرویؒ سے کروائی۔

۹- جب شہزادہ سلیم لکھنے پڑھنے کے قابل ہوا تو اسے حکم دیا کہ شیخ عبدالنبی کے گھر جا کر ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کرے۔ اکبر کو شیخ عبدالنبی (نبیرۂ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ و صدر جہاں عہد اکبری) سے اتنی عقیدت و محبت تھی کہ اکثر ان کے گھر جا کر ان کے درس میں شرکت کرتا۔ بلکہ ایک دو مرتبہ ان کی جوتیاں بھی سیدھی کیں۔ اکبر نے ان کے لیے شاہی کارخانہ میں خصوصی دوشالہ تیار کروایا اور ملا عبدالقادر کے ہاتھ ان کی خدمت میں بھیجا اور کہا کہ یہ آپ ہی کے لیے شاہی کارخانہ میں تیار ہوا ہے۔

۱۰- اس عہد کے مشہور شطاری بزرگ شیخ محمد غوث گوالیاری کے گذارہ کے لیے ایک کروڑ سالانہ کی آمدنی کی جاگیر مخصوص کر دی۔ اور ان کے انتقال کے بعد وہ ان کے صاحبزادے شیخ ضیاء اللہ کے ساتھ بھی نیاز مندانہ طریقہ پر پیش آتا۔

Marfat.com

مشہور مورخ میر عبدالرزاق خافی خان کی مشہور کتاب مآثر الامراء میں اکبر کی دینداری کی شہادت میں یہ لکھا ہے کہ

"اگرچہ بادشاہ احکام شرعیہ کے اجراء، امر معروف اور نہی منکر کے سلسلہ میں بڑی کوشش کرتا تھا۔ خود اذان کہتا تھا اور امامت کراتا حتی کہ ثواب کی نیت سے مسجد میں اذان بھی دیتا تھا۔" (مآثر الامراء جلد۲ص ۵۶۱)

ان ساری عبادتوں کو دیکھ کر اگر اکبر کی دینداری کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی دینداری ایک سطحی اور عامیانہ قسم کی دینداری تھی جس کی بنیاد کتاب وسنت کے صحیح فہم سے آشنائی اور براہ راست علم پر نہ تھی۔ اور وہ بجائے علمائے راسخین کی صحبت و تربیت کے رہین منت ہونے کے مذاق زمانہ اور ناواقف امراء اور اہل حکومت کی تقلید و نقالی اور ضعیف الاعتقادی پر مبنی تھی۔ اس دین داری کا رکن اعظم مزارات پر حاضری دینا، کوسوں پیادہ پا چل کر وہاں جانا اور وہاں کے سجادہ نشینوں اور مجاوروں کے ساتھ جو اکثر بے علم، جاہل، اسلاف کے کمالات سے عاری اور صحیح روحانیت سے عاری ہوتے تھے، اپنی نیاز مندی کا اظہار کرنا، درباری سرکاری علماء ومشائخ کی توقیر و تعظیم، مجالس سماع میں شرکت وغیرہ تھی، ان سب باتوں کے باوجود وہ خود علم سے کورا اور ناخواندۂ محض تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود اس کا بچپن اور عنفوان شباب ناہموار اور غیر معمولی حالات میں گزرا۔ چچاؤں کی بے مروتی اور بے مہری کا اس نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے باپ کی شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست اور سفر ایران، پھر ایران میں مسافرانہ قیام ان سب حالات نے اس کی فطرت اور طبیعت میں بدگمانی اور اچھے اچھے آدمیوں کے خلوص و وفاداری کے بارہ شک وریب اس کی طبیعت کا ایک جزو لاینفک ہو گیا تھا۔

ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ ہونا ہی اس کی شخصیت کا ایک بہت بڑا نقص تھا، لہٰذا اس کے لیے بہتر تھا کہ وہ مذہبی امور میں دخل نہ دیتا، خاص طور پر کلامی مسائل، مذاہب کے تقابل اور ماوراء الطبیعاتی حقائق کی تحقیق کے میدان میں ہرگز قدم نہ رکھتا، لیکن اکبر

نے بے چین اور متجس دماغ پایا تھا۔ وہ اپنی مسلسل فتوحات اور کامیابیوں کی وجہ سے کسی قدر خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا اور وہ سمجھنے لگا تھا کہ جس طرح وہ ملکی مسائل کو حل کرتا اور سیاسی گتھیوں کو سلجھاتا ہے اسی طرح وہ مذہب وعقائد کی پرخار وادیوں میں بھی کامیاب ترکتازیاں کرسکتا ہے حالانکہ یہ بات اس کے لیے نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھی۔ دوسری طرف بعض شاطر ارکان سلطنت اور درباریوں نے کچھ تو اپنا ذہنی تفوق ظاہر کرنے کے لیے اور کچھ بادشاہ کی تفریح طبع کے لیے مختلف مذاہب اور فرقوں کے علماء کے دنگل قائم کیے اور اس بات کو مذہبی تحقیق اور علمی مباحثہ کا نام دیا۔ حالانکہ کوئی شخص اس قسم کے علمی مباحثہ کے لیے گہرا اور وسیع علم اور دقیقہ رس دماغ نہیں رکھتا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ توفیق الٰہی اس کا ساتھ نہیں دیتی تو وہ اکثر و بیشتر تشکک و ارتیاب اور لا ادریت کی عمیق اور گہری خندق میں گر جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے بیٹے جہانگیر نے اپنے باپ کی بابت تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ ''میرا باپ اکثر ہر دین و مذہب کے دانش وروں سے ملاقات کرتا تھا خصوصاً ہندوستانی فاضلوں اور پنڈتوں سے، اور ناخواندہ اور امی ہونے کے باوجود کثرت مجالست کی وجہ سے علماء اور فضلاء کے ساتھ گفتگو میں کسی کو اس کے امی اور ناخواندہ ہونے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ نظم ونثر کی باریکیوں اور دقائق کو وہ اس طرح سمجھتا تھا کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں تھا۔'' (ص ۱۵)

پھر اس نے اسی بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اہل دربار کی طرف سے توریت، انجیل اور زبور کے ترجمے اور ان کے مطالب کو بادشاہ تک پہنچانے کا اہتمام کیا گیا اور اس کے لیے ایک درباری سید مظفر کو متعین کیا گیا۔ ان کتابوں کے ترجموں کے ساتھ عقیدۂ تثلیث اور عیسائی عقائد کو دلائل سے ثابت کرنے کے لیے عیسائی پادریوں کی ایک کھیپ بھی دربار اکبری میں درآمد کی گئی (منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۲۶۰) ملا عبدلقادر بدایونی نے لکھا ہے کہ

''اہل بدعت اور ہوا پرست لوگ اپنی غلط آراء اور باطل شبہات کی وجہ سے

کمین گاہوں سے نکل آئے اور باطل کو حق کی صورت میں اور خطا کو صواب کی صورت میں پیش کرنے لگے، اور بادشاہ کو جو جوہر ذاتی رکھتا تھا، اور طالب حق مگر محض امی اور ناخواندہ اور کافروں سے مانوس تھا، شک و ارتیاب میں مبتلا کر دیا اور اس کی حیرت میں اضافہ کر دیا اور مقصد فوت ہو گیا اور شریعت کا بندھ ٹوٹ گیا اور پانچ چھ سال کے بعد اسلام کا کوئی اثر نہ رہ گیا اور معاملہ بالکل الٹ گیا۔" (منتخب التواریخ جلد۲ ص ۲۵۵)

ارکان دین اور اسلامی عقائد کے بارہ میں تمسخر اور ٹھٹھے کے ساتھ طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کیے جانے لگے اور تفسیر و تاریخ کو جن میں ناخدا ترس اور غیر راسخ العلم لوگوں کو ذہنی انتشار اور فکری ناہمواری پیدا کرنے کی بڑی گنجائش ہے، غیر سنجیدہ طریقے سے دربار شاہی میں پڑھے جانے لگے۔ دیپ چندہ مسخرہ راجہ منجھولہ کہتا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک گائے محترم اور معظم نہ ہوتی تو قرآن حکیم کی پہلی سورت میں کیوں مذکور ہوتی۔ تاریخ کو غیر سنجیدہ انداز میں پڑھنے کی صورت میں صحابہ کرامؓ کے بارہ میں لوگوں کا اعتقاد خراب کیا جانے لگا اور نماز روزہ اور تمام نبوی تعلیمات کو تقلیدیات کا نام دیا جانے لگا۔ دین کی بنیاد بجائے نقل کے عقل پر رکھی جانے لگی۔ فرنگیوں کی آمد و رفت دربار میں اکثر ہو گئی۔ چنانچہ ان کے بعض معتقدات بھی قبول کر لیے گئے۔

ایک طرف یہ معاملہ تھا دوسری طرف علماء اور ارکان سلطنت کا ایک خاص گروہ تھا۔ اہل بدعت اور ہوا پرست لوگوں کے اس حملہ کے باوجود اکبر کو اسلام کی صراط مستقیم پر قائم رکھنے اور اس کے مزاج کو بے اعتدالی اور انحراف کی شاہراہ سے ہٹانے میں علمائے دربار اور ارکان سلطنت بھی ایک اہم اور بنیادی کردار ادا کر سکتے تھے، لیکن افسوس کہ ان دونوں جماعتوں میں سے جو عنصر ملا وہ نہ صرف یہ کہ صحیح معیار پر پورا نہیں اترتا تھا بلکہ وہ اس سلسلہ میں خدمت کے بجائے بدخدمتی اور اکبر کو دین سے قریب کرنے کے بجائے اس کو دین سے دور، متوحش و متنفر بنانے اور ان مخالف اسلام دعوتوں اور تحریکوں سے دور رکھنے یا

Marfat.com

ان کے استیصال پر آمادہ کرنے کے بجائے اس کو ان دعوتوں اور تحریکوں کا علم بردار بنانے کی خدمت انجام دینے لگے۔ اور جو حضرات حکمت دین اور تفقہ کا جوہر رکھتے، ان کی نگاہ جزئیات سے زیادہ کلیات پر اور وسائل سے زیادہ مقاصد پر ہوتی، اخلاق عالیہ سے متصف، بے غرض، جاہ طلبی اور حب دنیا کے جذبہ سے امکانی حد تک دور اور وہ اس عظیم نوخیز اسلامی سلطنت کی اہمیت و نزاکت کو خوب سمجھتے ہوئے جو ایک غیر مسلم اکثریت سے گھری ہوئی تھی، تو ان کو جس تیموری سلطنت کی خدمت و راہ نمائی کا زریں اور تاریخی موقع ملا تھا، اور وہ اس وقت ترکی کی عثمانی سلطنت کے بعد ہر لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی مسلم سلطنت تھی، اس لیے اس کی حفاظت، اس کا دین اسلام سے رشتہ قائم رکھنے اور اس کے سربراہ کو ان نازک حالات میں اس شیشہ و آہن اور پنبہ و آتش کو اکٹھا رکھنے میں مدد دینے کو وقت کی سب سے بڑی عبادت سمجھتے اور دین و ملک کی سب سے بڑی خدمت تصور کرتے، لیکن افسوس کہ اس قسم کے علمائے دین اور ارکان سلطنت میسر نہ آئے۔ اور اگر میسر آ جاتے تو اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ سلطنت مشرق میں حمایت اسلام اور خدمت دین کا وہی کردار ادا کرتی جو مغرب میں آل عثمان کی حکومت نے کیا۔

علمائے دربار:

جہاں تک علمائے دین کا تعلق ہے جن پر اکبر نے آغاز حکومت میں سب سے زیادہ اعتماد اور اعتبار کیا، ان کے بارہ میں ملا عبدالقادر بدایونی جو خود ارکانِ دربار میں سے ہے، لکھتا ہے:

"عبادت خانہ میں ہر جمعہ کی رات کو علماء و امراء اور سادات و مشائخ کی طلبی ہوتی تھی۔ آگے پیچھے بیٹھنے میں نفسانیت کا اظہار ہوتا۔ ہر ایک دوسرے سے آگے اور ممتاز جگہ پر بیٹھنے کے لیے تگ و دو کرتا۔ بادشاہ نے اس مشکل کا حل اس طرح کیا کہ حکم دیا کہ امراء مشرق کی جانب اور سادات مغرب کی جانب، اور مشائخ شمال میں بیٹھیں اور بادشاہ خود ہر ایک حلقہ میں آتا اور مسائل کی تحقیق کرتا۔" (منتخب التواریخ جلد ا ص ۲۰۲)

Marfat.com

اس زمانہ میں دربار میں دو اہم رکن تھے۔ ان میں ایک ملا عبداللہ سلطان پوری تھے جن کا عہدہ مخدوم الملک تھا اور دوسرے صدر الصدور مولانا عبدالنبی تھے جو اس وقت ہندوستان کے سب سے بڑے عالم اور فن حدیث کے ماہر سمجھے جاتے تھے حالانکہ دراصل وہ اتنے بڑے عالم نہ تھے۔ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے حریف اور رقیب ہو گئے۔ مخدوم الملک شیخ عبدالنبی کو الزام دیتے جب کہ شیخ عبدالنبی مخدوم الملک کی تجہیل و تکفیر کرتے۔ جب ان دونوں کا حال یہ تھا تو ان کے حامی اور طرفدار تو ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ ان دونوں حضرات کے وقائع زندگی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات علم و حکمت دینی اور تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کسی لحاظ سے اس نازک زمانہ اور دربار اکبری کے اس اہم اور پیچیدہ ماحول میں دین کی صحیح نمائندگی کے لیے موزوں نہ تھے۔ یہ دونوں عام تہذیب اور موقع شناسی سے بالکل عاری تھے۔ مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کے بارہ میں تواریخ میں ہے کہ انہوں نے محض اس لیے کہ انہیں حج نہ کرنا پڑے فریضہ حج کے اسقاط کا فتویٰ دیا تھا۔ زکوٰۃ کے معاملہ میں بھی حیلۂ شرعی سے کام لیتے تھے اور اس کی فرضیت سے بچ جاتے تھے۔ یعنی حولان حول (ایک سال گزر جانے) سے پہلے وہ رقم جس پر زکوٰۃ فرض ہو رہی تھی اہلیہ یا کسی دوسرے عزیز کو دے دیتے۔ وہ لینے کے بعد وہ رقم انہیں واپس کر دیتا۔ اس طرح وہ اس سال زکوٰۃ سے بچ جاتے کیونکہ زکوٰۃ کے لیے حولان حول شرط ہے، آئندہ سال بھی یہی عمل کرتے۔ اس طریقے سے انہوں نے اپنے عروج کے زمانے میں اتنی دولت اکٹھی کر لی تھی کہ سونے سے بھرے ہوئے صندوق ان کے آبائی قبرستان سے برآمد ہوئے جنہیں مردوں کے بہانہ سے انہوں نے دفن کیا ہوا تھا۔

دوسرا عالم دین جس کو اکبری دربار میں سب سے زیادہ اہمیت تھی، وہ صدر الصدور مولانا عبدالنبی تھا۔ اس کا علمی پایہ کچھ اتنا بلند نہیں تھا جتنا جاہ و جلال اور اختیار و اقتدار اس کو حاصل تھا۔ دربار اکبری میں اس کی ایک خاص اہمیت اور اس کا ایک خاص

Marfat.com

مقام تھا۔ اچھے اچھے ارکان دولت اور ارباب سلطنت کا چراغ اس کے سامنے نہیں جلتا تھا۔ بڑے بڑے علماء اور مشائخ شرف باریابی حاصل کرنے کے لیے گھنٹوں اس کے دروازے پر کھڑے رہتے۔ کئی مرتبہ خود بادشاہ اکبر نے اپنے ہاتھوں سے اس کو جوتے پہنائے۔ لیکن اتنا مقام و مرتبہ حاصل ہونے کے باوجود ملا عبدالنبی میں علماء کے وہ اعلیٰ اخلاق مفقود تھے اور عام تہذیب اور موقع شناسی سے بھی وہ عاری تھا بلکہ وہ اپنے عہدہ اور رسوخ کا غلط استعمال کرنے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں مہارت تامہ رکھتا تھا، اور اس پر مستزاد یہ کہ مخدوم الملک اور ملا عبدالنبی کی آپس کی ہر وقت سر پھٹول رہتی تھی۔ ملا عبدالقادر کا بیان ہے کہ ان علماء کو جو اکبر کے عہد کی زینت تھے وہ غزالی اور رازی سے بہتر سمجھتا تھا لیکن جب ان کی یہ خفیف اور بچگانہ حرکتیں دیکھیں تو علمائے سلف کو بھی ان پر قیاس کر کے سرے سے ان علماء ہی کا منکر ہو گیا بلکہ ان کو بھی ان جیسا سمجھنے لگا۔

ملا مبارک اور اس کے فرزندان:

دربار اکبری میں پہلے ہی کافی اہل علم و فضل ایسے موجود تھے جو اکبر کو دین کی صراط مستقیم سے ہٹا کر اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتے اور اس کی ناخواندگی اور جہالت سے فائدہ اٹھا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے اور اپنے معتقدات اور نظریات کی اشاعت و تبلیغ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اکبر کے قدموں کو متزلزل بھی کر دیا تھا۔ اسی اثنا میں ایران سے تین بھائی حکیم ابوالفتح گیلانی، حکیم ہمایوں اور نور الدین قراری وارد ہوئے اور دربار میں اونچی اور اہم جگہ پائی۔ کچھ عرصہ کے بعد ملا یزدی ولایت سے آئے اور صحابہ کرامؓ کے بارہ میں بے باکانہ زبان طعن کھولی۔ اور حکیم ابوالفتح نے حقائق دینی وغیرہ کا برملا انکار کیا۔ اس عرصہ میں کچھ اور لوگ بھی آئے جنہوں نے اکبر کے ذہن میں تشتت و انتشار کی تخم ریزی کی۔ کچھ بذلہ سنج اور لطیفہ گو ہندو بھی دربار میں داخل ہوئے اور بہت جلد اکبر کے مزاج میں دخیل ہو گئے۔ ان میں ایک راجہ بیربر تھا جس کا اصل نام برہم داس تھا۔ چنانچہ ان سب لوگوں نے مل کر بادشاہ کے مزاج کو دین کے

Marfat.com

معاملہ میں غیر سنجیدہ بنا دیا۔ اس پر طرفہ یہ کہ ملا مبارک ناگوری کی آمد و رفت دربار اکبری میں شروع ہوگئی، اور جلد ہی اس کے دونوں بیٹوں فیضی اور ابوالفضل کو بادشاہ کے مزاج میں ایسا دخل اور دربار میں ایسا اعزاز حاصل ہوا جو اس سے قبل کسی اور کو نہ تھا۔ یہ تینوں باپ بیٹے نہایت ذکی، اعلیٰ علمی استعداد اور تبحر رکھنے والے، علوم عقلیہ وادبیہ پر حاوی، فارسی اور عربی کے شاعر اور انشا پرداز غرضیکہ ہر قسم کے علوم وفنون کے لحاظ سے لائق فاضل اور دانشور تھے۔ اگر ان تینوں میں دین میں استقامت، رسوخ فی الدین، خداترسی، آخرت کوشی اور اخلاص و للّٰہیت ہوتی تو وہ اس عہد کی ایسی دینی خدمت انجام دے سکتے تھے جس کی نظیر ملنی مشکل ہوتی، لیکن ان کی تصنیفات اور ان کی کارروائیوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں کی طبیعت میں بے چینی اور دماغ میں شورش تھی۔ وہ اسلاف کے پورے فقہی ذخیرے سے بے اعتقاد ہو گئے۔ شیراز کے مشہور فاضل معقولات ابوالفضل گازرونی کے حلقہ میں شریک ہو کر ان پر تفلسف کا غلبہ ہوا۔ مکائد شیطان اور امراض نفس میں بری طرح مبتلا تھے۔ شیطانی کوچوں سے گزرنے کے بعد ان کے اندر ایک تلون اور انتشار پیدا ہو گیا۔ چنانچہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادے خواجہ کلاں جن کی تربیت شیخ مبارک کی بیٹی کے گھر میں ہوئی تھی، ان کے بارہ میں لکھتے ہیں: ''ہر زمانے کا وہ مروجہ مذہب و مشرب اپنا لیتے تھے جس سے امراء و ملوک بھی رغبت رکھتے تھے۔'' اور سر ویلز لی ہیگ لکھتا ہے کہ ''شیخ مبارک مختلف ادوار میں سنی، شیعہ، صوفی اور مہدوی کے علاوہ خدا جانے کیا کیا رہ چکا تھا۔''

(کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ۴ ص ۱۸)

اس زمانہ کے علماء نے اور خاص طور پر مخدوم الملک اور ملا عبدالنبی جو دربار پر حاوی تھے، ان کو وہ مقام نہیں دیا تھا جس کے وہ اپنے علم و فضل، ذہانت و فطانت اور قابلیت و فضیلت کی بنا پر اہل تھے اور ان کے بعض معتقدات و خیالات اور تلون مزاجی کی بنا پر دینی حلقوں میں ان کی سخت مخالفت کی جاتی تھی۔ ان باتوں کا زخم ان کے دل پر بہت گہرا تھا۔ علماء کی اس مخالفت کی وجہ سے اس پورے گھرانے میں احساس کمتری پیدا

Marfat.com

ہو گیا جو مختلف شکلوں میں احساس برتری کی شکل میں ظاہر ہوتا۔ اب انہوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ نہایت ذہین اور دانشور ہیں اور ان کے علم و ذہانت کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جل سکتا، اس کوشش میں انہوں نے اسلام اور پورے دینی نظام کو داؤ پر لگا دیا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ تینوں ہر علم و فن میں یگانۂ روزگار تھے، لیکن انہوں نے اسلام اور شعار اسلام اور علوم اسلامیہ کو جو نقصان پہنچایا اس کی تلافی وہ بعد میں نہ کر سکے اگرچہ ان کو بعد میں اپنی اس غلطی کا احساس بھی ہو گیا۔ چنانچہ ابو الفضل ایک خط میں خانخانان کو اپنے بارہ میں لکھتا ہے:

"اس دردناک کہانی کا ایک معمولی المیہ یہ ہے کہ راقم سطور مشاغل لایعنی کے جہنم میں پھنس کر بندۂ خدا کے مرتبہ سے گر کر بندۂ فطرت ہو گیا اور اس کے قریب پہنچ گیا کہ خدا کی بندگی کے بجائے بندہ درہم و دینار کہا جانے لگے...... وہ اس تحریر میں اپنا یہ غم ظاہر کر رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ دنیا میں گزرے ہوئے ان ۴۳ برسوں کی احمقانہ دوڑ دھوپ اور جدوجہد اور خصوصاً اس بارہ سالہ کش مکش سے جو ابنائے زمانہ کی صحبت میں رہی، مجھ میں نہ طاقت صبر ہے اور نہ قوت گریز و پرہیز۔ میں اس بات کو قید تحریر میں لا کر اس کا اعلانیہ اظہار کر رہا ہوں۔" (انشائے ابو الفضل دفتر ۲ ص ۱۰۲)

اکبر کی طبیعت کی اس تبدیلی میں کہ اس نے دین کے راستہ کو چھوڑ کر بے دینی کے راستہ کو اختیار کیا، اس پر اس کی راجپوت اور ہندو رانیوں کا اثر بھی تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے استحکام کے لیے راجپوت راجاؤں کے ساتھ رشتے ناطے کیے اور ان کا اعلیٰ ترین مناصب پر تقرر کیا۔ چنانچہ ان کا پورا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اور ان کی نگاہ میں اپنے کو محبوب اور عزیز بنانے کے لیے اس نے بہت سے وہ کام کیے جو اس کو ایک مسلمان کی حیثیت سے نہ کرنے چاہیے تھے، مثلاً ذبیحہ گاؤ کی ممانعت، ڈاڑھی منڈوانا، بھدرا کروانا، قشقہ لگوانا، ہندو رانیوں کے ساتھ مل کر ان کی تمام ہندوانہ رسموں کو منانا اور

Marfat.com

ان میں حصہ لینا۔ اکبر کی ایک بیوی راجہ بہاری مل کی بیٹی اور راجہ بھگوان داس کی بہن تھی، دوسری جودھا بائی جودھ پور کی رانی وغیرہ، ان ہندو رانیوں اور ان کے عزیز رشتہ داروں کا اکبر کی عملی اور فکری زندگی پر خاصا اثر تھا۔ اور دین کے ایوان میں سب سے پہلا تزلزل اسی تعلق کی وجہ سے واقع ہوا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۵۷۹ء میں متھرا کے قاضی عبدالرحیم نے ایک مسجد بنانے کے لیے مسالہ منگوایا۔ ایک مقامی مالدار برہمن نے اس پر قبضہ کر لیا اور اس مسالے کو ایک مندر کی تعمیر میں صرف کر دیا۔ جب قاضی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے اسے روکنا چاہا تو اس نے بانی اسلام کو سب وشتم کیا اور اہل اسلام کی اہانت کی۔ قاضی یہ شکایت لے کر شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس گیا۔ شیخ نے برہمن کو بلا بھیجا۔ وہ نہ آیا۔ چنانچہ دربار سے ابوالفضل اور بیربر کو بھیجا گیا۔ وہ جا کر برہمن کو لے آئے اور اس وقوعہ کی نسبت ابوالفضل نے تصدیق کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اسے سزا کیا دی جائے؟ شیخ نے بادشاہ سے استصواب کیا۔ بادشاہ ٹال مٹول کرتا رہا۔ صریحاً کچھ نہ کہتا، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا رہا کہ سیاسیات شرعیہ آپ سے متعلق ہیں، مجھ سے کیا پوچھتے ہیں؟ اس کشمکش میں معاملہ نے طول کھینچا۔ برہمن دیر تک قید خانے میں رہا اور بادشاہ کی راجپوت بیویاں اس کی رہائی کے لیے کوشاں ہوئیں۔ شیخ نے بادشاہ سے پھر پوچھا اور حد سے زیادہ اصرار کیا۔ بادشاہ نے کہا: میں اس بارہ میں اپنا خیال بتا چکا ہوں۔ اب تم جانو اور یہ ملزم۔ چنانچہ شیخ نے برہمن کو قتل کروا دیا۔ اس پر محل کے اندر رانیوں نے اور باہر مصاحبوں نے کہنا شروع کیا کہ ان علماء کو حضور نے اتنا سر پر چڑھا رکھا ہے کہ اب وہ آپ کی خوشی کا بھی کوئی خیال نہیں کرتے اور اپنا جاہ وجلال دکھانے کے لیے لوگوں کو بے حکم قتل کر دیتے ہیں۔ بادشاہ چونکہ ناخواندہ تھا اس لیے اس واقعہ سے بگڑا۔ اتفاق سے ان دنوں شیخ مبارک کسی تقریب سے حضور میں آیا۔ اکبر نے اس کے سامنے وہ ساری دقتیں بیان کیں جو علماء کے اختیارات کی وجہ سے پیش آئی تھیں۔ شیخ مبارک نے

Marfat.com

کہا کہ بادشاہ خود امام وقت اور مجتہد روزگار ہے۔ اس نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اجتہاد کا دعویٰ کرے اور علماء سے محضر طلب کرے۔ چنانچہ آیتوں او روایتوں کی اسناد سے ایک محضر تیار کیا گیا جو اکبر اور اس کی مملکت کے رخ کے پھیرنے میں سنگ میل ثابت ہو اور جو ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے پورے قصر کا صدر دروازہ کہا جا سکتا ہے۔ (اس محضر کا پورا متن منتخب التواریخ جلد۲ ص ۲۷۱-۲۷۲ میں مرقوم ہے)

یہ محضر نامہ رجب ۹۸۷ھ میں تیار کیا گیا اور اس کا پوری مملکت میں نفاذ ہوا۔ اس کی رو سے بادشاہ کو امام مجتہد اور واجب الاطاعت اور خلیفۃ اللہ فی الارض قرار دیا گیا۔ یہ دین اسلام سے انحراف کا نقطۂ آغاز تھا۔

اب اس کے ساتھ ہی مخدوم الملک اور صدر الصدور کا زوال شروع ہو گیا کیونکہ اب بادشاہ کے امام، مجتہد اور واجب الاطاعت ہونے کی وجہ سے نہ ان عہدوں کی ضرورت رہی اور نہ یہ عہدہ رکھنے والوں کی۔ چنانچہ اب ان دونوں کی توہین کی گئی اور ان دونوں سے کچھ ایسی دارو گیر کی گئی کہ یہ دونوں یکے بعد دیگرے راہی ملک عدم ہو گئے۔

دین الٰہی کا اجراء:

اس محضر نامہ میں بادشاہ کو مجتہد مطلق بنایا گیا۔ ایک ناخواندہ اور ان پڑھ شخص کے لیے یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ اب انہی لوگوں نے جنہوں نے محضر نامہ تیار کیا تھا بادشاہ کے ناہموار ذہن میں یہ بات ڈالی کہ اس دین اسلام پر ایک ہزار سال گزر چکے ہیں یہی اس دین کی طبعی عمر ہے۔ اور اب چند سالوں تک دوسرے ہزار سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس نئے ہزار سال سے دنیا کی ایک نئی عمر شروع ہو گی، اس کے لیے ایک نیا دین، نیا آئین اور ایک نیا شارع اور نیا حاکم مطلوب ہے اور اس کے لیے اکبر جیسا صاحب تاج و نگین اور صاحب سطوت و مملکت اور امام عادل ہی موزوں ترین شخص ہے۔ اس محضر نامہ کے ذریعہ اکبر کو جو اختیارات اور پاورز تفویض (Delegate) کی گئی تھیں ان کے تحت اب مملکت میں تبدیلیاں شروع کر دی گئیں اور اکبر شاہی دین کا

آغاز شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے سکہ پر جو ہر ایک کے ہاتھ میں جاتا ہے اس وجہ سے یہ سب سے بڑا اشتہار سمجھا جاتا ہے، اس پر الف کی تاریخ ثبت کر دی گئی۔ اس نئی تاریخ کی تدوین کا کام علماء کے ایک بورڈ کے سپرد ہوا۔ اس میں سنین میں بجائے ہجرت کے رحلت کا ذکر کیا گیا۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی کہ ''اس صاحب زمان کا وقت آ گیا ہے جو ہندو مسلمان کے ۷۲ فرقوں کے اختلافات مٹانے والا ہوگا اور وہ بادشاہ کی ذات قدسی صفات ہے۔'' (منتخب التواریخ جلد ۱ص ۳۰۱) اس کے ساتھ ہی اب اسلام کے معتقدات و احکام میں تبدیلیاں شروع ہوئیں۔ توحید کے بجائے کواکب پرستی، ایمان بالبعث کے بجائے عقیدۂ تناسخ کو رائج کیا گیا۔ اس بارے میں اکبر باقاعدہ بیعت لیتا تھا۔ اس دین میں داخل ہونے والوں سے جو کلمہ پڑھوایا جاتا تھا اس میں لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اکبر خلیفۃ اللہ بھی شامل کیا جاتا تھا۔ کلمہ کے ساتھ ایک اقرار نامہ بھی ہوتا تھا جس میں یہ الفاظ مرقوم تھے:

''میں اپنی رغبت، خواہش اور دلی شوق کے ساتھ مجازی اور تقلیدی دین اسلام سے جو آباء واجداد سے سنا اور دیکھا تھا، علیحدگی اختیار کرتا ہوں اور اکبر شاہی دین الٰہی میں داخل ہوتا ہوں، اور اس دین کے اخلاص کے چاروں مرتبوں یعنی ترک مال، ترک جان، ترک ناموس وعزت اور ترک دین کو قبول کرتا ہوں۔''

یہ دین اکبر کیا تھا؟ اس میں سود، جوئے، شراب اور خنزیر کے گوشت کی حلت تھی۔ اور ذبیحہ گاؤ کی ممانعت تھی کیونکہ اس سے ہندوؤں کی دل آزاری ہوتی تھی۔ پردہ اور رسم ختنہ کی ممانعت تھی۔ جسم فروشی کے کاروبار کو منظم کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ مقرر کی دی گئی تھی اور اس کے لیے ایک قانون بنا دیا گیا تھا۔ تدفین کے طریقہ میں بھی ترمیم کر دی گئی تھی۔ غرضیکہ دین اسلام کے مقابلہ میں ایک مستقل اکبری دین کی تدوین ہوئی تھی جس میں رواداری اور صلح کل تحریک یا نئے دین وآئین میں ہندوؤں کے مذہب کا پلڑا جھکا ہوا تھا۔ چنانچہ مختصر تاریخ ہند کے مصنفین مسٹر مور لینڈ اور مسٹر اے۔ سی۔ چیڑجی نے بھی لکھا ہے کہ ''اکبر نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے

Marfat.com

لیے گاؤ کشی بھی بند کردی تھی اور اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دیں۔ اکبری قوانین دین اسلام سے زیادہ ہندو مذہب کی موافقت اور حمایت میں ہوتے تھے۔ اور اس کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔" (A. Short History of India, P.25)

دین اکبری:

اکبر نے مجتہد مطلق ہوتے ہی جو دین اکبری لوگوں کے سامنے پیش کیا اس کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ دین اسلام اور اس کے معتقدات میں اس نے جو تبدیلیاں کیں وہ کیا تھیں۔ اس بارہ میں اکبر کے نفس ناطقہ ابوالفضل علامی نے جو لکھا ہے کہ اس کو یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔ اور میرے خیال میں اس سے زیادہ معتبر اور کوئی شہادت نہیں ہے کیونکہ اکبر ابوالفضل کو عقل کل سمجھتا تھا اور یہ اکبری دین انہی باپ بیٹوں ہی کی ذہنی فکر کا نتیجہ تھا۔

۱- آتش پرستی:

ابوالفضل اس بارہ میں اپنی کتاب آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ:

"جہاں پناہ اپنی روشن ضمیری کی وجہ سے روشنی کو بے حد پسند کرتے ہیں اور اس کی تعظیم و تکریم کو خدا پرستی اور ستائش الٰہی خیال فرماتے ہیں۔ لیکن نادان کور باطن اس کو خدا فراموشی اور آتش پرستی خیال کرتے ہیں۔"

(آئین اکبری جلد ا ص ۲۸، لکھنوء)

"ہوتا یہ ہے کہ آفتاب کے غروب ہونے کے بعد خدمت گزار بارہ کافوری شمعیں روشن کرتے ہیں اور ہر شمع چاندی اور سونے کے لگن میں رکھ کر حضور بادشاہ سلامت پیش کرتے ہیں اور ان میں سے ایک شیریں زبان اور خوش گلو خادم شمع کو ہاتھ میں لے کر مختلف دل کش سروں میں خدا کی حمد کے اشعار گاتا ہے اور آخر میں خود جہاں پناہ کی زیادتی عمر و دولت کے لیے دعا کرتا ہے۔"

(آئین اکبری جلد ا ص ۲۹)

Marfat.com

۲- آفتاب پرستی:

"فرماتے ہیں کہ آفتاب کی سلاطین کے حال پر ایک خاص عنایت ہے، اسی وجہ سے اس کی عبادت خدا کی عبادت خیال کی جاتی ہے، لیکن کوتاہ بین شخص بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عوام کس لیے سیہ دل دولت مندوں کی اپنے نفع کی غرض سے عزت واحترام کرتے ہیں اور اپنی نابینائی کی وجہ سے اس چشمۂ نور کے احترام میں کوتاہی کرتے ہیں اور عبادت گزار پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ اگر خود ان کی عقل پر آفت نہ آ گئی ہو تو سورہ الشمس کیوں فراموش کر دی گئی ہے۔" (آئین اکبری جلد ۳ ص ۱۸۴)

۳- آداب ملاقات:

اس اکبری دین میں آداب ملاقات بھی اسلام کے آداب ملاقات سے مختلف تھے۔ اسلام میں تو دو ملنے والے جب ملتے ہیں تو ایک السلام علیکم کہتا ہے اور دوسرا وعلیکم السلام سے اس کا جواب دیتا ہے۔ لیکن دین اکبری میں ابوالفضل لکھتا ہے کہ "ملاقات کے وقت ایک آدمی اللہ اکبر کہتا اور دوسرا جل جلالہ سے اس کا جواب دیتا۔" (آئین اکبری جلد ۱ ص ۱۱۰)

۴- سجدۂ تعظیمی:

اسلام میں جہاں عبادتی سجدہ ناجائز ہے وہاں تعظیمی سجدہ بھی ناجائز ہے، لیکن دین اکبری میں ابوالفضل کا بیان ہے کہ "بندگانِ عقیدت مند سجدۂ تعظیمی کرتے اور اسے سجدہ ایزدی شمار کرتے ہیں۔" (آئین اکبری جلد ۱ ص ۱۰۷)

۵- گنگا جل:

اسلام میں آب زمزم کو تبرک طور پر استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ احادیث میں اس کے بارہ میں بہت سے فضائل آئے ہیں لیکن ہندوؤں کے ہاں گنگا کا پانی نہایت متبرک سمجھا جاتا ہے۔ اکبر بھی اس پانی کو نہایت پوتر اور متبرک سمجھتا تھا اور اس کو ہر وقت نوش کرتا تھا۔ چنانچہ ابوالفضل نے لکھا ہے:

Marfat.com

''بادشاہ سفر وحضر میں ہر وقت گنگا کا پانی نوش فرماتے ہیں۔ قابل اعتماد ملازمین کی ایک جماعت دریا گنگا کے کنارے مامور ہے جو سربمہر کوزوں اور برتنوں میں پانی بھر کر لاتی ہے۔ جب جہاں پناہ آگرہ اور فتح پور میں قیام فرماتے ہیں تو قصبہ سے پانی لایا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ شاہی خیمہ لاہور میں نصب ہوتا ہے ہر دوار کے عمدہ پانی سے آبدار خانہ سیراب ہے۔ باورچی خانہ میں جمنا اور چناب کا پانی یا آب باراں صرف ہوتا ہے لیکن ان میں تھوڑا پانی گنگا کا ملایا جاتا ہے۔'' (آئین اکبری جلد ا ص ۳۳)

ان چیزوں کے علاوہ اور بھی کئی غیر اسلامی چیزیں دین اکبری میں داخل کی گئیں۔ سن ہجری سے تنفر کا اظہار کیا گیا کیونکہ اس کا بھی اسلام سے ایک رابطہ تھا۔ (آئین اکبری جلد ا ص ۱۹۳) اور غیر اسلامی تہواروں کو منانے کی تلقین کی گئی (آئین اکبری جلد ا ص ۴۶) زکوۃ جو دین اسلام میں فرض کی گئی ہے، اس کا دینا روک دیا گیا۔ (طبقات اکبری ص ۶۷-۶۸) شراب نوشی کی ہر جشن میں کھلے عام اجازت تھی۔ (آئین اکبری جلد ۳ ص ۲۰۶)

اس بارہ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی کچھ تفصیلات دی ہیں، ان کو ملاحظہ فرمالیں۔ بدایونی لکھتا ہے کہ ''ملت اسلامی کا سارا سرمایہ حادث و بدعقلی کا مجموعہ ٹھیرایا گیا اور اس کے بنانے والے (العیاذ باللہ) عرب کے وہ چند مفلس بدو قرار پائے جن میں سب کے سب مفسد اور راہزن تھے اور شاہ نامہ فردوسی کے درج ذیل دو شعروں سے سند حاصل کی گئی جو اس نے نقل کیے ہیں ۔

زشیر شتر خوردن و سوسمار   عرب رابجائے رسیدست کار
کہ تخت کیاں راکنند آرزو   تفو باد بر چرخ گرداں تفو

(منتخب التواریخ ص ۳۰۷)

نماز اور دوسرے فرائض دینی کو پڑھنے اور ادا کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ چنانچہ بدایونی کا بیان ہے: ''دیوان خانہ میں کسی شخص کی مجال نہ تھی کہ اعلانیہ نماز ادا کر سکے۔'' اور

Marfat.com

ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ "نماز روزہ اور حج تو اس سے پہلے ہی ساقط ہو چکے تھے۔"
(منتخب التواریخ جلد۲ص ۳۱۵،ص ۲۵۱)

بلکہ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ ملا مبارک کے ایک بیٹے نے جو ابوالفضل کا شاگرد تھا، اسلامی عبادات کے متعلق اعتراض اور تمسخر کے پیرایہ میں چند رسائل تصنیف کیے۔ شاہی دربار سے ان رسالوں کی بڑی پذیرائی ہوئی اور اس کی سرپرستی کا بھی رسائل ذریعہ بن گئے۔" (منتخب التواریخ ص ۲۵۱، جلد۲) معراج نبوی کا انکار کیا گیا اور نبوت کی اہانت میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ (منتخب التواریخ جلد۳ص ۳۱۷)

غرض کہ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا یہ ایک سنگین موڑ تھا کہ ملا مبارک، فیضی اور ابوالفضل نے اکبر کی پشت پناہی میں اس وقت کے ہندوستان کو ایک ذہنی، دینی، فکری اور تہذیبی ارتداد کے راستہ پر ڈال دیا تھا حالانکہ اہل قلوب اور اصحاب صفا نے یہاں اسلام کے شجرہ طیبہ کو نصب اور بارآور کرنے کے لیے چار سو برس تک اپنی دماغی صلاحیتیں اور جسمانی توانائیاں صرف کر دی تھیں۔ اگر حالات کی رفتار اور واقعات کا تسلسل یہی رہتا اور کوئی طاقتور شخصیت ان کے راستہ کی رکاوٹ نہ بنتی تو اس ملک کا حال بھی وہی ہوتا جو نویں صدی ہجری میں اندلس کا ہوا تھا، یا پھر انقلاب روس کے بعد ترکستان کا ہوا، لیکن اللہ نے غیب سے ایک شخصیت کو اپنے دین کی حفاظت کے لیے کھڑا کر دیا۔

Marfat.com

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ

وہ کون شخص تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے اور دین میں تحریف اور تغییر کرنے والوں کے راستہ میں مزاحمت کرنے کے لیے کھڑا کر دیا؟ اس وقت کیا حالات تھے جن میں وہ تجدید دین کا عزم لے کر اٹھا؟ بقول حضرت سید سلیمان ندوی قدس سرہ کے

''یہ اکبر کا دور تھا جب عجم کے ایک جادوگر نے آ کر بادشاہ کے کان میں یہ منتر پھونکا کہ دین عربی کی ہزار سالہ عمر پوری ہو گئی۔ اب وقت ہے کہ ایک شہنشاہ امی کے ذریعہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دین منسوخ ہو کر دین الٰہی کا ظہور ہو۔ مجوسیوں نے آتش کدے گرمائے، عیسائیوں نے ناقوس بجائے، برہمنوں نے بت آراستہ کیے اور جوگ اور تصوف نے مل کر کعبہ اور بت خانہ کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار کیا۔ اس بیچ میل تحریک کا جو اثر ہوا اس کی تصویر اگر کوئی دیکھنا چاہے تو ''دبستان مذاہب'' کا مطالعہ کرے۔ کتنے زنار داروں کے ہاتھوں میں تسبیح اور کتنے تسبیح خوانوں کے گلوں میں زنار نظر آئیں گے۔ بادشاہی آستانہ پر کتنے امیروں کے سر سجدہ میں پڑے اور شہنشاہ کے دربار میں کتنے دستار بند کھڑے دکھائی دیں گے، اور مسجدوں کے منبر سے یہ صدا سنائی دے گی:

Marfat.com

تعالیٰ شانہ اللہ اکبر

یہ ہو ہی رہا تھا کہ سرہند کی سمت سے ایک پکارنے والے کی آواز آئی: "راستہ صاف کر دو کہ راستہ چلنے والا آتا ہے، ایک فاروقی مجدد، فاروقی شان سے ظاہر ہوا۔ یہ احمد سرہندی تھے۔

ولادت و تعلیم:

یہ فاروقی مجدد حضرت شیخ احمد سرہندیؒ ۴ شوال ۹۷۱ھ مطابق ۲۶ جون ۱۵۶۳ء جمعہ کی رات سرہند کے شہر میں پیدا ہوا۔ آپ کا اسم گرامی احمد، لقب بدرالدین اور کنیت ابوالبرکات تھی۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے آپ ہم جد تھے کیونکہ ان دونوں کا نسب نامہ شیخ شہاب الدین علی سے ملتا ہے۔

ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے والد مخدوم عبدالاحدؒ سے حاصل کی۔ اس کے بعد ملک کے بعض بہترین علماء سے فیض حاصل کیا۔ سیالکوٹ میں آپ نے علامہ کمال الدین کشمیریؒ سے جن کے حلقہ درس سے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اور سعد اللہ خان علامی جیسے فاضل روزگار اٹھے فنون کی کتابیں پڑھیں۔ حدیث میں آپ کے مشہور استاذ شیخ یعقوب صرفی کشمیری تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی اساتذہ سے علوم و فنون حاصل کیے۔ تعلیم کی ابتداء حفظ قرآن سے ہوئی۔

علوم عقلیہ اور نقلیہ سے فراغت کے بعد درس و تدریس کے کام کا آغاز کیا اور عربی اور فارسی میں کچھ رسائل بھی لکھے۔ آپ اکبرآباد (آگرہ) بھی تشریف لے گئے اور ابوالفضل اور فیضی سے بھی کئی بار ملنے کا موقع ملا۔ اور بعض اختلافات کے باوجود دونوں بھائی آپ کے علم و فضل کے بڑے معترف تھے۔ ایک روز آپ ابوالفضل کے بھائی فیضی کے مکان پر گئے۔ وہ غیر منقوط تفسیر سواطع الالہام کے لکھنے میں مشغول تھا۔ آپ کو دیکھ کر فیضی بڑا خوش ہوا اور کہا کہ آپ اچھے وقت تشریف لائے۔ اس وقت میں تفسیر کے لیے ایک ایسی بات لکھنا چاہتا ہوں جس کے لیے غیر منقوط الفاظ نہیں ملتے۔

Marfat.com

بہت دماغ سوزی کی۔ آپ نے اسی وقت اس مقام کی تفسیر اس طرح فصاحت و بلاغت سے غیر منقوط الفاظ میں لکھ دی کہ فیضی حیران رہ گیا۔ (زبدۃ المقامات ص ۱۴۱-۱۴۲)

حضرت مجدد صاحبؒ آگرہ ہی میں تھے کہ آپ کے والد ماجد باوجود کبرسنی اور بعد مسافت کے آپ سے ملنے آگرہ تشریف لے گئے۔ کچھ روز وہاں قیام کرنے کے بعد حضرت مجدد کو ساتھ لے کر واپس وطن تشریف لائے۔ دہلی اور سرہند کے درمیان جب شہر تھانیسر سے گذر ہوا تو وہاں کے حاکم شیخ سلطان نے انہیں اپنے ہاں مہمان رکھا اور حضرت مجدد کے اخلاق و خصائص کو دیکھ کر ان سے نسبت مصاہرت قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ والد صاحب نے اس رشتہ کو منظور فرمایا اور عقد مسنون انجام پایا اور آپ بہو کو رخصت کر کے سرہند تشریف لائے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کی بیعت و استفادہ:

سرہند میں آپ والد ماجد کی وفات تک انہی کی خدمت میں مصروف رہے اور سلسلۂ چشتیہ قادریہ کا سلوک طے کیا اور اس کے ساتھ علوم ظاہری کی تعلیم کا مشغلہ بھی جاری و ساری رہا۔ ۱۰۰۷ھ میں آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ۱۰۰۸ھ میں آپ نے حرمین شریفین کی حاضری اور حج بیت اللہ کے لیے رخت سفر باندھا۔ جب آپ سرہند سے دہلی پہنچے تو دوسرے علماء کے ساتھ مولانا حسن کشمیری بھی آپ کی ملاقات کے لیے آئے۔ انہوں نے دوران گفتگو حضرت خواجہ باقی باللہ کے علو مرتبہ اور قوت باطنی کا تذکرہ کیا۔ حضرت مجددؒ کے دل میں آپ کی ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ چنانچہ آپ مولانا حسن کشمیری کی معیت میں وہاں حاضر ہوئے۔ حضرت باقی باللہؒ نے بڑی شفقت اور مہربانی کے ساتھ آپ کی پذیرائی فرمائی۔ حضرت باقی باللہؒ نے خلاف معمول فرمایا کہ "آپ چند روز ہمارے مہمان رہیں۔ ایک ماہ ایک ہفتہ ہی سہی۔" حضرت مجدد کے لیے اس ارشاد کے بعد انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی کیونکہ یہاں طالب خود مطلوب تھا۔ چنانچہ آپ نے دعوت قبول فرمالی اور رفتہ رفتہ یہ قیام ایک ماہ دو ہفتہ کو منجر

Marfat.com

ہوا۔ اس صحبت میں سلسلۂ نقشبندیہ کے اکتساب کا کچھ ایسا جذبہ طاری ہوا کہ بیعت کی درخواست کی جو حضرتؒ نے بلا تامل قبول فرمالی اور خلوت میں لے جاکر ذکر قلبی کی تلقین کی۔ آپ کی توجہ سے اسی وقت ذکر قلبی جاری ہوگیا۔ اس دو اڑھائی ماہ میں حضرت مجددؒ کو جو باطنی کیفیات اور ترقیات حاصل ہوئیں الفاظ کے ذریعہ ان کا سمجھانا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ حضرت مجدد اس کے بعد سرہند تشریف لے گئے۔ اور دوسری مرتبہ جب دہلی تشریف لائے تو حضرت باقی باللہؒ نے خرقہ خلافت عطا فرمایا۔ اس کے بعد حضرت مجدد تیسری اور آخری مرتبہ حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت خواجہؒ نے شہر سے بہت دور باہر نکل کر استقبال فرمایا اور بڑی بشارتیں دیں، مریدوں سے فرمایا کہ ان کی موجودگی میں کوئی شخص میری طرف متوجہ نہ ہوا کرے۔ حضرت خواجہؒ حضرت مجددؒ کے بڑے مدح خوان تھے کیونکہ انہیں پہلی ہی توجہ اور تلقین سے یہ یقین ہوگیا تھا کہ وہ ایک ایسا چراغ بنیں گے جس سے ایک عالم روشن ہو جائے گا۔ حضرت خواجہؒ کا ان کے ساتھ معاملہ کچھ اس طرح کا ہوگیا تھا جو کم تر کسی شیخ کا اپنے مسترشد کے ساتھ ہوا ہوگا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے اس مسترشد کے بارہ میں فرمایا کہ ''شیخ احمد آفتاب است کہ مثل ماہزاراں سیارگان درضمن ایشاں گم اند۔'' (زبدۃ المقامات ص ۳۴۰) یعنی شیخ احمد وہ آفتاب ہے کہ ہم جیسے ہزاروں سیارے جس کی روشنی میں گم ہیں۔

سفر لاہور:

حضرت مجدد نے سرہند میں حضرت باقی باللہ سے اکتساب فیض وتکمیل کے بعد گوشہ نشینی اختیار فرمائی۔ آپ کی ہر لحہ طبیعت عروج کی طرف مائل تھی۔ آخر وہ وقت آگیا کہ آپ کا فیض عام ہو۔ اور طالبین کی تکمیل اور ارشاد کا کام شروع ہو۔ مجدد صاحب اپنے احوال مسترشدین اور برادران طریقت کی ترقیات باطنی کی تفصیل اپنے شیخ کو لکھتے رہے۔ کچھ ایسی بشارتیں بھی ظاہر ہوئیں جن سے آپ کو یقین ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے اور آپ سے دین کی کوئی بہت بڑی خدمت وجود میں آئے گی۔

Marfat.com

آخر وہ وقت آیا کہ آپ نے شیخ کے اشارہ اور ارشاد پر لاہور کا سفر اختیار کیا۔ لاہور اس وقت ہندوستان کا دہلی کے بعد دوسرا بڑا علمی اور دینی مرکز تھا۔ لاہور میں بکثرت علماء اور مشائخ موجود تھے۔ آپ کی آمد پر ایک جم غفیر آپ کے پر جوش استقبال کے لیے آیا اور وہاں کے لوگ آپ سے بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ اس سفر میں مولانا طاہر لاہوریؒ، مولانا حاجی محمدؒ اور مولانا جمال الدین تلویؒ آپ کے حلقہ ارادت و بیعت میں داخل ہوئے۔ حضرت مجدد ابھی لاہور ہی میں مقیم تھے کہ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی رحلت کی اطلاع ملی۔ شیخ کے سانحۂ ارتحال کا سننا تھا کہ حضرت مجدد اضطرابی اور اضطراری حالت میں لاہور سے سیدھا دہلی تشریف لے گئے۔ راستہ میں اگرچہ سرہند پڑتا تھا لیکن آپ نے وہاں بالکل قیام نہیں فرمایا۔ دہلی میں شیخ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ مرشد زادوں اور برادرانِ طریقت سے تعزیت فرمائی اور ان کی خواہش پر چند روز دہلی میں قیام فرمایا اور پھر سرہند تشریف لے آئے۔ ۱۰۲۶ھ میں آپ نے اپنے بہت سے خلفاء کو تبلیغ و ہدایت کے لیے مختلف مقامات کی طرف روانہ کیا۔ ان میں سے ستر (۷۰) مولانا محمد قاسم کی زیر قیادت ترکستان کی طرف روانہ کیے گئے۔ چالیس (۴۰) حضرات مولانا فرخ حسین کی سیادت میں عرب، یمن، شام اور روم کی طرف بھیجے۔ دس تربیت یافتہ حضرات کو مولانا محمد صادق کابلی کی قیادت میں کاشغر روانہ کیا اور تیس (۳۰) خلفاء کو مولانا شیخ احمد برکی کی امارت میں توران، بدخشان اور خراسان بھیجا۔ ان حضرات کو اپنے اپنے مقامات میں بڑی کامیابی اور کامرانی ہوئی۔ (روضۃ القیومہ ص ۱۶۶-۱۶۷) ادھر ہندوستان میں بھی آپ نے اپنے خلفاء کو مختلف علاقوں میں دعوت و ارشاد پر مامور فرمایا۔ اب حالت یہ تھی کہ حضرت مجدد کی جلالت شان اور قوت ارشاد و ہدایت اور حسن تربیت کا شہرہ نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ہند میں بھی پہنچ گیا۔ کہ لوگ جوق در جوق زیارت و استفادہ کے لیے آنے لگے۔

جہانگیر کا شیخ مجدد کے ساتھ رویہ:

۱۰۱۴ھ میں اکبر کا انتقال ہوا اور اس کا بیٹا سلیم نور الدین جہانگیر کے لقب

Marfat.com

کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ اکبر کے دور میں اسلام اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا اور اس عظیم ملک میں جس کو محمد بن قاسم، محمود غزنوی، سلطان محمد غوری اور دوسرے مسلمان فاتحین نے اپنے خون سے، اور علماء اسلام نے اپنے خون پسینہ سے اور اہل قلوب نے اپنے اشک سحر گاہی سے سیراب اور بارآور کیا تھا، اسلام کی بیخ کنی کا کام جس قوت اور منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا، وہ آپ کے مضطرب اور درد مند دل کو ہر وقت مضطرب اور پریشان رکھتا۔ لیکن ابھی آپ حالات کو موافق نہیں سمجھتے تھے جس سے آپ سلطنت اور ارکان سلطنت اور مسلمانوں کے بارہ میں اس کی سیاست پر اثر انداز ہو سکیں۔ اس کے لیے آپ نے سب سے پہلے خان خانان، سید صدر جہاں اور مرتضیٰ خان وغیرہ کے ذریعہ بادشاہ کو نصیحت آمیز پیغامات بھیجے کیونکہ ان حضرات کو بادشاہ کا تقرب حاصل تھا اور آپ کی عظمت اور عقیدت ان کے دلوں میں موجود تھی۔

اکبر اور جہانگیر کی طبیعتوں میں بہت اختلاف تھا، جہانگیر ایک طرح کی سلامت روی اور حسن اعتقاد کا حامل تھا۔ اس کو دین اکبری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حضرت مجددؒ نے اس کی اس سادہ طبیعت سے فائدہ اٹھا کر برصغیر پاک و ہند سے سابقہ حکومت کے اثرات کو ختم کرنے کا ارادہ فرمایا، لیکن قبل اس کے آپ اپنا یہ انقلاب انگیز پروگرام شروع کریں آپ کو گرفتار کر کے قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا، جو آپ کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، بعض لوگوں نے آپ کے خلاف جہانگیر کے کان بھرے کہ سرہند کا ایک شیخ زادہ اپنے تئیں سیدنا صدیق اکبرؓ سے افضل سمجھتا ہے اور کچھ ایسی باتیں کرتا ہے جن سے کفر کی بو آتی ہے۔ ہزاروں لوگ اس کے حلقہ بگوش ہیں۔ ہو سکتا کہ اس کے کچھ اثرات حکومت پر بھی پڑیں۔ سلاطین کو دنیا کی ہر شی حتیٰ کہ اپنے والدین اور اولاد سے بھی سلطنت اور حکومت عزیز ہوتی ہے لہٰذا وہ یہ بات ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی ان کے امور مملکت میں داخل اندازی کرے، چنانچہ جونہی جہانگیر کے کانوں میں ایسی باتیں پہنچیں، اس نے حضرت مجددؒ کو بلا بھیجا۔ جہانگیر نے اس واقعہ کے بارہ میں توزک جہانگیری میں بھی لکھا ہے۔ (ملاحظہ ہو توزک جہانگیری ص ۲۷۵)

Marfat.com

حضرت مجددؒ جب دربار جہانگیری میں پہنچے تو بادشاہ نے ان سے کئی سوالات کیے جن کے آپ نے معقول جوابات دیے۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے جو خدا شناسی سے دور تھا، جہانگیر سے کہا: جہاں پناہ! اس شیخ کا حال دیکھئے کہ آپ ظل اللہ فی الارض اور خلیفۃ اللہ ہیں، انہوں نے آپ کو سجدہ نہیں کیا بلکہ معمولی تواضع باہمی بجا نہیں لایا۔ بادشاہ نے جونہی یہ بات سنی تو خفا ہو گیا اور حضرت مجددؒ کو قلعہ گوارلیار میں قید کرنے کا حکم دیا۔ اس واقعہ سے قبل شاہزادہ شاہ جہان آپ سے خلوص کامل رکھتا تھا اور مقامی علماء افضل خان اور خواجہ عبدالرحمٰن مفتی کو کتب فقہ کے ساتھ حضرتؒ کی خدمت میں بھیج چکا تھا کہ سجدۂ تحیۃ سلاطین کے لیے آیا ہے، اگر آپ سجدہ کرلیں تو بادشاہ سے کوئی گزند آپ کو نہیں پہنچے گا۔ میں اس کا ضامن اور ذمہ دار ہوں۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ مسئلہ ضعیف حکم رخصت ہے اور مسئلہ قوی عزیمت یہ ہے کہ غیر حق کو کبھی سجدہ نہ کریں۔''

(حضرات القدس دفتر ۲ ص ۸۹-۹۰)

بعض حضرات کا خیال ہے کہ امرائے دربار نے اپنے نمبر بنانے کے لیے حضرت مجددؒ کے خلاف جھوٹی باتیں بادشاہ کو پہنچائی تھیں، لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت مجددؒ کے خلاف ایک عام شورش کی صورت پیدا ہو گئی تھی، لہٰذا آپ کو قید کرنے سے جہانگیر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عوام کی شورش ٹھنڈی پڑ جائے۔

حضرت مجددؒ تقریباً ایک سال گوالیار کے قلعہ میں قید رہے۔ قید کے بعد آپ کی حویلی، سرائے، کنواں، باغ اور کتابیں وغیرہ سب ضبط کرلی گئیں اور آپ کے متعلقین کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ (توزک جہانگیری دفر ۳ ص ۲۷۳-۲۷۴)

آپ کی گوالیار میں یہ نظر بندی حق تعالیٰ شانہ کی بہت سی حکمتوں اور دینی مصالح پر مبنی تھی۔ آپ نے یہاں اپنے رفقائے زندان میں تبلیغ و ارشاد کا کام پوری سرگرمی سے شروع کر دیا اور پس دیوار زندان کی آواز اس بلند آہنگی سے بلند کی کہ گوالیار کے قلعہ کے درو دیوار گونج اٹھے۔ اور صحبت و تربیت کے فیض سے مشرف با سلام ہو گئے اور سینکڑوں قیدی

Marfat.com

ارادت وصحبت سے سرفراز ہوکر درجات عالیہ تک پہنچے۔ چنانچہ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی مشہور و معروف کتاب پریچنگ آف اسلام (Preaching of Islam) میں لکھا ہے:

''بادشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ء-۱۶۲۸ء) کے عہد میں ایک سنی عالم شیخ احمد مجدد نامی تھے جو شیعی عقائد کی تردید میں خاص طور پر مشہور تھے۔ شیعوں کو اس وقت شاہی دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ ان لوگوں نے کسی بہانہ سے انہیں قید کرادیا۔ دو برس وہ قید میں رہے اور اس مدت میں انہوں نے اپنے رفقائے زندان میں سے سینکڑوں بت پرستوں کو دائرہ اسلام میں داخل کردیا۔'' (ص ۴۱۲)

اسی طرح انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ ایتھکس (Encyclopedia of Religion and Ethics) میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں لکھا ہے:

''ہندوستان میں سترہویں صدی عیسوی میں ایک عالم دین جن کا نام شیخ احمد مجدد تھا، جو ناحق قید کردیے گئے، ان کے بارہ میں روایت ہے کہ انہوں نے قید خانہ کے ساتھیوں میں سے کئی سو بت پرستوں کو مسلمان بنالیا۔''

(جلد ۸ ص ۷۴۸)

قلعہ گوالیار کی اس اسیری کے دوران حضرت مجدد پر جن انعامات الٰہیہ کی بارش ہوئی اور آپ کو جو باطنی ترقیات، حقیقی شکستگی اور وارفتگی کی لذت اور خلوت میں جلوت کی جو نعمت حاصل ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ چنانچہ آپ میر محمد نعمان کے نام ایک خط میں جو قلعہ گوالیار سے بھیجا گیا، تحریر فرماتے ہیں:

''اگر محض فضل خداوندی سے فیوض و برکات اور واردات الٰہی کا تسلسل اور اس کے غیر متناہی انعامات وعطیات کا پے در پے ظہور اس محنت کدہ میں مجھ جیسے شکستہ پر کے شامل حال نہ ہوتا تو قریب تھا کہ معاملہ یاس و ناامیدی کی حد تک پہنچ جاتا، اور رشتۂ امید ٹوٹ جاتا۔ حمد و ثنا ہے اس اللہ تبارک و تعالیٰ کی جس نے مجھ کو عین بلا میں عافیت عطا فرمائی اور ظلم و جفا میں عزت سے

Marfat.com

سرفراز فرمایا، مشقت و تکلیف میں مجھ پر احسان کیا اور راحت و مصیبت میں شکر کی توفیق عطا فرمائی۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کرنے والوں اور اولیائے کرامؒ کے نقش قدم پر چلنے والوں اور علماء وصلحائے امت سے محبت رکھنے والوں میں داخل فرمایا۔ اس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں انبیاء کرام پر اولاً اور ان کے متبعین پر ثانیاً۔'' (دفتر ۳ مکتوب نمبر ۵)

بعض روایات میں ہے کہ حضرت مجدد صاحبؒ کے اس پس دیوار زندان ہونے کا ہندوستان کے صحیح الاعتقاد امراء اور اراکین سلطنت پر بہت برا اثر پڑا بلکہ بعض جگہ شورش اور انتشار کے آثار بھی ظاہر ہوئے۔ عبدالرحیم خانِ خانان، خان اعظم، سید صدر جہاں، خان جہاں لودھی وغیرہ بھی جہانگیر کے اس غلط اقدام سے کبیدہ خاطر اور آزردہ تھے۔ آخر کار بادشاہ کو اپنے اس اقدام سے ندامت ہوئی۔ بعض روایات میں ہے کہ جہانگیر کو خواب میں زیارت نبوی ہوئی اور اس نے دیکھا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بطور تاسف اپنی انگلی دانتوں میں دبائے ہوئے فرما رہے ہیں کہ ''جہانگیر! تو نے کتنے بڑے شخص کو پس دیوار زنداں کر دیا۔'' بہرحال اسے اپنے اس کیے پر ندامت ہوئی یا اس نے اتنی مدت کی اسیری کو کافی سمجھا اور آپ کی ملاقات کا اشتیاق ظاہر کر کے تشریف لانے کی دعوت دی۔ چنانچہ ایک سال پس دیوار زنداں رہنے کے بعد قلعہ گوالیار سے آپ کی رہائی جمادی الآخرہ ۱۰۲۹ھ مطابق مئی ۱۶۲۰ء میں ہوئی۔

قید خانے سے رہائی کے بعد جہانگیر نے حضرت مجدد کو اجازت دی تھی کہ وہ چاہیں تو لشکر کے ساتھ رہیں اور چاہیں تو گھر چلے جائیں۔ (در رفتن و ماندن مختار گردانیدم) یہ جہانگیر نے حکومتی جھوٹ اور ڈپلومیسی کا اظہار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے مجدد صاحبؒ کو آخر وقت تک ایک لحاظ سے نظر بند رکھا، بہرحال مجدد صاحبؒ نے لشکر کے ساتھ رہنا قبول کیا۔ جہانگیر کا منشاء بھی یہی تھی۔ لیکن

عدو شرے برانگیزد کہ خیرے مادراں باشد

Marfat.com

اس طریقے سے مجدد صاحبؒ کو سارے لشکر میں بلکہ ساری مملکت میں دعوت و تبلیغ کا موقع ملتا رہا۔ لشکر کے ساتھ قیام کے دوران آپ کو بادشاہ کو دعوت و تبلیغ کرنے کا موقع بھی میسر آیا۔ چنانچہ مکتوبات کے تیسرے دفتر میں ایک خط بادشاہ کے نام ہے اور ایک اور خط میں اس گفتگو کا ذکر ہے جو آپ نے مجلس شاہی میں کی تھی۔ فرماتے ہیں:

''عجیب و غریب صحبتیں گذر رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان گفتگوؤں سے امور دینیہ اور اصول اسلامیہ میں سرمو تکاسل، سستی اور مداہنت کا دخل نہیں۔ باقی باری تعالیٰ کی توفیق سے ان محفلوں میں بھی وہی باتیں ہوتی ہیں جو خاص خلوتوں اور مجلسوں میں بیان ہوا کرتی ہیں۔ اگر ایک مجلس کا حال لکھا جائے تو اس کا پورا ایک دفتر بن جائے خاص کر آج ماہ رمضان کی سترھویں رات کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت اور عقل کے عدم استقلال اور آخرت کے ایمان اور اس کے عذاب و ثواب اور رویت و دیدار کے اثبات اور حضرت خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی خاتمیت اور ہر صدی کے مجدد اور خلفائے راشدین کی اقتداء اور تراویح کی سنت اور تناسخ کے باطل ہونے اور جنوں اور جنیوں کے احوال اور ان کے عذاب و ثواب کی نسبت بہت کچھ مذکور ہوا۔ بادشاہ بڑی خوشی سے سنتا رہا۔ اس اثنا میں اور بھی بہت سی چیزوں کا ذکر ہوا اور اقطاب و اوتاد اور ابدال کے احوال اور ان کی خصوصیتوں وغیرہ کا بیان ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ بادشاہ سب کچھ قبول کرتے رہے اور کوئی تغیر نہ ہوا۔ ان واقعات و ملاقات میں شاید کوئی اللہ کی پوشیدہ حکمت اور خفیہ راز ہوگا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوالیار کی اسیری سے رہائی کے بعد حضرت مجدد بادشاہ کے قریب ہی رہے اور انہوں نے بادشاہ کو دین کی طرف راغب کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ چنانچہ گوالیار سے رہائی کے تین سال بعد بادشاہ نے

Marfat.com

حضرت مجددؒ کے بارہ میں توزک میں لکھا:

"بدستور ہر سال خود را بہ طلا و اجناس وزن فرمودہ در وجہ مستحقاں مقرر فرمودم۔ ازاں جملہ شیخ احمد سرہندی را دو ہزار روپیہ عنایت شد۔"

قلعہ گوالیار سے واپسی کے بعد قریباً چار سال حضرت مجددؒ جہانگیر کے لشکر میں رہے اور وہ بادشاہ کے ساتھ کشمیر اور کانگڑہ بھی گئے۔ پھر لشکر کے ساتھ ہی آپ ۱۶۲۲ء میں اجمیر تشریف لے گئے جہاں انہوں نے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری قدس سرہ کے مزار کی زیارت کی۔ اور دیر تک مراقبہ کر کے روحانی فیوض و برکات حاصل کیں۔ لشکر سے کبھی کبھی رخصت لے کر آپ سرہند تشریف لے جاتے اور رخصت ختم ہونے کے بعد واپس لشکر میں تشریف لے جاتے بعض مکتوبات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مجددؒ لشکر شاہی کے ساتھ لاہور پہنچے۔ وہاں سے سرہند کوچ ہوا۔ سرہند میں حضرتؒ نے بادشاہ کی ضیافت کی۔ حضرت کی خواہش سرہند رہ جانے کی تھی لیکن بادشاہ نے آپ کی جدائی گوارا نہ کی، لہٰذا وہاں سے دہلی روانگی ہوئی۔ دہلی سے بنارس پھر اجمیر قیام رہا۔

وفات:

لشکر جہانگیری میں حضرت مجددؒ کی شمولیت جو چار سال رہی اس نے جہانگیر پر کافی اچھے اثرات ڈالے۔ اس وجہ سے جہانگیر کو آپ کے ساتھ گہری عقیدت ہو گئی۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ جہانگیر آپ سے بیعت ہو گیا لیکن اس بات کا کوئی مستند تاریخی ثبوت نہیں۔ لیکن اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اکبر کے دین الٰہی کے وہ ملحدانہ نظریات جو جہانگیر کو ورثہ میں ملے تھے، حضرت مجددؒ کی صحبت سے وہ سب ختم ہو گئے بلکہ اس کے اندر نئے دینی رجحانات پیدا ہوئے۔ چنانچہ اس نے منہدم مساجد کی دوبارہ تعمیر اور مفتوحہ علاقوں میں دینی مدارس کے قیام میں بہت دلچسپی لی۔ ۱۰۳۱ھ میں قلعہ کانگڑہ کی فتح کے موقع پر اس نے جس طرح اپنی اسلامیت کا اظہار کیا اور وہاں اسلامی شعائر کا اجراء کرایا (جس کا تذکرہ توزک جہانگیری ص ۳۴۰ پر ہے) اس سے بھی

Marfat.com

اس کی ذہنی اور فکری تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔

زبدۃ المقامات ص ۲۸۳ میں ہے کہ ۱۰۳۲ھ میں آپ اجمیر تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے اپنے صاحبزادگان کو جو اس وقت سرہند میں تھے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا: ''ایام انقراض عمر نزدیک و فرزندان دور'' یعنی زندگی کے اختتام کے دن قریب ہیں اور فرزند دور، اس خط کا ملنا تھا کہ دونوں صاحبزادگان فوری طور پر اجمیر حاضر ہوئے۔ ایک روز دونوں فرزند (خواجہ محمد سعیدؒ اور خواجہ محمد معصومؒ) سے خلوت میں فرمایا۔ اب اس دنیا سے کسی طرح کی دلچسپی اور اس کی طرف کوئی التفات نہیں۔ اب سفر کے دن قریب ہیں اور اس دوسرے عالم کا خیال ہر وقت ذہن پر غالب اور مستولی ہے۔

لشکر سے واپسی پر حضرت مجددؒ کا سرہند میں قیام دس ماہ اور ۹ روز رہا۔ جب آپ نے اجمیر سے سرہند مراجعت فرمائی تو آپ نے سرہند پہنچ کر تمام تعلقات سے کنارہ کشی اختیار فرمالی اور تمام لوگوں سے خلوت اختیار فرمالی۔ حضرت جہاں تشریف فرما ہوتے وہاں سوائے صاحبزادگان اور دو تین مخصوص خادموں کے جن میں ایک خواجہ محمد ہاشم کشمیؒ بھی تھے اور کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اور آپ سوائے پنج گانہ نماز اور جمعہ کے باہر تشریف نہ لاتے تھے۔ سارا وقت ذکر وفکر اور استغفار میں گزرتا۔ گویا آپ باہمہ ہو کر بے ہمہ تھے۔ وسط ذی الحجہ سے ضیق النفس (دمہ) کے عارضہ میں شدت ہوگئی۔ اکثر گریہ میں مصروف رہتے اور جب ضعف کی شدت ہوتی تو زبان پر ''اللھم الرفیق الاعلیٰ'' کا ورد جاری ہو جاتا۔ اسی عرصہ میں چند روز صحت کے ساتھ گزرے اور حاضرین اور معتقدین بلکہ صاحبزادگان کو بھی قدرے سکون ہوا۔ اسی حالت میں اکثر فرماتے: ''ضعف کی شدت میں وہ حلاوت ولذت محسوس ہوتی تھی جس کا اس چند روزہ صحت میں پتہ نہیں۔'' اس حالت میں بکثرت صدقہ اور خیرات فرمائی۔ ۱۲ محرم الحرام کو فرمایا کہ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ ۴۵ دن کے اندر تمہیں اس عالم سے دوسرے عالم کا سفر کرایا جائے گا اور مجھے قبر کی جگہ بھی دکھائی گئی ہے۔'' ایک روز آپ کے صاحبزادگان نے دیکھا کہ آپ پر گریہ غالب

Marfat.com

ہے، انہوں نے اس گریہ کا سبب پوچھا تو فرمایا: ''شوق وصال۔'' صاحبزادگان نے دریافت کیا کہ ''ہمارے بارہ میں اس قدر خلاف معمول بے التفاتی اور بے مہری کیوں ہے؟'' فرمایا: ''اللہ کی ذات تم سب سے زیادہ محبوب ہے۔''

۲۲ صفر کو خدام اور اعزہ سے فرمایا: ''آج چالیس (۴۰) روز پورے ہو گئے۔ دیکھنا چاہیے کہ ان سات آٹھ روز میں کیا پیش آتا ہے؟'' ان ایام میں آپ اللہ تعالیٰ کے انعامات اور بے غایات عنایات کا تذکرہ فرماتے رہے۔ ۲۳ صفر کو اپنی تمام پوشاکیں اور کپڑے اپنے خدام کو تقسیم فرما دیے۔ اب حالت یہ تھی کہ جسم پر کوئی روئی دار کپڑا نہ تھا جو سردی سے محفوظ رکھتا۔ سردی کا موسم تھا شاید نومبر کا مہینہ تھا جس میں سردی کافی ہوتی ہے، اس لیے ٹھنڈی ہوا کا اثر ہوا اور دوبارہ بخار ہو گیا، اور جیسا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج مبارک بیماری سے قلیل افاقے کے بعد دوبارہ ناساز ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت بھی ادا ہوئی۔ اس ضعف کی حالت میں علوم عالیہ کا افاضہ نہایت شدت کے ساتھ تھا۔ صاحبزادہ خواجہ محمد سعیدؒ نے عرض کی: ''حضرت کا ضعف اس گفتگو کا متحمل نہیں، لہٰذا ان حقائق و معارف کے بیان کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی رکھیں۔'' صاحبزادے کی یہ بات سن کر فرمایا: ''فرزند عزیز!'' ''اب کوئی وقت نہیں کہ ان مضامین اور حقائق و معارف کو دوسرے وقت پر اٹھا رکھوں۔''

اگرچہ کمزوری اور ضعف انتہائی شدت اختیار کر چکا تھا لیکن اس کے باوجود بھی کوئی نماز بغیر جماعت کے ادا نہیں کی۔ وفات سے چار پانچ روز قبل لوگوں اور صاحبزادگان کے کہنے سننے سے تنہا نماز پڑھی لیکن ان میں بھی ادعیہ ماثورہ اور ذکر و مراقبہ میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا اور شریعت و طریقت کے آداب و احکام میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں رکھا۔ ایک ثلث اخیر رات میں اٹھ کر وضو فرمایا: تہجد کھڑے ہو کر پڑھی۔'' پھر فرمایا کہ یہ ہماری آخری تہجد کی نماز ہے اور ہوا بھی یہی کہ اس کے بعد تہجد پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔

وفات سے ایک روز قبل فرمایا کہ میری تجہیز و تکفین میں سنت پر پورا پورا عمل کیا

Marfat.com

جائے۔ اس بارہ میں کوئی سنت ترک نہ کی جائے۔ اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا: "چونکہ میری رحلت تمہاری رحلت سے پہلے ہوتی معلوم ہوتی ہے اس لیے میرے کفن کا سامان اپنے مہر سے کرنا۔" یہ بھی فرمایا کہ "میری قبر کسی گمنام جگہ پر بنائی جائے۔" صاحبزادوں نے عرض کیا کہ پہلے تو حضرتؒ کی وصیت تھی کہ ہمارے برادر اکبر خواجہ محمد صادقؒ (حضرت مجددؒ کے فرزند اکبر جو آپ کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے۔ تاریخ وفات ۹ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ ہے) جہاں دفن ہیں وہیں دفن کیا جائے۔ اب حضرتؒ یوں فرماتے ہیں۔ فرمایا: ہاں اس وقت مجھ پر یہی شوق غالب تھا۔ جب آپ نے دیکھا کہ صاحبزادے یہ سن کر خاموش ہو گئے اور ان کو اس میں تردد ہے تو فرمایا: "اگر ایسا نہ کر سکو تو بیرون شہر والد بزرگوار کے پاس یا باغ میں کہیں دفن کر دینا۔ پھر فرمایا کہ میری قبر کو خام رکھنا تاکہ تھوڑے دنوں میں اس کا نشان باقی نہ رہے۔ جب دیکھا کہ صاحبزدگان کچھ سوچ اور غور وفکر میں پڑ گئے ہیں تو مسکرا کر فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے جہاں مناسب سمجھو دفن کر دینا۔

یہ ساری وصیتیں کرنے کے بعد سہ شنبہ (منگل) کی رات ۲۷ صفر جس کے اگلے روز سفر آخرت تھا، اپنے ان خدام سے جنہوں نے پوری رات آنکھوں میں کاٹ کر تیمارداری کی تھی، فرمایا کہ تم لوگوں نے بڑی محنت کی۔ بس اس رات کی محنت اور رہ گئی ہے۔ پھر فرصت ہے۔ آخر شب میں فرمایا: "رات کسی طرح صبح کر۔" دن چڑھا تو چاشت کے وقت پیشاب کے لیے طشت منگوایا جس میں ریت نہیں تھی۔ اس خیال سے کہ کہیں چھینٹے اڑ کر نہ پڑیں اس کو واپس کر دیا۔ کسی شخص نے کہا کہ حکیم کو قارورہ دکھانا چاہیے۔ فرمایا: میں وضو توڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے بستر پر لٹا دو۔ آپ کو گویا اس بات کا انکشاف ہو گیا کہ اب کچھ ہی دیر کے بعد اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کی طرف کوچ ہے۔ وضو کی فرصت نہ ہو گی۔ چنانچہ آپ کو بستر پر لٹا دیا گیا۔ لیٹتے ہی مسنون طریقہ کے مطابق دائیں رخسار کے نیچے دایاں ہاتھ رکھ کر ذکر میں مشغول ہو گئے۔ صاحبزادوں نے سانس کی تیزی دیکھ کر عرض کیا: "مزاج کیسا ہے؟ فرمایا: اچھا ہے۔ فرمایا: میں نے

Marfat.com

جو دو رکعت نماز پڑھی ہے کافی ہے۔ اس کے بعد سوائے اسم ذات کے ذکر کے کوئی بات نہیں فرمائی اور ایک لمحہ کے بعد جان جاں آفرین کے سپرد کر دی۔ یہ واقعہ سہ شنبہ چاشت کے وقت ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ عیسوی کا ہے۔ اس وقت عمر مبارک تریسٹھ (۶۳) سال تھی۔

غسل کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ آپ نماز کے طریقہ پر ہاتھ باندھے ہوئے بائیں ہاتھ کی کلائی پر داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور چھنگلیاں سے حلقہ کیے ہوئے تھے۔ صاحبزادگان نے انتقال کے بعد ہاتھ پھیلا دیا لیکن غسل کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ آپ کے دونوں دست مبارک پہلی ہیئت کے مطابق حالت نماز کی طرح بندھ گئے اور یہ حالت آخر تک قائم رہی۔ ہاتھوں کو کتنا ہی الگ کیا جاتا وہ نماز کی کیفیت میں ایک دوسرے پر خود بخود آ جاتے۔ تجہیز و تکفین سب سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہوئی۔ فرزند کلاں خواجہ محمد سعیدؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جسم مبارک کو آخری آرام گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ (زبدۃ المقامات ص ۲۵۶-۲۸۰)

تجدید کا مرکزی نقطہ:

اب ایک سوال یہ ہے کہ حضرت مجددؒ جن کی تجدید کی دنیا میں اتنی شہرت ہوئی کہ لفظ ''مجدد'' ان کے نام کا قائم مقام بن گیا، کی وہ تجدید دین کیا تھی؟ یہ درست ہے کہ دین اکبری نے اسلام کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کے بارہ میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے۔ کئی نظریات نے جن میں بعض بظاہر اور بعض حقیقتاً خلاف اسلام تھے، مسلم معاشرہ میں جنم لے چکے تھے۔ آپ نے ان سب چیزوں کو اپنی دعوت و تبلیغ اور اپنے مکتوبات کے ذریعہ ختم کیا اور آپ کے ہاتھوں اسلام کی حفاظت و تقویت کا وہ تاریخ ساز اور عہد آفرین کام انجام پایا کہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ روح و فکر اسلامی کی جلا اور تازگی، وقت کے سنگین ترین فتنوں کا استیصال، نبوت محمدی اور شریعت اسلامی کی صداقت و ابدیت پر از سر نو اعتماد اور

اعتقاد بحال کرنا اور ایسی تلاش حقیقت اور خدارسی کی کوشش کی طلسم شکنی جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے بے نیاز ہو، وحدت الوجود اور ہمہ اوست کے عقیدہ اور نظریہ کی پردہ کشائی جو اپنے غلو و مبالغہ اور اشاعت و مقبولیت کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا، جس سے نہ صرف عقائد میں تزلزل ہو گیا تھا بلکہ مسلم معاشرہ بھی تشتت و انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔ بدعات کی کھلی تردید و مخالفت حتی کہ بدعت حسنہ کے وجود سے بھی انکار، ان تمام چیزوں کی تجدید سے انہوں نے برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے اکھڑتے ہوئے قدموں کو جمانے اور دین اکبری کے مخالف اسلام اثرات کو ختم کرنے کی ایک انقلابی کوشش کی، اور اس میں وہ نہ صرف بڑی حد تک بلکہ پوری طرح کامیاب بھی ہوئے۔ انہوں نے برہمنیت یا وحدت ادیان کی گود میں اسلام کو لے جانے کے بجائے دوبارہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور دین حجازی کی نگرانی میں دیا۔ بلکہ حقیقت میں برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کو اس ہمہ گیر اعتقادی، ذہنی اور تہذیبی ارتداد کے فوری خطرہ سے محفوظ کر دیا جو شہنشاہ اکبر جیسی باعزم اور قوی الارادہ شخصیت اور اس کے یگانہ روزگار سفیروں، ملا مبارک ناگوری، فیضی اور ابو الفضل کی ذہانت سے ایک امر واقعہ بن کر سامنے آ گیا تھا اسی لیے اقبال مرحوم نے ان کے بارہ میں فرمایا ؎

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

لیکن حقیقت میں ان کا اصل کارنامہ جس کے جلو میں اس کے سارے تجدیدی کارنامے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ان کی تجدید کا اصل کارنامہ جس سے ان کے تمام انقلابی و اصلاحی کاموں کے چشمے پھوٹتے ہیں اور دریا بن کر سارے عالم اسلام میں رواں دواں اور جاری و ساری ہو جاتے ہیں وہ نبوت محمدی اور اس کی ابدیت و ضرورت پر امت میں اعتماد بحال کرنے اور مستحکم کرنے کا وہ تجدیدی و انقلابی کارنامہ ہے جو ان سے پہلے اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ کسی مجدد نے انجام نہیں دیا، شاید اس لیے کہ ان

کے زمانے میں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی، اور اس کے خلاف کوئی منظم تحریک یا فلسفہ سامنے نہیں آیا۔ (تذکرہ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ، مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ ص ۲۷) اس تجدیدی اقدام سے ان تمام فتنوں کا دروازہ بند ہو گیا جو اس وقت عالم اسلام میں منہ پھیلائے اسلام کے شجرہ طیبہ اور اس کے پورے اعتقادی، فکری اور روحانی نظام کو نگل لینے کے لیے تیار تھے۔ ان میں ایران کی نقطوی تحریک اور اس کے پیروکار، اکبر کا دین اکبری جو ہندوستان میں نبوت و شریعت محمدی کی جگہ لینے اور اس کا بدل بننے کا مدعی تھا، اور اس میں وہ دینی بدعات بھی تھیں جو دینی زندگی، اعمال و عبادات اور معاشرہ و تمدن میں پھیلی ہوئی تھیں اور جن کی ایک مستقل ''فقہ'' مدون ہو رہی تھی۔ اسی سلسلہ میں وحدت الوجود کا فلسفہ بھی آتا ہے جو اپنے داعیوں اور علم برداروں کے بقول کشفی حقائق پر مبنی تھا۔ اس ضمن میں فرقہ امامیہ کا گروہ بھی آتا ہے جس کے اساسی عقائد میں امامت کا عقیدہ بھی ہے جس میں امام نبی کا ہمسر اور مساوی بن جاتا ہے۔ اس طرح انہوں نے ''نبوت محمدی پر ایمان و اعتماد کی تجدید'' کی شاہ کلید (Master Key) سے وہ سارے بھاری اور پیچیدہ قفل کھول دیئے جو یونانی و ایرانی فلسفہ اور مصری و ہندوستانی اشراقیت نے ایجاد کیے تھے۔ آپ نے اس ایک تیر سے ان سب فتنوں کو ختم کیا جن کا مسلمانوں کا ذہین طبقہ نشانہ بنا ہوا تھا۔

حضرت مجدد صاحبؒ کا ایک تجدیدی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے عقل اور کشف دونوں کو ''غیبیات'' ماوراء عقل علوم، ذات و صفات الٰہی کی صحیح معرفت، لاریبی علم اور قطعی الثبوت حقائق کے یقینی ادراک سے عاجز اور قاصر ثابت کیا اور یہ کہ ان کے حاصل کیے ہوئے نتائج شک و ریب اور خطاء، لغزش اور غلط فہمی سے مبرا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح عقل کا مرتبہ حواس سے ماوراء ہے اسی طرح نبوت کا مرتبہ عقل سے ماوراء ہے۔ خدا کی تعظیم کا صحیح طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور انبیاء علیہم السلام کی اطلاع اور تعلیم پر موقوف

Marfat.com

ہے۔ معرفت خداوندی میں عقلائے یونان نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں اور مضحکہ خیز غلطیاں کی ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ عقل کا خالص اور بے آمیز ہونا ممکن نہیں اور وہ بھی داخلی عقائد و مسلمات اور خارجی عوامل و اثرات سے متاثر ہوتی ہے اور اس کے بہت سے فیصلے اور نتائج غلط ہوتے ہیں۔ انہوں نے ثابت کیا کہ عقل حجت میں ناقص ہے۔ حجت کامل انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہے۔

پھر عقل کی قوت اور اس کا عمل محدود ہے۔ اس کا ایک دائرہ ہے جس سے وہ باہر نہیں جا سکتی جس طرح انسان کے حواس کے علیحدہ علیحدہ دائرے ہیں اور ان کا عمل انہی کے اندر محدود ہے۔ اسی طرح عقل اگرچہ اس کا میدان ان حواس ظاہری سے زیادہ وسیع ہے لیکن بہرحال محدود ہے۔ چنانچہ علامہ ابن خلدونؒ نے لکھا ہے:

''عقل صحیح ترازو ہے۔ اس کے فیصلے یقینی ہیں جن میں کوئی جھوٹ اور کذب نہیں۔ لیکن تم اس ترازو میں امور توحید، امور آخرت، حقیقت نبوت، حقائق صفات الٰہی اور وہ تمام امور و حقائق جو ماوراء عقل ہیں، تول نہیں سکتے۔ یہ ایک لاحاصل کوشش ہو گی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے ایک ترازو دیکھی جو سونے کا وزن کرنے کے لیے ہے، اس کو اس ترازو میں پہاڑوں کو تولنے کا شوق پیدا ہوا جو ناممکن ہے۔ اس سے ترازو کی صحت پر کوئی حرف نہیں آتا، لیکن اس کی گنجائش کی ایک حد ہے۔ اسی طرح عقل کے عمل کا بھی ایک دائرہ ہے جس سے باہر وہ قدم نہیں نکال سکتی۔ وہ اللہ اور اس کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی کہ وہ اس کے وجود کا ایک ذرہ ہے۔''

(مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۳)

اب حضرت مجدد صاحبؒ کے عقل کے بارے میں مندرجہ ذیل ارشادات پر نگاہ ڈالیے جو ان کے مختلف مکاتیب سے اقتباس کیے گئے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''عقل اگر معرفت الٰہی کے مسئلہ میں کافی ہوتی تو فلاسفۂ یونان جنہوں نے

Marfat.com

عقل کو اپنا مقتدیٰ بنایا ہے، گمراہی کے بیابان میں نہ بھٹکتے پھرتے اور حق تعالیٰ شانہ کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پہچانتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے معاملہ میں جاہل ترین یہی لوگ ہیں کہ انہوں نے حق سبحانہ کو بیکار اور معطل سمجھ لیا اور سوائے ایک چیز (عقل فعال) کے اس کو کسی چیز کا فاعل اور خالق نہیں مانتے اور وہ بھی ان کے خیال کے مطابق اس سے اضطراراً نہ کہ اختیاراً وجود میں آئی ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے عقل فعال تراشی ہے، حوادث کو زمین و آسمان کے خالق سے ہٹا کر اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور اثر کو موثر حقیقی سے روک کر اپنی تراشیدہ چیز یعنی عقل فعال کا اثر مانتے ہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک معلول علت قریبہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ علت بعیدہ کے لیے معلول کے حصول میں کوئی دخل اور اثر نہیں مانتے اور اپنی نادانی سے ان اشیاء کی طرف نسبت نہ ہونے کو اللہ کی صفت کمال جانتے ہیں، اور اس کو بیکار اور معطل ماننے کو اس کی تعظیم سمجھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے کو خود زمین و آسمان کا خالق کہتا ہے اور "رب المشرق والمغرب" کے ساتھ اپنی تعریف بیان کرتا ہے۔

"ان بے عقلوں کو اپنے خیال کے مطابق اللہ تعالیٰ کی کچھ احتیاج نہیں اور نہ اس کے سامنے کچھ عجز و نیاز ہے۔ مجبوری اور ضرورت کے وقت چاہیے کہ وہ اپنی عقل فعال کی طرف رجوع کریں اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل اسی سے چاہیں، اس لیے کہ اصل قدرت اور اصل اختیار ان کے نزدیک اسی کا ہے بلکہ عقل فعال بھی ان کے خیال کے مطابق اپنا عمل کرنے میں مجبور اور غیر مختار ہے، اس لیے اس سے بھی اپنی ضرورت کی تکمیل چاہنا غیر معقول بات ہے۔ اصل یہ ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے: "ان الکافرین لا مولیٰ لھم" (ان کافروں کا کوئی سرپرست اور کارساز نہیں) ان کا کوئی بھی حامی و ناصر نہیں۔

Marfat.com

خدا بھی نہیں اور عقل فعال بھی نہیں۔ عقل آخر کیا چیز ہے؟ جو چیزوں کا انتظام کرتی ہے اور حوادث کے ظہور و خلق کی اس کی طرف نسبت کی جاتی ہے، محض اس کے ثابت ہونے اور اس کی ہستی میں ہزاروں اعتراض اور کلام ہیں کیونکہ اس کا ثبوت و وجود محض فلسفہ کے گھڑے ہوئے مقدمات پر مبنی ہے جو اسلام کے قواعد صحیحہ کی رو سے نامکمل اور ناقص ہیں۔ کوئی احمق ہی ہوگا جو اشیاء کو قادر و مختار جل شانہ سے ہٹا کر اسے محض ایک فرضی اور موہوم شی کی طرف منسوب کرے گا، بلکہ خود ان چیزوں کو اس بات سے ہزار ہزار ننگ و عار ہے کہ وہ اپنے خلق میں فلسفہ کی ایک تراشی ہوئی بے حقیقت چیز کی طرف منسوب ہوں بلکہ یہ چیزیں اپنے نابود ہونے پر راضی اور مسرور ہوں گی، اور ان کو موجود ہونے کی کوئی خواہش نہ ہو گی۔ اس بات کے مقابلہ میں کہ ان کے وجود کی نسبت ایک بے حقیقت فرضی شی کی طرف ہو اور وہ قادر و مختار کی قدرت کی طرف منسوب ہونے کی سعادت سے محروم ہو جائیں، کبرت کلمة، تخرج من افواههم ان يقولون الا كذبا (بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے، یہ محض جھوٹ کہتے ہیں) دار الحرب کے کافر اپنی بت پرستیوں کے باوجود اس جماعت فلاسفہ سے بہتر ہیں کہ حق سبحانہ وتعالیٰ سے مشکل کے وقت التجا کرتے ہیں اور بتوں کو اس کے حضور میں شفاعت کے لیے وسیلہ بناتے ہیں۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک گروہ ان احمقوں یعنی حکمائے یونان کو حکماء کے لقب سے یاد کرتا ہے اور حکمت کی طرف ان کو منسوب کرتا ہے۔ ان فلاسفہ کے اکثر مسائل خصوصاً الٰہیات میں جو مقصد اعلیٰ ہے، غلط ہیں اور کتاب وسنت کے مخالف، حکماء کا ان کو لقب دینا جن کا سرمایہ جہل مرکب ہے، آخر کس لحاظ سے ہے؟ ہاں البتہ طنز و مذاق کے طور پر ہو سکتا ہے یا اس طرح جس طرح نابینا کو بینا کہا جائے۔"

(مکتوب بنام خواجہ ابراہیم قبادیانی دفتر ۳ نمبر ۲۳)

Marfat.com

حضرت مجدد صاحبؒ نے ہمارے علم کے مطابق علمائے اسلام میں پہلی مرتبہ یہ آواز بلند کی کہ عقل کا خالص اور بے آمیز ہونا جسم عنصری کے متعلق اور ماحول میں پھیلے ہوئے اوہام و تخیلات، عقائد و مسلمات، باطنی رجحانات اور راسخ اخلاق اور خواہشات سے آزاد ہونا قریباً محال ہے۔ مجدد صاحبؒ کی یہ تحقیق ان کے مکتوبات میں کئی جگہ پر مرقوم ہے۔ یہ ان کی علمی اور فکری دنیا میں ایک دریافت اور ایک ایسا انقلابی اور جرأت مندانہ اعلان ہے جس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ صحیح طور پر ابھی تک نہیں کیا گیا۔

لیکن حیرت انگیز اور حیرت زا بات یہ ہے کہ حضرت مجدد صاحبؒ سے قریباً دو سو سال بعد جرمنی کے مشہور فلسفی امینول کانٹ (Immanuel Kant) (۱۷۲۴-۱۸۰۴ء) نے عقل کے خالص اور مجرد ہونے اور اس کے ماحول، ورثہ، عادات و معتقدات سے آزاد ہو کر بے لاگ فیصلہ کرنے کی صلاحیت پر علمی اور تحقیقی بحث کا آغاز کیا، اور اس نے عقل کے حدود کی جرأت و وضاحت کے ساتھ تعیین کی۔ ۱۷۸۱ء میں اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''تنقید عقل محض'' (Critique of our Reason) شائع کی جس نے دنیائے فکر و فلسفہ میں ہلچل مچا دی اور ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ''روشن خیالوں کے کارناموں کو خاک کا ڈھیر کر دیا۔'' مغرب میں کانٹ کے اس کارنامہ کی عظمت کا شاندار طریقہ پر اعتراف کیا گیا اور کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ وہ جرمن قوم کے لیے خدا کا سب سے بڑا عطیہ تھا۔ تاریخ فلسفہ کا ایک غیر فانی کمال پارہ ہے جس نے فکر انسانی کی ہرزہ گردیوں میں انگشت راہنما کا کام کیا۔''

(تاریخ فلسفہ جدید ترجمہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جلد۲ ص ۳۸)

کانٹ نے عقل پر جو تنقید کی ہے وہ نامکمل ہے اور کئی سوالوں کے وہ جواب نہیں دے سکا لیکن مجدد صاحب نے ان سب سوالوں کے شافی جوابات اپنے مکتوبات میں دیے ہیں۔ پھر آپ نے مخالف عقل اور ماوراء عقل کا فرق بیان کر کے کشف اور مقام نبوت کو ثابت کیا ہے لیکن یہ بحث ہم یہاں نہیں کرنا چاہتے۔

Marfat.com

کیا حضرت مجددؒ نے تنہا اکبری الحاد کو ختم کیا؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کیا تنہا اس فتنہ اکبری کا قلع قمع کیا یا کچھ اور علماء بھی آپ کے ساتھ تھے اور ان کا بھی اس اکبری الحاد کے استیصال میں کچھ حصہ ہے؟ یہ درست ہے کہ اس زمانہ میں اور بھی کئی علماء ایسے تھے جو موقع بموقع عہد اکبری میں اس الحاد پر اپنی ناگواری اور اسلامی جذبات کا اظہار کرتے رہتے تھے جن میں ایک شیخ ابراہیم محدث اکبرآبادی (م ۱۰۰۱ھ) بھی تھے۔ وہ بادشاہ کے لیے غیر شرعی آداب و تعظیم نہیں بجا لائے۔ جس سے اکبر ناراض ہو گیا۔ ان میں ایک شیخ حسین اجمیری تھے جنہوں نے اکبر کو سجدۂ تعظیمی نہیں کیا اور بادشاہ ان سے بھی ناراض ہو گیا اور ان کو بھکر کے قلعہ میں قید کر دیا۔ اسی سلسلہ میں جرأت مندانہ اقدام شہباز خان کنبوہ کا بھی ہے جو اکبر کے امراء کبار میں سے تھے۔ یہ بھی بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے کبھی باز نہیں رہے۔ شیخ عبدالقادر اچی بھی انہی جری اور بہادر لوگوں میں سے تھے جنہوں نے کبھی بھی غیر شرعی امور میں بادشاہ کی موافقت نہیں کی۔ انہی کے ایک ہم نام شیخ عبدالقادر لاہوری تھے۔ ان سے بھی اکبر ان کی دینی صلابت کی وجہ سے ناراض تھا۔ اسی طرح مرزا عزیز الدین دہلوی کوکہ جو اکبر کے ہم عمر اور دودھ شریک بھائی تھے اور جن سے اکبر کو از حد محبت تھی، وہ بھی صاف گوئی میں اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے اکبری الحاد کی کبھی موافقت نہیں کی۔ ان حضرات کے علاوہ اور بھی کئی حضرات تھے جو ان باتوں میں اکبر کے سخت مخالف تھے، لیکن حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جس ترکیب و ترتیب کے ساتھ فتنۂ اکبری کا قلع قمع کیا اس میں آپ یکہ و تنہا تھے اور کوئی شخص اس میں آپ کا شریک نہیں تھا، اسی وجہ سے آپ کے معاصرین اور متاخرین نے آپ کو الف ثانی کا مجدد قرار دیا۔ مولانا ابوالکلام نے لکھا ہے:

''شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیا ہندوستان علماء اور مشائخ سے بالکل خالی ہو گیا تھا؟ کیسے کیسے اکابر موجود

تھے، لیکن مفاسد وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔
صرف مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا وجود گرامی ''تن تنہا'' اس
کاروبار کا کفیل ہوا۔'' (تذکرہ ص ۲۳۸)

اس کے فٹ نوٹ میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ان (مجدد صاحب) کی تجدید محض ردّ بدعات جہال صوفیہ و تحقیق بعض معارف تصوف و اعلان و اشتہار توحید شہودی میں منحصر ہے حالانکہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔''

ہمارے خیال میں مولانا ابوالکلام آزاد نے بالکل صحیح فرمایا ہے اس لیے آج عوام الناس ہی نہیں بلکہ اہل علم حضرات بھی اکبری الحاد کا قاطع صرف حضرت مجدد صاحب کو قرار دیتے ہیں۔

تجدید کا طریقۂ کار:

حضرت مجدد نے تجدید کا طریقہ کار یہ اختیار کیا کہ برائے نام مسلم سلطنت کے فرماں روا کو اپنی اصلاح کا مرکز بنایا کیونکہ آپ یہ سمجھتے تھے کہ اگر بادشاہ درست ہو گیا تو اس کی تمام سلطنت درست اور صحیح ہو جائے گی۔ چنانچہ آپ نے شیخ فرید کو جو بادشاہ کے بڑے مقرب تھے ایک مکتوب میں لکھا کہ

''بادشاہ کی درستگی سے عالم کی درستگی ہے اور بادشاہ کے فساد سے عالم کا فساد ہے۔ (صلاح بادشاہ صلاح عالم است و فساد او فساد عالم) آپ جانتے ہیں کہ زمانۂ ماضی (یعنی عہد اکبری) میں اہل اسلام پر کیا کچھ نہیں گزرا۔ زمانہ ماسبق میں جب کہ اسلام کی غربت حد کو پہنچی ہوئی تھی، اہل اسلام کی بدحالی اس سے آگے نہیں بڑھی تھی کہ مسلمان اپنے دین پر رہیں اور کافر اپنے طریقہ پر...... لیکن زمانہ ماضی میں تو یہ حال ہوا کہ کفار تو برملا پورے غلبہ کے ساتھ دار الاسلام میں احکام کفر جاری کرتے تھے اور مسلمان احکام اسلام ظاہر

Marfat.com

کرنے سے بھی عاجز وقاصر تھے اور اگر ظاہر کرتے تھے تو قتل کیے جاتے تھے۔
(مکتوب نمبر ۴۷ دفتر اول حصہ دوم ص ۱۸)

آپ کو اپنی باطنی تکمیل وتربیت کے بعد ہی اس بات کا اذعان پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی دوسرا ہی کام لینا ہے اور وہ پیری مریدی یا انفرادی عبادات و ترقیات کے لیے پیدا نہیں کیے گئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سلسلہ ہی کے ایک بزرگ خواجہ عبید اللہ احرارؒ (م ۸۹۵ھ) کا یہ مقولہ نقل کر کے ''حدیث دیگراں'' میں ''سر دلبراں'' کہہ دیا ہے کہ حضرت خواجہ احرارؒ فرماتے تھے:

''اگر میں صرف پیری مریدی کرنے پر آ جاؤں تو دنیا میں کسی پیر کو کوئی مرید نہ ملے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ کچھ اور ہی کام سپرد کیا ہے، اور وہ ترویج شریعت اور تائید ملت ہے۔''

پھر اس جملہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آپ بادشاہوں کی مجلسوں میں تشریف لے جاتے تھے اور اپنی قوت باطنی اور تاثیر روحانی سے ان کو اپنا مطیع ومنقاد بنا لیتے تھے، پھر ان کے ذریعہ شریعت کو رواج دیتے تھے۔'' (مکتوب نمبر ۶۵ بنام خانِ اعظم دفتر اول)

آپ نے اس راستہ میں پھونک پھونک قدم رکھا۔ آپ نے حالات میں انقلاب لانے کے لیے پرخطر اور مشتبہ راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ تخریب کے بجائے تعمیر، نفی کے بجائے اثبات اور ازالہ کے بجائے امالہ کا راستہ اختیار کیا جو ایک بے ضرر اور ہر طرح کے خطرات سے محفوظ راستہ تھا۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے ارکان سلطنت سے رابطہ قائم کیا جو بہر حال مسلمان تھے۔ آپ نے اپنی خداداد ذہانت سے معلوم کر لیا کہ دور اکبری کے مخالف اسلام منصوبہ میں وہ شریک نہیں تھے بلکہ وہ اکبر کے ملحدانہ اقدامات کو ناپسند کرتے تھے۔ ان حضرات میں سے کئی ان کے مرشد حضرت باقی باللہ اور خود ان سے اگر ارادت کا نہیں تو محبت وعقیدت کا تعلق رکھتے تھے اور وہ حضرت مجددؒ

Marfat.com

کے اخلاص و بے غرضی اور اسلام کے لیے دل سوزی اور دردمندی سے واقف و آشنا تھے۔ اور وہ حضرات درج ذیل تھے۔

۱-	نواب سید مرتضٰی عرف شیخ فرید	(م ۱۰۲۵ھ)
۲-	خان اعظم مرزا کوکہ	(م ۱۰۳۳ھ)
۳-	خان جہاں لودھی	(م ۱۰۴۰ھ)
۴-	صدر جہاں پہانوی	(م ۱۰۲۷ھ)
۵-	لالہ بیگ جہاں گیری	وغیرہ

چنانچہ آپ نے ان حضرات کو اور ان جیسے دوسرے ارکانِ سلطنت کو خطوط لکھے اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ جہانگیر کو نیک مشورہ دے کر سلطنت کا رخ اکبر کے ڈالے ہوئے راستے پر چلتے رہنے اور اسلام کے تقاضوں سے چشم پوشی اور بے تعلقی، اسلام اور مسلمانوں کی کس مپرسی سے حمایت دین اور شعائر واحکام اسلام کے احترام کی طرف موڑنے کی کوشش کریں۔ اس طریقہ سے آپ نے مکتوب الیہ اور مکتوب الیہ نے بادشاہ کو پھر بادشاہ نے سلطنت کے رخ کو حمایت اسلام کے راستہ پر ڈالا۔ اور گذشتہ حکومت کے اثرات کو بتدریج مضمحل کیا۔ چنانچہ آپ نے نواب سید فرید بخاری کو اپنے ایک خط میں جو غالباً جہانگیر کی تخت نشینی کے بعد جلد ہی لکھا گیا، فرماتے ہیں:

"بادشاہ کو عالم سے وہی نسبت ہے جو دل کو بدن سے ہے۔ اگر دل صحیح و صالح ہے تو بدن بھی صحیح اور صالح ہوگا، اور اگر وہ فاسد ہے تو بدن بھی فاسد ہوگا۔ بادشاہ کا صلاح عالم کا صلاح ہے اور اس کا فساد عالم کا فساد ہے۔"

یہ سارا خط پڑھنے کے قابل ہے۔ اسی طرح دوسرے حضرات کو بھی آپ نے اسی طرح کے خطوط لکھے۔ چنانچہ آپ کی یہ سعی رائیگاں نہیں گئی اور ان مکتوب الیہم نے اور خاص طور پر نواب سید فرید نے حکومت کا رخ بدلنے میں ایک بنیادی اور مرکزی کردار ادا کیا، لیکن ابھی جہانگیر کے مزاج میں وہ تبدیلی نہیں پیدا ہوئی تھی جس کی اس

Marfat.com

عظیم الشان کام کے لیے ضرورت تھی۔ شخصی سلطنتوں میں بادشاہ کی ذات مرکزی نقطہ ہوتی ہے جس کے گرد حکومت کا سارا نظام گردش کرتا ہے۔ اس کا کسی بات کے لیے ارادہ کر لینا اور خدا کے کسی مخلص اور بے لوث بندے سے اس کے دل میں عقیدت اور محبت کا پیدا ہو جانا ہزاروں میل کے فاصلہ کو گھنٹوں اور منٹوں میں طے کرا دیتا ہے اور بعض اوقات بظاہر ممکن العمل چیز کو نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بنا دیتا ہے۔ گوالیار کی اسیری سے رہائی کے بعد حضرت مجدد جو ساڑھے تین چار سال لشکر شاہی کے ساتھ رہے اور اس عرصہ میں جہانگیر سے صحبتیں رہیں اور مختلف اوقات میں مسائل دینیہ پر گفتگو رہی، اس سے بادشاہ کو مجدد صاحبؒ کی دینی صلابت اور استقامت کا نمونہ اور ان کے روحانی فیوض و برکات اور پھر جیل خانے میں ان کی صحبت کی تاثیر سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں غیر مسلموں کا مسلمان ہو جانا دیکھا اور مجلس کی گفتگو میں ان کے رسوخ فی العلم کا بھی تجربہ کیا تو وہ سمجھ گیا کہ وہ ان لوگوں سے بہت مختلف ہیں جو ابھی تک دربار کی زینت اور بوریائے فقر کے مسند نشین ہیں۔ چنانچہ اس بات نے جلد ہی بادشاہ کا رخ شعائر اسلام کی سربلندی اور اسلام سے دلچسپی کی طرف پھیر دیا۔

پھر بادشاہ کا بیٹا شاہجہان جس کا عہد سلطنت ۳۱ سال رہا اور جو حضرت مجدد صاحبؒ کی وفات کے دو سال بعد تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس کے دل میں حضرت مجدد صاحبؒ کے لیے نرم گوشہ اور احترام و اخلاص رہا۔ اب شاہجہان کے فرزند اورنگ زیب عالم گیر کو تو حضرت مجددؒ کے خاندان سے عقیدت اور ان کی دعوت و مسلک سے ابتداء ہی سے مناسبت تھی۔ اسے حضرت مجددؒ کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصومؒ سے بیعت و ارادت کا تعلق تھا، حضرت خواجہ معصوم کی اورنگ زیب کی شہزادگی کے وقت سے اس پر نظر خاص تھی اور وہ اس کو شہزادہ دین پناہ کے لقب سے یاد فرماتے تھے۔ اورنگ زیب نے پھر دین کا وہ کام کیا کہ دینی حلقوں نے اسے ”محی الدین“ کا لقب دیا۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے بھی ان کے بارہ میں لکھا۔

Marfat.com

شاہ عالمگیر گردوں آستان	اعتبار دودمان گورگان
پایۂ اسلامیاں برتر ازو	احترام شرع پیغمبر ازو
درمیان کار زار کفر و دیں	ترکش مارا خدنگ آخریں
تخم الحادے کہ اکبر پرورید	باز اندر فطرت دارا دمید
شمع دل در سینہ ہا روشن نبود	ملت مارا فساد ایمن نبود

Marfat.com

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد ہندوستان میں ایک اور ہستی نے جنم لیا جس نے نہایت تجدیدی اور عظیم انقلابی کارنامے انجام دیے۔ وہ شخصیت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تھی جس نے اگرچہ جنم تو ہندوستان کے مشہور شہر دہلی میں لیا لیکن تجدیدی کارناموں کے منصوبے انہوں نے حجاز میں بیٹھ کر بنائے۔ انہوں نے حجاز میں اپنے دو سالہ قیام میں عالم اسلام کی روحانی، علمی، اخلاقی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی حالت کا جائزہ لیا اور مختلف ممالک عربیہ اسلامیہ کی ترقی وانحطاط اور عروج و زوال کا اندازہ کیا۔ عالم اسلام کی نبض حیات اور قلب اسلام کی دھڑکنوں کو سنا۔ شاہ ولی اللہؒ ایک بیدار مغز اور دردمند دل رکھنے والے انسان تھے جس کو تدبیر الٰہی تجدید و احیائے دین کے کار عظیم کے لیے تیار کر رہی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ولادت اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات (۱۱۱۸ھ) سے چار سال پہلے (۱۱۱۴ھ) ہوئی۔ عالمگیر ہندوستان کا سب سے بڑا فرماں روا تھا، چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ

''اس کی حکومت غزنی سے چٹاگانگ تک اور کشمیر سے کرناٹک تک وسیع تھی۔''

(کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ۴ ص ۳۱۶)

اک اور مورخ نے لکھا ہے کہ

''قدیم زمانہ سے انگریزوں کے عروج تک ہندوستان میں اتنی طویل وعریض حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی تھی۔'' (کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد ۴ ص ۳۱۶)

اورنگ زیب نے زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اپنی پوری توجہ عہد اکبری کے ملحدانہ نظریات اور خلاف اسلام اثرات کو مٹانے، ایران کے ان مجوسیت آمیز تہذیبی اثرات کو جو عہد اکبری میں قائم ہو گئے تھے ختم کرنے کے اقدامات کیے۔ محتسب کا شرعی عہدہ قائم کیا، حکومت کی بیش قرار غیر شرعی آمدنیاں موقوف کیں، رقص وسرود اور جھروکہ درشن کو بند کیا، شرعی قاضی مقرر کیے، پوری سلطنت میں شرعی قوانین نافذ کرنے اور قاضیوں کی آسانی کے لیے مسائل فقیہ کی تدوین و ترتیب کا بیڑا اٹھایا جس کے لیے فتاویٰ عالمگیری کا ایک مجموعہ تیار ہوا جو پوری اسلامی دنیا میں ''الفتاویٰ الہندیہ'' کے نام سے مشہور ہو کر اسلامی قوانین کا ایک مستند ماخذ سمجھا گیا۔ ان انقلابی کارناموں کے علاوہ اس کی سب سے نمایاں صفت اس کی بیدار مغزی، فرض شناسی اور امور سلطنت سے مکمل واقفیت اور نظم ونسق پر کلی طور پر حاوی ہونے کی کوشش ہے۔ مملکت کی وسعت کے باوجود اس کے نظم ونسق پر مطلع اور حاوی ہونا اسی شخص کا کام ہے جو فولادی جسم اور آہنی عزم کے ساتھ ساتھ خوف خدا اور احساس ذمہ داری کا جذبہ رکھتا ہو۔

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اس کی اولاد میں اس کے انتقال کے بعد اس تخت پر وہ لوگ آئے جنہوں نے گویا قسم کھائی تھی کہ عالمگیر سے حمایت وحفاظت اسلام، احیاء دین اور اجراء شریعت کی جو غلطی ہوئی تھی وہ اس کی تلافی کریں گے۔ نیز اس نے سلطنت کے حدود میں جو توسیع کی تھی اور ملک کو جو استحکام بخشا تھا، وہ اپنی تعیش پسندی، کاہلی و نااہلی، اندرونی اختلاف وکشمکش اور امور سلطنت سے غفلت کے ذریعہ اس گناہ کا جو اورنگ زیب سے سرزد ہوا تھا، مسلسل کفارہ ادا کرتے رہیں گے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) میں عالمگیر کے بعد گیارہ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ ان میں سے کسی کی مدت حکومت صرف دس ماہ، کسی کی چار ماہ سے کم اور کسی کی چند روز کی رہی۔

Marfat.com

اسی سیاسی انتشار اور اجتماعی بدنظمی اور انحطاط کے باوجود یہ دور انفرادی طور پر علمی کمالات، تصنیفی انہماک اور باطنی ترقی کا دور تھا جس میں علمی اور روحانی طور پر ایسی باکمال شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کو اس دور انحطاط سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ چنانچہ اس دور میں ملا جیون امیٹھویؒ صاحب نور الانوار، ملا حمد اللہ سندیلوی، صاحب شرح سلم مشہور بحمد اللہ، مولانا محمد حسن معروف بملا حسن فرنگی محلی صاحب شرح ملا حسن، قاضی محب اللہ بہاری مصنف سلم العلوم و مسلم الثبوت، قاضی مبارک مصنف شرح سلم معروف بہ قاضی، مولانا رستم علی قنوجی، شیخ صفۃ اللہ خیر آبادی، مولانا غلام علی آزاد بلگرامی، مولانا غلام نقشبند لکھنوی، مولانا محمد اعلیٰ تھانوی مصنف کشاف اصطلاحات الفنون اور ملا نظام الدین لکھنوی بانی درس نظامی جیسے سرآمد روزگار اور فخر بلاد و امصار حضرات پیدا ہوئے۔ اور روحانی حضرات میں سے سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگ سید عبدالرزاق بانسوی، سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مجدد شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی، شاہ فخر الدین دہلوی، شاہ محمد غوث قادری لاہوری، شیخ محمد عابد سنامی، خواجہ محمد ناصر عندلیب والد خواجہ میر درد اور شاہ منیب اللہ بالا پوری وغیرہ اس عہد میں مسند آرا نظر آتے ہیں۔

لیکن ان نامور اہل کمال اور مسیحا نفس شیوخ کے ہوتے ہوئے ہندوستان کا مسلم معاشرہ اور خاص طور پر طبقہ امرا، سیاسی زوال، دولت کی فراوانی اور ایرانی تہذیب کے اثر سے اخلاقی زوال کے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اس اخلاقی اور معاشرتی پستی سے زیادہ خطرناک اور خدا کی نصرت سے محروم کرنے والی خرابی ضعیف الاعتقادی تھی۔ مسلم معاشرہ میں بدعات کا زور، ہندوؤں اور شیعوں کے بہت سے رسوم و عادات کی تقلید تھی، قبر پرستی، مشائخ کے لیے سجدۂ تعظیمی، مزارات اور ان کے قرب و جوار کا حرم کی طرح احترام، قبروں پر چادریں چڑھانا، بزرگوں کے نام پر قربانیاں کرنا، مزارات پر میلے لگانا، مزارات کا طواف کرنا، گانا بجانا، شیخ سدو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے، محرم کے تعزیے، غیر اسلامی تہواروں کو شان و شوکت سے منانا، چیچک کی بیماری میں سیتلا کی تعظیم، اولیاء اور صالحین کے لیے منتیں ماننا،

Marfat.com

خاص کھانے جیسے بی بی کی صحنک، مخدوم صاحب کا توشہ وغیرہ۔ ان سب باتوں سے عقیدہ توحید اپنی وسعت کے باوجود اس مفہوم میں محدود ہو کر رہ گیا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی زمین و آسمان اور تمام کائنات کا حقیقی خالق اور صانع ہے اور بڑے بڑے امور وہی انجام دیتا ہے لیکن اس نے سلاطین عالم کی طرح اپنی سلطنت کے بہت سے شعبے اپنے مقبول بندوں کے سپرد کر دیے ہیں جو ان کے مالک اور مختار ہیں۔ اب ان کو راضی کیے اور ان سے رابطہ کیے بغیر اس سلسلہ میں کوئی کار براری اور کامیابی نہیں ہو سکتی۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس وقت کی اس مجموعی صورت حال کو اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے:

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام تھا۔ مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا۔ جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے۔ مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا۔ فقہ و فتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی۔ مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق مذہب کا سب سے بڑا جرم تھا۔ عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکامات و ارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے۔" (مقالات سلیمانی ص ۴۴)

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کو ۴ شوال ۱۱۱۴ھ بروز بدھ طلوع آفتاب کے وقت قصبہ پھلت (حال ضلع مظفر نگر) میں اپنے ننہال میں پیدا فرمایا، آپ کی ولادت کے وقت آپ کے والد شاہ عبدالرحیم کی عمر ساٹھ سال تھی۔ آپ کی والدہ کا نام فخر النساء تھا وہ علوم دینیہ میں ایک درک رکھتی تھیں۔ ولادت سے قبل شاہ عبدالرحیم نے خواجہ قطب الدین بختیارؒ کو خواب میں دیکھا۔ انہوں نے فرزند کی بشارت دی اور فرمایا کہ اس کا نام میرے نام پہ قطب الدین احمد رکھنا۔ باپ نے پہلے نام ولی اللہ رکھا۔ کچھ مدت کے بعد دوسرا نام قطب الدین احمد رکھا۔ (انفاس العارفین ص ۴۴)

پانچ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوئے اور پندرہ سال کی عمر میں تمام علوم

Marfat.com

متداولہ سے فراغت حاصل کر لی۔ باپ نے نہایت اچھے طریقے سے تعلیم و تربیت کی۔ جس کا تذکرہ الجزء اللطیف ص ۳ پر کیا ہے۔ چودہ سال کی عمر میں باپ نے آپ کے ماموں شیخ عبیداللہ صدیقی پھلتی کی صاحبزادی سے شادی کر دی۔ اس زوجہ سے آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد پیدا ہوئے۔ آپ کا دوسرا عقد پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد سید ناثناء اللہ سونی پتی کی صاحبزادی بی بی ارادت سے ہوا۔ اس زوجہ محترمہ سے آپ کے چاروں نامور فرزند تولد ہوئے جو ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے ارکان اربعہ ہیں۔ اور ایک صاحبزادی امۃ العزیز پیدا ہوئیں جو صاحب اولاد ہوئیں۔

تیس (۳۰) سال کی عمر میں شاہ صاحبؒ نے سفر حج کیا۔ اس وقت سورت ہندوستان کی بندرگاہ اور باب مکہ تھا۔ راستہ مرہٹوں کی غارت گری کی آماجگاہ تھا۔ شمالی ہند سے جنوبی ہند تک اس طویل راستہ کو سواریوں، بیلوں وغیرہ سے طے کرنا آسان نہ تھا۔ سورت سے جدہ ۴۵ روز میں پہنچنا ہوا۔ ۱۵ ذی قعدہ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ علماء اور طلباء کی درخواست پر مسجد حرام میں درس شروع کیا جس میں بہت ہجوم ہوا۔ آخر ذی الحجہ ۱۱۴۳ھ میں حج سے مشرف ہوئے۔ ۱۱۴۴ھ تک بیت اللہ کی مجاورت کی اور زیارت مدینہ سے مشرف ہوئے۔ شیخ ابو طاہر مدنی اور دوسرے مشائخ سے حدیث کی روایت کی۔ شیخ ابو طاہر نے خرقہ پہنایا۔ اس سال ۱۱۴۴ھ میں دوبارہ مناسک حج ادا کیے اور ۱۱۴۵ھ کے اوائل میں ہندوستان واپس ہوئے اور ۱۰ رجب ۱۱۴۵ھ کو جمعہ کے روز دہلی تشریف لائے۔ (الجزء اللطیف ص ۵) شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم مدنیؒ کہا کرتے تھے کہ شیخ ولی اللہ مجھ سے الفاظ کی سند لیتے ہیں اور میں ان سے حدیث کے مطالب میں استفادہ کرتا ہوں۔ اپنی اجازت میں بھی ایسا ہی لکھا۔ (الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی) شیخ ابو طاہر محدث کبیر ہونے کے باوجود صوفیہ کے بڑے معتقد اور ان پر تنقید کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں جب شیخ ابو طاہر سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے یہ شعر پڑھا ۔

Marfat.com

نسیت کل طریق کنت اعرفه

الا طریقاً یودینی لربعکم

یعنی میں چلنے کا ہر راستہ بھول گیا سوائے اس راستہ کے جو آپ کے گھر تک پہنچاتا ہے۔

شاہ صاحب کے دوسرے استاد حدیث شیخ تاج الدین قلعی حنفی مفتی مکہ تھے۔ آپ نے ان سے مؤطا کا ایک حصہ، مسند دارمی، کتاب الآثار امام محمد اور موطا امام محمد سنی۔ حدیث مسلسل بالاولیہ بھی ان سے سنی۔ آپ نے حافظ حدیث شیخ محمد بن سلیمان المغربی کے صاحبزادہ شیخ محمد وفد اللہ سے اپنے والد کی تمام مرویات کی اجازت حاصل کی۔ اس کے علاوہ مؤطا یحییٰ بن یحییٰ کا ملاً ان سے پڑھی اور اس کی اجازت لی۔

ہندوستان میں آپ نے امام حدیث حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے حدیث پڑھی جنہوں نے حدیث کی سند شیخ سالم بن عبداللہ بصری سے حاصل کی تھی۔ وہ شیخ عبدالاحد بن شیخ خواجہ محمد سعید سرہندی کے بھی شاگرد تھے۔ غازی الدین خان کے مدرسہ دہلی میں حدیث کا درس دیتے تھے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے حدیث و سلوک دونوں میں ان سے استفادہ کیا۔

علم حدیث کی تکمیل کے بعد آپ نے ہندوستان واپسی کا فیصلہ کیا جس میں اللہ تعالیٰ نے وہ خیر مقدر فرما رکھی تھی جس کا آپ کے تجدیدی واجتہادی کارنامہ میں ظہور ہوا اور اس بشارت نبوی کا تحقق جو آپ کو مدینہ منورہ کے قیام میں حاصل ہوئی تھی۔

ان مراد الحق فیک ان یجمع شملاً من شمل الامة المرحومة بک

(فیوض الحرمین ص ۶۲)

خدا کا ارادہ ہو چکا ہے کہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کی ایک خاص شیرازہ بندی ہو۔

تجدیدی کارنامے:

ہندوستان واپسی پر اپنی وفات ۱۱۷۶ھ تک حضرت شاہ ولی اللہ نے تجدید و

Marfat.com

اصلاح کے ذریعہ امت مرحومہ کی شیرازہ بندی کی۔ دین کے فہم صحیح کے احیاء، علوم نبوت کی نشر و اشاعت اور اپنے عہد وملت کے فکر و عمل میں ایک نئی زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا جو عظیم الشان کام لیا اس کی مثال دور ماضی کے علماء و مصنفین میں بھی کم ملتی ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ امت کی اکثریت کے عقائد میں کئی قسموں کی خرابی واقع ہو چکی تھی۔ آپ نے دعوت الی القرآن دے کر ان کے عقائد کو درست کیا اور ان کی اصلاح کی۔ عقائد کی اصلاح کیے بغیر احیاء دین وملت کی جو کوشش بھی کی جائے گی وہ نقش بر آب اور بے بنیاد عمارت کی طرح ہو گی۔ غیر مسلم اور عجمی اقوام کے اختلاط نیز جاہل و گمراہ صوفیوں کی تعلیم و عمل سے عام مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد و رسوم کا رواج ہو گیا تھا۔ بہت سے مسلمان اپنے دینی پیشواؤں، مشائخ طریقت اور اولیاء و صالحین کے بارہ میں غالیانہ بلکہ مشرکانہ خیالات رکھتے تھے۔ بزرگان دین کے مزارات پر وہ کچھ ہو رہا تھا جو غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مقدس شخصیتوں کی قبروں پر ہوتا تھا۔ ان کی قبروں پر بڑی بڑی مسجدیں تعمیر کرنے اور خود قبور کو سجدہ گاہ بنانے اور سال بہ سال میلہ لگانے کا عام رواج ہو گیا تھا۔ اہل کفر کے تہواروں کی تعظیم، مراسم شرک کی تعظیم، غیر اللہ سے استمداد، غیر مسلموں کے رسوم و عادات کی تقلید اور بزرگوں کے لیے حیوانات کو نذر و ذبح کرنے اور سیتلا دیوی کے خوف اور اس کی تعظیم تک کی ہندوانہ ذہنیت مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہو چکی تھی۔ گویا دین حنیفی کے متوازی ایک نظام عقائد اور مسلم معاشرہ کی زندگی کے میدان میں جاہلیت کا ایک قسم کا سبزۂ خودرو پیدا ہو گیا تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب تفہیمات الٰہیہ اور دوسری کتابوں میں ان تمام باتوں کو بیان کر کے ان کی کتاب و سنت کی روشنی میں تردید کی۔ اس کے علاوہ آپ نے قرآن حکیم کے فارسی ترجمہ کا کام جس نے فتح الرحمٰن کے نام سے تکمیل پائی، حجاز سے واپسی پر شروع فرمایا۔ شاہ صاحبؒ نے ترجمہ فتح الرحمٰن کے علاوہ اصول ترجمہ پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جو اگرچہ مختصر ہے لیکن بڑا بصیرت افروز اور عالمانہ ہے۔

Marfat.com

حضرت شاہ صاحبؒ کے فارسی ترجمہ کے بعد بہت جلد اردو میں ترجمۂ قرآن کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس ضرورت کو سب سے پہلے خود شاہ صاحب کے فرزند ارجمند حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی (م ۱۲۳۰ھ) نے محسوس کیا اور شاہ صاحبؒ کے ترجمہ کے پچاس سال بعد انہوں نے بامحاورہ اردو زبان میں ایسا ترجمہ کیا جس کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کا کسی غیر عربی زبان میں ایسا کامیاب اور شگفتہ ترجمہ نہیں ہوا۔ ان کے بعد ان کے برادر بزرگ حضرت شاہ رفیع الدین (م ۱۲۳۳ھ) نے قرآن حکیم کا تحت اللفظ ترجمہ کیا جو مصنف کے تبحر علمی اور اخلاص کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ یہ دونوں ترجمے مسلمانوں کے گھروں میں ایسے عام ہوئے کہ قرآن حکیم کی تلاوت کے ساتھ ان کے پڑھنے کا رواج بھی ہو گیا۔ ان کو پڑھ کر لوگوں کی اصلاح عقائد اور عقیدۂ توحید کی اشاعت وسیع پیمانے پر ہوئی۔ درحقیقت کوئی اسلامی حکومت بھی اپنے وسائل کے ساتھ دعوت واصلاح کا اتنا بڑا کام انجام نہیں دے سکتی تھی جو ان تین ترجموں نے انجام دیا۔

خواص اور اہل علم کے حلقہ میں قرآن کی دعوت کو عام کرنے اور ان میں تدبر قرآن کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے حضرت شاہ صاحب نے ایک تجدیدی اور انقلابی خدمت اور کارنامہ ''الفوز الکبیر'' کی تصنیف کی شکل میں انجام دیا۔ جو اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے۔ یہ اصول تفسیر پر ایک جلیل القدر کتاب ہے اور اس کی قدر وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کو قرآن فہمی کی مشکلات سے واسطہ پڑا ہو۔ اس کتاب میں بعض اصول جو شاہ صاحب نے اپنے ذوق و وجدان اور فہم قرآن کی بنا پر لکھ دیئے، وہ دوسری کتابوں میں سینکڑوں صفحات کے مطالعہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اصلاح عقائد اور توحید خالص کی دعوت کے سلسلہ میں قرآن مجید کے ترجمہ اور درس قرآن ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک عالم اور محقق کے انداز سے اس کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے۔ آپ نے اپنی کتابوں میں توحید و شرک کے درمیان ایسا خط امتیاز کھینچا، توحید کی حقیقت کو اس طرح عیاں کیا اور شرک کے ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ اور اس

Marfat.com

کی ہلکی سے ہلکی پرچھائیں کے خلاف ایسا جہاد کیا جس سے زیادہ کا تصور ممکن نہیں۔ یہ سب کام ایسے متواتر اور بدیہی ہیں جن کے لیے دلائل اور مثالوں کی ضرورت نہیں۔

حدیث کی اشاعت وترویج:

قرآن حکیم کی دعوت، ترجمہ اور درس کے بعد شاہ صاحبؒ نے حدیث کی ترویج واشاعت درس حدیث کے احیاء، فن حدیث کے ساتھ اعتناء، اس موضوع پر آپ نے اپنی محققانہ اور مبصرانہ تصنیفات کے ذریعہ ایسا عظیم تجدیدی اور انقلابی کارنامہ انجام دیا جو ان کی کتاب زندگی کا ایک اہم اور روشن باب ہے۔ حدیث دراصل امت مسلمہ کے لیے ایک صحیح میزان اور معیار ہے، اور یہ ایک ایسی میزان ہے جس میں ہر دور کے مصلحین اور مجددین اس امت کے اعمال وعقائد اور رجحانات وخیالات کو تول سکتے ہیں اور امت کے طویل تاریخی وعالمی سفر میں پیش آنے والے تغیرات اور انحرافات سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اخلاق واعمال میں کامل اعتدال اور توازن اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتا جب تک قرآن وحدیث کو بیک وقت سامنے نہ رکھا جائے۔ اسی وجہ سے سنت نبویؐ اور حدیث نبویؐ کے مجموعے ہمیشہ اصلاح وتجدید اور امت اسلامیہ میں صحیح اسلامی فکر کا سرچشمہ رہے ہیں۔ انہیں سے اصلاح کا بیڑا اٹھانے والوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں صحیح علم دین اور خالص فکر اسلامی اخذ کیا۔ اور آج بھی جو مسلمانوں کو دین خالص اور اسلام کامل کی طرف آنے کی دعوت دینا چاہتا ہے اور ان کے اور نبوی زندگی اور کامل اسوہ کے درمیان تعلق استوار رکھنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ اس سرچشمہ سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

برصغیر پاک وہند میں اور خصوصی طور پر شمالی ہندوستان میں علم حدیث تقریبا ختم ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نشر واشاعت کے لیے شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) کو منتخب فرمایا اور ان کے ذریعہ سے علم حدیث کی اشاعت بہت عام ہوئی۔ انہوں نے دہلی میں مسند درس آراستہ فرمائی۔ اور اپنی ساری کوششیں اس علم حدیث کی نشرواشاعت پر صرف فرمائی۔ بہت سی کتابیں علم حدیث میں تصنیف کیں۔ ان کے بعد

Marfat.com

ان کے صاحبزادے شیخ نور الحق (م۱۰۷۳ھ) نے اس علم کی خدمت اور نشر و اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ان کے بعض تلامذہ اور اولاد نے بھی اس فن کی بھرپور خدمت کی مثلاً نور الحق کے صاحبزادے مولانا سلام اللہ مصنف محلی وکمالین۔

ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس علم کی نشر و اشاعت میں سرگرمی دکھائی اور اس علم کے لیے اپنی زندگی اور اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دیں۔ اس کام کے لیے ان کا کون سا جذبہ محرک تھا؟ اس بارہ میں شاہ صاحبؒ خود فرماتے ہیں:

''علوم یقینیہ کا معتمد علیہ سرمایہ و سرتاج اور فنون دینیہ کی اساس علم حدیث ہے جس میں افضل المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل یا کسی بات پر آپ کے سکوت و رضامندی کا ذکر خیر ہوتا ہے، اس لیے یہ حدیثیں تاریکی میں روشن چراغ، رشد و ہدایت کا سنگ میل اور بدر کامل کا حکم رکھتی ہیں۔ جو شخص ان پر عمل پیرا ہوتا اور ان کی نگہداشت کرتا ہے، وہ ہدایت یاب اور خیر کثیر سے فیض یاب ہوتا ہے۔ اور جو بدبخت اس سے اعراض کرتا ہے وہ گمراہ اور ہلاک ہوتا ہے اور اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی امر و نہی، انذار و تبشیر اور نصیحت و تذکیر سے معمور ہے۔ اور آپ کی احادیث میں یہ چیزیں قرآن ہی کی طرح یا اس سے مقدار میں کچھ زیادہ ہی ہیں۔'' (مقدمہ حجۃ اللہ البالغہ ص۲)

ایک اور جگہ آپ نے فرمایا:

''پہلی شی جس کو عقل اپنے اوپر واجب قرار دیتی ہے، یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و ارشادات کا تتبع کیا جائے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے بارہ میں کیا ارشاد فرمایا اور کس طرح اس پر عمل کیا۔ پھر قلب و جوارح سے ان اقوال و احوال کی پیروی کی جائے۔ اس لیے کہ ہماری گفتگو اس شخص کے بارہ میں ہے جس نے حقیقت تسلیم کر لی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے

بندوں کو اپنے احکام کا مکلف بنایا ہے اور اس شخص نے تکلیف شرعی کی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا عزم مصمم کر لیا ہے۔" (کلمات طیبات ص ۱۷۲)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے مدینہ منورہ سے واپس آتے ہی ہندوستان میں حدیث کی نشر و اشاعت کے لیے گویا کمر کس لی۔ بہت جلد ان کا مدرسہ رحیمیہ برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں حدیث کی سب سے بڑی درس گاہ بن گیا جہاں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے تشنگان علم حدیث نے پروانہ وار ہجوم کیا۔ مسند الہند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ماسوا اس درس حدیث سے فائدہ اٹھانے والے فخر ہندوستان علامہ سید مرتضٰی بلگرامی مشہور بزبیدی صاحب تاج العروس اور اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء علوم الدین تھے جن کے تبحر و تحدیث کی عالم عربی میں دھوم مچ گئی۔ انہیں تلامذہ میں سے بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی مصنف تفسیر مظہری بھی تھے۔ اسی مدرسہ ولی اللہی کے فضلاء، اور شاہ صاحب کے تلامذہ کے تلامذہ حضرت شاہ محمد اسحاق اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی نے حرمین شریفین میں خدمت اور درس حدیث کی بساط بچھائی اور عرب و عجم ان سے فیض یاب ہوئے۔ اس طرح ہندوستان میں صدیوں کے بعد (غالباً پہلی مرتبہ) علم حدیث کا ایسا چرچا اور اس کی طرف ایسا رجوع ہوا کہ ہندوستان یمن کا ہم سر بن گیا اور اس کے جانفزا جھونکے سرزمین حجاز تک پہنچنے لگے۔

حدیث و فقہ کے درمیان تطبیق:

مدت سے علمی حلقوں میں حدیث و فقہ کے دو متوازی سلسلے چلے آرہے تھے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر دوسرے سے مستغنی اور بے نیاز ہو کر اپنا سفر طے کر رہا تھا اور اکثر اوقات ایک دوسرے سے جدا ہو کر پھر وہ کسی نقطہ پر جا کر ہم کنار نہیں ہوتے تھے۔ مذاہب فقہیہ کے کچھ ایسے آہنی سانچے بن گئے تھے جن کا ٹوٹ جانا تو ممکن تھا، پھیلنا ممکن نہ تھا۔ ہر مذہب کے پیروکار اپنے مذہب کے بارہ میں یہ خیال قائم کیے ہوئے تھے کہ ان کا مذہب سو فیصد درست اور صحیح ہے۔ اس طرز فکر کا نتیجہ یہ تھا کہ مذاہب

Marfat.com

اربعہ کے درمیان خلیج روز بروز عمیق اور وسیع ہوتی چلی جا رہی تھی اور ان پر عمل کرنے والوں کے درمیان اختلاف ومنافرت تک، اور بحث ومناظرہ بعض اوقات مجادلہ اور مقاتلہ تک پہنچ جاتا تھا۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مجددانہ کارناموں میں ایک کارنامہ فقہ اور حدیث میں تطبیق تھی۔ اور پھر مذاہب اربعہ میں جمع وتالیف کی کوشش تھی۔ اس سے اس بشارت نبوی کی تصدیق ہوتی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ "تم سے خدا اس امت کی شیرازہ بندی کے ایک خاص نوع کا کام لے گا۔" (فیوض الحرمین ص ٦٢)

حضرت شاہ صاحبؒ کے عازم حجاز ہونے سے قبل ہی ان کی طبیعت میں فطری طور پر جامعیت نظر وقلب میں وسعت اور فطرتاً تطبیقی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ میں فقہائے محدثین کے مسلک کو ترجیح دینے کا عزم پیدا کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ خود فرماتے ہیں:

"مذاہب اربعہ اور ان کے اصول فقہ کی کتابوں کے مطالعہ اور جن احادیث سے وہ استدلال کرتے ہیں، ان پر غور وفکر کرنے کے بعد طبیعت میں فقہائے محدثین کی روش کو پسندیدگی قرار پذیر ہوئی۔ اس میں نور غیبی کی مدد بھی شامل تھی۔ اس کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کا شوق دامن گیر ہوا۔"
(الجزء اللطیف مشمولہ انفاس العارفین ص ٢٠٣)

اپنی ایک اور کتاب میں فرمایا:

"ایک طرف کلام فقہاء پر تخریج اور دوسری طرف احادیث کے الفاظ کا تتبع دونوں کی دین میں مستحکم اصل موجود ہے۔ اور ہر زمانہ کے علمائے محققین ان دونوں اصولوں پر عمل کرتے رہے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جن کا تخریج کے بارہ میں قدم پیچھے ہے اور حدیث کے الفاظ کے تتبع میں قدم آگے ہیں، اور بعض اس کے برعکس ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سے بھی مطلقاً صرف نظر مناسب

Marfat.com

نہیں جیسا کہ فریقین کے عوام کا شیوہ ہے۔ اس بارہ میں صراط مستقیم یہی ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جائے اور ایک کی کمی دوسرے سے پوری کی جائے۔ اور یہی امام حسن بصریؒ کا قول ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۵۶ جلد ۱)

حضرت شاہ صاحبؒ کا سارا علمی نشوونما فقہ حنفی اور اصول فقہ حنفی کے ماحول میں ہوا تھا اور وہ حنفی مذہب کی خصوصیات سے اتنا ہی آشنا تھے اور ان کے اتنا ہی قائل تھے جتنا کوئی بڑے سے بڑا حنفی عالم ہو سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی عظمت کے بھی قائل تھے اور خاص طور پر موطا کی صحت اور اس کے مرتبہ و مقام اور اس کی برکت کے بھی قائل بلکہ داعی تھے۔ اور امام شافعیؒ کی دقیق النظری کے بھی بڑے قائل تھے (الخیر الکثیر ص ۱۲۴، قرۃ العینین ص ۲۴۲) پھر اس کے ساتھ امام احمد بن حنبلؒ کے بارہ میں بھی فرمایا:

"ان فقہاء اور محدثین میں سب سے عالی مرتبہ، وسیع الروایہ، حدیث سے باخبر اور تفقہ میں عمیق النظر امام احمد بن حنبلؒ پھر امام اسحاق بن راہویہؒ ہیں۔"
(حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۱۵۰)

حضرت شاہ صاحبؒ نے ان چاروں فقہی مذاہب کے بارہ میں جن پر عالم اسلام میں عام طور پر عمل کیا جا رہا ہے، تحریر فرمایا:

"یاد رکھو کہ ان مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے اور ان چاروں کو بالکل نظر انداز کر دینے میں بڑا مفسدہ ہے۔ اس کے کئی وجوہ و اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ امت کا اس پر اتفاق ہے کہ شریعت کے معلوم کرنے کے بارہ میں وہ سلف متقدمین پر اعتماد کرے۔ تابعین نے اس بارہ میں صحابہ کرامؓ پر اعتماد کیا اور تبع تابعین نے تابعین پر علیٰ ہذا القیاس ہر دور کے علماء نے اپنے پیش رووں پر اعتماد کیا۔ عقل سے بھی اس کا مستحسن ہونا ثابت ہوتا ہے، اس لیے کہ شریعت کے علم کا ذریعہ نقل اور استنباط ہے۔ اور نقل جب ہی

Marfat.com

ممکن ہے جب ہر طبقہ اپنے پہلے طبقہ سے جو اس سے متصل ہے اخذ کرے۔ استنباط میں یہ بھی ضروری ہے کہ متقدمین کے مذاہب معلوم ہوں تاکہ ان کے اقوال کے دائرہ سے خارج ہو کر خرق اجماع نہ ہو جائے، اس لیے ان اقوال کے جاننے اور سابقین سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ دوسرے علوم و فنون اور ہنروں اور پیشوں کا بھی یہی حال ہے۔ صرف ونحو، طب، شاعری، لوہاری، نجاری، رنگ ریزی سب اسی وقت حاصل ہوتے ہیں جب ان کے استادوں اور ان کے ساتھ اشتغال رکھنے والوں کی صحبت اختیار کی جائے۔ اس کے بغیر مہارت حاصل ہو جائے ایسا بہت کم پیش آتا ہے، اگرچہ عقلاً ایسا ممکن ہے لیکن واقعتا ہوتا نہیں۔"

"جب یہ بات متعین ہوگئی کہ سلف کے اقوال اور تحقیقات پر اعتماد ضروری ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہو گیا کہ جن اقوال پر اعتماد کیا جا رہا ہے، وہ سند صحیح سے مروی اور مشہور کتابوں میں مدون ہوں اور ان پر ایسا کام ہوا ہو کہ اس میں راجح اور مرجوح اور عام وخاص کا امتیاز آسان ہو۔ جہاں اطلاق پایا جاتا ہے وہاں یہ پتہ چل سکے کہ اس میں مقید کیا ہے۔ مختلف اقوال میں تطبیق دی جا چکی ہو اور احکام کے علل پر روشنی ڈالی جا چکی ہو، نہیں تو ایسے مذاہب و اختیارات پر اعتماد صحیح نہیں ہوگا۔ ان پچھلے ادوار میں کوئی فقہی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں، اور یہ شرطیں پوری ہوتی ہوں سوائے ان مذاہب اربعہ کے۔" (عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید ص ۳۶-۳۸)

اس طرح حضرت شاہ صاحب نے اجتہاد وتقلید کے درمیان وہ نقطۂ اعتدال اختیار کیا ہے جو مقاصد شریعت، فطرت انسانی اور واقعات کی دنیا سے پورے طور پر مطابق ہے۔ انہوں نے تقلید کے ساتھ یہ شرط لگا دی ہے کہ اس بارہ میں ذہن صاف اور نیت درست ہو کہ مقصود صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور کتاب وسنت کی

Marfat.com

پیروی ہے اور یہ اس اعتماد پر ہے کہ ہم جس کو واسطہ بنا رہے ہیں وہ کتاب وسنت کا عالم اور شریعت اسلامی کا مخلص نمائندہ اور ترجمان ہے۔ نیز یہ کہ ذہن اس کے لیے تیار رہے کہ جب اس بات کا یقین پیدا ہو جائے گا کہ صورت حال اس سے مختلف ہے اور سنت نبویہ سے ثابت حکم دوسرا ہے تو ایک صاحب ایمان کو دوسری شکل کے اختیار کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ جیسا کہ سورۃ النساء آیت ۶۵ میں بتایا گیا ہے۔

مذاہب اربعہ کی خصوصیات اور فقہائے محدثین کی خدمات اوران کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اور موجودہ فقہی اور حدیثی ذخیرہ کو قابل استفادہ اور اس سے بے نیازی اور استغنا کو مضر اور محرومی کا سبب مانتے ہوئے، حضرت شاہ صاحبؒ ہر دور کی ضرورت اور انسانی تمدن و معاشرت کی تغیر پذیری اور شریعت اسلامی کی وسعت اور اس کے من جانب اللہ ہونے اور قیامت تک کے انسانوں کی راہ نمائی کی صلاحیت رکھنے کا ثبوت دینے کے لیے ہر زمانہ میں اجتہاد کے بھی قائل ہیں اور اس کو فرض بالکفایہ مانتے ہیں، لیکن یہ اجتہاد نہ ہر ایک کا حق ہے اور نہ ہی فکری طور پر آزاد ہو کر جیسا کہ آج کل کے غیر مقلد حضرات کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ مصفّٰی شرح مؤطا کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''اجتہاد ہر زمانہ میں فرض بالکفایہ ہے۔ یہاں اجتہاد سے مراد اجتہاد مستقل نہیں جیسا کہ امام شافعیؒ کا اجتہاد تھا جو جرح وتعدیل اور زبان دانی وغیرہ میں کسی دوسرے کے محتاج نہ تھے۔ اور اسی طرح اپنی مجتہدانہ درایت میں اپنے پورے اقسام کے ساتھ وہ دوسرے کے تابع نہ تھے۔ مقصود اجتہاد منتسب ہے، اور وہ نام ہے احکام شرعی کو ان کے تفصیلی ادلہ کے ذریعہ جاننے کا، اور مجتہدین کے طریقہ پر تفریع مسائل اور ترتیب احکام کا، خواہ وہ کسی صاحب مذہب کی راہ نمائی سے ہو۔''

اور ہم جو یہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں اجتہاد فرض ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسائل کثیر الوقوع ہیں جن کا حصر ممکن نہیں، اور ان کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا

حکم جاننا واجب ہے، اور جو تحریر و تدوین میں آچکا ہے وہ ناکافی ہے اور اس کے بارہ میں اختلافات بہت ہیں جن کا حل دلائل کی طرف رجوع کیے بغیر ممکن نہیں۔ (مصفیٰ شرح موطا ص ۱۲)

وفات اور جانشین:

حضرت شاہ ولی اللہؒ اپنی عمر کی ۷۷ منزلیں طے کر چکے تھے اور آخری بار رمضان المبارک کی روزے رکھے۔ شوال کے مہینے میں ان کی طبیعت ناساز ہوئی۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آخر امید زیست منقطع ہوگئی لیکن اس کے بعد پھر صحت عود کر آئی مگر اوائل صفر میں مرض پھر غالب آ گیا اور صبح صادق سے پہلے وفات کے آثار ظاہر ہوئے ،اس دوران آپ کی پوری توجہ اس طرف تھی کہ نماز فجر فوت نہ ہو۔ چنانچہ آپ نے ضعف اور کمزوری کی حالت میں کئی بار پوچھا: صبح ہوگئی یا نہیں؟ حاضرین نے شاید آپ کی کمزوری اور ضعف کی وجہ سے یہ جواب دیا کہ ابھی صبح نہیں ہوئی لیکن جب وقت آخر بالکل قریب آ گیا تو آپ نے حاضرین کو سختی سے فرمایا کہ اگر تمہاری نماز کا وقت نہیں آیا تو ہماری نماز کا وقت آ گیا ہے۔ فرمایا: میرا رخ قبلہ کی طرف کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور آپ نے اشارہ سے نماز فجر ادا کی، اس کے بعد آپ زیر لب اسم ذات کے ذکر میں مشغول ہو گئے اور اسی حالت میں اپنی جان جاں آفرین کے سپرد کر دی۔ آپ کی وفات ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ بروز بدھ ہوئی۔ انتقال کے وقت عمر ۷۷ سال تھی۔

(انفاس العارفین ص ۸۳-۸۵)

آپ تو اپنی زندگی کے ۷۷ سال گزار کر اس عدم ہستی نما سے ہستی عدم نما کو انتقال فرما گئے۔ لیکن آپ نے اپنے مشن کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے قابل اور صاحب فضیلت جانشین چھوڑے جنہوں نے نہ صرف آپ کے جلائے ہوئے چراغ کو روشن و تاباں رکھا بلکہ اس چراغ سے ہزاروں چراغ جلائے اور آج تک جل رہے ہیں۔ آپ نے چار صاحبزادے اپنے جانشین چھوڑے جنہوں نے آپ کے مشن کی نہ

Marfat.com

صرف تکمیل کی بلکہ اس کو بام عروج پر پہنچایا۔ پھر آپ کے شاگردوں اور تلامذہ نے آپ کے علوم و معارف کی تبلیغ و اشاعت اور مردان کار کی تربیت و تکمیل کی۔ آپ کے تین صاحبزادوں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے آپ کے علوم کی ہندوستان کے کونے کونے میں اشاعت کی۔ ان میں بھی سب سے زیادہ کام امام العلماء حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے کیا جو اپنے زمانہ کے علماء کے سردار تھے۔ بعض حضرات نے آپ کو ''سراج الہند'' اور بعض نے ''حجۃ اللہ'' کا خطاب دیا۔ انہوں نے اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہؒ سے پڑھا۔ جب حضرت شاہ ولی اللہ کا انتقال ہوا تو اس وقت آپ کی عمر ۱۶ سال تھی۔ چنانچہ والد کے انتقال کے بعد آپ نے محمد عاشق پھلتی اور شیخ محمد امین کشمیریؒ سے استفادہ کیا۔ پھر آپ سے آپ کے بھائیوں شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالغنیؒ اور آپ کے داماد مولانا عبدالحی بن ہبۃ اللہ بڑھانوی نے درس لیا۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ اور سید قمر الدین سونی پتی آپ سے قرأت و سماعت میں آپ کے بھائیوں کے ساتھ تھے۔ حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ نے آپ سے صحیح بخاری پڑھی اور مولانا سید قطب الہدیٰ رائے بریلی نے آپ سے صحاح ستہ کا درس لیا۔

شیخ محسن بن یحیٰ ترہتی ''الیانع الجنی'' میں لکھتے ہیں:

''وہ فضل و کمال اور شہرت و مقبولیت کے اس مقام پر فائز تھے کہ اطراف ہند کے لوگ ان سے انتساب بلکہ آپ کے تلامذہ و منتسبین سے بھی ادنیٰ نسبت پر فخر کرتے تھے......... آپ کے ان کمالات میں جن میں آپ کا کوئی معاصر آپ کے مقابل نہ تھا، آپ کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی بھی تھی جس کی وجہ سے آپ بحث میں غالب آتے اور مخاطب کو لاجواب کر دیتے۔ انہیں کمالات میں آپ کی قادر الکلامی، حسن تعبیر اور خوبی تحریر بھی تھی جس میں اہل نظر نے آپ کو سب پر فائق تسلیم کیا ہے۔''

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے تجدیدی کارناموں میں ایک قرآن حکیم کی اشاعت و تبلیغ بھی تھی تاکہ اس سے عقائد باطلہ اور رسوم فاسدہ کی اصلاح اور ربط مع اللہ کی کوشش ہو۔ اس سلسلہ میں شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد کے کام کو بہت ترقی دی اور اس میں بڑی عمومیت اور وسعت پیدا کر دی۔ شاہ ولی اللہؒ کا درس قرآن سورہ النساء کی آیت ''اعدلوا ھوا قرب للتقویٰ'' تک پہنچا تھا کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے یہیں سے درس قرآن شروع کیا اور سورت حجرات کی آیت ''ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم'' تک پہنچے تھے کہ یہ سلسلہ بھی آپ کے سلسلہ حیات کے ساتھ ختم ہو گیا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے نواسہ شاہ محمد اسحاقؒ نے اس درس کو جاری رکھا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کا دوسرا علمی اور اصلاحی کارنامہ تفسیر ''فتح العزیز'' کی شکل میں ہے یہ آپ کی املائی تصنیف ہے۔ افسوس کہ اس تفسیر کا بیشتر حصہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ضائع ہو گیا۔ صرف سورہ فاتحہ و سورہ بقرہ اور پھر سورہ ملک سے آخر قرآن تک کا حصہ باقی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے ایک شاگرد علامہ حیدر علی فیض آبادی نے اس کا تکملہ لکھا جو ۲۷ جلدوں میں ہے۔

جہاں تک درس حدیث کا تعلق ہے ہندوستان کی علمی اور دینی تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ آپ کے درس حدیث کی مدت قریباً ۶۴ سال ہے۔ اس عرصہ میں آپ نے درس حدیث کا فیض عام کیا۔ آپ کے باکمال تلامذہ کی تعداد ۴۰ سے اوپر ہے۔ ان میں سے وہ حضرات جن سے حدیث کے درس کے حلقے قائم ہوئے اور انہوں نے حدیث کے دوسرے شیوخ و اساتذہ پیدا کیے حسب ذیل ہیں:

مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی، مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، مولانا سید اولاد حسن قنوجی، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، مولانا حسین احمد ملیح آبادی محدث، مولانا حیدر علی ٹونکی، مولانا خرم علی بلہوری، مفتی صدرالدین دہلوی، مولانا مفتی علی کبیر مچھلی شہری، مولانا سید قطب الہدیٰ حسنی رائے بریلوی،

Marfat.com

ان کے علاوہ جن لوگوں نے آپ سے حدیث کی سند لی ان کی فہرست نہایت طویل ہے ان تلامذہ حدیث اور تربیت یافتہ شیوخ میں حدیث کی سب سے بڑی اشاعت حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے ذریعہ ہوئی جنہوں نے ۱۲۵۸ھ میں مکہ مکرمہ ہجرت کی اور ان سے حجاز کے ممتاز ترین علماء نے سند حدیث لی۔

آپ کے تلامذہ میں مولانا سید نذیر حسین دہلویؒ، مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، مولانا سید عالم علی مراد آبادیؒ، مولانا مفتی عبدالقیوم ابن مولانا عبدالحی بڑھانویؒ، مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادیؒ، نواب قطب الدین دہلویؒ، مولانا احمد علی سہارنپوریؒ، مفتی عنایت احمد کاکورویؒ کے علاوہ اور بہت سے علماء ہیں۔

مولانا محمد اسحاقؒ کے تلامذہ میں حضرت شاہ عبدالغنی مہاجر مدنیؒ بھی شامل ہیں۔ جن سے ہندوستان کے اکابر علماء اور اساتذۂ حدیث کو شرف تلمذ حاصل ہے۔ ان کے ذریعہ سے سارا برصغیر پاک و ہند نور سے منور اور معمور ہو گیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، اور ان کے تلامذہ میں سے مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا محمد یحیٰ کاندہلویؒ، مولانا محمد الیاس کاندہلویؒ اور مولانا محمد قاسمؒ کے تلامذہ میں مولانا سید احمد حسن امروہیؒ اور مولانا محمود حسنؒ اور پھر ان کے تلامذہ میں مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا مفتی کفایت اللہؒ وغیرہ کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے انقلابی اور تجدیدی کارناموں میں ایک کارنامہ ان مردانِ کار کی تربیت کا بھی تھا جو حالات اور وقت کے تقاضوں اور دین کے حقیقی مطالبوں کے مطابق دعوت و اصلاح کا کام انجام دیں۔ اس سلسلہ میں شاہ عبدالعزیز نے وہ کام کیا جو آپ کے والد ماجد سے بھی بڑھ کر ہے۔ آپ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ایسے متعدد عالی استعداد اور بلند ہمت و عزیمت رکھنے والے صاحب تاثیر نفوس کی تربیت کا کام لیا جنہوں نے ہزاروں انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا اور

Marfat.com

ایک پوری صدی سنبھال لی۔ شاہ صاحب کے علم اور زندگی کے دریا کی سطح ساکن تھی لیکن اسی دریا سے وہ موج تند جولاں اٹھی جس نے نہنگوں کے نشیمنوں کو تہہ و بالا کر دیا۔ ان میں سے ایک شخصیت آپ کے خلیفہ ارشد حضرت سید احمد شہید بریلویؒ تھے۔ جنہوں نے برصغیر پاک و ہند کی اس عظیم اسلامی تحریک کی راہ نمائی کی جس کی نظیر جامعیت، قوت تاثیر اور اسلام کی اولین دعوت اور طریق نبوت سے قرب و مماثلت میں گذشتہ کئی صدیوں میں نظر نہیں آتی۔ اس تحریک نے آئندہ نسل، اپنے بعد آنے والے اہل حق، اصحاب دعوت اور دین کے علم برداروں اور خادموں پر گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے۔

سید صاحبؒ اور ان کی دعوت و تربیت کے اثرات کی وسعت اور گہرائی و گیرائی کا اندازہ کرنے کے لیے چند اہل نظر کی آراء نقل کرتے ہیں۔

۱- مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن خانؒ جنہوں نے سید صاحبؒ کی تعلیم و تربیت کے اثرات کو خود دیکھا تھا اور آپ کے دیکھنے والوں کی ایک بہت بڑی جماعت کا زمانہ پایا تھا فرماتے ہیں:

''خلق خدا کی راہ نمائی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے میں وہ اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی تھے۔ ایک بڑی خلقت اور ایک دنیا آپ کی قلبی و جسمانی توجہ سے درجۂ ولایت کو پہنچی۔ آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمین ہند کو شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا اور کتاب و سنت کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ ابھی تک ان کے وعظ و پند کے برکات جاری و ساری ہیں۔''

پھر آگے چل کر نواب صاحبؒ لکھتے ہیں:

''خلاصہ یہ کہ اس زمانہ میں دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحب کمال سنا نہیں گیا اور جو فیوض اس گروہ حق سے خلق خدا کو پہنچے اس کا عشر عشیر بھی اس زمانہ کے علماء و مشائخ سے نہیں پہنچا۔''

(تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص ۱۰۹-۱۱۰)

۲- حضرت مولانا حیدر علی رام پوری ٹونکیؒ جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے۔تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت سید صاحبؒ کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ ہندو وغیرہ کفار مسلمان ہوئے۔اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلہ بیعت آپ کے خلفاء کے ذریعہ تمام روئے زمین پر جاری ہے،اس سلسلہ میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہیں۔''

(سوانح احمدی، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت جلد ۵)

سید صاحبؒ کے مکمل اور مفصل حالات زندگی کے بارہ میں سید احمد شہید از مولانا غلام رسول مہر، سیرت احمد شہید از مولانا ابوالحسن علی الندویؒ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

حضرت مولانا سید احمد بریلویؒ کے علاوہ جو مردانِ کار حضرت شاہ عبدالعزیز نے تیار کیے ان میں مولانا عبدالحی بڑھانویؒ اور شاہ محمد اسماعیل شہید بھی قابل ذکر ہیں۔ علمی لحاظ سے جو مردان کار آپ نے تیار کیے ان میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوبؒ آپ کے صحیح جانشین تھے۔شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اکثر اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا فرمایا کرتے تھے کہ اللہ نے ان کو محمد اسماعیل (بھتیجا) اور محمد اسحاق (نواسہ) کی شکل میں دو قوت بازو اور عصائے پیری عطا فرمائے ہیں۔اور آپ اکثر قرآن حکیم کی یہ آیت پڑھتے تھے:

''الحمدلله الذی وهب لی علی الکبر اسماعیل واسحاق۔''

یعنی تمام تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جنہوں نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔

دہلی کی تاراجی:

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے اس تجدیدی عمل پر ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ

Marfat.com

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوگئی۔ جنگ آزادی میں ناکامی کی وجہ سے دہلی تاخت وتاراج ہوئی۔ اس کا سہاگ اجڑا۔ اس کے علمی غازہ کو نوچا گیا۔ اس کی سیاسی بساط الٹ گئی اور علم و دانش کا کارواں یہاں سے رخت سفر باندھنے پر مجبور ہوگیا۔ دہلی کی مرکزیت بھی ختم ہوگئی۔ سمندر پار کی ایک سفید فام قوم نے جس کا ہندوستان سے لسانی، معاشرتی، اور ثقافتی کوئی تعلق نہیں تھا، پورے ہندوستان پر قابض ہوگئی۔ اب اس قوم کا سارا زور اس بات پر تھا کہ پورے ہندوستان کو اندلس (اسپین) کی طرف عیسائی بنا دیا جائے تاکہ ہمارے کسی کام میں کوئی مزاحمت نہ کر سکے۔ انگریزوں کی ہندوستان کو عیسائی بنانے کی یہ خواہش بہت پرانی تھی، اور وہ ۱۸۵۷ء سے قبل بھی مختلف طریقوں سے اس کو سرانجام دینے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ انگریزوں سے قبل پرتگیزی اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ ہندوستان کو عیسائی بنایا جا سکے، لیکن ان کی یہ ساری کوششیں صرف گوا تک محدود رہیں اور علمائے ربانی نے ان کو ہندوستان کے دوسرے شہروں میں گھسنے نہ دیا۔ اور گوا میں بھی یہ کوئی زیادہ کامیاب نہ ہو سکے جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔ پرتگالیوں کی ان کوششوں کے بعد انگریزوں نے بھی اس بارہ میں پوری پوری کوشش کی اور باہر سے فنڈر اور اس جیسے کئی اور پادری مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے درآمد کیے گئے، لیکن حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے علماء نے ان کو اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

......❀......

Marfat.com

ہندوستان میں عیسائیت کی یلغار

یورپ کی صلیبی طاقتوں کو جب شام، فلسطین اور مصر وغیرہ میں اہل اسلام کے ہاتھوں شکست فاش ہوئی تو انہوں نے اب یہ پلان بنایا کہ مشرقی ممالک میں ایک ایسی عیسائی حکومت قائم کی جائے جو طاقت کے بل پر مسلمانوں سے مقامات مقدسہ چھین لے۔ دوسری طرف پرتگالی حکمران ہنری (۱۳۴۹-۱۴۶۰ء) نے عیسائی مبلغین کو ایک پیغام بھیجا جس میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ غیر مسلم ملکوں پر اسلامی فوجوں کی یورش پر پابندی لگا دی جائے۔ یہ ہنری وہی حکمران ہے جس کے باپ یوحنا نے مسلمانوں کو اندلس سے نکالنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اس شخص کے دل میں مسلمانوں کے خلاف ایک خاص نفرت بھری ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ دین اسلام کو تباہ و برباد کر کے مسلمانوں کا صفحۂ ہستی سے نام و نشان مٹا دیا جائے اور پوری دنیا میں مسیحی مذہب کا پھریرا لہرایا جائے۔

اس شخص کے عزائم یہ تھے کہ اسپین سے مسلمانوں کے اخراج کے بعد اب ہندوستان کا رخ کیا جائے اور اس وسیع و عریض ملک کو بھی سرزمین اندلس کی طرح مسیحیت کے دائرہ میں داخل کر لیا جائے۔ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے ۱۴۱۷ء میں ''یسوع مسیح کے مجاہدین'' کے نام سے ایک تبلیغی دستے کی تشکیل کی اور انہیں خطیر رقم دے کر افریقہ اور ایشیاء کے ملکوں کو روانہ کیا تا کہ ان ملکوں میں عیسائی تبلیغ کے میدان کو وسیع کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دین مسیحی میں داخل کیا جائے۔ (عبدالمنعم نمر: تاریخ

Marfat.com

الاسلام فی الہندص ۳۴۳، بانیکار: آسیا والسیطرۃ الغربیۃ ص ۴۷-۷۶)

پاپائے روم نیکولس پنجم نے ۱۴۵۴ء میں اپنے پیغام میں کہا کہ ''ہمیں اس بات کی انتہائی خوشی ہے کہ ہمارے بیٹے ہنری بادشاہ پرتگال نے اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر وہ کام کرنا شروع کیا ہے جو اس کے والد نے (مسلمانوں کو سرزمین اندلس سے نکال کر) کیا تھا۔ یہ سب کچھ وہ اس غیرت اور بہادری کے باعث کر رہا ہے جو مسیح کے ایک سپاہی کے اندر ہونی چاہیے۔ اس نے اللہ کے نام کے ساتھ دور ونزدیک شہروں میں اپنے لوگوں کو بھیجنا شروع کیا ہے جو مسیح کے دشمنوں کو سبق سکھائیں گے۔

(بانیکار: آسیا والسیطرۃ الغربیۃ ص ۳۷)

اس سلسلہ میں ایک وفد ہندوستان بھی آیا۔ اس نے مختلف مقامات کا دورہ کر کے واپسی پر شاہ پرتگال کو یہ رپورٹ دی کہ فوجی، سیاسی، تجارتی اور دینی میدانوں میں وہاں کامیابی کے غیر معمولی امکانات ہیں۔ اس رپورٹ کا جائزہ لینے کے بعد ہندوستان کے ساحلی علاقوں، گوا، دمن، کلکتہ اور مالا بار میں پرتگالیوں نے سب سے پہلے تجارتی دفاتر قائم کیے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے تجارت کے پردہ میں اپنے اصلی مشن کا آغاز کر دیا۔ چنانچہ ان ساحلی علاقوں میں لبنان اور شام کے عیسائیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو لا کر آباد کیا گیا جو تجارت کے پردے میں عیسائی دعوت کے کاموں میں بڑی مہارت اور تجربہ رکھتے تھے۔

ان لوگوں نے وہاں آباد ہوتے ہی وہاں کی غیر مسلم آبادی پر اپنا حربہ آزمایا جو غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ ایک طرف تو ان لوگوں نے وہاں کی غیر مسلم آبادی کو عیسائی بنانا شروع کر دیا اور دوسری طرف ان ساحلی علاقوں پر انہوں نے قبضہ کر کے پرتگال کے ساتھ تجارتی تعلقات کو مزید مستحکم اور مضبوط کر لیا جو آگے چل کر عیسائیوں کے لیے فوجی اور اقتصادی لحاظ سے بڑا مفید ثابت ہوا۔ تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ عیسائی پادریوں نے کافی زمانے تک اس بات کی کوشش کی کہ مغل عیسائیت قبول کر لیں لیکن

Marfat.com

جب وہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور اسلام کے شیدائی بن گئے تو پادریوں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اب مغربی استعمار نے مشرق میں لوگوں کو عیسائیت قبول کرنے کی ترغیب دینی شروع کر دی اور دین کے ذریعہ مشرقی ممالک میں اپنا اثر ونفوذ شروع کر دیا۔ اسی مقصد کے لیے وہ ساری صلیبی جنگیں لڑی گئیں۔ (التبشیر والاستعمار فی البلاد العربیہ ص ۱۱۵)

پرتگالیوں نے مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دربار میں مختلف اوقات میں تین وفود بھیجے۔ اکبر نے ان وفود کا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ پہلے وفد کے ارکان نے شہنشاہ اکبر سے آگرہ میں ایک گرجا گھر کے قیام کی درخواست کی۔ بادشاہ نے عواقب سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے انہیں آگرہ میں ایک گرجا گھر کے قیام کی اجازت دے دی، نہ صرف اجازت دی بلکہ اس کے ساتھ شہزادہ سلیم کو تربیت کے لیے ان عیسائی پادریوں کے حوالے کر دیا۔ تین سال تک یہ عیسائی وفد اکبر اعظم کے پاس اس امید پر مقیم رہا کہ شاید بادشاہ عیسائی مذہب اختیار کر لے کیونکہ وہ اندر ہی اندر کچھ ایسے حربے اختیار کر رہے تھے جن کی وجہ سے انہیں قوی امید تھی کہ جلد ہی شہنشاہ اکبر دین عیسوی قبول کر لے گا، لیکن ۱۵۸۳ء میں یہ وفد ناکام و نامراد واپس آ گیا کیونکہ اکبر نے دین عیسوی قبول نہ کیا۔ دوسری طرف شہزادہ سلیم پر تین سال کی تربیت کے باوجود عیسائی اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس وجہ سے انہیں اپنے مقاصد مکروہہ میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

اس وفد کے بے نیل مرام واپس جانے کے بعد اسی طرح کا ایک دوسرا وفد اسی غرض کے تحت ۱۵۹۰ء میں دربار اکبری میں حاضر ہوا۔ یہ وفد بھی ۱۵۹۴ء میں اسی طرح نامراد واپس آ گیا۔ جب پرتگالیوں کو اپنی ناکامی کا احساس ہوا تو انہوں نے پھر تیسرا وفد دربار اکبری میں روانہ کیا جس نے لاہور اور آگرہ میں گرجا گھروں کی تعمیر کی اجازت اور سہولت حاصل کر لی، جس کی وجہ سے آگے چل کر بہت سی مشکلات پیش آئیں اور ہندوستان کی تاریخ کا رخ اکبر کی اس چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے تبدیل ہو گیا۔ (جمال الدین الشیال: تاریخ دولۃ اباطرہ المغول الاسلامیۃ فی الہند ص ۹۲)

Marfat.com

شہنشاہ اکبر ہو یا کوئی اور مغل بادشاہ، یہ حضرات اپنی شاہ خرچیوں اور غیر ضروری سخاوتوں کی وجہ سے ملت اسلامیہ کو بعض مرتبہ ایسی مشکلات میں ڈال کر گئے ہیں جن کا خمیازہ اہل اسلام آج تک بھگت رہے ہیں۔ ان سخاوتوں اور نوازشوں میں اکبر اعظم کی ایک یہ نوازش بھی تھی کہ پرتگالیوں نے تجارت کے نام پر گوا اور دوسرے ساحلی علاقوں میں اپنے سیاسی اور تبلیغی اڈے قائم کر لیے۔ جن میں مسلمانوں اور ہندو دونوں کو عیسائی بنانے کی کوششیں کی جاتیں تاکہ عیسائیوں کی آبادیوں میں اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ پرتگالیوں نے بہت سی جگہوں پر اسلامی سرحدوں میں مداخلت شروع کر دی اور حکومت کے داخلی معاملات میں بھی دخل اندازی شروع کر دی۔ تجارت کے پردے میں وہاں کے لوگوں کو قید کر کے یورپ کی منڈیوں میں فروخت کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے تنگ آ کر انہیں تکلیف دینا شروع کر دی اور حکومت کی آنکھیں بھی ان کے ظلم و ستم کو دیکھ کر کھل گئیں۔ چنانچہ گوا کے بڑے پادری نے پرتگال کے بادشاہ سے اس بارے میں شکایت کی۔ (الشرقاوی والصیاد: ملامح الہند والباکستان ص ۶۳، الشبال: تاریخ دولۃ اباطرہ المغول الاسلامیہ فی الہند ص ۹۴، ص ۱۳۸)

شہزادہ سلیم کے بعد جب اس کا بیٹا شاہجہان سلطنت کے تخت پر بیٹھا اور اسے پرتگالیوں کے اس جور و ستم کا پتہ چلا تو اس نے ۱۶۲۷ء مطابق ۱۰۳۸ھ میں بنگال کے حاکم قاسم خان کو حکم دیا کہ عیسائیوں کے مراکز پر قبضہ کر کے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے تاکہ عوام الناس ان کے شرور و فتن اور ظلم و ستم سے نجات پا سکیں۔ بادشاہ کے اس حکم کا ملنا تھا کہ گورنر بنگال قاسم خان نے ہوگلی وغیرہ میں عیسائیوں کے مستحکم اور مضبوط قلعوں کو شاہ جہانی فوج کے ذریعہ سے زمین بوس کر دیا اور بادشاہ کے حکم کے مطابق واقعی ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ان خونریز معرکوں میں قریباً دس ہزار عیسائی مارے گئے اور چار ہزار کے قریب پا بجولاں ہوئے۔ نیز ان دس ہزار ہندوستانیوں کو بھی پرتگالیوں کے قبضہ سے رہا کرایا گیا جنہیں اس مقصد کے لیے

Marfat.com

جہازوں میں قید کر کے رکھا گیا تھا تاکہ انہیں یورپ کی منڈیوں میں غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا جائے۔

لوگوں کو عیسائی بنانے کا پرتگالیوں کو اس قدر جنون تھا کہ وہ آزاد لوگوں کو غلام بنا کر فروخت کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے تاکہ ان غلاموں کو ان کے آقا عیسائی بنا سکیں۔ کاش اس قسم کی کوششیں لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے اگر ہندوستان کے مسلمان بادشاہ کرتے تو آج برصغیر پاک و ہند کا نقشہ اس سے مختلف ہوتا۔ وہ مسلمان بادشاہ مفت میں بدنام بھی ہوئے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے انہوں نے کچھ بھی نہ کیا۔ اس سلسلہ میں اورنگ زیب عالمگیر کو بڑا بدنام کیا جاتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کو مسلمان کرنے کے لیے سرکاری دباؤ اور سختی سے کام لیا، لیکن یہ صرف زبانی باتیں ہیں، اس زمانے کی تاریخوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تاریخ فرشتہ نے اورنگ زیب کے بارہ میں لکھا ہے کہ "فروغ اسلام کے جوش میں اس نے نومسلموں کے ساتھ دریا دلی سے فیاضی کی، لیکن اس نے غیر مذاہب کے لوگوں پر مذہبی امور میں سختی نہیں کی۔" (تاریخ ہندوستان فارسی، جلد ۳ ص ۳۶۱) اورنگ زیب کے فرامین اور مراسلات کے ایک قلمی مجموعے میں عالمگیر کی مذہبی آزادی کا وہ جامع اور مانع اصول مندرج ہے جو ہر ایک بادشاہ کو غیر مذہب کی رعایا کے ساتھ برتنا ضروری ہے۔ جس واقعہ کے بارہ میں یہ اصول بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ عالمگیر کو کسی شخص نے درخواست دی کہ دو پارسی ملازموں کو جو تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے، اس بنا پر نوکری سے برخواست کر دیا جائے کہ وہ آتش پرست ہیں اور ان کی جگہ کسی تجربہ کار معتبر مسلمان کو متعین کیا جائے کیونکہ قرآن حکیم میں ہے: یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء۔ (اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ) عالمگیر نے اس درخواست پر یہ حکم لکھا کہ "مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے۔ انہوں نے اپنے قول کی تائید میں یہ آیت نقل کی "لکم دینکم ولی دین"

(تم کو تمہارا دین مبارک اور مجھ کو میرا دین) بادشاہ نے لکھا کہ جو آیت عرضی نویس نے نقل کی ہے۔''اگر یہی سلطنت کا دستور العمل ہوتا تو ہم کو چاہیے تھا کہ اس ملک کے سب راجاؤں اور ان کی رعایا کو غارت کر دیتے، لیکن یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ شاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے مطابق ملیں گی۔ اس کے سوا اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکتیں۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الزام ہندو اور انگریز مورخین کی جانب سے تعصب کی وجہ سے عالمگیر پر لگایا جاتا ہے اور اس بارہ میں بے بنیاد قصے گھڑے گئے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانیؒ نے مضبوط تاریخی دلائل اور شواہد سے اس الزام کی پرزور تردید کی ہے۔ ملاحظہ ہو علامہ شبلیؒ کی کتاب ''اورنگ زیب پر ایک نظر'' اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی اس الزام کی تردید میں بہت کچھ لکھا ہے۔

شاہجہان کے بعد جب اس کا لڑکا اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان کی سلطنت کے تخت پر بیٹھا تو پرتگالیوں کے ظلم وستم اس کی نگاہ میں بھی تھے جو انہوں نے اپنے زیر اثر علاقوں کے لوگوں پر کیے تھے۔ چنانچہ اس نے اس وقت کے بنگال کے گورنر شائستہ خان کو حکم دیا کہ وہ پرتگالیوں کے رہے سہے مراکز کو بھی نیست نابود کر دے تاکہ لوگ ہمیشہ کے لیے ان کے ظلم وستم سے نجات پا جائیں۔ شائستہ خان نے اورنگ زیب کے اس حکم کی تعمیل کی اور پرتگالیوں کی قوت کے خاتمہ کے لیے بھرپور ایکشن لیا۔ اس مہم میں بنگال کے بحری بیڑے کی تین سو کشتیاں بھی کام میں لائی گئیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ولندیزی، فرانسیسی اور انگریزی کمپنیوں نے بھی حکومت کی بھرپور مدد کی یہاں تک کہ اسلام آباد اور جفنہ کے علاقوں کو پرتگالیوں کی دست برد سے رہا کرا لیا گیا۔ یہ ایکشن ۱۶۵۸ء میں لیا گیا۔ پرتگالیوں کے خلاف فرانسیسی، انگریزی اور ولندیزی لوگوں نے اس وجہ سے حکومت کا ساتھ دیا تھا کہ پرتگالیوں نے تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی، اور یہ بات ان کمپنیوں کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی، لہٰذا انہوں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اپنے ذاتی کینہ کی بنا پر پرتگالیوں کی اجارہ داری ختم کرنے میں حکومت کا ساتھ دیا۔

Marfat.com

(السادتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ جلد ۲ ص ۱۹۳، ص ۲۱۹، الشبال: تاریخ دولۃ اباطرۃ المغول الاسلامیہ فی الہند ص ۱۴۰، ص ۱۵۷)

۱۴۹۰ء میں جب پرتگالیوں نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر قدم رکھا تھا اسی وقت سے عیسائیت کی نشر واشاعت کے بارہ میں ان کی نیتیں طشت از بام ہوگئی تھیں اور ہر شخص یہ جاننے لگا تھا کہ یہ تجارت کے لبادہ میں کیا کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ پھران کی سرگرمیاں بھی یہ بتاتی تھیں کہ ان کے باطن میں کیا کچھ ہے۔ انہوں نے بہت جلد ہی گوا اور دیگر ساحلی علاقوں میں گرجا گھر قائم کیے اور پانچ کیتھولک پادریوں کی یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ عیسائی مذہب کی اشاعت وتبلیغ میں دن رات ایک کر دیں۔ اس سے پرتگالی حاکموں کے شعور کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے عیسائی کیتھولک مذہب کی تبلیغ اور نشر واشاعت کو اپنی حکومت کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد سمجھتے تھے۔ یہ لوگ ہر گرجا گھر کی تعمیر وتاسیس اور اس کے دوسرے اخراجات باہر سے بھیجتے اور ہر گرجا گھر کو اپنے کلی تسلط کا حکم دیتے اور کوشش کرتے کہ ہر گرجا گھر مشرق میں ایک حکومت قائم کرلے۔ (بانیکار: آسیا والسیطرۃ الغربیۃ ص ۱۲۲)

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ۱۴۹۰ء میں پرتگالیوں نے ہندوستانیوں کے ساحلی علاقوں پر قدم رکھتے ہی کوچین اور گوا میں اپنی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے مختلف یورپی ملکوں سے تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور سرگرم مبلغین منگوائے گئے۔ پاپائے روم کی طرف سے ۱۵۳۹ء میں ایک عیسائی کارکن فرانسیس زیویئر کو جس نے پیرس میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہایت متعصب کیتھولک عقیدہ کا عیسائی تھا، عیسائی مبلغین کے وفد کا سربراہ بنا کر گوا بھیجا گیا۔ اس شخص نے گوا کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی عیسائیوں کے تبلیغی مرکز جانے کے بجائے ننگے پاؤں جذامیوں (کوڑھیوں) کے ہسپتال کا رخ کیا۔ وہاں اس نے مریضوں کے قدم چومے، ان کے زخم دھوئے اور اس طرح ان کے دل میں پہلے اپنا مقام بنا کر انہیں مسیحیت کی بشارت دی۔ مسیحیت کی تبلیغ کا یہ ایک انوکھا طریقہ تھا جو لوگوں کے جذبات کو اپیل کرتا تھا۔ اس طریقہ سے عیسائیت

Marfat.com

کے فروغ میں بہت کامیابی ہوئی اور اسی طریقہ کو آج تک عیسائی اپنا رہے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے جگہ جگہ ہسپتال اور شفا خانے کھولے ہوئے ہیں۔

۱۵۴۲ء میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ مسیحیت کی دعوت کا کام کرنے والوں کی ٹریننگ نہایت ضروری ہے تا کہ دعوت و تبلیغ کا کام کسی سلیقے سے ہو اور اس کے اثرات بھی جلد ظاہر ہوں۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ''قدیس یونیورسٹی'' کے نام سے گوا میں ایک تربیتی مرکز قائم کیا گیا اور ایشیاء کے پورے خطے میں عیسائی مبلغین کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ تبلیغ کے لیے جانے سے پہلے اس یونیورسٹی میں ٹریننگ حاصل کریں۔ اس کے علاوہ جاپان اور چین سے لوگوں کو اغوا کر کے یہاں پر لایا جاتا اور ان عیسائی مبلغوں اور مربیوں کی نگرانی میں زبردستی عیسائی بنایا جاتا۔

اگرچہ یہ طریقہ تبلیغ پہلے سے بہت زیادہ موثر ثابت ہوا، لیکن فرانسیس زیویئر اس سے کوئی زیادہ مطمئن نہ تھا۔ اس نے اپنے منصوبے کے مطابق تمام عیسائی مبلغین کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ چین اور جاپان کے ادیان و مذاہب اور ان ملکوں کے باشندوں کی عقلی وفکری اور سماجی و معاشی حالات کا گہرا مطالعہ کریں اور ان کی سطح پر اتر کر ان سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کریں۔ ان ملکوں کی زبانیں سیکھیں اور یہاں کے اطوار و عادات اور رسوم و رواج پر گہری نظر رکھی جائے۔ اس منصوبے نے آگے چل کر عیسائی مبلغین کو خاصہ فائدہ پہنچایا کیونکہ یہ تبلیغ کا ایک سائنٹیفک طریقہ تھا۔ (برنارولویس: الغرب والشرق الاوسط ص ۴۹)

پرتگالیوں نے ۱۵۳۰ء میں گوا پر قبضہ کیا۔ قبضہ کرتے ہی انہوں نے گوا میں اسپین کی طرز پر ایک ایسی عدالت قائم کر دی جو لوگوں کے عقائد و خیالات کی چھان بین کر کے زبردستی ان کو عیسائیت کے دائرہ میں داخل کرتی۔ جو لوگ عیسائیت میں داخل ہونے سے انکار کرتے ان کے ساتھ انتہائی وحشیانہ سلوک کیا جاتا۔ کسی غیر مسیحی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کوچین اور گوا کے علاقوں میں رہ سکے۔ کم سن بچے اور بچیاں بھی ان

Marfat.com

کے ظلم وستم سے محفوظ نہ تھیں، چنانچہ کم سن بچوں، بچیوں اور یتیم بچوں کو اغوا کر کے عیسائی مراکز میں رکھا جاتا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد انہیں پرتگال کی راجدھانی لشبونہ بھیج دیا جاتا، جہاں انہیں باقاعدہ عیسائی بنانے کا کام شروع کر دیا جاتا۔ اور اگر وہ نرم طریقے سے عیسائی نہ ہوتے تو پھر ہر سخت سے سخت طریقہ انہیں عیسائی بنانے کے لیئے آزمایا جاتا۔ چنانچہ اس صغیر السن اور یتیم بچوں کو عیسائی بنانے کے لیے بڑے بڑے بھیانک طریقے اختیار کیے گئے۔ (السادتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ جلد۲ ص ۱۹۱)

تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ گوا کے صرف ایک علاقے سے تین سال کے قلیل عرصہ میں چھ ہزار ایسے بچے اغوا کر کے لشبونہ (لزبن) بھیج دیئے گئے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ممتاز محل کی دو خادماؤں کو اغوا کیا اور کچھ عرصہ پاس رکھنے کے بعد انہیں بھی لشبونہ بھیج دیا۔ (السادتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ جلد۲ ص ۱۹۱)

ان لوگوں نے بچوں کو اغوا کر کے عیسائی بنانے کی مہم کو بڑا کامیاب سمجھا۔ چنانچہ اس کو مزید کامیاب بنانے کے لیے انہوں نے کچھ عرصہ کے بعد لشبونہ (لزبن) سے مزید فوج گوا اور کوچین اس مقصد کے لیے بھیجی تاکہ دیہاتوں اور شہروں سے بچوں کو زبردستی اغوا کیا جائے۔ اور اگر کسی صورت ان کے اغوا میں ناکامی ہو یا ان کے اغوا میں کوئی مزاحمت ہو تو شہروں اور دیہاتوں کے غریب اور فاقہ کش لوگوں سے ان کے بچے اونے پونے میں خرید لیے جائیں۔ چنانچہ صرف ایک سال یعنی ۱۵۴۸ء میں دس ہزار اور ۱۵۶۰ء میں تیرہ ہزار بانوے ہندوؤں کو زبردستی عیسائی بنالیا گیا۔ ہر سال اس تعداد میں کچھ اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ ۱۵۷۸ء تک زبردستی عیسائی بنائے جانے والے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہو گئی۔

۱۵۸۸ء میں ایک نومسیحی پرسورام جوشی کو عیسائیت کی تعلیم لینے کے بعد پادری بننے کے لیے چین اور جاپان بھیجا گیا۔

ایک طرف اس زور شور سے عیسائیت کی دعوت کا کام جاری تھا اور لوگوں کو زبردستی

Marfat.com

عیسائیت کے حلقہ میں داخل کیا جا رہا تھا، لیکن دوسری طرف ان سب باتوں کے باوجود پرتگالیوں کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے اور اس طرح انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو رہی، خصوصاً برہمنوں نے ابھی تک معقول تعداد میں عیسائیت کو قبول نہیں کیا تھا۔ اور اگر یہ برہمن لوگ دین مسیحی کو قبول کر لیں تو تمام ہندو ہمارے دین کو قبول کر لیں گے۔ (لکان جمیع وثنیین قد اعتقوا دیننا) چنانچہ پرتگالیوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے فوج کا سہارا لیا جس نے مندروں پر دھاوا بول کر ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ہندوؤں کو مجبور کر دیا کہ وہ دین مسیحیت کو قبول کر لیں۔ (صور من الاستعمار ص ۶۹)

جب لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانے کے جنوں میں اور جوش پیدا ہوا تو پرتگالیوں نے مختلف احکامات اور قوانین کے ذریعہ اپنے مقبوضات سے غیر عیسائیوں کو یک قلم بے دخل کر دیا، مثال کے طور پر ۱۵۵۹ء میں یہ فرمان جاری ہوا کہ تمام پرتگالی مقبوضہ علاقوں میں طبی خدمات صرف اور صرف عیسائی ہی سرانجام دیں گے۔ ایک دوسرے سرکلر کے ذریعہ صرف عیسائیوں ہی کو سرکاری عہدہ کا اہل قرار دیا گیا۔ ایک اور فرمان شاہی میں یہ کہا گیا کہ جو ہندو بچے یتیم ہو جائیں ان کی نگرانی اور تربیت عیسائیوں کے ذمہ ہوگی اور وہی ان کے والی وارث ہوں گے۔ ایک اور سرکلر کے ذریعہ عیسائی پادریوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ گوا کے تمام علاقوں سے غیر عیسائیوں میں سے جس کو چاہیں بے دخل کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر وہ مسیحیت قبول کر لے تو وہ اس قانون سے مستثنیٰ ہو سکتا ہے یعنی یہ قانون اس پر لاگو نہ ہوگا۔ اسی طرح پادریوں کو اس بات کا بھی پورا پورا اختیار دیا گیا کہ جو شخص مسیحیت قبول نہ کرے اس کو زندہ جلا دیا جائے یا اس پر اتنا تشدد کیا جائے کہ وہ اس دنیا ہی سے کوچ کر جائے۔

تاریخ کے رپورٹر یہ بتاتے ہیں کہ اس حکم اور تفویض کے مطابق واسکوڈی گاما نے ان سینکڑوں مسلمانوں کو سمندر میں غرق کروا دیا جو حج بیت اللہ کے ارادہ سے جہازوں پر سوار ہو کر حجاز مقدس جانا چاہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پرتگالی

Marfat.com

عیسائیوں میں اس قدر مذہبی تعصب تھا کہ وہ کسی غیر مسیحی کو زندہ دیکھنا پسند ہی نہیں کرتے تھے، خصوصاً مسلمانوں سے ان کو خاص عداوت تھی کیونکہ وہ ان کو اپنا براہ راست حریف سمجھتے تھے۔ اسی طرح ایک اور پادری الیڈا کے متعلق کتابوں کے اوراق بتاتے ہیں کہ جو مسلمان خواتین عیسائیت قبول نہیں کرتی تھیں وہ ان کی آنکھیں پھوڑ دیتا تھا۔ ایک اور پادری بوکویرک کے بارہ میں مشہور تھا کہ وہ مسلمان خواتین کی ناک اور مسلمان مردوں کے ہاتھ کاٹ کر انہیں زندہ جلا دینے میں لذت محسوس کرتا تھا۔ اس ذلیل پادری نے پرتگالی بادشاہ کو ایک خط میں بڑے فخر سے لکھا کہ

''میں نے شہر میں کسی مسلمان کی عمارت قائم وسالم نہیں رہنے دی۔ جو مسلمان بھی میرے ہاتھ لگ جاتے ہیں میں انہیں زندہ جلا دینے کا حکم دیتا ہوں۔''

یہ پادری (بوکویرک) ان مسلمان علماء کو بھی زندہ جلا دیتا تھا جو مسلمانوں کو عیسائیت قبول نہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اس طرح اس ظالم اور ذلیل شخص کے ہاتھوں سینکڑوں علماء، زندہ جلائے گے، آگ میں بھونے گئے بلکہ ہزاروں خواتین، بچوں اور بوڑھوں تک کو نذر آتش کیا گیا۔ یہ سفاکی ایک بڑی بھیانک مثال تھی اور عیسائی پادریوں کا مذہب کے پردہ میں ظلم وستم کا ایک زندہ ثبوت۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صور من الاستعمار ص ۳۷-۳۸، السادتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ جلد ا ص ۲۱۱، جلد ۲ ص ۹۷، الموسوعۃ العربیۃ المیسرۃ ص ۵۹۷)

لوہے کی زنجیریں، بندوقوں کی سنگینیں، جیل خانوں کی کوٹھڑیاں، عدالتوں کے کٹہرے اور پھانسی کے پھندے سب کے سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ غلاموں اور آقاؤں، مذہبی پیشواؤں اور ان کے زیردستوں کے درمیان نفرت اور تشدد کے بادل اس تیزی کے ساتھ برسے کہ سارا ملک لہو سے داغدار ہو گیا۔ آسمان وزمین کے درمیان خون بے گناہ کی لکیر کھینچ گئی جس کے دونوں جانب پرتگالی قانون کے نخچیر

Marfat.com

تڑپتے نظر آتے تھے۔ مذہبی راہ نماؤں اور ان کے زیرِ دستوں کے درمیان اعتماد کی ساری کڑیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ رعایا کے گریبان داعی نے نوچ ڈالے اور قانون کے محافظوں نے قانون کے گریبان کی دھجیاں اڑا دیں، اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرنے والے اپنے ہاتھوں سے لوگوں کی جان و مال کو ظلم وستم کے تیشہ سے تباہ و برباد کرنے لگے۔ تاریخ کے اوراق اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے خون کے آنسو روتے ہیں کہ ایک خاص تقریب کے موقع پر جنوبی ہند کے ساحلی شہروں اور دیہاتوں پر بوکویرک کی فوجوں نے مسلمانوں پر اچانک حملہ کر کے ایک دن میں چھ ہزار مسلمان مردوں کو اس طرح تہ تیغ کیا کہ گلیاں اور سڑکیں خون میں نہا گئیں۔ خود گوا جیسے شہر کی جامع مسجد میں خواتین، بوڑھوں اور بچوں کو جمع کر کے چاروں طرف سے آگ لگا دی گئی اور یہ سب مسجد میں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ پھر بڑے چاؤ کے ساتھ اور داد حاصل کرنے کے لیے یہ سارا واقعہ پرتگالی بادشاہ کو ایک خط میں لکھا گیا کہ

''میں (بوکویرک) نے اس کے بعد پورے شہر کو جلا کر راکھ کر دیا اور ہر شخص کی گردن پر تلوار رکھ کر اس کے جسم سے جدا کر دیا۔ اور جہاں کہیں بھی ہم نے کسی مسلمان کو پایا اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہم نے ایسا کیا کہ چھ ہزار مسلمانوں سے مسجد کو بھر لیا، پھر اس کو چاروں طرف سے آگ لگا دی یہاں تک کہ وہ چھ ہزار نفوس جل کر راکھ ہو گئے۔ اور اے میرے آقا! (یعنی پرتگالی بادشاہ) یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا جو آغاز وانجام کے لحاظ سے بہت اچھا تھا۔''

(صور من الاستعمار ص ٦٦)

چشم فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ مسلمان مردوں کو زندہ جلا کر ان کی لڑکیوں اور بیویوں کو عیسائی حکام کے حوالے کر دیا جاتا تاکہ وہ ان کو لونڈیاں بنا کر رکھیں، پھر ان کی شادی عیسائی مردوں سے کر دی جاتی تاکہ ان کا وجود ہی تحلیل ہو کر رہ جائے۔

(صور من الاستعمار ص ٦٦)

Marfat.com

۱۵۴۰ء میں یوحنا سوم نے یہ فرمان جاری کیا کہ گوا اور کوچین کے علاقوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے جو اوقاف یا دینی مراکز ہیں، ان کو زمین بوس کر کے ان کی جگہ گرجا گھر تعمیر کیے جائیں، اور ان اوقاف کی آمدنی کو مسجد یا مندر پر صرف کرنے کے بجائے گرجا گھروں پر صرف کیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساڑھے تین سو مسجدوں اور مندروں کو پرتگالی فوجوں نے منہدم کر دیا جہاں بعد میں گرجا گھر تعمیر کیے گئے۔ چنانچہ سینٹ پال نامی گرجا جو گوا میں واقع ہے ایک مسجد کو گرا کر بنایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں مقدسہ کیتھرائن کا گرجا بو کو یرک پادری نے خود ایک جامع مسجد کو گرا کر بنایا تھا۔ علاوہ ازیں فرانسس ڈی، اسیسی کا گرجا بھی ایک مسجد کو گرا کر بنایا گیا تھا۔

(صور من الاستعمار ص ۶۶، نیز ملاحظہ ہو مقدمۃ الستا لکتاب اظہار الحق ص ۲۲-۲۳)

یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب ہندوستان پر مغلیہ خاندان کی حکومت تھی اور وہ اپنے کو مسلمان کہتے تھے۔ ان کی حکومت میں مسلمانوں پر یہ تمام ظلم توڑے گئے۔ آنے والی نسلوں نے انہیں بہت بدنام کیا کہ وہ بہت متعصب مسلمان تھے لیکن یہ سب واقعات ان کی غفلت اور بے حمیتی کی نشان دہی کرتے ہیں۔

معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ پرتگالیوں کی طرح انگریزوں نے بھی برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں ہی کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور ہندومت کے بجائے انہیں اسلام ہی سے زیادہ دشمنی رہی۔ چنانچہ ولیم ہوار ڈسل کے ان الفاظ سے انگریزوں کی اسلام دشمنی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

''ہماری مخالفت اور عناد پیروان محمدؐ سے کہیں زیادہ شدید ہے بمقابلہ اس اختلاف کے جو ہمارے اور سیوا اور وشنو کے پجاریوں کے درمیان ہے۔ یہ لوگ (مسلمان) ہماری حکومت کے لیے زیادہ خطرناک ہیں۔ اگر ہم ان روایات کو اکھاڑ پھینکتے اور اپنی طاقت اور کوشش سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مسجد کو مسمار کر دیتے تو یہ مسیحی عقیدہ اور ہماری برطانوی حکومت کے حق میں یقیناً بڑا اچھا ہوتا۔''

Marfat.com

(منقول از ذکر وفکر ص ۱۶، جون ۱۹۸۸ء مضمون مولانا حسن مثنیٰ ندوی)

انگریزوں کے مسلمانوں پر ظلم و ستم اور وحشت و بربریت کے لیے ملاحظہ ہو کفاح المسلمین فی تحریر الہند، عبدالمنعم نمر، نیز اذھبت ریح الایمان لابی الحسن علی الندویؒ ص ۱۹۴-۲۰۰)

پرتگالی وحشت اور بربریت اور جبر و تشدد سے انسان تو انسان جانور اور درخت تک محفوظ نہ تھے۔ تاریخ کے رپوٹر بتاتے ہیں کہ

''۱۵۵۵ء میں کاناکور شہر میں نو ہزار مسلمانوں کو قتل کر کے ان کے پالتو جانوروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ نیز ان کے چالیس (۴۰) ہزار درختوں کو کاٹ کر جلا دیا گیا۔'' (صور من الاستعمار ص ۳۸)

ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر مظلوموں کے دل میں ظالموں کے خلاف نفرت کا لاوا پکنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس نفرت کو نہ پھر بندوقوں کی گولیاں، جیل خانوں کی کوٹھڑیاں اور پھانسی کے پھندے ختم کر سکتے ہیں اور نہ ظلم و ستم کا کوئی اور حربہ۔ مظلوموں کی نگاہوں کے میل اور دلوں کی کدورت کو کوئی شی ختم نہیں کر سکتی۔ حکومت کا مقصد رعایا پر ظلم و ستم نہیں بلکہ ان کے دلوں میں محبت و یگانگت کی تخم ریزی ہوتی ہے۔ گوا کے پرتگالی حکمرانوں کو بڑی دیر کے بعد احساس ہوا کہ اپنے ماتحتوں اور زیر دستوں کے ساتھ ان کا رویہ نہایت شرمناک بلکہ افسوس ناک ہے۔ رعایا سلطنت کے باغ کے پودے ہوتی ہے۔ باغبان جب پودوں کی تخم ریزی اور پھر آبیاری کرتا ہے تو ان کے جوان ہونے تک لیل و نہار کی محنت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ روز و شب کی ستم ظریفیوں سے انہیں محفوظ رکھے۔ موسم کے نشیب و فراز بھی پھول آنے تک سد راہ ہوتے ہیں۔ باغبان کی تمنائیں موسم سے بھی دست و گریبان ہوتی ہیں، لیکن یہاں تو معاملہ الٹا تھا۔ باغبان تبر ظلم اور تیشۂ ستم سے گلستان کے ہر نخل کو بیخ و بن سے کاٹ رہا تھا۔ رعایا ملک چھوڑ کر بھاگ رہی تھی اور جو بھاگ نہ سکے وہ وحشت و بربریت کی نذر ہو گئے۔

Marfat.com

ان سب چیزوں کو بعض با اختیار انتظامیہ کے لوگوں نے محسوس کیا اور انہیں اس بات کا شدید احساس ہوا کہ لوگوں کو عیسائی بنانے کا جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا ہوا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ رعایا کے قلب ونظر پر اس کے اثرات الٹے پڑ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے لشبونہ کے حکام کو اس بارہ میں لکھا کہ لوگوں کو مسیحیت کی دعوت کے لیے جبر وتشدد کے یہ جو طریقے اختیار کیے گئے ہیں، ان کو ختم کیا جائے اور شفقت ومحبت کی نیو پر دعوت کی عمارت کو کھڑا کیا جائے، لیکن لشبونہ کے حکمرانوں کے دل ودماغ پر خون سوار تھا۔ انہوں نے ان سفارشات کو درخور اعتناء نہ سمجھا اور ظلم وستم کے وہ تمام حربے جاری رکھنے کی ہدایت دی جو کئی سالوں سے رعایا کا مقدر بن چکے تھے، اور جن حکمرانوں نے خزاں سے بہار چھین کر گل وگل چین کے رشتہ کی نیو اٹھانے کی کوشش کی تھی، انہیں سوائے مایوسی کے اور کچھ نہ ملا، لہٰذا حالات میں کوئی سدھار پیدا نہ ہوا۔ غیر ملکی حکمران غلام رعایا کے ساتھ باہم دست وگریبان رہے۔ آدمی کے لہو سے آدمیت کی ذلت ٹپکنے لگی۔ دلوں کے انگارے بدبو دینے لگے اور خار مغیلاں بھی خون انسانی سے لالہ وگل کی رنگت حاصل کرنے لگے۔

انگریزوں کی داستانِ ظلم:

یہ تو پرتگالیوں کی داستانِ ظلم کی چند جھلکیاں تھیں جو انہوں نے عیسائیت کے فروغ اور تبلیغ کے لیے کیے انگریزوں نے ہندوستان کے ساتھ اپنے دین کی نشرواشاعت اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے جو کچھ کیا، وہ داستان ظلم بھی اس سے کوئی مختلف نہیں۔ انگریزوں کے ہندوستان میں وارد ہونے پر اگرچہ بہت سے غدارانِ وقت نے جو بعد میں جاگیردار اور بڑے بڑے زمیندار کہلائے، ان کا ساتھ دیا اور پوری ہندوستانی قوم کو انگریز کے پنجۂ استبداد میں پھانسنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن جب قفس کی تیلیاں ٹوٹیں تو بہاران سے روٹھ چکی تھی اور شبنم کے آنسو ہچکیاں لے رہے تھے۔ بادنسیم موت کی مضراب لے کر ان کے استقبال کو آئی اور ان لوگوں نے قوم سے غداری کر کے اور غیر ملکی حکمرانوں

Marfat.com

کا ساتھ دے کر غیر معینہ وقت تک کے لیے اہل وطن کو غلامی کے لیے پابند سلاسل کر دیا۔

پرتگالیوں نے یورپ میں ہندوستان کی زرخیزی و شادابی اور خوشحالی کا زبردست پراپیگنڈہ کیا تھا جس کی وجہ سے کئی ملکوں اور کئی لوگوں کے منہ سے رال ٹپکنے لگی۔ پرتگالیوں نے یہ خوش خبری بھی عیسائی دنیا کو دی تھی کہ وہاں عیسائیت کے فروغ اور اس کی نشر و اشاعت کے سنہرے مواقع ہیں۔ ان خبروں کے سننے کے بعد یورپی قزاقوں نے بڑی تعداد میں ہندوستان کا رخ کیا تاکہ اس سونے کی چڑیا پر جلد از جلد قبضہ کر سکیں۔ سترھویں صدی میں فرانسیسی اور ولندیزی تاجروں نے سوات اور گجرات میں اپنے تجارتی مراکز قائم کیے۔ ان کی تجارتی سرگرمیاں اس حد تک بڑھ گئیں کہ انہوں نے مالابار کے ساحل پر واقع تمام پرتگالی مراکز پر قبضہ کر لیا۔ اس سے قبل فرانسیسیوں نے ان مراکز پر قبضہ کیا تھا، لیکن آخر میں انگریزوں نے پرتگالیوں، ولندیزیوں اور فرانسیسیوں کا پتا ہندوستان سے کاٹ دیا اور خود بلاشرکت غیرے ہندوستان کے مالک بن گئے۔

سب سے پہلا انگریز جس نے سرزمین پاک و ہند پر قدم رکھا تھا وہ پادری تھامس سٹیفنز (Thomas Stephenes) تھا جو ۱۵۷۹ء میں گوا آیا تھا۔ تین اور انگریز ہندوستان آئے اور انہوں نے ۱۵۹۹ء میں شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں ہندوستان کے تعاون و اشتراک سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی۔ ۱۶۰۱ء میں ملکہ الزبتھ اول نے یہ فرمان جاری کیا کہ "لندنی تاجروں کی کمپنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ معاملہ کرے گی۔" اس کمپنی کو یہ حق دیا گیا کہ وہ جس غیر مسیحی کے ساتھ چاہے صلح یا جنگ کرے۔

۱۶۰۸ء میں ولیم ہاکنز برطانوی سفیر بن کر ہندوستان آیا۔ اس نے برطانوی سفیر کی حیثیت سے انگلستان کے بادشاہ جیمز اول کا خط شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا۔ اس خط میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ ہندوستان میں انگریزوں کو تجارتی سہولتیں مہیا کی جائیں لیکن شہنشاہ جہانگیر نے ان کی یہ درخواست مسترد کر دی۔ بعد میں تھامس رو ۱۶۱۲ء میں انگلستان کے بادشاہ کا پیغام دوبارہ لے کر آیا تو انہیں یہاں فیکٹری لگانے

Marfat.com

اور تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ اس کے بعد ان کے کارخانے اور فیکٹریاں پورے ہندوستان میں پھیلتی گئیں، اور غدر و خیانت اور مکر و خباثت سے انگریزوں نے آہستہ آہستہ سارے ہندوستان پر اپنے قدم جما لیے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہوگیا۔ بنگال اور بعض دوسرے ساحلی علاقوں میں انہوں نے بڑی بڑی فیکٹریاں اور تجارتی مراکز قائم کر لیے۔

انگریزوں کی سیاست یہ تھی کہ جس جگہ یہ رہے انہوں نے وہاں رہائش کے لیے مخصوص جگہ کا انتخاب کیا۔ اس طرح تجارتی قافلوں اور کاروبار کی حفاظت کا بہانہ بنا کر انہوں نے اپنی مخصوص فوج بھی تیار کر لی۔ مغل فوجوں اور حکام نے اپنی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے انگریزوں کی اس فوجی تیاری کو یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا کہ یہ لوگ تجارت پیشہ ہیں اور مغلیہ خاندان ایک طاقتور اور مستحکم حکومت کے لیے یہ کسی طرح خطرہ نہیں بن سکتے۔ اس چیز کو اس بات سے بھی تقویت ملی کہ ابتدائی مراحل میں انگریزوں اور مغل فوجوں کے مابین ایک معرکہ ہوا جس میں انگریزی فوجوں کو ناکامی اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مغل حکام اس چھوٹے سے واقعہ سے انگریزوں کے خطرات سے اپنے کو بالکل محفوظ سمجھنے لگے یہ ان کی حماقت تھی کیونکہ عقل مندوں کا مقولہ ہے کہ کمزور دشمن کو کبھی کمزور نہیں سمجھنا چاہیے، لیکن انگریزوں نے اپنے ان فوجیوں کی ناکامی سے یہ سبق سیکھا کہ انہوں نے اپنے کو مزید طاقتور بنانا شروع کر دیا تا کہ آئندہ کے معرکوں میں ان کی فوج کو ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں عیسائیوں کی تعداد بہت کم تھی اور عیسائی مبلغین نے بھی اپنا تبلیغی کام اس زور شور سے شروع نہیں کیا تھا، اس لیے انگریزوں کے ساتھ بدگمانی کے بجائے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی کمپنیوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ مدغم کر دیں، لیکن انگریزوں نے اس رعایت سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اس وجہ سے سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے ہوگلی اور دوسرے علاقوں میں انگریزوں کے مضبوط ٹھکانوں کو تباہ و برباد کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انگریزوں

نے بادشاہ سے اپنی غلطی کی معذرت چاہی۔ چنانچہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے انہیں معاف کر دیا اور انہیں دوبارہ اپنے کارخانوں، فیکٹریوں اور کمپنیوں کے قیام کی اجازت مل گئی جس کے بعد ہی کلکتہ شہر کی داغ بیل پڑی۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جنۃ الاستعمار ص ۲۱۲، نشاۃ باکستان ص ۳۰، تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ جلد ۲ ص ۱۸۱، ص ۱۸۴، ص ۲۳۵، ۲۴۸، حقائق عن باکستان ص ۲۷)

انگریزوں نے مسلمانوں کی قوت وشوکت کا اندازہ کر کے دو باتوں کو اپنی گرہ میں باندھ لیا:

۱- کل ہند پیانے پر تجارتی سرگرمیوں کی وسیع تنظیم و تربیت ضروری ہے تا کہ برطانوی مفادات کا تحفظ ہو سکے، لیکن اس کے ساتھ خود اس ملک کی تجارتی سرگرمیوں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا ضروری ہے۔

۲- اس کا پورا اہتمام کیا جائے اور مظاہرہ بھی کہ انگریزوں کو برصغیر پاک و ہند کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی سے کوئی مطلب نہیں تا کہ اس بہانے پورے ملک میں قدم مضبوط کیے جائیں۔ اسی طرح ساحلی علاقوں کو اپنے تصرف میں لا کر باہر سے ایسے جدید ترین اسلحے درآمد کیے جائیں جو مغل فوجوں کے پاس نہیں ہیں۔

ان دونوں اصولوں پر عمل کر کے انگریزوں نے پورے ملک میں اپنے قدم جما لیے۔ انہوں نے نوابوں، صوبائی اور مرکزی حکام کے درمیان غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پیدا کر کے اس ملک کے شیرازے کو پراگندہ کر کے رکھ دیا۔

(السادتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ جلد ۲ ص ۲۴۸)

انگریزوں سے پہلے پرتگالیوں نے تجارتی کمپنیوں کی اوٹ میں دعوتی جدوجہد شروع کی تھی، لیکن انہوں نے اس میں بہت سی غلطیاں کی تھیں۔ انگریزوں نے پرتگالیوں کو دعوتی جدوجہد اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بات کا بڑا

Marfat.com

اہتمام کیا کہ اپنی تجارتی کمپنیوں کو صرف تجارتی مقاصد کے فروغ کے لیے مصروف کر دیا اور عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کی سرگرمیوں سے ان کو دور رکھا۔ ظاہری طور پر تو ان دونوں شعبوں کو الگ الگ رکھا لیکن خفیہ طور پر عیسائی مبلغین کی ان تجارتی کمپنیوں نے بھرپور مدد کی اور اسی کے ساتھ ان مبلغین کو ہدایت کی کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے کمپنی کے مفادات کو نقصان پہنچے یا ہندوستانیوں کو دینی حیثیت سے انگریزوں کے خلاف فتنہ وفساد کا موقعہ فراہم ہو۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک اسی پالیسی پر عمل ہوتا رہا لیکن جوں جوں انگریز کمپنیوں کی طاقت اور اثر ونفوذ میں اضافہ ہوتا گیا، انگریزوں کی اس پالیسی میں تبدیلی آتی گئی۔ اور عیسائی مبلغین کو بھی آہستہ آہستہ ڈھیل دی جاتی رہی۔ ڈھیل دینے اور پالیسی میں تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پورا ہندوستان انگریزوں کا محکوم ہو گیا۔ اور غلامی میں صرف آزادی ہی سلب نہیں ہوتی بلکہ عقل انسانی بھی اپنی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے، اور مذہب کی پاکیزگی غلامی کے گناہوں سے آلودہ ہو کر اپنا دامن داغدار کر لیتی ہے۔ غلام قوم اپنا وقار کھو چکتی ہے۔ حکمران قوم کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور نسیم سحرگاہی کا ہر جھونکا بادسموم بن جاتا ہے، اور چمن کا ایک ایک پتا صیاد کا معاون بن کر لالہ وگل کی پتیاں بکھیرنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے غلام قوم سے حکمران قوم کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا، اس لیے انگریزوں نے اب ایسی پالیسیاں تبدیل کر دیں اور یہ ہدایات جاری کی گئیں کہ اب دعوتی جدوجہد ان علاقوں میں انجام دی جائیں جہاں غیر مسلموں کی آبادی ہے۔ مسلم آبادی میں تبلیغی کام قطعاً نہ کیا جائے کیونکہ مسلمان حکمران قوم سے انگریزوں نے حکومت چھینی تھی، لہٰذا ابھی انگریز کی سیاسی قوت شامہ مسلمان قوم سے باوجود اس کے محکوم ہونے کے مزاحمت کی بو سونگھ رہی تھی۔

انگریز نے اپنی اس پالیسی کے تحت نہایت خاموشی کے ساتھ پورے ملک میں گرجا گھر، تعلیمی ادارے، ہسپتال اور شفاخانے بڑی تعداد میں قائم کر دیے۔ ۱۷۹۲ء

۱۷۹۵ء اور ۱۷۹۹ء میں مختلف ناموں سے عیسائیت کی تبلیغ کی انجمنیں قائم کی گئیں۔ اس کے بعد ہی یورپ، امریکہ، جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں سے عیسائی مشنریز نے ہندوستان پر یورش کر دی، لیکن ان سب کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ کن لوگوں سے کام کا آغاز کیا جائے۔ آیا عام لوگوں میں تبلیغ کی جائے یا روشن خیال، مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کو عیسائیت کی دعوت دی جائے۔

کئی ماہ تک اس سوال پر غور و خوض ہوتا رہا۔ بہت سے عیسائی دانشور اور مبلغ سر جوڑ کر بیٹھے۔ آخر میں اس بات کا فیصلہ ہوا کہ کم سن بچوں کو خرید کر یا زبردستی اغوا کر کے انہیں عیسائی بنانا زیادہ مفید ہے، لیکن لارڈ منٹو کو یہ منصوبہ پسند نہ آیا۔ کمپنی کے عیسائی مبلغین اور برطانوی حکومت لارڈ منٹو کے خیالات سے متفق نہ ہو سکی۔ البتہ اس نے عیسائی مبلغین کو متنبہ کر دیا کہ اصل خطرہ کیتھولک مبلغین سے ہے جو کمپنی کے تابع نہیں ہیں، اس لیےس بات کا انتہائی اندیشہ ہے کہ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک مبلغین کے درمیان مسابقت کا جذبہ ہندوستانیوں کے دینی جذبہ کو ٹھیس پہنچائے، لہٰذا کمپنی کے مبلغین کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ کیتھولک مبلغین کی دعوت جدوجہد کو حدود میں رکھیں اور پروٹسٹنٹ مبلغین کی ہر طرح مالی اعانت اور سرپرستی کریں۔ چنانچہ اس طریقے سے کیتھولک مبلغین کی سرگرمیاں کم ہو گئیں اور ساتھ ہی یورپ اور امریکہ سے آنے والی امداد بھی کم ہو گئی۔

اب پروٹسنٹ مبلغین کے لیے میدان صاف تھا۔ کمپنی کا اپنا عقیدہ بھی چونکہ پروٹسنٹ تھا، لہٰذا کمپنی نے ان کی کھل کر سرپرستی اور حمایت کی۔ اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان عیسائی دعوت کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ اسلامی عقائد، شخصیات، تاریخ و تہذیب کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو شکوک و شبہات کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ جدوجہد زیادہ دیہی علاقوں کے سادہ دل مسلمانوں میں مرکوز رکھی گئی تاکہ ان کے اسلامی عقائد متزلزل ہو جائیں اور وہ آسانی سے

Marfat.com

عیسائیوں کے جال میں پھنس جائیں۔ شہری علاقوں میں اس دعوتی جدوجہد کو ابھی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ وہاں اس پر اتنا زور نہ دیا گیا۔

شروع شروع میں عیسائی مشنریز کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی زبردست تائید اور حمایت حاصل رہی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حکومت نے سرکاری سطح پر یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انگریز حاکم فوجیوں اور سرکاری عہدیداروں کو گاہے گاہے یہ حکم دیتے رہتے تھے کہ عیسائی مشنریز کی تائید وحمایت جاری رکھی جائے۔

لارڈ منٹو کے عہد میں عیسائی مشنریز کے خلاف فساد میں تیس (۳۰) انگریز مارے گئے۔ اس پر حکومت برطانیہ نے عیسائی مشنریز کی جدوجہد اور سرگرمیوں کو مزید تیز تر کرنے اور ان میں تنظیم اور نظم ونسق پیدا کرنے کے لیے یہ حکم جاری کیا کہ ہندوستان تبلیغ کے لیے وہی مبلغ جا سکتا ہے جس کے پاس حکومت کا آرڈر ہو۔ اپنی مرضی سے کوئی مبلغ نہیں جا سکتا۔ حکومت نے اس مقصد کے لیے ایک بڑے پادری کو متعین بھی کر دیا تاکہ وہ تبلیغی سرگرمیوں میں مشورہ دے سکے۔

اب چونکہ پورے ہندوستان میں انگریزوں کا سیاسی اقتدار تھا اور انگریز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو مکمل طور پر ختم کر چکا تھا، لہٰذا اس کی دلی خواہش تھی کہ اب سرزمین اندلس کی طرح یہ خطہ میں عیسائیت کی اکثریت والا علاقہ بن جائے۔ ہندوستان کی سرزمین میں انہیں اندلس سے زیادہ دلچسپی اور چارم (Charm) نظر آتا تھا، لہٰذا وائسرائے ہند لارڈ کیننگ نے اس بات کا عہد کیا کہ تین سال کے اندر پورے ہندوستان کو عیسائی اکثریت میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ ادھر انگلستان میں ایک برطانوی ممبر پارلیمنٹ نے ۱۸۵۷ء میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ

''آج سے پورا ہندوستان انگریزوں کے زیر نگیں ہے۔ اب پورے ملک پر مسیح کا پرچم لہرایا جائے گا۔ اب ہم تمام عیسائیوں کا یہ بنیادی فریضہ ہے کہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔''

Marfat.com

ایک اور رپورٹ میں اس بات کا اشارہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے عیسائی مبلغین بڑے امن وسکون سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، اس لیے کہ وہ حکومت برطانیہ کی سرپرستی اور حمایت میں یہ کام انجام دے رہے ہیں۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ دولۃ الاباطرہ المغول الاسلامیہ ص ۱۶۲، نورالدین داؤد: محنۃ فی الفردوس، ص ۱۸۶، عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الھند ص ۴۰۴، السادتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ جلد۲ ص ۲۷۱، ص ۲۸۱، انور الجندی: العالم الاسلامی والاستعمار ص ۱۵۳، عبدالعزیز نوار: الشعوب الاسلامیہ ص ۵۴۸-۵۵۵، عبداللہ حسین: المسالۃ الہندیہ ص ۲۰۵-۲۰۷ وغیرہم)

انگریزوں کی لسانی اور تعلیمی پالیسی کے عوامل:

صلیبی جنگوں کی ناکامی کے بعد مسیحی دنیا نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف انتقام کے لیے جو منصوبہ بندی کی تھی، اس کا کرتا دھرتا اسپینی پادری ریمون للی (Raymn Lilly) تھا جس نے اسپین میں مسلمانوں کو نہ صرف نیست ونابود کیا بلکہ ان کے وجود ہی کو تحلیل کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ریمون للی نے پاپائے روم کے سامنے جو منصوبہ پیش کیا اس میں گرجا گھروں سے اس بات کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ تعلیمی اور ثقافتی مراکز کو عیسائی دعوت کی نشرواشاعت اور تبلیغ مذہب کے لیے استعمال کیا جائے۔ اگر تعلیم وتربیت کے تمام وسائل استعمال کرنے کے بعد بھی مسلمان عیسائی نہ بنیں تو بجبر واکراہ یعنی جس طریقے سے بھی ہو سکے انہیں عیسائی بنایا جائے۔

یہ منصوبہ عیسائی مبغلین کے ذہنوں پر ایک عرصہ تک چھایا رہا۔ بالآخر پادری گریگورس شانزدہم نے ۱۸۳۱ء میں تعلیمی مشنریز کی تشکیل کرکے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ پھر ۱۸۸۱ء میں پادری لیون نے عیسائی مبلغین کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ ہر قسم کی علمی سندیں حاصل کر سکتے ہیں تاکہ مسیحی عقائد کی ترویج واشاعت کا کام وسیع پیمانہ پر کرسکیں۔ اس کے بعد تجربات سے اس بات پر تمام مبلغین کا قریباً اتفاق ہو گیا

کہ تعلیمی اداروں کے ذریعہ ذہین مسلمان نوجوانوں کو متاثر کیا جا سکتا ہے اور شہروں اور دیہاتوں میں نہایت آسانی، آزادی اور بڑے اطمینان کے ساتھ یہ کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بڑے پیمانے پر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تعلیم و تربیت کے ادارے قائم کیے گئے۔

۱۹۰۰ء میں سرزمین پاک و ہند میں عیسائی مشنریز کے زیر اہتمام چلنے والے تعلیمی اداروں کی تعداد ایک ہزار تھی جب کہ ان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء و طالبات کی تعداد ۶۵ ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔ آگرہ، اودھ، الہ آباد، حیدر آباد اور مدارس وغیرہ میں ایسے معیاری تعلیمی ادارے تھے جہاں عیسائی مبلغین کو مسلمانوں کے درمیان دین مسیحی کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔

عیسائیت کو تعلیمی اداروں کے علاوہ ہسپتالوں کے ذریعہ لانے کی بھی کوشش کی گئی، کیونکہ دانشوروں نے اس طریقے کو بڑا موثر بتایا۔ اس طریقے سے مریض اور اس کے گھر والوں کے جذبات سے کھیلا جاتا ہے۔ اس سے قبل فرانسس زیور بھی اس طریقے کے موثر ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر چکا تھا۔ چنانچہ اب حکومت برطانیہ نے ان تعلیمی اداروں کے پہلو بہ پہلو عیسائی مشنریز کے زیر اہتمام ہسپتال اور شفا خانے بھی قائم کیے۔ ان سب کا مجموعی بجٹ بیس لاکھ ڈالر سالانہ تھا۔ ان مسیحی ہسپتالوں میں کام کرنے والی نرسوں کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ سال میں کم از کم چھ ہزار خاندانوں سے ذاتی روابط پیدا کریں، خصوصی طور پر خواتین کو مختلف عیسائی تقریبات میں مدعو کر کے ان کے ذہنوں کو عیسائیت کے لیے ہموار کریں۔ سالانہ تیس ہزار خواتین کے مفت علاج کی سہولت بھی ان ہسپتالوں میں مہیا کی گئی تھی۔

انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور نئے نصاب تعلیم کے نافذ ہونے کے بعد انگریزی حکومت کو ایسے افراد ملنے شروع ہو گئے جو ذہن و فکر اور ذوق و مزاج کے اعتبار سے نیم انگریز تھے اور جو دین اور اخلاقی قدروں کا مذاق اڑانے کو فیشن سمجھتے تھے۔

Marfat.com

ان لوگوں کے ذریعہ اسلامی عقائد اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو بے اختیار ثابت کرنے کی ایک خاص مہم چلائی گئی تا کہ اسلامی عقائد کی عمارت میں دراڑیں بھی پڑ جائیں اور ہم پر کوئی حرف بھی نہ آئے۔ چنانچہ یہ مہم کامیاب رہی۔ ایک پادری نے ایک خط میں لکھا ہے:

''ہم ہندوستان اس لیے نہیں آئے کہ یہاں کے باشندوں کے ساتھ کوئی بھلائی کریں بلکہ ہم نے ان پر ایسا تعلیمی نظام مسلط کر دیا ہے جو رفتہ رفتہ ان کی دینی اور اخلاقی اقدار کو ختم کر کے زوال کے آخری درجہ تک انہیں پہنچا دے گا۔''

یہ تعلیمی ادارے اور مشنری سکول حکومت نے اس لیے کھولے تھے تا کہ لوگوں کے ذہنوں میں ایک ایسا نظام تعلیم ٹھونس دیا جائے جس کو پڑھ کر لوگ دیکھنے میں تو مسلمان نظر آئیں لیکن ذہنی طور پر وہ انگریز ہوں۔ ان کو چلانے کے لیے انگریزی حکومت نے اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا تھا بلکہ مسلمانوں کے مدارس اور مساجد کے اوقاف کو بحق سرکار ضبط کر کے ان کی ساری آمدنی بلکہ ان اوقاف کی عمارتوں کو بھی عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف کر دیا۔ گویا ہمارے ہی جوتے اور ہمارا ہی سر۔ علاوہ ازیں جو مسلمان امراء اور نواب اسلامی مدارس کی امداد اور اعانت کرتے، ان کو سخت دھمکیاں دی جاتیں۔ بسا اوقات معمولی غلطیوں کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کو بند کر دیا جاتا۔ اس طرح بڑی تعداد میں مسلمان اپنے تعلیمی مراکز سے محروم ہو گئے۔ یہ بھی ایک طریقہ تھا مسلمانوں کو اسلامی تعلیم سے دور رکھنے اور انگریزی تعلیم سے نزدیک لانے کا۔ پھر اس سے انگریزوں کو یہ فائدہ ہوا کہ اسلامی تعلیمی مراکز بند کرنے یا بند ہونے سے نہ صرف موجودہ نسل اسلامی تعلیم سے محروم ہو گئی بلکہ مستقبل کی مسلمان نسلیں بھی اسلامی تعلیم سے یک قلم دور ہوتی چلی گئیں۔

یہ وقت مسلمانوں کے لیے بہت نازک تھا کیونکہ ان کی حکومت تو چھینی جا چکی تھی اب دین بھی چھینا جا رہا تھا۔ چنانچہ مولانا الطاف حسین حالی نے اس وقت کی نزاکت کو یوں بیان کیا ہے کہ

Marfat.com

''ہندوستان میں اسلام خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری گھات میں لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ قحط کے دوران میں ان کو دبلا پتلا شکار پیٹ بھراؤ مل جاتا تھا، مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ زور ان کا مسلمانوں پر تھا، اس لیے کہ ان کی منادیوں میں، ان کے اخباروں میں اور ان کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام پر ہوتی تھی۔ اسلام کی تعلیم کی طرح طرح سے برائیاں ظاہر کرتے تھے۔ بانی اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ بہت سے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب اور اکثر افلاس کے سبب ان کے دام میں آ گئے۔ اس خطرہ سے بلاشبہ علماء اسلام جیسے مولانا آل حسن، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور ڈاکٹر وزیر خان وغیرہ متنبہ ہوئے۔ انہوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلہ میں لکھیں اور ان سے بالمشافہ مناظرے کیے جس سے یقیناً مسلمانوں کو فائدہ پہنچا۔ ردّ نصاریٰ میں تالیف و تصنیف اور پادریوں سے مقابلہ و مناظرہ کا سلسلہ ایک جماعتی نہ سہی لیکن انتظامی شکل میں شروع ہو گیا تھا۔ قدرتی طور پر ہر جگہیں مسجدیں تھیں۔ علمائے کرام کے وہ گڑھ تھے۔ اس انقلابی تحریک کے چلنے میں کوئی دشواری پیدا نہیں ہوئی۔ راہ نما کی ضرورت تھی۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ سے بہتر کون ثابت ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس کام کے لیے دہلی، آگرہ کو مرکز قرار دیا۔ یہاں بھی مولاناؒ نے تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ ان کی جماعت میں ہندوستان کے انتہاء پسند اور حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کے فدائی مسلمان تھے جن کی تعداد کافی تھی۔'' (حیات جاوید ص)

اسی طرح حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی اس زمانہ کے حالات کا ایک نقشہ حیات شبلی کے دیباچہ میں پیش کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت

Marfat.com

مسلمانوں پر فتنوں کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ سید صاحبؒ لکھتے ہیں:

''انگریزوں کے برسر عروج آتے ہی تین طرف سے حملوں کا آغاز ہوا۔ چنانچہ مشنریوں نے اپنی نئی سیاسی طاقت کے بل بوتے پر اسلام کے قلعہ روئیں پر حملے شروع کر دیے۔ دوسری طرف ہندوؤں میں آریہ تحریک نے اپنے سابق مسلمان حکمرانوں سے نجات پا کر ان پر حملہ کی جرأت پائی اور سب سے آخر میں یورپین علوم و فنون اور تمدن کی ظاہری چمک دمک مسلمانوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی۔ خدا نے عیسائیوں کے مقابلے کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، ڈاکٹر وزیر خان صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رحم علی منگلوری، مولانا عنایت رسول چڑیا کوٹی اور مولانا سید محمد علی مونگیریؒ وغیرہ اشخاص پیدا کیے جنہوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیے، خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خان صاحبؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا وجود تو ردّ عیسایت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں۔ اور کون باور کر سکتا ہے کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ کے لیے ڈاکٹر وزیر خان جیسا آدمی پیدا ہوگا، جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود انہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھیرائے گا، اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا۔'' (دیباچہ حیات شبلی)

ان دونوں اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے نازک موقع پر علمائے اسلام نے مسلمانوں کو ان فتنوں سے بچانے کی پوری پوری کوشش کی، خصوصی طرح پر اس موقع پر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے تو عیسائیت کے مقابلہ میں اپنا تن، من اور دھن سب کچھ تج دیا۔ مولانا

Marfat.com

رحمت اللہ کیرانویؒ تو جلا وطن ہوئے، جائداد بحق سرکار انگریزی ضبط کروائی۔ لیکن عیسائیت کا مقابلہ اس سختی کے ساتھ کیا کہ آج تک عیسائی پادری ان کے دلائل و براہین سے منتشر زیر پر ہیں۔

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کا زمانہ جنگ آزادی کے قریب کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں انگریزی حکومت ہر وہ پالیسی اختیار کر رہی تھی یا کیے ہوئے تھی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس زمانہ میں انگریز اپنی بالادستی کے ساتھ ساتھ اپنا فکری اور تہذیبی اثر و رسوخ پیدا کرنے کے لیے بہت سے حربے استعمال کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک حربہ یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی اور دینی زبانوں کو ختم کر دیا جائے اور ان کی جگہ انگریزی زبان کو رواج دیا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر انگریزوں نے ملک میں بہت سے سکول اور کالج قائم کیے کیونکہ سیاسی دباؤ کو مستحکم کرنے کے ساتھ مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت میں اس سے بڑے فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔

کسی قوم کی زبان اس کے افکار، فلسفہ حیات اور تاریخی و ثقافتی اقدار کا آئینہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ اس کی روایات، نفسیات اور اجتماعی خصوصیات کا عکس اور نقش حیات دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کا تعلق اپنے ماضی اور علمی، فکری اور دینی سرمایہ سے منقطع کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو سکتی ہے کہ زبان کو یا صرف اس کے رسم الخط کو تبدیل کر دیا جائے۔ ماضی قریب میں آپ کو ایشیاء میں ایسی مثالیں مل جائیں گی جو اس دعویٰ کی صداقت کی شاہد عدل ہیں بلکہ ترکی کی بین مثال ہمارے سامنے ہے۔

فرانسیسی پادری A. Le Chatlier نے اپنی کتاب La Conqrute du Mond Musulman میں اس زمانہ کی مشنری سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس حکمت عملی سے مشنریاں اس وقت عالم اسلام میں سرگرم عمل تھیں۔ یہ کتاب فرانس سے شائع ہونے والے مجلہ Le Revue Du Monde Musulman کا ایک خاص نمبر ہے۔ یہ ایک مشنری پرچہ تھا اور اس کا مقصد اسلامی ممالک میں

Marfat.com

پروٹسٹنٹ مشنریز کی سرگرمیوں کو منظر عام پر لانے اور کیتھولک مشنریز کی غیرت کو بھڑکانے اور ان کے خوابیدہ عزائم کو بیدار کرنے کے لیے بچاس سال قبل یہ پرچہ نکلتا تھا۔ شاتلیہ نامی شخصیت اس وقت اس کا مدیر تھی۔ اس شمارہ میں شامل طویل مقدمہ اسی کے قلم سے ہے۔ مصر کے مسائد الیافی اور شیخ محب الدین الخطیب نے اس کا عربی ترجمہ کر کے اپنے مجلہ ''المؤید'' میں اس کو شائع کیا تھا جو بعد میں ۱۳۰۵ھ میں الغارۃ علی العالم الاسلامی کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آیا تھا۔ (محمد قطب: ھل نحن مسلمون ص ۱۴۵)

عیسائی مشنریز کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں اہم مشنری کانفرنسوں کی تجاویز اور قرار دادوں کی تفصیلات بھی درج ہیں جو ۱۹۰۲ء میں قاہرہ میں، ۱۹۱۰ء میں ایڈنبرا اور ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے شہر لکھنو میں منعقد کی گئی تھیں۔ یہ کتاب نہایت معلومات افزا ہے اور اس کو پڑھنے سے مشنریوں کی عجیب و غریب سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے مقدمہ میں شاتلیہ ایک جگہ پر لکھتا ہے کہ:

''اس بات میں ذرا برابر شک نہیں کہ صرف پروٹسٹنٹ اور کیتھولک مشنریز کی سرگرمیوں سے اگر ہم چاہیں کہ اہل اسلام کے دل اسلامی عقائد سے خالی ہو جائیں تو یہ بات محالات میں سے ہے۔ اس کی صرف ایک صورت یہ ہے کہ یورپی افکار پھیلائے جائیں۔ انگریزی، جرمن، ولندیزی اور فرانسیسی زبانوں کے پھیلانے سے اسلام یورپ کے پرچوں میں کسی طرح جگہ پا سکتا ہے۔ اور ایک مادی اسلام کے لیے راہ ہموار ہو گی۔ اسی طرح مشنریاں اسلامی دینی عقائد و افکار کو ناپید کرنے میں مصروف عمل رہیں گی، جن کی وجود و نمود کی بقا اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ دنیا میں کٹ کر ہی رہیں۔''

ایک اور موقع پر شاتیلہ لکھتا ہے:

''عیسائی مشنریوں کی جدوجہد کا پہلا ثمرہ یہ ہے کہ نوجوان مردوں اور عورتوں کی

Marfat.com

اگرچہ ایک تھوڑی سی تعداد عیسائی بن سکی ہے، لیکن دوسرا اہم ثمرہ اور نتیجہ یہ ہے کہ ہر طبقہ کے مسلمان بتدریج مسیحی افکار اخذ کرنے کے عادی بنتے جا رہے ہیں۔"

پھر اسی صفحہ پر شاتلیہ لکھتا ہے:

"عیسائی مشنریاں اگر یہ دیکھیں کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی جدوجہد کے نتائج سست ہیں تو اس سے ان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ اب ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں یورپ کے علوم وفنون اور آزادی نسواں کی طرف شدید میلان بڑھتا جا رہا ہے۔"[1] (الغارۃ علی العالم الاسلامی ص ۴۸)

یہ وہ مسیحی لائحہ عمل تھا جو عیسائی مشنریز نے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے تیار کیا تھا جس کا خلاصہ ہم نے یہاں شاتلیہ کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے شہر لکھنو میں مشنریوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ شاتلیہ نے اس کے زیر عنوان لکھا ہے کہ

"اسلامی حکومتوں کے زیر اقتدار رہنے والے مسلمانوں کی تعداد اب ۳۷۱۲۸۸۰۰ سے زیادہ نہیں ہے۔ خود مسلمانوں کی اکثریت کے ذریعہ ہی سیاسی اقتدار اسلامی خلافت سے منتقل ہو کر انگلینڈ، فرانس، روس اور ہالینڈ کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ مسلمانوں کی جو تعداد ان ممالک کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہی ہے وہ خلافت اسلامیہ کے تحت رہنے والے لوگوں سے زیادہ ہے۔ پھر مسلمانوں کی

---

[1] اسلامی اقدار اور شریعت اسلامیہ کے ارکان سے اپنے آپ کو بری قرار دینا اور ان پر عمل نہ کرنا بھی گویا عیسائیت کی طرف ایک میلان ہے اور مشنریز بھی یہی چاہتے تھے اور چاہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مسیحیت کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتا تو نہ ہو، اس کی احکام اسلام سے آزادی بھی ان کے مشن کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ مرے کالج سیالکوٹ کے پرنسپل مسٹر جان گیرٹ سے ایک مرتبہ ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کو یہاں اتنا عرصہ ہو گیا لیکن میرے علم کے مطابق آپ نے ابھی تک کسی مسلمان کو عیسائی نہیں بنایا؟ پادری جان گریٹ نے جواب دیا اگرچہ میں کسی مسلمان کو عیسائی نہیں بنا سکا لیکن جو مسلمان میرے زیر اثر تھے میں نے انہیں مسلمان بھی نہیں رہنے دیا اور اسلامی اقدار سے انہیں کوسوں دور کر دیا ہے۔

Marfat.com

جو تعداد مسیحی ممالک کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہی ہے وہ خلافت اسلامیہ کے تحت رہنے والے لوگوں سے زیادہ ہے۔ پھر مسلمانون کی جو تعداد مسیحی ممالک کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہی ہے اس میں مستقبل قریب میں آنے والے انقلابات سے ضرور اضافہ ہوگا۔ اس طرح اسلامی ممالک میں مشنری مہم سرگرم رکھنے کے سلسلہ میں عیسائی حکمرانوں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔"

(الغارۃ علی العالم الاسلامی ص ۹۴)

قاہرہ اور لکھنو میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں جو قرار دادیں اور تجاویز منظور کی گئی تھیں، ان کے سلسلہ میں شاتلیہ لکھتا ہے کہ

"ان تمام واقعات سے (یعنی عالم اسلام میں نشأۃ ثانیہ کے آثار سے) کلیسا کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ عزم صمیم اور ثابت قدمی کے ساتھ سرگرم عمل رہے اور مشنری معاملہ کا زیادہ اہتمام کرے۔ اس کی روشنی میں لکھنو کانفرنس کے پروگرام میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:

۱- حالات حاضرہ کا مطالعہ

۲- مشنری تعلیم اور تعلیم نسواں کے دائرہ کی توسیع

۳- ضروری حد تک طاقت کے استعمال کی تیاریاں اور اس کے معیار کو بلند کرنے کی تدابیر۔ (الغارۃ علی العالم الاسلامی ص ۸۸-۸۹)

یہ اختیارات اس بات کے اندازے کے لیے کافی ہیں کہ انگریزوں کی لسانی اور تعلیمی پالیسی کے پیچھے کون کون سے عوامل کارفرما تھے اور وہ اصلاً کس شی کے حصول کی کوشش کر رہے تھے۔ اصل میں انگریزوں کی یہ سب پالیسیاں عیسائیت کی دعوت کے لیے تھیں تا کہ جبر واکراہ سے لوگ دائرہ مسیحیت میں داخل ہو جائیں، لیکن وہ علمائے اسلام کی مزاحمتی کوششوں کی وجہ سے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور ہندوستان کو اندلس بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

......❀......

Marfat.com

جنگ آزادی کے بعد انگریزی پالیسیاں

جیسا کہ گذشتہ سطور میں بتایا گیا ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے قبل انگریزوں کی پالیسی اور تھی اور جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد اس سے مختلف تھی۔
چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے اظہار الحق کے پہلے صفحہ ہی پر لکھا ہے کہ:

''انگریزوں نے جب ہندوستان پر مکمل قبضہ کر لیا اور صحیح طریقہ سے امن و امان بحال ہو گیا تو اپنی حکومت کے آغاز سے ۳۴ سال تک ان کے علماء نے عیسائی مذہب کی دعوت کی طرف اس قدر دھیان نہ دیا، لیکن اس کے بعد انہوں نے بڑے زور شور سے دعوت کا کام شروع کیا۔ پھر اس کی درجہ بندی کی یہاں تک کہ بے شمار رسائل اور کتابیں مسلمانوں کے رد میں شائع کر کے مختلف شہروں کے عوام میں تقسیم کیں۔''

اہل اسلام کے رد میں رسائل اور کتابیں لکھ کر تقسیم کرنے کے علاوہ حکومت کی بنیادوں پر عیسائیت کے فروغ کے لیے جو کام کیا وہ زود اثر بھی تھا اور دیرپا بھی اور اس کے نتائج بھی بڑے دور رس تھے۔ عیسائیت کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کو دین اسلام سے دور رکھنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے وہ حسب ذیل تھے۔

۱- انگریزی زبان کی ترویج:

انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کیا اس وقت سرزمین پاک و ہند میں

اردو اور فارسی اسلامی زبانیں تھیں، جو علماء، مفکرین اور دانشور حضرات کا ذریعہ اظہار تھیں۔ اس زمانہ کے تمام علوم وفنون کی تدوین ان ہی دو زبانوں میں ہوئی تھی۔ عہد مغلیہ میں اور اس وقت بھی جب خاندان مغلیہ کی حکومت چراغ سحری کی طرح دم آخرین تھی، ملک کی سرکاری زبان ہونے کا شرف فارسی کو حاصل تھا، اور اردو اگرچہ اپنے ابتدائی ادوار میں تھی، لیکن عوام میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی تھی، شاید اسی وجہ سے حضرت شاہ رفیع الدینؒ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اردو زبان میں قرآن حکیم کا ترجمہ کیا تھا۔ پھر دین کے علوم کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بھی اس زبان میں تھا۔ اس عہد کے علماء اور مفکرین اسلام نے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے اور بغاوت کا سلسلہ جاری کرنے کے لیے ان ہی دو زبانوں کو تقریر وتحریر کا ذریعہ بنایا تھا۔

ان دونوں زبانوں کے علاوہ اس زمانہ میں ایک اور زبان کا بھی کافی چلن تھا اور وہ عربی زبان تھی۔ یہ زبان چونکہ قرآن و حدیث کی زبان ہے، لہٰذا غیر مسلم ہندوستانیوں کے درمیان اسلام کی اشاعت کے سلسلہ میں اس کا کردار معاون رہا۔ عیسائیت کی تبلیغ میں اس سے رکاوٹیں پیدا ہوئیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کو قرآن وحدیث سے الگ کر کے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے مسلمانوں کی بھی تھی جن کی تقریر وتحریر کا ذریعہ عربی زبان تھی۔

(انور الجندی: العالم الاسلامی والاستعمار ص ۳۵۹، ص ۳۶۳، ساداتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ جلد ا ص ۲۵، جلد ۲ ص ۲۲۴، ۲۲۵، ابوالحسن علی الندوی: المسلمون فی الہند ص ۲۶)

علماء اور اہل علم حضرات اردو اور فارسی کے علاوہ عربی زبان کو بھی اپنا ذریعۂ اظہار بناتے تھے۔ بڑے بڑے علماء نے بھی عربی زبان میں بڑی کارآمد کتابیں لکھیں جن سے نہ صرف اس زمانہ کے لوگ مستفید ہوئے بلکہ آج تک لوگ ان سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

کسی قوم کے افکار اور تہذیب وتمدن کی نشوونما میں اس کی زبان کو بڑا دخل

Marfat.com

ہوتا ہے۔ زبان ایک قوم کے جذبات اور افکار کا آئینہ ہوتی ہے۔ چنانچہ جن ماہرین تعلیم کو اندازہ تھا کہ مشرقی اقوام میں یورپی افکار اور تمدن کی اشاعت میں خود یورپی زبان بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہے انہوں نے انگریزوں کو مشورہ دیا کہ ان اسلامی زبانوں کو ختم کرنے کی مہم چلائی جائے اور انگریزی زبان کو اس کا قائم مقام بنا دیا جائے۔

انگریزوں نے اپنی حکومت کے خیر خواہوں اور ان ماہرین تعلیم کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے عملاً اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر سرکاری اداروں میں انگریزی کو لازمی زبان قرار دے دیا۔ تورات اور انجیل کے مخصوص اور منتخب حصوں کے پڑھنے کے لیے انگریزی زبان کا ناجائز استعمال کیا گیا اور اسلامی زبانوں کی تعلیم و تدریس کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ ان زبانوں کے سیکھنے سکھانے والوں کو ملازمت کے بہت سے مواقع سے محروم رکھا گیا کیونکہ وہ مشنری اسکولوں میں اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے قائل نہ تھے۔

گورنر جنرل ہند لارڈ ولیم بینٹنگ نے انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اپنے مشیر خاص مؤرخ ماکولی کے مشورہ پر یہ قانون بنایا کہ انگریزی زبان کی تعلیم و تدریس کا اعلیٰ انتظام کرنا حکومت کی اولین ذمہ داری ہے، چنانچہ انگریزوں نے ملک کے مختلف حصوں میں اس نہج پر چلنے والے اسکول اور کالج قائم کیے۔

(اتول ترجی: الہند الجدیدہ ص ۱۳۵، شاتلیہ: الغارۃ علی العالم الاسلامی ص ۸، نورالدین داؤد: محنۃ فی الفردوس ص ۱۸۸)

۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے ماہرِ تعلیم ہونے کے ناطے حکومت برطانیہ کو ایک ایسا نظام تعلیم مرتب کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو انگریزی حکومت کی مصلحتوں کو ملحوظ خاطر رکھے، اور اس بات پر بھی زور دیا کہ مشرقی زبانوں کے بجائے انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے۔ اس نے کہا کہ ہمیں ایسے لوگ چاہییے جو ہمارے اور ہماری رعیت کے مابین ترجمان کا کام دیں اور یہ لوگ ایسے ہونے چاہیں جو رنگ و خون کے لحاظ

Marfat.com

سے تو ہندوستانی ہوں لیکن ذوق ورائے اور زبان وفکر کے لحاظ سے انگریز ہوں۔
(الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ ص ۱۶۷ لابی الحسن علی الندویؒ)

انگریزوں کی اسلامی زبانوں سے دشمنی کا دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ ہندوستان کی قدیم زبانوں کے احیاء کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ ہندوؤں کی تاریخ اور تمدن سامنے آسکے اور ان کے اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ واریت کو ہوا دی جائے، چنانچہ انگریزوں نے کلکتہ میں ۱۸۰۰ء میں ''وان جیکرسٹ'' نامی ایک مستشرق کے زیراہتمام ''فورٹ ولیم کالج'' قائم کیا۔ اس کے علاوہ انگریزی، لاطینی اور سنسکرت کی تعلیم دینے کے لیے بہت سے کالج قائم کیے۔ اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا کہ زبان، ثقافت اور تہذیبی روایات کے تضاد کی بناپر مسلمان اور ہندو طلبہ کے مسائل بڑھ گئے۔

سنسکرت کو سکھوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ اعلان کیا تھا کہ ہندوؤں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اردو زبان کا مطلق سہارا نہ لیں کیونکہ یہ صرف مسلمانوں کی کتابوں کی زبان ہے، لیکن جہاں تک سنسکرت کا معاملہ ہے تو یہ ہندوستان کی مذہبی امہات کتب کی زبان ہے۔

(السید ابوالحسن علی الندوی: المسلمون فی الہند، ص ۱۱۲، انور الجندی: العالم الاسلامی والاستعمار ص ۳۶۳-۳۶۵، ساداتی: تاریخ المسلمین فی شبہ القارۃ الہندیہ جلد۲ ص ۳۲۵)

ماہرین تعلیم نے انگریزوں کو جو تعلیمی پالیسی اختیار کرنے کا مشورہ دیا، اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے، اس کو بھی ایک انگریز مونیہ ویلمس کی زبان سے سنیئے:

''وہ (مسلمان) اپنی زبان کو خیرباد کہتے ہوئے اپنی ادبیات، فلسفہ اور دین کو حقیر سمجھتے ہیں اور ہماری تربیت سے جو انحطاط ہوتا ہے اس کا آخر ہم سے بدلہ لیتے ہیں۔'' (میجر بالو: ہسٹری آف ایجوکیشن ص ۷۰، ابوالحسن علی الندویؒ: الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ ص ۷۵)

Marfat.com

گستاف لیبان نے مونیہ کے کلام پر یہ حاشیہ چڑھایا ہے کہ:

''اس پر مستزاد وہ زبردست فکری شکوک وشبہات تھے جو خالص مغربی تربیت کی بنا پر ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو گئے تھے، کیونکہ وہ تربیت اخلاق سے عاری ہوتے تھے۔ چنانچہ ان کے عادات واطوار میں ان پختہ دینی بنیادوں کا فقدان ہوتا جو ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہوئی تھیں۔''

(حضارۃ الہندص ۶۹۳)

نتائج تو ان مدارس وکلیات کے یہی نکلنے تھے جو نکلے اور آج تک نکل رہے ہیں کیونکہ ان کے قیام کی غرض وغایت ہی مسلمانان پاکستان وہندکو دین اور دینی اقدار سے دور لے جانا تھا تاکہ وہ اپنی دینی قومیت اور روحانی اور تاریخی ورثے کو یک قلم فراموش کر کے انگریزی حکومت اور اس کی تہذیب کی مضبوطی کا باعث بنیں۔ یہ مدارس اور کالج ہندوؤں کے فائدے کے لیے بھی نہ تھے کیونکہ ایک انگریزی ماہر تعلیم نے حکومت کو اس بارہ میں یہ مشورہ دیا تھا کہ

''ہندوؤں کی بھی اتنی ہی تعلیم وتربیت کی جائے جتنا وہ ہماری تجارت اور حکومت کے لیے مفید ہو سکیں۔''

(عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہندص ۳۹۸، مسعود عالم الندوی: الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند وتطوراتہاص ۳۰)

یہ درست ہے کہ انگریزی تعلیم نے نہ تو ہندو کو ہندو رہنے دیا اور نہ ہی مسلمان کو مسلمان، نہ سکھ کو سکھ اور نہ عیسائی کو عیسائی، لیکن اس سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا کیونکہ دیگر تمام مذاہب کا کوئی پس منظر نہیں تھا جب کہ اسلام کی روحانی اور تاریخی طاقت کا کوئی مدمقابل نہیں۔ یہ سارے مدارس وکلیات مسلمانوں کی قومیت کو نیست ونابود کرنے کے لیے کھولے گئے تھے تاکہ ان کے تاریخی اور روحانی ورثہ کو تباہ وبرباد کر کے انگریزی تہذیب وثقافت میں رنگ دیا جائے بلکہ مدغم کر دیا جائے، اور ان کے اجتماعی نظم کو

Marfat.com

غارت کر کے ان کی اجتماعی قوت کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ چنانچہ اس بات کا اعتراف ایک انگریز دانشور ماکولی نے اپنے باپ کے نام ایک خط میں یوں کیا ہے کہ

''اس تعلیم نے ہندوستان میں وہ اثر دکھایا ہے کہ انگریزی جاننے والا ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جو انگریزی جاننے کے بعد اپنے دین کی صداقت پر قائم رہا ہو۔'' (عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند ص ۴۰۱)

مسٹر ہابسن (Hobson) ایک انگریزی ماہر تعلیم نے ان الفاظ میں اس تعلیم کے اثرات کا اعتراف کیا ہے:

''ہم (انگریز قوم) ہندوستان میں ہندوستانیوں کی خیریت اور بہبودی کے لیے نہیں آئے بلکہ ہم نے یہاں مدارس وکلیات میں ایک ایسا نظام تعلیم رائج کر دیا ہے جس کا بتدریج یہ تقاضا ہے کہ وہ ان کی دینی اور اجتماعی زندگی کو خرافات کے طور پر ان کے سامنے پیش کرے اور انسانی حقوق کی پامالی کا باعث بنے۔'' (ھوبسون: الامیریالیہ ص ۳۰۶)

اس طرح اس مدارس وکلیات کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے مسلمانوں کے قلوب واذہان سے دینی اقدار کی عظمت کو نکال کر ان کو عیسائیت سے قریب تر کر دیا گیا

۲۔ مسلم اوقاف پر قبضہ:

مسلمان امراء اور حکام نے مدارس، مساجد اور دوسرے دینی احکام کے سرانجام دینے کے لیے بڑے بڑے اوقاف قائم کیے ہوئے تھے جن کی آمدنی سے یہ ادارے چلتے تھے۔ انگریزوں نے جونہی انگریزی نظام تعلیم کو رائج کیا اور اس کی ترویج کے لیے بڑے بڑے مدارس اور کالج قائم کیے۔ ان مدارس وکلیات کو چلانے کے لیے انگریزوں نے اوقاف پر قبضہ کر لیا، اور اس آمدنی پر بھی قبضہ کر لیا جو ان اوقاف سے حاصل ہوتی تھی، اور ان ذرائع آمدنی پر بھی قبضہ کر لیا جن سے مساجد اور مسلمان بچوں کی تعلیم کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ بعض مساجد کو گرجا گھروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان میں دہلی کی بھی ایک مسجد شامل تھی جس پر انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ

Marfat.com

آزادی کی ناکامی کے بعد قبضہ کرلیا تھا۔ وائسرائے ہند نے بعد میں دہلی کے لیے جب ایک خاص پادری کا تقرر کیا تو اس مسجد کو گرجا گھر میں تبدیل کردیا گیا۔

(مسعود عالم الندوی: المسلمون فی الہند ص ۴۵، جمال الدین افغانی: العروۃ الوثقیٰ ص ۴۱۳، عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند ص ۲۵، عبدالعزیز نوار: الشعوب الاسلامیہ ص ۵۵۶)

لارڈ ہیسٹنگز نے ۱۷۷۲ء مطابق ۱۱۸۵ھ میں مساجد کے اوقاف پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن یہ ناکام رہا۔ اس کے بعد لارڈ کارنوالس گورنر جنرل ہند نے ۱۷۹۳ء مطابق ۱۲۰۷ھ میں پھر اوقاف کو سرکاری تحویل میں لینے کی طرف توجہ کی لیکن اس کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر ۱۸۱۵ء مطابق ۱۲۲۹ھ میں انگریزی عدالت نے اپنے ایک انگریز جسٹس کو حکم دیا کہ مسلمانوں کے اوقات کو چھین لیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے انگریزی حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ سالانہ کا اضافہ متوقع تھا۔ بنگال کے صوبہ کے ٹیکس کی آمدنی کی ایک چوتھائی انگریزوں تک نہیں پہنچنے پاتی تھی کیونکہ مدارس اور مساجد کے اوقاف میں شامل اراضی ٹیکس سے مستثنیٰ تھی، اور اوقاف زیادہ تر بنگال ہی میں تھے۔

انگریزی زبان کی ترویج اس وقت تک نہیں ہوسکتی تھی جب تک دینی اور تعلیمی ادارے بند نہ ہوں اور ان کو بند کرنے کا نہایت موثر طریقہ صرف یہی تھا کہ جن اوقاف کی آمدنی پر وہ ادارے چل رہے ہیں، ان اوقاف پر قبضہ کرلیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اسلامی اوقاف پر قبضہ کرنے سے مسلمان اپنے بہت سے اداروں سے محروم ہوگئے۔ اوقاف کے چھن جانے کے بعد مساجد، بڑے بڑے تالاب، پارک اور دوسری کئی ایک چیزیں بالکل ویران ہوگئیں۔ مساجد یا تو گرجا گھروں میں تبدیل کر دی گئیں یا پھر انگریزی حکومت کے پارکوں اور چھاؤنیوں میں بدل دی گئیں۔ انگریزوں کو اس بات کا خود اعتراف ہے کہ انہوں نے مسلمانوں پر عیدین کی نماز ادا کرنے اور دیگر دینی رسوم پر پابندی عائد کر دی تھی۔ عیسائی مشنریوں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ جمعہ کو سرکاری

چھٹی کا دن منسوخ کر کے اتوار کو سرکاری چھٹی کا دن مقرر کیا جائے تاکہ کسی حال میں بھی سرکاری اداروں میں ملازمین کو اسلامی آداب اور روایات کے سامنے جھکنا نہ پڑے۔

(شاتلیہ: الغارۃ علی العالم الاسلامی ص ۴۷، محمود شاکر: پاکستان ص ۲۶)

ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب (The Indian Musalman) میں لکھا ہے:

''مسلمان ہم پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو دینی امور کے انجام دینے سے روکا ہے۔ ان کے نزدیک ہمارا یہ سب سے بڑا جرم ہے کہ ہم نے ان اوقاف کو چھین لیا جو مسلمان سربراہوں نے مساجد اور تعلیم کے لیے وقف کیے تھے، اور ہم نے اس کا دوسرا مصرف نکالا۔ عیدین اور نکاح وزواج کے قواعد وضوابط بدل ڈالے۔''

ہنٹر نے مزید لکھا ہے کہ

''ہم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ذلیل کیا اور ان کے قانون وراثت کو مسخ کر دیا۔ ان کے دینی شعائر کو مضحکہ بناتے تھے۔ ان کی مساجد کے اوقاف اور سارے صوبے ہمارے قبضہ میں آ گئے۔''

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مسلمانان ہند، ولیم ہنٹر ص ۲۰۸، عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند ص ۴۰۹ وغیرہ)

انگریزوں نے صرف مسلم اوقاف ہی پر قبضہ نہ کیا بلکہ جن علماء نے انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا، ان کی ذاتی جائدادوں کو بھی غصب کر لیا۔ جیسا کہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کے ساتھ کیا گیا۔ مولانا مرحوم نے جب زبان وقلم کے ساتھ ساتھ اپنی فوج کے ہمراہ تیغ وتفنگ سے بھی انگریزوں کے خلاف عملاً جہاد کیا اور بعض محاذوں میں انگریزوں کو شکست بھی دی تو تاریخ کے رپورٹر بتاتے ہیں کہ اس جرم کی پاداش میں انگریزوں نے حضرت مولانا کیرانویؒ کی تمام جائداد بحق سرکار ضبط کر لی اور بعد میں اپنے چند حاشیہ برداروں بلکہ غدارانِ قوم ووطن کے ہاتھ اونے پونے نیلام

کر دی، لیکن حضرت مولانا نے اپنی جائداد کے اس نیلام کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دی۔ اسی طرح اور کئی دوسرے علماء کے ساتھ بھی کیا گیا۔ ان کو تختہ دار پر چڑھایا گیا۔ بعض کو عبور دریائے شور (کالا پانی) کی سزا دی گئی، لیکن یہ حضرات اپنے موقف اور مشن سے ایک بالشت بھی ادھر ادھر نہ ہوئے ع

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

۳- علماء پر سختی:

ہندوستان میں مشنریوں نے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے جو یلغار کی اور ہر طریقے سے لوگوں کو انگریزی مذہب اور انگریزی تہذیب و تمدن میں رنگنے کی کوشش کی تو مشنریوں کی یلغار اور انگریزی سامراج سے ان کی ملی بھگت سے پیدا ہونے والے خطرات علماء کی نظروں سے مستور نہیں رہ سکتے تھے۔ علماء کی بصیرت اور ان کی دوررس نگاہوں نے فوراً اس فتنہ کو بھانپ لیا اور نہ صرف زبان و قلم سے بلکہ عملاً تیغ و تفنگ سے ان کے خلاف جہاد کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔ علماء اگرچہ بے سروسامان تھے، نہ قالین ان کے پاؤں تلے تھے اور نہ چتر شاہی سر پر تھا، لیکن درویش جب تاج شاہی سے ٹکراتا ہے تو قباؤں کے پیوند ہی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جنونِ شوق سے جب دیوانے بادہ پیمائی کو نکلتے ہیں تو باد سحرگاہی بادِ سموم سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے کہ ریت کے ذرات دیوانوں کی پیشوائی نہ کر سکیں، لیکن جن کے سامنے منزل ہوتی ہے وہ آبلہ پائی کے نشانوں پر سفر کرتے ہیں۔ زمانہ کی کوئی رکاوٹ ان کا راستہ نہیں روک سکتی اور نہ وقت کا کوئی فیصلہ ان سے متصادم ہوتا ہے۔ وہ راستہ کے ہر سنگ گراں سے بچتے اور کبھی اسے پائے استحقار سے ٹھکراتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ آبلہ پائی بھی انہیں سفر سے باز نہیں رکھ سکتی کیونکہ ان کی نگاہ نشان منزل پر ہوتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ ؎

پاؤں کے چھالوں سے کانٹوں کی بجھائی میں نے پیاس
جس طرف کو میں چلا گویا کہ مے خانہ چلا

Marfat.com

بجلیاں اس کو راستہ دکھاتی ہیں، آسمان کے فرشتوں کو اس کی مدد کے لیے بھیجا جاتا ہے اور ہر ظلم و تشدد کو وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔

انگریزوں کی اس پالیسی کے خلاف علماء نے بغیر کسی خوف و خطر کے فتویٰ دیا کہ انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کے دوستانہ مراسم، تعاون اور مشنری سکولوں میں مسلمان بچوں کو بھیجنا ناجائز اور حرام ہے۔ علماء نے مساجد کے منبر اور مدارس کے پلیٹ فارم سے خطاب کر کے مسلمانوں کو اس مسئلہ کی سنگینی سے آگاہ کیا اور سامراجیت کے ساتھ ساتھ عیسائیت کے ساتھ سخت مقابلہ کی دعوت دی۔ اس معاملہ میں انگریزوں سے ٹکر لینے میں پیش پیش وہی علاقے رہے جن میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی عقیدۂ جہاد کے سرچشمہ سے پھوٹنے والی قوت کا مقابلہ کرنے میں انگریزوں کو سخت مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی وجہ سے انگریزوں نے بعد میں مرزا غلام احمد قادیانی علیہ ماعلیہ سے دعویٰ نبوت کروا کر مسئلہ جہاد کو حرام کروانے کی پوری پوری کوشش کی۔ چنانچہ ولیم ہنٹر نے اعتراف کیا ہے کہ انگریزوں کا اولین اور سخت مقابلہ کرنے والے علاقوں میں سرفہرست ہندوستان کے شمالی اور مغربی حصے آتے ہیں کیونکہ ان ہی علاقوں میں علماء نے سب سے پہلے جہاد کے واجب ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ بنگال کے مسلمانوں کا اس کے بعد نمبر آتا ہے[1]۔

(عبدالعزیز نوار: الشعوب الاسلامیہ ص ۹ ن ۵، عبدالمنعم نمر: تاریخ الاسلام فی الہند ص ۴۴۸، ص ۴۴۲)

انگریزوں نے علماء کو بڑی آزمائشوں اور امتحانات میں ڈالا، لیکن علماء بھی بڑے سخت جان نکلے۔ بڑی سختیاں برداشت کیں۔ تختۂ دار پر کھینچے گئے۔ کالے پانی بھیجے گئے۔

---

[1] آج امریکہ بھی جہاد کے بارہ میں وہی کچھ کر رہا ہے، اور جہاد سے وہ بھی اتنا ہی خائف ہے جتنا جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر پاک و ہند میں انگریز تھے۔

Marfat.com

جیلوں کی کالی کوٹھڑیوں میں ظلم و تشدد کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو ان پر آزمایا نہ گیا۔ یہ سب کچھ برداشت کیا، کس کے لیے؟ صرف دین کے لیے، اسلام کے لیے۔ اپنا سارا جسم سختیوں سے داغدار کروا لیا لیکن اسلام کے پاکیزہ اور شفاف دامن کو داغدار نہ ہونے دیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے حکومت وقت سے فائدہ اٹھانے کی خاطر حقیقی اسلام کے دامن تک کو چھوڑ دیا۔ انگریزوں نے دیکھا کہ مساجد اور مدارس کے اوقاف چھین لینے اور انہیں برباد کر دینے کے بعد بھی علماء کی دعوتی جدوجہد، اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت، انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کو صف آرا کرنے کی دعوت اور نور قرآن سے مستنیر ہونے میں کچھ بھی فرق نہیں آیا تو انہوں نے علماء پر عرصہ حیات مزید تنگ کرنے کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ان کو بدنام کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے اختیار کیے گئے۔ خود علماء میں سے ایک گروہ ایسا پیدا کیا گیا جنہوں نے علماء ربانی پر کفر کے فتوے لگائے اور انہیں عوام میں بدنام کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے اختیار کیے گئے، ان کے وقار کو مجروح کیا ان کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کرنے کے لیے ان پر ''وہابی'' ہونے کے الفاظ استعمال کیے تاکہ ان کی عزت و ناموس کو عوام میں داغدار کر دیا جائے اور لوگ ان کی بات پر عمل نہ کریں اور ہمارے آقا انگریز کو اس سے گزند نہ پہنچے اور اس کی حکومت میں مضبوطی پیدا ہو۔

انگریزوں کی طرف سے علماء کو انگریزوں کی مخالفت سے باز رکھنے کے لیے دردناک سزائیں دی گئیں جن میں کسی قسم کے مقدمہ کی سماعت کے بغیر قید دائمی، جلاء وطنی اور پھانسی جیسی سزائیں بھی شامل تھیں۔ جب کسی عالم دین سے جواب طلب کرنا ہوتا تو عدالت میں اس کو حاضر کیا جاتا۔ کوئی افسر قرآن حکیم اور حدیث کی کوئی کتاب لاتا۔ جہاد کے بارہ میں آیات اور احادیث نکالی جاتیں۔ پھر وہ افسر اس عالم دین سے پوچھتا کہ ان آیات و احادیث کے بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اگر وہ عالم یہ جواب دیتا کہ یہ سب صحیح اور درست ہیں تو وہ افسر کہتا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے

خلاف جہاد کرنے کو ضروری اور واجب سمجھتے ہو۔ اس پر اس عالم دین کا موقف اگر یہ ہوتا کہ میں ایک گوشہ نشین انسان ہوں۔ ان آیات و احادیث کی صحت کا عقیدہ صرف اس لیے ہے کہ یہ قرآن و احادیث میں وارد ہوئی ہیں تو اس کو چار روز کی مہلت دی جاتی۔ اس دوران اگر وہ اپنا موقف بدل لیتا اور کسی اخبار میں اپنے موقف کی تبدیلی کا اعلان کر دیتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا، وگرنہ اسے تختہ دار پر چڑھا دیا جاتا، یا پھر دائمی جلا وطنی اس کا مقدر ہوتی۔ اس سے کم اس کے لیے اور کوئی سزا نہ ہوتی۔ اس طریقہ سے لنکا اور انڈیمان کے جزائر ایسے ہی بے گناہ ''مجرم'' علماء سے بھر گئے تھے۔ سی۔ یون نے اپنی کتاب (Muhammedanism in India) میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ایک انگریز مصنف ''بلنٹ'' نے لکھا ہے کہ

''شہرت پانے والے ہر مولوی پر حکومت کی سخت نگاہ ہوتی تھی۔ ہر طرح سے اس پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ اس پر بھی اگر وہ اپنے موقف پر قائم رہتا تو اسے جزائر انڈیمان میں جلاء وطن کر دیا جاتا تھا۔''

(مسعود عالم الندوی: تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۱۸۵، جمال الدین الافغانی: العروۃ الوثقیٰ ص ۳۲۲، ص ۴۱۳، سید ابوالحسن علی الندوی: ربانیۃ ولا رہبانیۃ ص ۱۲۱، نور الدین داؤد: محنۃ فی الفردوس ص ۱۸۸)

علماء کے شوق شہادت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ایک بار ایک انگریز جج نے علماء کی ایک جماعت کو پھانسی دینے کا فیصلہ سنایا تو وہ علماء شہادت کے تصور سے بے انتہا خوش ہوئے۔ انگریز جج کو یہ بات ہرگز پسند نہ تھی کہ اس کا کوئی فیصلہ ان کے لیے مسرور کن ہو۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر اپنا فیصلہ بدل دیا اور کہا:

''اے باغیو! پھانسی تم کو بہت عزیز ہے۔ اللہ کی راہ میں تم اس کو شہادت تصور کرتے ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ذریعہ تمہاری کوئی امید بر آئے یا ہم تمہارے لیے کسی خوشی اور مسرت کا باعث بنیں، لہٰذا ہم پھانسی کے حکم کو فوری طور

پر منسوخ کرتے ہیں اور تمہیں جزائر لنکا میں دائمی جلا وطنی کا فیصلہ سناتے ہیں۔"
(عبدالمنعم نمر: کفاح المسلمین فی تحریر الہند ص ۳۲-۳۴، تاریخ الاسلام فی الہند ص ۴۲۶، سید ابوالحسن علی الندوی: اذ ہبت ریح الایمان ص ۱۹۴، ص ۲۰۰)

اندازہ فرمائیں کہ علماء نے یہ ساری سختیاں صرف اپنی ذات کے لیے برداشت نہیں کی تھیں بلکہ لوگوں کے لیے برداشت کیں تا کہ ان کے ایمان محفوظ ہو جائیں، دین کے لیے برداشت کیں تا کہ دین کے دامن پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ اگر وہ لوگ بھی انگریزوں کی حکومت کو، ان کی تہذیب کو ان کے تمدن اور معاشرت کو یا دوسرے لفظوں میں مغربیت کے الحاد کو برداشت کر لیتے تو انگریز ان کے لیے ہر خوشی کے دروازے کھول دیتا، لیکن تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان لوگوں نے پھانسی کے پھندے کو خوشی سے چوما لیکن حق بات کہنے سے پیچھے نہ ہٹے اور ظالم انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات کی۔ اپنی جان کی پروانہ کی لیکن لوگوں کے ایمانوں کو محفوظ کر لیا۔

جو علماء تختۂ دار پر چڑھ گئے وہ تو ایک مرتبہ اذیت اٹھا کر اس عالم فانی سے عالم باقی کو انتقال کر گئے، لیکن جن لوگوں کو مختلف سزائیں ہوئیں، ان کو ہر روز ایک موت سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک نام مولانا فضل حق خیر آبادیؒ کا ہے۔ آپ ایک یکتائے روزگار عالم تھے۔ مولانا خیر آبادی نے اپنی تصنیف "الثورۃ الہندیہ" میں ہندوستان کے جیل خانوں، جزائر انڈیمان اور وہاں کے مصائب و تکالیف کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مولانا مرحوم کو خود بھی کالے پانی کی سزا ہوئی تھی۔ مولاناؒ کو یہ سزا کیوں دی گئی، مولانا خیر آبادیؒ فرماتے ہیں:

"ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے، اور ان کا شمار علماء اسلام میں ہوتا تھا۔" (الثورۃ الہندیہ ص ۴۱۷)

حضرت مولانا خیر آبادیؒ مزید فرماتے ہیں:

Marfat.com

''مکر و تلبیس سے جب نصاریٰ نے مجھے قید کرلیا تو ایک قید خانہ سے دوسرے قید خانہ اور ایک سخت زمین سے دوسری سخت زمین میں منتقل کرنا شروع کیا۔ مصیبت پر مصیبت اور غم پر غم پہنچایا۔ میرا جوتا اور لباس تک اتار کر موٹے اور سخت کپڑے پہنا دیے۔ نرم بستر چھین کر خراب، سخت اور تکلیف دہ بچھونا حوالہ کر دیا۔ گویا کانٹے بچھا دیئے گئے یا دہکتی ہوئی چنگاریاں ڈال دی گئی تھیں۔ میرے پاس لوٹا، پیالہ اور کوئی برتن تک نہیں چھوڑا۔ بخل سے ماش کی دال کھلائی اور گرم پانی پلایا۔ کوئی گرم جوش دوست تو کیا ملتا گرم جوش پانی دیا گیا۔ اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں ہر وقت اور ہر آن ذلت و توہین سے کام لیا گیا۔''

''پھر مجھے دریائے شور کے کنارے ایک ایسے پہاڑ پر پہنچا دیا گیا جس کی آب و ہوا ناموافق، جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا ہے۔ اس کی گھاٹیاں دشوار گذار، پیچ در پیچ جنہیں دریائے شور (جزیرہ انڈیمان) کی موجیں ڈھانپ لیتی ہیں۔ اس کی نسیم صبح بھی سموم سے زیادہ گرم، غذا حنظل سے زیادہ کڑوی اور زہر ہلاہل سے زیادہ مضر، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے زیادہ ضرر رساں۔ ہر کوٹھڑی پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں اور ان سے بدبو مہکتی رہتی تھی۔ امراض کی کثرت، بیماری عام، دوا ناپید اور مشکل، خارش اور قوبا (قوبا ایک مرض کا نام ہے جس میں بدن کی کھال چھلنے اور پھٹنے لگتی ہے) کا رواج عام۔ بیمار کے علاج، تندرست کے بقاء صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہیں۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک، بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام (دماغ کے پردوں کا ورم) ہلاکت کی علت تام ہے۔ اور کتنی ہی بیماریاں ایسی ہیں کہ طب کی کتابوں میں ان کا نام و نشان نہیں۔ ڈاکٹروں کی یہ حالت

Marfat.com

کہ مرض کچھ اور دوا کچھ اور۔ مرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کہ مردہ خاکروب کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اس کے کپڑے اتار کر ٹانگ پکڑ کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ غسل، نہ کفن، نہ دفن اور نہ نمازہ جنازہ۔ اگر میت کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا تو یہاں کی مصیبتوں کے مقابلہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی۔ اور اگر مذہبا خودکشی ممنوع نہ ہوتی تو قید و بند کی ان مصیبتوں سے نجات پالینا بہت آسان تھا۔"

"میں نہیں جانتا کہ ان مصیبتوں سے کس طرح چھٹکارا ہو سکے گا۔ خارش اور وبا میں مبتلا ہو جانا مصیبت بالائے مصیبت ہے۔ صبح و شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔"

(الثورۃ الہندیہ ص ۴۲۱-۴۲۲)

حضرت مولانا خیر آبادیؒ کو پہلے صفائی کے کام پر لگایا گیا تھا۔ برہنہ پا، صرف ایک لنگی اور کمبل کا کرتہ۔ کوڑا کرکٹ صاف کرتے اور ٹوکرے میں اکٹھا کر کے پھینک آتے۔ پھر کچھ دنوں بعد آپ کو محرری کے کام پر لگا دیا گیا، اور اس تبدیلی کا سبب آپ کا علمی تبحر ہوا۔ صورت یہ ہوئی کہ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علم ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی۔ سپرنٹنڈنٹ کے یہاں ایک مولوی صاحب کام کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے وہ کتاب مولوی صاحب کو دی کہ اس کی غلطیاں درست کر دیں۔ مولوی صاحب یہ کتاب مولانا خیر آبادیؒ کے پاس لے آئے۔ مولانا نے نہ صرف عبارتیں درست کیں بلکہ جگہ جگہ مضمون کی بھی تصحیح اور توضیح کر دی، اور کتابوں کے حوالے بھی اپنے یادداشت سے درج کر دیئے۔ سپرنٹنڈنٹ کو جب مولانا کے علم و فضل کا احساس ہوا تو اس نے صفائی کی خدمت سے ہٹا کر محرری پر لگا دیا اور حکومت سے رہائی کی سفارش بھی کر دی۔

علامہ فضل حق خیر آبادیؒ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بےخبر میر منشی

Marfat.com

لیفٹیننٹ گورنر کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ ادھر انڈیمان کے سپرنٹنڈنٹ جیل نے بھی سفارش کی تھی۔ نتیجہ میں کامیابی ہوئی یعنی رہائی کا حکم ہو گیا۔ لیکن عجیب وغریب اور نہایت تکلیف دہ اور دل خراش صورت یہ پیدا ہوئی کہ مولانا شمس الحق صاحب پروانہ رہائی حاصل کر کے بڑی مشکلوں سے انڈیمان پہنچے۔ جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا۔ اس کے ساتھ بڑا اژدہام تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۲۰ اگست ۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیر آبادیؒ کا انتقال ہو گیا۔ اب انہیں سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بھی بصد حسرت ویاس شریک دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (بحوالہ علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد ۴ ص ۴۵۲-۴۵۵)

یہ صرف ایک عالم دین کے مصائب کی مختصر داستان ہے وگرنہ ان جیسے سینکڑوں نہیں ہزاروں علمائے دین نے ہم لوگوں کے کل کو بچانے کے لیے اپنا آج برباد کر دیا۔ دین کے لیے ہنس کر مصائب کو گلے لگایا۔ تختۂ دار کو چوما اور دار ورسن کی مصیبتوں کو گلے لگایا تا کہ ہمارا ایمان محفوظ رہے لیکن آج ہم نے ان کے تمام مصائب کو گلدستۂ طاق نسیان بنا دیا ہے اور ہمیں ان کے نام تک یاد نہیں۔

ان کٹھن حالات میں علماء نے اسلامی علوم وفنون اور اسلامی سیاست و معاشرت کو بچانے کے لیے مختلف مدارس قائم کیے جب کہ انگریزوں کی پالیسیوں کے تحت پہلے قائم شدہ مدارس بھی بند ہو رہے تھے۔ انہی نو قائم شدہ مدارس میں سے ایک مدرسہ دارالعلوم دیوبند تھا جنہیں چھ بزرگوں نے چندہ اکٹھا کر کے قائم کیا۔ اور آج یہ دارالعلوم ایک یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا ہے اور چار دانگ عالم میں اس کا شہرہ ہے۔ یہ چھ بزرگ کون تھے؟ وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ والد مولانا شیخ الہندؒ — عمر ۴۵ سال

۲۔ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب والد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ — عمر ۳۵ سال

۳۔ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ — عمر ۳۳ سال

۴۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ — عمر ۳۴ سال

Marfat.com

۵- حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ : عمر ۳۲ سال

۶- حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ عمر ۳۰ سال

ان حضرات کی عمروں کو ملاحظہ فرمائیں اور پھر ان کے اس کام پر غور فرمائیں جو انہوں نے سرانجام دیا۔ یہ اکابر ستہ وہ تھے جن کے بارہ میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے لکھا ہے کہ

''بڑوں بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سروسامان و اسباب کار فراہم نہیں، لیکن وقت کا عازم و فاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سروسامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کرلوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے۔ اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے۔ وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھرلوں۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں۔ اس کی نظریں طاق کی بلندی نہیں ناپتیں، ہمیشہ ہاتھ کی رسائی اور قد کی بلندی دیکھتی رہتی ہیں۔'' (تذکرہ ص ۲۶۲)

Marfat.com

دعوتِ اسلام کے لیے انفرادی کوششیں

گذشتہ صفحات میں جملہ معترضہ کے طور پر ہم نے پرتگالیوں اور انگریزوں کے بارہ میں اجمالی طور پر کچھ بیان کیا کہ انہوں نے عیسائیت کی اشاعت وتبلیغ کے لیے کیا کیا حربے اختیار کیے۔ لوگوں پر کس کس طرح کے ظلم وستم روا رکھے اور کس طرح عیسائیت کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوششیں کی۔ اندلس میں ان لوگوں نے مسلمانوں پر کیا کیا ظلم وستم کیے ان کو ہم نے یہاں بیان نہیں کیا، لیکن لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے اتنا ظلم وستم اور جبر واستبداد کرنے کے باوجود بھی آج یورپ کے مستشرقین یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ بہرحال یہ ہمارا موضوع نہیں ہے وگرنہ اس پر بھی تفصیل سے بیان کیا جاتا کہ بقول ان کے اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو عیسائیت توپ اور بندوق کے زور سے پھیلی ہے۔ جس کی کچھ جھلکیاں ہم نے گذشتہ سطور میں بیان کر دی ہیں۔

گذشتہ کئی سالوں سے بہت سے مبلغین اسلام نے دین اسلام کی اشاعت کے لیے انفرادی طور پر بھی کوششیں کیں اور وہ ان میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ تیرھویں صدی کے اخیر میں ایک بزرگ حضرت بوعلی قلندرؒ جو عراق عجم کے رہنے والے تھے اور انہوں نے پانی پت میں سکونت اختیار کر لی تھی، انہوں نے اس شہر کے مسلمان راجپوت جن میں تین سو مرد ہیں اور ایک شخص امر سنگھ کی اولاد میں سے ہیں، اپنی ذاتی

Marfat.com

کوشش نے ان کو مسلمان کیا۔ ان کا مزار آج تک مرجع خاص و عام ہے۔

انیسویں صدی کے نصف ثانی میں دعوتی کوششوں میں ایک نئی جان پیدا ہوئی اور ہندوستان میں جتنے لوگ ہر سال مسلمان ہوتے ہیں ان کی تعداد دس ہزار، پچاس ہزار، ایک لاکھ بلکہ چھ لاکھ تک اندازہ کی گئی ہے، لیکن اس تعداد کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ یہ دعوتی کوششیں انفرادی نوعیت کی ہیں اور مسلمانوں کے ہاں کوئی مرکزی دعوتی تنظیم نہیں ہے۔ چنانچہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارسین دتاسی (Garcin de Tassy) نے لکھا ہے کہ پنجاب میں ایک شخص حاجی محمد نے دو لاکھ ہندوؤں کو مسلمان کیا تھا۔ اسی طرح بنگلور کے ایک مولوی صاحب نے پانچ برسوں میں ایک ہزار آدمیوں کو مسلمان کیا۔ اس طرح کے کئی اور مبلغ انفرادی طور پر دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف ہیں۔ چنانچہ مولوی بقا حسین خان نے چل پھر کر چند سالوں میں ۶۲۸ خاندانوں کو مسلمان کیا جن کا تعلق بمبئی، کانپور، اجمیر وغیرہ شہروں سے تھا۔ مولوی حسن علی جن کا انتقال ۱۸۹۶ء میں ہوا انہوں نے پچیس خاندانوں کو مسلمان کیا جن میں بارہ پونا کے تھے اور باقی حیدر آباد دکن کے۔ مولوی حسن علی ایک اسکول ٹیچر تھے انہوں نے پٹنہ میں اسلام پر کئی لیکچر دیئے۔ پھر کلکتہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے انگریزی میں ایک لیکچر دیا جس سے متعدد یورپی پادریوں نے اسلام کی حقانیت کو تسلیم کر لیا۔ ان کی کتابوں کو پڑھ کر کئی سو لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اسی طرح بمبئی پریزیڈنسی کے ضلع خاندیش میں نصیر آباد کے قاضی سید صفدر علی کی تبلیغ سے ایک بہت بڑی جماعت دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئی جس کا پیشہ آہن گری اور اسلحہ سازی تھا۔ اسی پیشے کے کچھ اور لوگ جن کی تعداد ضلع ناسک میں قریباً دو سو تھی، یہ بھی ایک درویش کی تلقین سے مسلمان ہو گئے۔ ان کے بارہ میں لکھا ہے کہ عیسائی مبلغ ایک مدت دراز سے ان کو عیسائی بنانے کی کوشش کر رہے تھے، یہ عیسائی مذہب کو قبول نہیں کر رہے تھے۔ اسی اثناء میں بمبئی سے ایک درویش آیا۔ اس نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا جس کو ان سب نے قبول کر لیا۔

Marfat.com

مولوی عبیداللہؒ:

اسی سلسلہ میں ایک اہم نام مولوی عبیداللہ کا بھی ہے۔مولوی صاحب پٹیالہ کے ایک بہت بڑے وددان برہمن تھے۔ انہوں نے پہلے خود اسلام قبول کیا۔ پھر یہ اسلام کے پرجوش مبلغ ہو گئے۔ ان کے تمام رشتہ دار ہندو تھے۔ وہ ان کی تبلیغ اسلام میں بڑی مزاحمت کرتے تھے، لیکن یہ ان کی تمام رکاوٹوں کو توڑتے ہوئے تبلیغ اسلام کے کام میں مگن رہے اور پٹیالہ کا ایک پورا محلہ ان کی تلقین سے مسلمان ہو گیا۔ پھر انہوں نے عیسائی اور ہندو مذہب کے رد میں چند کتابیں بھی مناظرانہ انداز میں لکھیں جن سے بڑا فائدہ ہوا اور ان کو پڑھ کر کئی لوگ مسلمان ہوئے۔ ایک کتاب میں انہوں نے اپنے مسلمان ہونے کا حال اس طرح لکھا ہے۔

''محمد عبیداللہ ولد کوٹے مل ساکن قصبہ پاٹل واقع ریاست پٹیالہ لکھتا ہے کہ یہ فقیر لڑکپن میں اور اپنے باپ کی زندگی میں بت پرستی میں گرفتار تھا کہ اتنے میں رحمت الٰہی نے میری دستگیری کی اور مجھے اسلام کی طرف کھینچا یعنی مجھ پر اسلام کی خوبیاں اور ہندو مذہب کی خامیاں منکشف ہوگئیں اور میں نے دل و جان سے اسلام قبول کیا اور اپنے آپ کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں شمار کیا۔ اس وقت عقل خداداد نے مجھ کو سمجھایا کہ اپنے باپ دادا کے رسوم کی آنکھیں بند کیے پیروی کرنا اور گمراہی کے جال میں پھنسے رہنا کمال حماقت اور غفلت ہے۔ دین و ایمان کے معاملات میں تحقیق نہ کرنا جس میں انسان کی سعادت اور شقاوت کا دارومدار ہے، سخت نادانی ہے۔ پس اس خیال سے میں نے مروجہ مذاہب کا مطالعہ شروع کیا اور بلا رو رعایت ہر ایک مذہب کی تحقیق کی۔ چنانچہ میں نے ہندومت کی خوب تحقیق و تدقیق کی اور وددان پنڈتوں سے گفتگو کی۔ اسی طرح میں نے عیسائی مذہب کی بھی پوری واقفیت حاصل کی۔ میں نے اسلامی کتابیں بھی پڑھیں اور

علمائے اسلام سے بات چیت کی۔ میں نے تمام مذاہب کو غلطی اور گمراہی پر پایا سوائے دین اسلام کے جس کی صداقت مجھ پر صاف طور پر واضح ہو گئی۔ اس کے بانی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے اخلاق حسنہ سے متصف ہیں کہ زبان ان کے بیان سے عاجز ہے، اور جو شخص اس دین کے عقائد اور عبادات اور اخلاق و معاملات کو معلوم کرتا ہے، وہی ان کی خوبی کو پورے طور پر جان سکتا ہے۔ سبحان اللہ! کیا سچا دین ہے جس کی ہر بات انسان کو راستہ دکھاتی ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مجھ پر حق اور ناحق کا امتیاز ایسی وضاحت سے منکشف ہو گیا جس طرح دن اور رات اور اندھیرے اور اجالے کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ ہر چند کہ میرا دل ایک مدت سے نور اسلام سے منور اور میرا ذہن کلمۂ شہادت سے معطر تھا لیکن نفس امارہ اور شیطان نے مجھے عیش و آرام اور دنیائے بے بنیاد کی آسودگی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا اور رسوم کفر کی ظاہری پابندی سے ایک مدت تک خراب حال رہا۔ آخر کار توفیق الٰہی نے مجھے یوں فہمائش کی کہ ''تو کب تک اس گوہر بے بہا کو پردۂ صدف میں پوشیدہ رکھے گا اور اس عطر راحت فزا کو حجاب کے صندوقچے میں بند رکھے گا۔ تجھے اس گوہر کو گلے کا ہار بنانا چاہیے اور عطر کی خوشبو سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔'' اس کے علاوہ علمائے دین کا بھی یہ فتویٰ ہے کہ ایمان بالاسلام کو چھپانا اور کفار کا لباس اور ان کی وضع قطع اختیار کرنا انسان کو جہنم میں پہنچاتا ہے۔ سوالحمدللہ کہ ۱۲۶۴ھ میں عیدالفطر کے دن اس فقیر کا آفتاب اسلام حجاب سحاب سے نکل کر جلوہ گر ہوا اور میں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ نماز عید باجماعت ادا کی۔'' (تحفۃ الہند، دہلی ص ۳)

یہی تحفۃ الہند کتاب تھی جس کو پڑھ کر برصغیر پاک وہند کے مشہور عالم دین حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ جو سیالکوٹ کے قصبہ چیانوالی کے رہنے والے تھے، سکھ

Marfat.com

مذہب کو چھوڑ کر مسلمان ہوئے تھے اور حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے والد بھی اسی کتاب کو پڑھنے کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ یہ بھی مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی طرح پہلے سکھ مذہب کے پیروکار تھے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب نہایت مفید ثابت ہوئی۔

ہندوستانیوں کے مسلمان ہونے کی ایک اہم وجہ:

اسلام ایک ایسا دین ہے جس نے ذات پات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ حجۃ الوداع میں دنیا کے سامنے انسانی حقوق کا وہ چارٹر پیش کیا کہ آج اقوام متحدہ اربوں ڈالر خرچ کرنے کے بعد بھی اس سے بہتر چارٹر پیش نہیں کر سکی۔ آپؐ نے فرمایا تھا:

> ''کسی عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی وجہ سے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اکرم اور باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے بھی اس پر عمل کر کے دکھایا اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولیٰ کر دیا۔ خود ہندوستان میں ایک خاندان غلاماں تھا جس کے ماتحت بڑے بڑے بادشاہ زادے اپنی زندگی نہایت خوش اسلوبی سے گزارتے تھے۔ سلطان قطب الدین ایبک اور سلطان شمس الدین التمش جن کا پورے ہندوستان میں طوطی بولتا تھا، اصل میں غلام ہی تھے۔ محمود غزنوی کا گورنر لاہور ایاز بھی غلام ہی تھا۔ اس کے برعکس ہندوؤں میں ذات پات کا بڑا مسئلہ تھا۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر یہ چار ذاتیں پوری ہندو سوسائٹی کو تقسیم کیے ہوئے تھیں۔ چنانچہ اعلیٰ ذاتوں کے ہندو ادنیٰ ذاتوں کے ہندوؤں کی تحقیر و تذلیل کرتے تھے اور ان کو ذلیل وخوار سمجھتے تھے۔ اگر کوئی نیچی ذات کا ہندو اپنی معاشرتی اور معاشی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا تو اعلیٰ ذات کے ہندو اس کے راستہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرتے۔ چنانچہ ایسے معاشرہ اور سماج میں اسلام کے معاشرتی نظام کے فوائد نمایاں نظر

آتے جس میں کسی شخص کو حقیر و ذلیل نہیں سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی اس کو برادری سے خارج کیا جاتا۔ بنگالی جلاہے جو سوتی کپڑا بنتے ہیں، ہندوان کو ناپاک سمجھ کر حقارت کی نگاہ سے دیکھتے۔ اس وجہ سے یہ جولاہے کثرت سے مسلمان ہو گئے جہاں ان کے معاشرتی حقوق دوسرے مسلمانوں کے ساتھ برابر تھے۔ نیچ ذات کے ہندوؤں کو مسلمان ہونے کے ساتھ ہی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ظلم وستم سے بھی نجات مل جاتی۔ چنانچہ اس کی ایک زندہ مثال انیسویں صدی کے اخیر میں ملتی ہے کہ نیچ ذات کے سنار چند سالوں سے معاشی طور پر خوش حال ہو گئے تھے اور ان میں سے اکثر نے نہایت اعلیٰ مکانات بنا لیے اور ان کا رہن سہن نہایت اچھا ہو گیا، لیکن ہندوان کو پھر بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے۔ ہندوؤں کے مندروں میں ان کا داخلہ بند تھا اور اعلیٰ ذات کے ہندو ان کو اپنے کنوؤں سے پانی تک بھرنے نہیں دیتے تھے۔ سنار ذات کے ہندوؤں نے یہ دعویٰ کیا کہ ہم بھی مندروں میں پوجا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ دوسرے ہندوؤں نے ان کے اس دعویٰ کی مزاحمت کی جس پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور اس ہنگامے بلکہ بلوے میں سنار قوم نے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ہاتھوں سخت نقصان اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب سنار قوم نے دیکھا کہ اسلام میں یہ ذات پات نہیں ہے تو انہوں نے اسلام قبول کر کے اسلام کے دامن میں پناہ لی۔ چنانچہ ایک گاؤں کے چھ سو سنار خاندان ایک ہی روز میں مسلمان ہو گئے۔ اور اس کے بعد دوسرے گاؤں کے سناروں نے بھی ان کی پیروی کر کے اسلام قبول کر لیا اور نہایت اعلیٰ طریق سے اپنی زندگی گزارنے لگے۔ اس طرح کی اور کئی مثالیں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی ملتی ہیں۔

ہندو جاتی میں اگر کوئی ہندو کسی وجہ سے ذات سے خارج ہو جاتا تو اس کے رشتہ دار اور وہ لوگ جن کے ساتھ اس کی نشست و برخاست ہوتی، اس سے یک قلم ملنا جلنا چھوڑ دیتے اور وہ پوری ہندو سوسائٹی میں تنہا رہ جاتا۔ ایسے شخص کو طبعی طور پر ایک ایسے مذہب کی طرف رغبت ہوتی جو اپنے معاشر میں بغیر کسی تفریق و امتیاز کے اس کو

Marfat.com

قبول کرتا اور اس کو اپنے سماج میں وہی درجہ دیتا جو اس کو اپنے پہلے سماج میں حاصل تھا۔ چنانچہ وہ دیکھتا کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے سماج میں یہ امتیاز اور تفریق نہیں ہے تو وہ فوری طور پر اسلام کو قبول کر لیتا۔

اسلامی کتابیں پڑھنے اور مسلمانوں کی صحبت میں بیٹھنے سے بھی اکثر اوقات ہندوؤں نے محسوس کیے بغیر اسلام کا اثر قبول کر لیا۔ انیسویں صدی میں راجپوتانہ اور بندھیل کھنڈ کے راجپوت حکمرانوں میں اسلام کی طرف اس قسم کا میلان پایا گیا۔ اگر مغلیہ سلطنت کو دوام حاصل ہوتا تو یہ راجپوت راجے بالآخر مسلمان ہو جاتے کیونکہ وہ نہ صرف مسلمان اولیائے کرام کا احترام کرتے تھے بلکہ اپنے لڑکوں کے لیے مسلمان معلّم اور تربیت دینے والے استاد مقرر کرتے تھے۔ وہ اپنے کھانے کے لیے جانوروں کو اسلامی طریقے سے ذبح کراتے تھے اور اسلامی تہواروں میں فقیروں کے بھیس میں شریک ہوتے تھے اور سچے مسلمانوں کی طرح دعائیں مانگتے تھے۔

اسلام چونکہ ذات پات کی تمیز اور طبقاتی منافرت کو روا نہیں رکھتا، اس لیے ہندوستان میں اسلام کو اس بات سے بھی قوت حاصل ہوئی ہے اور اسی کی بدولت بے شمار ہندوؤں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی ہے۔ بنگال کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے سر ولیم ہنٹر نے لکھا ہے کہ ان مفلس لوگوں کے لیے جن میں ماہی گیر، شکاری، سمندری ڈاکو اور نیچ ذات کے کاشتکار شامل تھے، اسلام ایک نعمت عظمیٰ تھی۔ اسلام حکمران قوم کا مذہب تھا اور اس کے پر جوش داعی اور مبلغ خدا کی توحید اور انسانی مساوات کا مژدہ جانفزا لے کر ایک ایسی قوم کے پاس پہنچے جس کو سب لوگ حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے اور جس کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اس نے فوری طور پر اسلام قبول کیا اور وہ اور اس کی اولاد ہمیشہ کے لیے مومن صادق بن گئی۔

اس طرح اسلام ہندوستان کے سب سے زیادہ شاداب اور سرسبز صوبے میں مضبوطی سے قائم ہو گیا جو ایک انتہائی گنجان اور روز افزوں آبادی کی پرورش کے قابل تھا۔

Marfat.com

اس مذہب میں لوگوں کے لیے کشش اور جاذبیت تھی اور اس کو بیشتر ماننے والے غریب اور نادار طبقہ کے لوگ تھے۔ اسلام نے ان کو خدا کی ذات کا ایک اعلیٰ تصور دیا۔ انسانی اخوت اور مساوات کے ایک اشرف تخیل سے آشنا کیا۔ بنگال میں نیچ ذاتوں کے لاکھوں آدمی صدیوں سے ہندو سماج کے رحم و کرم پر ذلت و خواری کے دن کاٹ رہے تھے۔ لیکن اسلام نے ان کے لیے ایک نئے معاشرے میں داخل ہونے کا راستہ کھول دیا۔

Marfat.com

اسلامی دعوت کا اختتام

علمائے اسلام نے لکھا کہ اسلامی دعوت مسلمانوں میں صدیوں سے ختم ہو چکی ہے۔ اب ہر عالم یا ہر دینی جماعت (الا ماشاء اللہ) اسلام کی دعوت نہیں دیتی بلکہ اپنے اقتدار کی دعوت دیتی ہے۔ اب سارا دعوتی معاملہ نعروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت سے جو قوم تیار کی تھی وہ نعرہ بازی والی قوم نہ تھی اور نہ ہی وہ جلسے جلوس نکالنے والی قوم تھی۔ آپ نے اپنے تئیس سالہ دعوتی دور میں ان میں وہ اخلاقی اقدار پیدا کی تھیں جن سے وہ دنیا میں ایک نرالی اور عجیب قوم بن گئی۔ چنانچہ مشہور مستشرق پروفیسر فلپ ہٹی (Philip Hitti) جو مذہباً یہودی اور وطناً امریکی ہے، نے لکھا ہے کہ عرب کے بیابانوں میں اسلامی دعوت سے جو قوم تیار ہوئی اس کی صفات مندرجہ ذیل تھیں:

> ''ہمت، مشکل کے وقت برداشت (مثبت) پڑوسی کے حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائیگی، مردانگی، فیاضی اور مہمان نوازی، عورتوں کی عزت وحرمت اور وعدہ کو وفا کرنا۔'' (ہسٹری اف دی عربز، فلپ ہٹی، ص ۲۵۳)

اسلامی دعوت سے تیار شدہ یہ قوم تمام قوموں میں سب سے بہتر تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس کے بارہ میں فرمایا: ''کنتم خیر امۃ اخرجت للناس'' لیکن پھر یہ امت اپنے اس مشن دعوت الی اللہ کو خیر باد کہہ بیٹھی حالانکہ اسی مشن کی وجہ

Marfat.com

سے یہ "خیر امت" کے لقب سے سرفراز ہوئی تھی اور یہی وہ عمل ہے جو دنیا میں اس کی حفاظت اور کامیابی کو یقینی بناتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک، وان لم تفعل فمابلغت رسالتک، واللہ یعصمک من الناس، ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین۔ (مائدہ:٦٧)

یعنی اے پیغمبر! آپ پر جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ سب پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ حق رسالت ادا نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھیں گے۔ یقین جانیے اللہ تعالیٰ کافروں کو کامیابی کی راہ نہیں دکھلائیں گے۔

اس آیت میں دو باتیں بیان کی گئیں:

پہلی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے علم کو لوگوں تک پہنچانا امت کا اصل کام ہے جو مطلوب خداوندی ہے۔

دوسری بات یہ کہ دعوت کا حکم دیتے ہوئے یہ کہنا کہ "واللہ یعصمک من الناس" یعنی اللہ تعالیٰ تم کو لوگوں سے بچائے گا، یہ واضح کرتا ہے کہ دعوتی عمل ہی میں مسلمانوں کے تمام مسائل کے حل کا راز چھپا ہوا ہے۔

آیت کے آخر میں جو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ منکروں (کافروں) کو کامیابی کی راہ نہیں دکھلائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوتی کام کے بعد تمہارے دعوتی عمل کے نتیجہ میں تمہارے معاندین کی راہیں مسدود ہوتی چلی جائیں گی اور وہ تمہارے خلاف اپنے عزائم کی تکمیل کے مواقع نہ پا سکیں گے۔

آپ کی زندگی کا عمل بھی یہ بتاتا ہے کہ آپ نے مختلف پیش آمدہ مسائل کو براہ راست نشانہ بنانے کے بجائے اپنی ساری توجہ اور اپنی ساری قوت دعوت کے کام پر لگا دی۔ اسی عمل سے اللہ تعالیٰ نے دوسرے تمام مسائل کے حل کی راہیں آپ پر کھول

دیں۔ معاہدہ حدیبیہ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس معاہدے کے اثرات اور نتائج بڑے خوش گوار ثابت ہوئے۔ بظاہر یہ معاہدہ دشمن کے سامنے جھک جانا تھا جیسا کہ صحابہ کرامؓ نے سمجھا اور اسی وجہ سے وہ شکستہ خاطر اور مغموم تھے، لیکن فراست نبوی جو کچھ سمجھ رہی تھی اور رسالت کی دور بین نگاہیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں وہ سوائے ابوبکر صدیق، مزاج شناس نبوت کے، اور کوئی نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس معاہدہ میں آپ نے کافروں کو ان کی منہ مانگی قیمت دے کر اپنے لیے دعوتی کام کی راہ کھول دی۔ مسئلہ جنگ کی سطح پر تھا آپ نے اس کا حل دعوت کی سطح پر تلاش کیا۔ آپ نے قریش کے تمام مطالبات تسلیم کر کے ان سے صرف ایک یقین دہانی لے لی اور وہ یہ کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان دس سال تک کوئی لڑائی نہ ہوگی۔ اب تک یہ تھا کہ مسلسل حالت جنگ کی وجہ سے دعوت وتبلیغ کا کام مکمل طور پر رکا ہوا تھا۔ جونہی آپ حدیبیہ سے واپس مدینہ لوٹے فوراً دعوت و تبلیغ کا کام عرب اور اطراف عرب میں نہایت تیزی سے شروع کر دیا۔ ابتدائی زمین پہلے ہی تیار ہو چکی تھی، اب صرف تخم ریزی کی ضرورت تھی۔ پر امن حالات نے جو موقع دیا اس میں دعوت کا کام نہایت تیزی سے پھیلنے لگا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ حلقہ اسلام میں آنے شروع ہو گئے۔ عرب قبائل ایک کے بعد ایک اسلام میں داخل ہونے لگے۔ عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں بھی اسلام کی دعوت پھیلائی جانے لگی۔ کفار مکہ کی طرف سے مامون ہو کر آپ نے مختلف ملکوں کے بادشاہوں اور سلاطین کو خطوط کے ذریعہ اسلام کی دعوت دی۔ چنانچہ حدیبیہ سے ڈیڑھ ہزار مسلمان واپس ہوئے تھے لیکن دو سال بعد یعنی ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر آپ دس ہزار مسلمانوں کی جمعیت کے ساتھ مکہ میں بغیر خون بہائے فاتحانہ طور پر داخل ہوئے۔

اسلام کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ جب بھی اہل ایمان کے لیے دوسروں سے عدم تحفظ کا خطرہ ہو یا مغلوبیت کا سوال پیدا ہو تو ان کو دعوت الی اللہ کے کام کی طرف دوڑنا چاہیے۔ اس کام میں لگنے سے اللہ تعالیٰ کا قانون ان کے حق میں متحرک ہوگا اور

Marfat.com

وہ غیر معمولی اسباب پیدا ہوں گے جو بالآخر ان کے لیے نجات اور کامیابی و کامرانی کا زینہ بن جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ممکن قیمت دے کر جنگ و جدال کا ماحول ختم کیا اور پرامن حالات میں دعوتی عمل جاری کیا اور اس کے نتیجہ میں دو سال کی قلیل مدت میں مسلمانوں کی تعداد چار گنا سے بھی زیادہ ہوگئی۔ اس پرامن ماحول میں دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ داخلی استحکام اور تیاری کا کام بڑے پیانے پر ہونے لگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صلح حدیبیہ کے صرف دو سال بعد یعنی ۸ھ میں اسلام اتنا طاقتور ہوگیا کہ قریش مکہ نے لڑے بھڑے بغیر ہتھیار ڈال دیئے۔ وہ مسلمانوں کا اتنی کثیر تعداد میں لشکر دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھے اور جس مکہ سے توہین آمیز پالیسی پر آپ کو راضی کرلیا گیا تھا اسی مکہ میں اس واپسی سے فاتحانہ داخلہ کا راستہ کھل گیا۔

ہوا یہ کہ اس معاہدہ کی وجہ سے فریقین کی آمدورفت شروع ہوگئی۔ خاندانی اور تجارتی تعلقات اور ربط کی وجہ سے مشرکین مدینہ طیبہ میں آتے اور کئی کئی روز تک قیام کرتے۔ مسلمانوں سے ملتے جلتے اور مسلمانوں کے اخلاق اور نیکوکاری اور پاکیزہ روش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے اور اس طریقہ سے ان کے دل اسلام کی طرف کھنچنے لگے۔ چنانچہ اس عرصہ میں کئی صنادید قریش اسلام میں داخل ہوئے جو اس سے قبل لڑائیوں سے داخل نہ ہوسکے تھے۔

اس سے قبل بھی جب آپ نے مکہ کی سرزمین پر اپنے پیغمبرانہ کام کا آغاز کیا تو مکہ کی سرزمین آپ کے لیے نہایت سنگلاخ ثابت ہوئی۔ مکہ میں رہتے ہوئے یثرب (مدینہ منورہ) میں نیا امکان صرف دعوتی جدوجہد کا نتیجہ تھا جو بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ میں آپ سے متاثر ہوئے اور پھر انہوں نے مدینہ طیبہ میں اس کو جاری رکھا اور اس کے ذریعہ سے مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پھیل گیا۔

ابن ہشام کے الفاظ ہیں:

حتی لم یبق دار من دور الانصار الا فیھا رجال ونساء مسلمون

Marfat.com

حتی کہ انصار کے گھروں میں سے کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں مرد اور عورتیں مسلمان نہ ہوں۔

اس طرح اس دعوتی جدوجہد کے نتیجہ میں انتہائی مشکل اور مایوس کن حالات میں مدینہ منورہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور مسلمانوں کو وہاں زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ یہ سب کچھ تلوار سے نہیں بلکہ ''دعوت'' سے ہوا۔

اسی طرح قبیلہ بنو ثقیف بھی دعوتی جدوجہد سے زیر ہوا اور اسی طرح قبیلہ بنو ہوازن کے قریباً چھ ہزار افراد بھی دعوت اور تالیف قلب سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ چنانچہ پروفیسر ہٹی کے یہ الفاظ صحیح طور پر اسلامی دعوت کی کامیابی کی عکاسی کرتے ہیں کہ

The Religion of the Muslims had corquered where their arms failed. (Hsitory of The Arabs. P.488)

یعنی مسلمانوں کے دین نے وہاں فتح پائی جہاں ان کے ہتھیار فیل ہو گئے۔

انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بھی اسلام مسلمان تاجروں کی دعوتی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ تاریخ کے اوراق سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں ملکوں میں کوئی بھی مسلمان فاتح نہیں گیا بلکہ عربی اور ہندی تاجروں نے ملایا کے تجارتی شہروں میں آباد ہو کر وہاں کے گھرانوں کو مسلمان کیا۔ سماٹرا کے لوگوں کے بارہ میں یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے دین اسلام کا علم ہندوستان سے حاصل کیا تھا۔ ہندوستان اور جزائر ملایا و سماٹرا کے درمیان تجارتی تعلقات کئی صدیوں سے چلے آ رہے تھے اور سماٹرا میں سب سے پہلے مسلمان مبلغ ہندی تاجر تھے۔ بعض تواریخ میں ہے کہ آنچہ کے علاقہ میں جو سماٹرا کے شمال مغرب میں واقعہ ہے، سب سے پہلے ایک عرب بزرگ عبداللہ عارف نے اسلام کی دعوت دی تھی جو بارھویں صدی کے وسط میں اس جزیرے میں وارد ہوا تھا۔ اس کا ایک مرید برہان الدین سماٹرا کے مغربی ساحل پر اسلام کا پیغام پریمان کے مقام تک لے گیا تھا۔ ملایا کی تاریخ میں لکھا ہے کہ سلطان علی مغیث شاہ جو آنچہ پر ۱۵۰۷ء سے ۱۵۲۲ء تک حکمران

Marfat.com

رہا، سب سے پہلا شخص ہے جس نے اسلام قبول کیا اور پھر اس کی رعایا نے اس کی پیروی کرتے ہوئے اسلام کو قبول کیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شریف مکہ نے اہل سماٹرا کو مسلمان کرنے کے لیے چند لوگوں کو وہاں بھیجا۔ اس جماعت کا سردار شیخ اسماعیل تھا۔ یہ لوگ مالا بار سے روانہ ہونے کے بعد جزیرہ سماٹرا کا سب سے پہلا شہر جس میں یہ لوگ وارد ہوئے، باسوری تھا۔ یہ شہر غالباً سماٹرا کے مغربی ساحل پر کسی قدر جنوب میں واقع تھا۔ وہاں کے باشندوں نے اس جماعت کے وعظ و نصیحت سے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ شمال کی سمت میں لمبری گئے۔ پھر وہاں سے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے دوسرے کئی شہروں میں وارد ہوئے اور ہر شہر میں اپنی دعوت سے لوگوں کو مسلمان کیا۔ وہاں سماٹرا کی ریاست کا حکمران ماراسیلو شیخ اسماعیل کی دعوت و تبلیغ سے مسلمان ہو گیا اور اس نے ''الملک الصالح'' کا نام اختیار کیا۔ ابن بطوطہ جب ۱۳۴۵ء میں سیاحت کرتا ہوا سماٹرا پہنچا تو اس وقت اس نے ''الملک الظاہر'' کو برسر حکومت پایا۔ یہ ''الملک الصالح'' کا بڑا لڑکا تھا۔ اس کے دربار میں مسلمان بادشاہوں کی تمام شان و شوکت پائی جاتی تھی اور اس کی سلطنت ساحل کے ساتھ ساتھ کئی دن کی مسافت پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک دیندار اور صحیح العقیدہ مسلمان تھا اور علماء اور فقہاء کے ساتھ مذاکرات کرنے کا بڑا ذوق و شوق رکھتا تھا۔

ساحل پر قدم جمانے کے ساتھ اسلام اب اندرون ملک بھی پھیل رہا تھا اور شیخ اسماعیل اور رفیقوں کی دعوتی کوششیں اس قدر بارآور ہوئیں کہ ایک چینی سیاح نے ۱۴۱۳ء میں سماٹرا کی سیاحت کی۔ لمبری کے بارہ میں اس نے لکھا ہے کہ اس میں ایک ہزار خاندان آباد تھے جو سب کے سب مسلمان تھے۔ مملکت آرد کا بادشاہ اور وہاں کے باشندے بھی مسلمان تھے۔ یہاں کے بت پرستوں نے اگرچہ اسلام کی بڑی مخالفت کی لیکن آخر کار ان تمام رکاوٹوں اور مزاحمتوں کے علی الرغم اسلام نے اندرون ملک اپنی جڑیں مضبوط کر لیں۔

اسی طرح ملایا میں بھی اسلام کو ان تاجروں نے رواج دیا تھا جو یہاں آ کر

آباد ہو گئے۔ ملاکا کی تواریخ میں ہے کہ اس مملکت کے لوگ سلطان محمد شاہ کے عہد میں مسلمان ہوئے تھے جو ۱۲۷۶ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس کی حکومت کو ابھی چند سال ہی گذرے تھے کہ جدّہ سے ایک جہاز ملاکا میں وارد ہوا جس کا کپتان سیدی عبدالعزیز تھا۔ اس نووارد نے بادشاہ کو اسلام کی دعوت دی اور اپنا نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر رکھنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ بادشاہ مسلمان بھی ہو گیا اور اس نے اپنا نام بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر رکھا اور اس میں لفظ شاہ کا اضافہ کر دیا۔

اسی طرح جاوا میں بھی اسلام وہاں کے تبلیغی مرکز کی کاوش اور جدوجہد سے پھیلا۔ اسی طرح جزائر مولکا وغیرہ میں بھی اسلام کی ترقی اور اشاعت کی ابتداء پندرھویں صدی عیسوی میں ہوئی اور وہ بھی تمام تر دعوتی جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ غرضیکہ مشرق بعید میں جس قدر بھی اسلام پھیلا وہ کسی فاتح کی جنگ جو پالیسی کا نتیجہ نہیں بلکہ مسلمان تاجروں اور مبلغوں کی دعوتی جدوجہد کا نتیجہ ہے اور آج انڈونیشیا اور ملائیشیا دو بڑی مسلم ریاستیں بین الاقوامی سیاست میں اثر انداز ہیں۔

لیکن مسلمانوں کا یہ ہتھیار (دعوتی جدوجہد) جتنا کامیاب تھا اتنا ہی مسلمانوں نے اسے گلدستہ طاق نسیان بنا دیا اور اتنی ہی اس سے غفلت برتی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوہ اور آپ کی اس سنت کو چھوڑ دیا اور اپنے مسائل کا حل دوسری چیزوں میں تلاش کرنے لگے۔ انہوں نے دعوتی ذہن کو ختم کر کے سیاسی ذہن بنا لیا اور دعوت الی اللہ کے نام سے دوسرے کام کرنے لگے۔ سیاسی تحریکیں چلانی شروع کر دیں بلکہ پورے اسلام ہی کو ایک تحریک اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تحریک کا لیڈر بنا دیا حالانکہ دین اور تحریک میں اور نبی اور لیڈر میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ ان خود ساختہ طریقوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور مسلمان دن بدن کمزور ہونے لگے۔ (نبی اور لیڈر کے درمیان فرق کے لیے ملاحظہ ہو احقر کی کتاب ''اسلام کا تصور نبوت'')

مسلمانوں نے جس شی کو دعوت الی اللہ یا دعوتی جدوجہد کا نام دیا، وہ اصل دعوت

Marfat.com

الی اللہ نہ تھی بلکہ دعوت الی السیاسۃ تھی، لہٰذا وہ نہ صرف دوسروں بلکہ خود اپنی حکومتوں کے ہاتھوں ہی بری طرح پٹے اور استعماری قوتیں ان پر چڑھ دوڑیں، مثال کے طور پر انگریزی استعمار کے خلاف سیاسی جدوجہد کی گئی اور نام اس کو جہاد اور دعوت الی اللہ کا دیا گیا، لیکن سیاسی جدوجہد کرنے کے باوجود بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور انگریزوں کی استعماریت میں روز بروز اضافہ ہوا۔ لیکن اگر انگریزوں کے درمیان تبلیغی اور دعوتی کام کیا جاتا تو عین ممکن تھا کہ پوری انگریز قوم تاتاریوں کی طرح حلقہ بگوش اسلام ہو جاتی۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس دعوت الی السیاسۃ کو ''اسلامی انقلاب'' کا نام دیا جاتا ہے حالانکہ اسلامی انقلاب ایک نفسیاتی انقلاب ہے اور نفسیاتی انقلاب کسی نفس ہی کے اندر وقوع میں آسکتا ہے اور نفس کا وجود صرف ایک فرد میں ہوتا ہے، کسی قوم یا بین الاقوامی ڈھانچہ یا کسی جماعت اور تحریک کا اپنا کوئی نفسیاتی وجود نہیں ہوتا۔ لہٰذا کسی قومی یا بین الاقوامی یا کسی جماعت کو اسلامی دعوت کا نشانہ بنانا ایک بے حاصل اور فضول کام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی انقلاب پہلے فرد انسانی میں آتا ہے اور پھر ہر فرد سے جماعت اور معاشرہ کی طرف سفر (Travel) کرتا ہے۔ اسی وجہ سے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کا مرکز فرد انسانی ہوتا۔ وہ پہلے اس میں نفسیاتی انقلاب یا اسلامی انقلاب برپا کرتے ہیں، پھر اس فرد سے وہ انقلاب ٹریول (Travel) کر کے معاشرہ اور اقتدار میں آتا ہے۔ یہی انبیاء کرام علیہم السلام کا اسلامی انقلاب برپا کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی جماعت یا گروہ کے قومی حالات یا جغرافیہ کے تمدنی احوال لوگوں میں ایک قسم کی ہل چل پیدا کرتے رہتے ہیں، اور اس کے بعد ان کے درمیان ایک تحریک (Movement) اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اس طرح اگر مسلمانوں کے اندر ان کے قومی یا سیاسی حالات کے نتیجہ میں کوئی تحریک اٹھ کھڑی ہو تو وہ اسلامی تحریک نہیں ہو جائے گی۔ اگر مسلمان اپنے قومی دشمن سے تصادم کو جہاد یا اپنی قومی تعمیر کو اسلامی نظام کی اصطلاحوں میں بیان کریں تو یہ اسلام نہیں بلکہ غیر اسلام کو

Marfat.com

اسلام کا نام دینا ہے۔ چنانچہ موجودہ دور میں اس قسم کی عظیم الشان پیمانہ پر اسلامی تحریکیں اٹھیں لیکن عملاً وہ اس طرح بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں جیسے حق تعالیٰ شانہ کے نزدیک ان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔

اسلامی دعوت کی تحریک جنت کی طرف بلانے کی تحریک ہے، لیکن لوگوں نے اپنے قومی اور جغرافیائی مسائل کو حل کرنے کی تحریکوں کا نام اسلامی تحریک رکھ لیا جو کہ سراسر ایک فریب اور اسلام سے جہالت ہے۔ دنیا میں سیاسی اور تمدنی انقلاب اسلامی دعوت کا براہ راست نشانہ نہیں تاہم وہ اس کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ کسی سماج اور معاشرہ میں جب معتد بہ تعداد ایسے افراد کی جمع ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے لیے جینا اور اللہ تعالیٰ کے لیے مرنا چاہتے ہوں تو قدرتی طور پر وقت کی سیاست اور اقتدار پر انہی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی ریاست یا اسلامی نظام نام ہے ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار آنے کا جو اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے آپ کو بے نفس کر چکے ہوں۔ اس کے برعکس اگر نعروں یا جلسوں کے زور پر کوئی انقلاب برپا کیا جائے تو وہ انقلاب نہیں ایک ہڑبونگ ہوگا، جہاں اسلام کے نعرے تو بہت ہوں گے لیکن اسلام کے عمل کا کہیں وجود نہیں ہوگا۔ ایسے لوگ حق کا نام لیں گے لیکن عملاً اپنے گروہ کے تقاضوں کے سوا اور کوئی شی ان کے سامنے نہ ہوگی۔ وہ اسلامی انقلاب کے ہنگامے برپا کریں گے لیکن ان کا مقصد اور مدعا یہ ہوگا کہ دوسروں کو اقتدار کی کرسی سے ہٹا کر خود اس پر قابض ہو جائیں۔ وہ انسانیت اور اخلاق کے نام پر جلسوں اور تقریروں کی دھوم مچائیں گے لیکن اس سے مقصود یہ ہوگا کہ ایک خوبصورت عنوان پر اپنی قیادت کی شان قائم کریں تاکہ اس قیادت کے بل بوتے پر وہ جلد از جلد اسمبلیوں کی کرسیوں اور پھر اقتدار کی کرسی پر براجمان ہوسکیں۔ اس دعوت کا نام خواہ وہ جو کچھ مرضی رکھ لیں، لیکن اسلام کی دعوت نہ ہوگی بلکہ اپنے اقتدار اور اپنی قیادت کی دعوت ہوگی۔ یہ دعوت دینے والا خواہ کوئی دراز ریش ہو یا جبہ پوش بزرگ ہو اور خواہ کوئی ڈاڑھی منڈھا یا تراشیدہ ڈاڑھی والا نوجوان ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (از افادات وحید الدین خان)

Marfat.com

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان علماء نے جب بھی دعوت الی اللہ کا فریضہ صحیح معنوں میں ادا کیا، اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت عطا فرمائی، اور داعیان کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریز کامیاب ہو گئے اور آزادی کی جنگ لڑنے والے ناکام ہوئے تو انگریزوں نے پکڑ دھکڑ شروع کی اور جن علماء نے جنگ آزدی کے لیے فتویٰ دیا تھا یا اس میں عملی طور پر حصہ لیا تھا، ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا تا کہ انہیں قرار واقعی سزا دی جا سکے۔ اس پکڑ دھکڑ میں بہت سے علماء روپوش ہو گئے اور ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد ہمالیہ کے دامن میں جنگلات میں پھیل گئی اور وہاں انہوں نے کھل کر نہیں بلکہ تعویذ اور دعا کے انداز پر دین کا کام شروع کر دیا۔ اس کے اثرات سے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہو گئی۔ چنانچہ آج آسام سے لے کر کشمیر کے پہاڑوں تک ہمالیہ کے دامن میں جو چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد ہیں، ان میں مسلمانوں کی جو آبادی ہے، وہ اس وقت کے علماء اسلام کی یادگار ہے۔ بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی اکثریت علماء کی اس دعوتی جدوجہد کا نتیجہ ہے جو جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد وہاں کے جنگلوں میں چھوٹی چھوٹی خانقاہیں بنا کر رہنے لگے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ بزرگوں نے وہاں دعوتی جدوجہد کا کام شروع کیا اور لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے ان کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔ چنانچہ ان داعیوں کے مزاروں کا لوگ آج تک احترام کرتے ہیں اور ہر سال ہزاروں کی تعداد میں ان پر حاضری دیتے ہیں۔ ان قدیم داعیوں میں شیخ جلال الدین تبریزیؒ بھی شامل ہیں جن کا انتقال ۱۲۴۴ء میں ہوا۔ وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے۔ انہوں نے بنگال میں اپنی ایک خانقاہ تعمیر کروائی۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے ایک ہندو گوالے کو ایک ہی نگاہ میں مسلمان کر دیا تھا۔

• اسی طرح کے ایک اور بزرگ جن کا نام بھی جلال الدین تھا۔ وہ وطن کے لحاظ سے ایرانی تھے انہوں نے سہلٹ کے مقام پر سکونت اختیار کی۔ ان کی دعوت و تبلیغ سے

Marfat.com

بھی ہزاروں لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ آج دارالعلوم دیو بند اور مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ کے اثرات جو تمام کرۂ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں، قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مناظر اسلام، فاتح عیسائیت حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی دینی جدوجہد کا نتیجہ ہیں اور ان مدارس سے سینکڑوں ایسے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ تمام عالم میں اسلام کی حقانیت کو واضح کر کے ہزاروں لوگوں کو اسلام کے حلقہ میں داخل کیا۔

امت مسلمہ اگر کسی تنظیم اور اصولوں کے تحت اس دعوتی جدوجہد کو جاری رکھتی تو تاریخ عالم میں کئی ایسے مواقع بھی آئے جب اس دعوتی قوت سے فائدہ اٹھا کر دنیا کے نقشہ کو بدلا جا سکتا تھا۔ مثال کے طور پر تیرھویں صدی عیسوی میں انگلستان کے لیے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مکمل طور پر ایک عیسائی مملکت سے مسلم ملک میں تبدیل ہو جاتا۔ چنانچہ ایک انگریز مصنف گیبریل رونے (Gabriel Ronay) نے اپنے ایک مضمون میں جو انگلستان کے اخبار سنڈے ٹائمز (Sunady Times) مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں چھپا تھا، بعض تاریخی دستاویزات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ

"تیرھویں صدی عیسوی میں ایک نازک لمحہ انگلستان کے لیے یہ امکان پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مکمل طور پر ایک مسلم ملک میں تبدیل ہو جائے۔"

اس نازک لمحہ کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ انگلستان کا بادشاہ جان لاک لینڈ (۱۱۶۷ء-۱۲۱۶ء) پاپائے روم اور کلیسا کے غلط اور ظالمانہ رویہ کی وجہ سے عیسائیت اور کلیسا سے بیزار ہو گیا، اور اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنی رعایا سمیت حلقہ بگوش اسلام ہو جائے گا اور بجائے کلیسا کی اطاعت قبول کرنے کے خلیفۃ المسلمین کی اطاعت قبول کرے گا۔ چنانچہ اس نے اس ارادہ کی تکمیل کے لیے ۱۲۱۲ء میں سلطنت موحدین کے امیر ناصر لدین اللہ کے پاس ایک خفیہ وفد بھیجا جو تین افراد پر مشتمل تھا اور اس سے بذریعہ خط درخواست کی کہ وہ کچھ مبلغین اور داعیین حضرات کو انگلستان بھیجیں جو لوگوں

Marfat.com

کو دین اسلام کے بنیادی عقائد کے بارہ میں روشناس کرائیں تا کہ ہم دائرہ اسلام میں داخل ہو کر کلیسا کے ظالمانہ رویہ سے نجات حاصل کر سکیں۔ وفد کے اراکینِ وفد طویل مسافت طے کر کے مراکش پہنچے اور امیر ناصر لدین اللہ سے ملاقات کی اور بادشاہ انگلستان کا خط پیش کیا اور اپنے بادشاہ کی خواہش سے امیر ناصر لدین اللہ کو آگاہ کیا۔ یہ کوئی معمولی پیغام نہیں تھا بلکہ ایک اہم اور عظیم پیغام تھا کیونکہ ایک پوری قوم اور پورے ملک کی تقدیر کا مسئلہ تھا بلکہ دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے مقدر تبدیل ہونے کا پیغام تھا جو حال اور مستقبل میں براعظم یورپ کے قلب میں مسلمانوں کی سلطنت کے قیام کا پیغام تھا کیونکہ بادشاہ سمیت پوری رعایا کا مسلمان ہو جانا اسلام اور مسلمان دونوں کی ایک عظیم فتح تھی، لیکن امیر ناصر لدین اللہ دعوت و تبلیغ کا مزاج نہ رکھتا تھا اور نہ ہی اس کے ہاں سلطنت میں کوئی دعوت و تبلیغ کا شعبہ تھا، لہٰذا وہ اس پیش کش میں دلچسپی نہ لے سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وفد ناکام اور بے نیل مرام واپس انگلستان چلا گیا۔ اس وفد نے جب امیر ناصر لدین اللہ کی اس اہم معاملہ کے بارہ میں عدم دلچسپی کا اظہار شاہ انگلستان سے کیا تو وہ بہت مغموم ہوا اور بہت رویا، اپنی حالت پر بھی اور مسلمانوں کے بے حسی اور دعوتی جدوجہد میں عدم دلچسپی پر بھی۔

انگلستان کے بادشاہ کی خواہش کے مطابق اگر اس وقت اس کو اور اس کی رعایا کو حلقہ بگوش اسلام کر لیا جاتا تو اس وقت یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کی یہ حالت نہ ہوتی بلکہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی تاریخ کچھ دوسری ہوتی، اور انگریزوں نے جو فتنے اس وقت مسلمانوں کے راستہ میں کھڑے کئے ہوئے ہیں جیسے اسرائیل کا فتنہ اور خلافت اسلامیہ کے اختتام کا فتنہ، مسلمان آج ان سے محفوظ و مصئون ہوتے اور اہل اسلام کی تعداد بھی موجودہ تعداد سے کہیں زیادہ ہوتی۔

موجودہ زمانہ میں امریکہ ایک سپر پاور (Super Power) ہے اور اس سپر پاور میں یہودی لابی پوری دنیا کے مسلمانوں کو تشتت و افتراق میں مبتلا رکھنے پر تلی کھڑی

Marfat.com

ہے۔لیکن اگر مسلمان امریکہ کو اپنی دعوتی جدوجہد کا مرکز بناتے جیسا کہ دوسرے مذاہب نے وہاں اپنی تبلیغ کے مراکز قائم کیے ہوئے ہیں، تو یقین جانیے آج امریکہ دینی اعتبار سے اس سے مختلف ہوتا۔ اگرچہ امریکہ میں مسلمانوں کا کام صفر کے برابر ہے لیکن اس کے باوجود خاموش مبلغین کی مساعی سے مسلمان اس وقت امریکہ کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں جاپان میں بھی اسلام کی شناخت کے غیر معمولی امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ جاپان کا بادشاہ میجی (Meiji) (۱۸۶۸ء تا ۱۹۱۲ء) جاپان میں عیسائیت کے داخلہ سے سخت پریشان تھا کیونکہ اس کے نزدیک عیسائیت مذہبی لباس میں مغرب کی استعماری طاقتوں کا ہراول دستہ تھی، اسے مسیحیت کو روکنے کی کوئی تدبیر نظر نہ آئی۔ آخر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے یہ تدبیر سوچی کہ جاپان میں اسلام کو پھیلایا جائے۔ وہ اسلام کو ایک بے ضرر چیز سمجھتا تھا جب کہ اس کے مقابلہ میں عیسائیت کا مطلب اس کے نزدیک استعمار کا دروازہ کھولنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ جاپان کے شہنشاہ نے ۱۸۹۱ء میں ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی (۱۸۴۲ء تا ۱۹۱۸ء) کے پاس ایک سرکاری وفد بھیجا۔ یہ وفد جاپان کے بادشاہ کا ایک خط لے کر سلطان عبدالحمید ثانی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ سلطان کچھ مبلغین جاپان بھیجیں جو اہل جاپان کو اسلامی تعلیمات سے آشنا کرائیں تاکہ عالم اسلام اور جاپان میں ایک معنوی اور روحانی رشتہ قائم ہو، لیکن امیر ناصرلدین اللہ کی طرح سلطان عبدالحمید ثانی بھی تبلیغی اور دعوتی جذبہ سے محروم تھا اور وہ علماء بھی اس جذبہ سے یکسر عاری تھے جو اس کے گرد و پیش جمع تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پیشکش شکریہ کے ساتھ واپس کر دی گئی اور کوئی مبلغ اور داعی جاپان نہ بھیجا گیا اور جاپان جیسا عظیم ملک ہماری دعوتی جدوجہد میں عدم دلچسپی کی وجہ سے اسلام کی دولت عظمیٰ سے محروم رہ گیا۔ اور جاپان میں اسلام کی اشاعت نہ ہو سکی۔

اگر ۱۸۹۱ء میں جاپان میں دعوتی عمل شروع کر دیا جاتا تو آج جاپان ایک مسلم ملک ہوتا اور اس کی ساری ترقی مسلمان قوم کے کھاتہ میں پڑتی اور دوسرے اسلامی

Marfat.com

ممالک بھی اس کی سائنسی اور صنعتی ترقی سے فائدہ اٹھاتے اور مسلمان قوم کی معاشی بدحالی کا کافی حد تک تدارک ہو جاتا۔

علامہ جمال الدین افغانی جو پان اسلام ازم کے داعی تھے اور نہایت جہاں دیدہ، تجربہ کار دانشور اور مبلغ اسلام تھے۔۱۸۸۴ء میں وہ پیرس میں مقیم تھے۔ایک روز انہوں نے اپنے شاگرد مفتی محمد عبدہ سے فرمایا کہ

''یورپ کے لوگ اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اگر اسلام کی دعوت اچھے طریقے سے ان کے سامنے پیش کی جائے، کیونکہ جب انہوں نے اسلام اور دوسرے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا تو انہوں نے دیکھا کہ عقیدہ کی سادگی اور عمل کی آسانی کے اعتبار سے دونوں میں بہت فرق ہے۔ اور مغربی اقوام میں قبول اسلام کے لحاظ سے سب سے زیادہ قریب امریکہ ہے (واقرب من اصل اروبا الیٰ قبول الاسلام الامریکا) کیونکہ ان کے اور اسلامی قوموں کے مابین اس طرح کی قدیم عداوتیں نہیں جو مسلمان اور یورپی قوموں میں ہیں۔'' (جمال الدین الافغانی تالیف محمود ابوریہ ص ۵۰)

علامہ جمال الدین افغانی کی یہ بات بالکل درست اور صحیح تھی جو معلوم نہیں کیسے ان کے منہ سے نکل گئی کیونکہ وہ فقیہ مصلحت بین تھے، رند بادہ خوار نہیں تھے۔شاگرد نے جب استاد کے منہ سے یہ بات سنی تو بھونچکا ہو کر پوچھا:

''حضرت! اگر معاملہ یہی ہے جو آپ نے فرمایا ہے تو پھر کیوں نہ ہم مختلف ممالک سے اپنی سیاسی محاذ آرائی چھوڑ کر امریکہ میں دعوتی جدوجہد اور تعلیم و تبلیغ کا کام شروع کر دیں؟''

علامہ افغانی ایک سیاسی شخصیت تھے، زمانے کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف و آشنا اور سرد و گرم چشیدہ انسان۔ ان کے سیاسی ذوق کو تبلیغی اور دعوتی کام نہایت ہلکا معلوم ہوا کیونکہ سیاسی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں بس یہی سب دین ہے۔

Marfat.com

حالانکہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔لہٰذا مفتی محمد عبدہ کے منہ سے یہ بات سن کر انہوں نے فرمایا:

''مفتی عبدہ! تم تو حوصلہ پست کرنے والی باتیں کرتے ہو۔''

تاریخ اسلام کے اوراق اس بات کی بین شہادت دیتے ہیں کہ علامہ جمال الدین افغانی نہایت غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی یہ صلاحیتیں سیاسی محاذ آرائی میں صرف کر دیں جس طرح کہ آج کل کے سیاسی لیڈر جو اسلامی تحریکوں کو لے کر اٹھے ہیں، صرف کر رہے ہیں۔ لیکن علامہ افغانی کی ان کوششوں کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اگر وہ ان صلاحیتوں کو دعوت و تبلیغ میں صرف کرتے تو وہ امریکہ میں زبردست دعوتی کام پھیلا سکتے تھے جس کے نتیجہ میں عجب نہیں کہ امریکہ آج ایک مسلم ملک بن چکا ہوتا کیونکہ وہ سائینٹفک معاشرہ ہونے کی وجہ سے اسلام کی دعوت و تبلیغ کا سب سے زیادہ پناہ گاہ ہوتا اور نہ وہ مسلمانوں کو نیو ورلڈ آرڈر کے تحت یہودیوں کا غلام بنانے کی کوشش کرتا اور نہ آج وہ اپنی استعماری قوت مسلمان ممالک پر ٹھونسنے کی کوشش کرتا اور نہ ہی وہ افغانستان کی اسلامی حکومت کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کارپٹ بمباری کرتا بلکہ آج مسلمان ایک امت وحدہ کی شکل میں تمام دنیا پر ''لیظھرہ علیٰ الدین کلہ'' کا نقشہ پیش کرتا اور صنعت و حرفت اور سائنس اور ٹیکنالوجی مسلمان ہو کر تمام غیر مسلم ممالک کی سرگرمیوں پر سایہ فگن ہوتی۔

یہ تھا مختصر تذکرہ اسلام کی اس دعوتی قوت کا جس کو مسلمانوں نے صدیوں سے خیر باد کہہ دیا ہوا ہے اور اب سوائے منبر و محراب کے اور کسی جگہ اسلام کی بات ہمارے علمائے کرام اور دانشوروں کے منہ سے نہیں نکلتی۔ بعض لوگ فریب نفس کے لیے یا دوسرے لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے اسلام کو میدان سیاست میں گھسیٹ لائے ہیں۔ چنانچہ اسلام کو میدان سیاست میں لانے والے علماء کے بارہ میں ایک بزرگ نے بڑے پتے کی بات کہی:

''ہمارے علمائے کرام نے سیکولرازم کی تردید کے جوش میں سیاست کو اسلام

Marfat.com

بنانے کے بجائے اسلام کو سیاسی بنا دیا۔ ان کا کہنا یوں تھا کہ سیاست کو دین سے الگ نہ ہونا چاہیے لیکن کہایوں کہ دین کو سیاست سے الگ نہیں ہونا چاہیے۔"

یہ تو پرانی باتیں ہیں۔ موجودہ زمانہ میں افریقہ میں عیسائیت اور اسلام کی کشمکش کافی عرصہ سے جاری ہے۔ عیسائی مشنریز اپنے پورے لاؤلشکر کے ساتھ افریقی باشندوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں علمائے اسلام اپنی بے سروسامانی کے باوجود دعوتی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۵ء تک جو لوگ عیسائی ہوئے ان کے مقابلہ میں مسلمان ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر خشونت سنگھ سابق ایڈیٹر السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا نے اپنے افریقی دورہ کی سرگزشت میں لکھا ہے:

"کینیا اور یوگنڈا کے آگے سفر میں میں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کی ان تبلیغی اور دعوتی کوششوں کا جائزہ لیا جو نیگرو قبائل کے درمیان جاری ہیں۔ عیسائیوں نے تسلیم کیا کہ مسلم عرب بردہ فروشوں کی ناخوشگوار یادوں کے باوجود افریقہ کے سیاہ فام باشندوں میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد عیسائی بننے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔"

Illustrated Weekly of India. July. 7 1974)

چند سال قبل عالمی ادارۂ مذاہب (World Religions Institiute) نے کچھ اعداد و شمار شائع کیے جن میں بتایا گیا کہ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۷۵ء تک پانچ سالوں میں یورپ اور امریکہ کے قریباً پانچ لاکھ لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے علاوہ دوسرے کئی ایک ملکوں میں کسی خاص تبلیغی کوشش کے بغیر جو لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں ان کی سالانہ تعداد دو لاکھ افراد سے زیادہ ہے۔ اور اگر بین الاقوامی سطح پر منظم ہو کر دعوتی کام کیا جائے تو چند برسوں میں غیر مسلم اقوام کی ایک بہت بڑی تعداد حلقہ بگوش اسلام ہو سکتی ہے۔

......❀......

Marfat.com

اسلام کی پھیلتی ہوئی روشنی

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ اسلام اپنی خوبیوں کی بدولت اس گئے گزرے زمانے میں بھی جب کہ ہم اس کی دعوت دینے سے نہایت غافل ہو گئے ہیں، الحمدللہ پوری دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے اور انشاء اللہ وہ وقت قریب ہے جب یہ ہر گھر میں خواہ وہ پکا ہو یا کچا ضرور داخل ہوگا۔ جیسا کہ اس کے بارہ میں حدیث میں بھی پیش گوئی کی گئی ہے۔ اب دنیا کے ہر کونے سے یہ خبریں آ رہی ہیں کہ اسلام کا نور اور روشنی پوری دنیا میں پھیل رہی ہے۔

جاپان میں قبولِ اسلام:

جاپان کے شہر ٹوکیو میں موجود اسلامک سینٹر اسلام کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ شاہ فہد بن عبدالعزیز اس مرکز کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ اس سال انہوں نے اسلامک سینٹر کی زیر نگرانی ایک اسلامی سکول کے قیام کے لیے قطعہ اراضی خرید کر دیا تاکہ مسلمانوں کے بچے اس سکول میں اسلامی تعلیم حاصل کریں اور جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا بھی خیال رکھا جائے۔ اسلامک سینٹر کی طرف سے ہر سال علماء، مفکرین، دانشور اور اسکالرز مختلف پروگراموں میں شرکت کر کے لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرتے ہیں۔ یہ پروگرام سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں منعقد کیے جاتے ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی کے اخبار العالم الاسلامی کی رپورٹ کے مطابق ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حادثہ کے بعد جاپان میں قبول اسلام میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ اسلامی معلومات

پر مشتمل کتابیں ختم ہو گئیں۔ جاپان میں مسلمانوں کی تعداد قریباً ایک لاکھ ہے جب کہ تین لاکھ مسلمان ایسے ہیں جو کہ دوسرے ممالک سے یہاں آئے ہیں۔ جاپان میں دعوت و تبلیغ کا کام مختلف دینی جماعتوں نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ اسلامک سینٹر جب سے ٹوکیو میں قائم ہوا ہے، ہزاروں لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں۔ مرکز کی طرف سے اب تک چالیس (۴۰) کتابیں جاپانی زبان میں چھاپ کر مفت تقسیم کی جا چکی ہیں۔ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر کئی نوجوان اسلامی تعلیمات کے حصول کے لیے مصری اور سعودی کالجوں میں بھی زیر تعلیم ہیں۔

کینیا میں قبولِ اسلام:

رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ سے شائع ہونے والے جریدے اخبار العالم الاسلامی کے مطابق کینیا کے قریب ''مرسابیت'' نامی علاقہ میں ۴۵۰ افراد نے حال ہی میں اپنے قبول اسلام کا اعلان کیا ہے۔ ''افریقی مسلمز سوسائٹی'' کے صدر دفتر سے ایک دعوتی قافلہ اس خطۂ ارضی کی طرف گیا اور قریباً ۱۸ دن وہاں مقیم رہا۔ اس دوران میں اس نے اسلامی موضوعات پر کئی تقاریر و محاضرات کا اہتمام کیا۔ ارکان اسلام بالخصوص نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی عملی مشق بھی کرائی۔ نومسلموں کے اس خطہ میں ۳۲ افراد نے دعوتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ایک دوسری اطلاع کے مطابق کینیا کے علاقہ ''غبرا'' میں قریباً ۳۲ افراد نے اپنے آپ کو دامن اسلام سے وابستہ کر لیا ہے۔

مڈغاسکر اور تنزانیہ میں قبولِ اسلام:

مڈغاسکر کے ''بونیہ رانتا'' نامی گاؤں کے ۱۵ افراد نے اپنے قبول اسلام کا اعلان کیا۔ اس میں تیرہ افراد مسجد المتقین کی اختتامی تقریب میں علی الاعلان کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے اور ایک بہت بڑی تعداد اسلام کے مطالعہ میں مصروف و مشغول ہے۔ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا انہوں نے قبول اسلام کے فوراً بعد اپنے اسلامی نام رکھ لیے، لیکن یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ ان میں سے اکثر کے نام پہلے ہی اسلامی

Marfat.com

تھے۔ ایک دوسری اطلاع کے مطابق ''ٹدغاسکر'' کے علاقہ ''مناکرا'' کے قریب ۹ افراد نے اپنے قبول اسلام کا اعلان کیا ہے۔ بعض نے ابھی صرف ارادے ظاہر کیے ہیں اور ان کا رجحان و میلان اسلام کی طرف بڑھتا نظر آ رہا ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی یہ لوگ بھی انشاء اللہ اسلام قبول کر لیں گے۔ اسی طرح تنزانیہ کے ''ماساوی'' قبیلہ کے ۶۰ افراد نے بھی اپنے قبول اسلام کا اعلان کیا ہے۔ ان کے قبول اسلام سے دیگر افراد پر بہت گہرے اثرات پڑے ہیں جو انشاء اللہ ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لائیں گے۔

تھائی لینڈ میں اسلامی بیداری اور قبولِ اسلام:

جنوبی تھائی لینڈ میں ''جالا'' میں واقع اسلامی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اسماعیل لطفی نے بتایا ہے کہ تھائی لینڈ میں بدھ مت کے ماننے والے خاصی تعداد میں حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں۔ گذشتہ چند سالوں میں پانچ ہزار سے زائد افراد نے اسلام قبول کیا ہے۔ دعوت و تبلیغ کے کام کو مزید فعال بنانے کی ضرورت ہے اور ایسے ماہر مبلغین اور داعیان اسلام کی توجہ اس خطہ کی طرف مبذول کرانا چاہیے جو اسلام کی صحیح تصویر عوام کے سامنے پیش کر سکیں۔ ڈاکٹر اسماعیل لطفی نے بتایا کہ ۱۹۹۸ء سے جب ملک میں اظہار خیال اور دین و مذہب سے متعلق آزادی حاصل ہوئی تو دعوت اسلامی کو ایک حد تک فروغ حاصل ہوا۔ اگر تھوڑی سی بھی مزید کوشش اور محنت کا سلسلہ جاری رہا تو جلد ہی انشاء اللہ پورے ملک میں اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا۔ تھائی لینڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے بتایا کہ یہ یونیورسٹی ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۷ء میں قائم ہوئی تھی اور اس سال انشاء اللہ اس کا پہلا گروپ سند فراغت حاصل کرے گا جو اس خطہ میں دعوت و تبلیغ کے کام کو آگے بڑھانے میں مدد و معاون ثابت ہوگا اور تھائی لینڈ میں اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے گا۔

جمہوریہ بنین میں قبولِ اسلام:

رابطہ عالم اسلامی کے شائع ہونے والے جریدہ ''اخبار العالم الاسلامی'' کی ایک

Marfat.com

رپورٹ کے مطابق گذشتہ چار مہینوں کے دوران میں "جمہوریہ بنین" کے سات ہزار سات سو چوبیس افراد نے اپنے قبول اسلام کا اعلان کیا ہے۔ "افریقی مسلمز سوسائٹی" کے ذریعہ اتنی بڑی تعداد نے اسلام میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ سوسائٹی نے اس سے پہلے ان خطوں میں کئی دعوتی وفود اور قافلے روانہ کیے۔ ان قافلوں نے کئی مہینوں تک وہاں کیمپ لگایا۔ رفتہ رفتہ تین ماہ کے اندر بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

"بورکینا فاسو" میں بھی اس سوسائٹی کے زیر اہتمام پانچ دن کے سفر پر ایک جماعت گئی۔ اس نے "زوندیگو" نامی علاقہ کو اپنی دعوتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ رپورٹ کے مطابق یہ وہ علاقہ ہے جہاں مسیحی مشنریوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا ہے لیکن اس ظلمت کدہ میں بھی قریباً ساٹھ افراد نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

برطانوی مفکر مارٹن لنجر کا قبولِ اسلام:

نومسلم مارٹن لنجر اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح عیسائیت کے ماننے والے تھے۔ پشتوں سے ان کا خاندان اسی مذہب پر قائم تھا۔ ان کی پرورش و پرداخت بھی اسی ماحول میں ہوئی۔ جب وہ انگلستان کی آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات میں زیر تعلیم تھے تو انہوں نے ادیان و مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ دوران مطالعہ جب مذہب اسلام کی تصویر ان کے سامنے آئی تو انہوں نے اسلام کو ایک ایسا نظام سیاست پایا جو عقل و دل اور شعور و جدان دونوں سے ہم آہنگ تھا۔ ان کا بیان ہے کہ "جب میں نے اسلام کا مطالعہ کیا تو اسلام کے صاف اور شفاف آئینہ میں مجھے میری تصویر جھلکتی ہوئی نظر آئی اور یہ احساس ہوا کہ میں اب حقیقی انسان ہوں۔ پہلے میری زندگی بہیمانہ طریقہ پر گزر رہی تھی۔ اسلام فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔" انہوں نے مزید بتایا کہ قدرت کا فیصلہ میرے حق میں یہ تھا کہ میں دامن اسلام سے وابستہ ہو جاؤں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اللہ کے فیصلہ میں کوئی رد و بدل کرنے والا نہیں۔ مارٹن لنجر نے الجزائر کے ایک عالم دین شیخ محمد علوی جو سوئٹزر لینڈ میں تدریسی خدمات

Marfat.com

انجام دے رہے تھے، کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ان کا مسلم نام ابوبکر سراج ہے۔ انہوں نے اپنے قبول اسلام کے محرکات و اسباب کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ میری شخصیت کی تشکیل اور مجھے اسلام کے قریب کرنے میں ایک نومسلم مصنف کی کتابوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کا نام شیخ عبدالواحد یحییٰ مصری ہے۔ ان کی کتابوں کو پڑھ کر میرے اندر ان سے ملنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں، میں نے مصر کا سفر کیا۔ وہ ایک بہت بڑے عالم دین اور شریعت حقہ پر عمل کرنے والے ہیں۔ زہد وتقویٰ ان کا شعار ہے، اور زہد سے دنیا و مافیہا سے عدم استفادہ مراد نہیں بلکہ دنیوی اسباب و وسائل کو ضرورتاً استعمال کرنا ہے، لیکن قلب کو ان کی آلائشوں سے پاک و صاف رکھنا ہے۔ مارٹن لنجر نے تھوڑی دیر خاموشی اختیار کی، اس کے بعد کہا کہ ''زہد کا یہ معنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث سے ماخوذ ہے جن میں آپ نے فرمایا کہ ''کن فی اللدنیا کانک غریب أو عابر سبیل'' دنیا میں ایک اجنبی شخص اور مسافر کی طرح زندگی گذارو اور ''انما انا واللدنیا کراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح و ترکھا'' میری اور دنیا کی مثال اس سوار کی سی ہے جس نے کسی سایہ دار درخت کے نیچے تھوڑی دیر آرام کیا پھر وہاں سے کوچ کر گیا۔ زہد کے یہی معنی میں نے شیخ عبدالواحد یحییٰ سے سنے ہیں۔ (تعمیر حیات لکھنو)

اسرائیل کے یہودی خاندان کا قبولِ اسلام:

اسرائیل کے ایک یہودی خاندان نے انٹرنیٹ پر چیٹنگ کے دوران میں ایک عرب عالم دین سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ اسرائیلی اخبار کے مطابق امریکہ میں چار سال قبل اسرائیل سے آنے والے یہودی بنیاد پرست اور شاس پارٹی کے رکن یوسف کوہین نے اپنے اہل خانہ سمیت ایک عرب عالم دین کے ساتھ انٹرنیٹ پر گفتگو کے بعد اسلام قبول کر لیا۔

انڈونیشیا میں قبول اسلام:

سعودی عرب کی دعوتی تنظیم ''اسلامک ریلیف آرگنائزیشن'' کے دعوتی کام کے نتیجے میں جزائر ملوکا میں انڈونیشیا کے پانچ ہزار عیسائیوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ انڈونیشیا

Marfat.com

کے ان جزائر میں اس تنظیم کے ایک سو پچاس مبلغین دعوتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

ڈنمارک میں قبولِ اسلام:

ڈینش ایجنسی (Danish Agency) کی ایک مطالعاتی رپورٹ کے مطابق ڈنمارک میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ رپورٹ کے مطابق کم از کم ایک باشندہ روزانہ اسلام قبول کرتا ہے۔ کوپن ہیگن یونیورسٹی کے ریکارڈ کے مطابق اسلامی مطالعہ میں داخلہ لینے والے طلبہ کی تعداد میں ساٹھ (۶۰) فیصد اضافہ ہوا۔

نیوزی لینڈ میں مسلمان رکن پارلیمنٹ:

۳۹ لاکھ آبادی کے ملک نیوزی لینڈ میں قریباً ۲۴ ہزار مسلمان آباد ہیں۔ ۱۱۷ رکنی نومنتخب اسمبلی میں ایک مسلمان بھی منتخب ہوا ہے جس نے ۲۶ اگست کو قرآن حکیم پر حلف اٹھایا۔ حلف کے لیے وہ اپنے گھر سے قرآن حکیم لایا کیونکہ سرکار کے پاس قرآن حکیم کی کوئی کاپی نہ تھی۔ منتخب رکن اسمبلی جناب اشرف چوہدری ایک سائنس دان ہیں اور ۵۳ سال قبل پاکستان کے صوبہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں وہ نیوزی لینڈ چلے گئے۔ پاکستان میں وہ ایک غریب کسان فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔

ہالینڈ میں اسلام کی روشنی:

ہالینڈ میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق ایمسٹرڈم میں تمام مذاہب میں اسلام سب سے زیادہ مقبول اور باعمل مذہب پایا گیا ہے۔ روزنامہ میٹرو (Daily Metro Dutch) کے مطابق عیسائیت اور یہودیت کا نمبر اسلام کے بعد ہے۔ روزنامہ میں شائع ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق شہر کی ۱۳ فیصد آبادی مسلمان ہے۔ ۱۰ فیصد سے کم کیتھولک، ۵ فیصد پروٹسٹنٹ اور ایک فیصد یہودی ہیں۔ دیگر مذاہب کے ماننے والے قریباً ۱۲ فیصد ہیں ۵۹ فیصد آبادی کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اخبار کے مطابق بیسویں صدی کے آغاز پر ہالینڈ میں مسلمانوں کی تعداد

Marfat.com

ناقابل ذکر تھی، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی عیسائیت میں دلچسپی کم ہوئی اور چرچ بند ہوتے گئے۔ بے مذہب افراد کی اسلام میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ ایمسٹرڈم کے علاوہ کئی دیگر شہروں میں بھی مسلمان سب سے بڑی مذہبی کمیونٹی ہیں۔ ہالینڈ میں پیدا ہونے والا ہر چوتھا بچہ مسلمان ہوتا ہے۔

بھارت میں قبولِ اسلام:

بھارت میں ذات پات کے باعث نیچ ذاتوں سے امتیازی سلوک اور ظلم عام ہے۔ اسی امتیازی سلوک اور ظلم کی وجہ سے نیچ ذات کے ہندو، ہندومت ترک کر کے دوسرے مذاہب کو قبول کرتے جا رہے ہیں۔ تھڈا کپور کا موہار سنگھ بھی گذشتہ ایک سال سے مسلسل امتیازی سلوک کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اس امتیازی سلوک سے تنگ آ کر اس نے اپنے ۹ اہل خانہ کے ہمراہ اسلام قبول کر لیا۔ علاقہ کے دیگر ۳۱ ہندوؤں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ جب سے ان افراد نے اسلام قبول کیا ہے، متشدد ہندو جماعت ویشو ہندو پریشد انہیں دوبارہ ہندو بنانے کے لیے ان پر ہر قسم کا دباؤ ڈال رہی ہے مگر جمال الدین (موہار سنگھ) نے ان کے دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے، جب ہر روز ہم پر ظلم ہو رہا تھا اس وقت ہندو لیڈر کہاں تھے؟ جب ہم ہندو تھے، ہمارے بارہ میں کسی نے سوچا تک نہ تھا، اب جب کہ ہم نے اسلام کا انتخاب کر لیا ہے تو یہ شور و غل کیوں؟" جمال الدین نے مزید کہا: کہ ہندو ہوتے ہوئے ہمیں ایک میل دور سے پانی لانا پڑتا تھا کیونکہ گاؤں کے کنویں سے پانی بھرنا ہمارے لیے ممنوع تھا۔ ہمارے پانی لینے سے ہندوؤں کا کنواں پلید ہو جاتا تھا جب کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہماری کئی مشکلات دور ہو گئی ہیں اور ہم خوش ہیں۔ وی۔ ایچ۔ پی اور بی۔ جے۔ پی نے ۳۰ دیہاتوں کے سرکردہ ہندوؤں کی پنچایت بلائی اور الٹی میٹم دیا کہ اگر دو دن کے اندر نو مسلموں نے فیصلہ نہ بدلا تو وہ گاؤں پر حملہ کر دیں گے۔ الٹی میٹم کا کیا بنا؟ اس کی تا حال کوئی خبر نہیں ملی۔

روانڈا میں اسلام کی تیز رفتاری:

شکاگو ٹریبون کے مطابق جمعہ کی اذان سے بہت پہلے روانڈا کے دارالحکومت

Marfat.com

کیگالی کے مضافات کے مسلمان شہر کی مساجد میں آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مسجدیں اور مسجدوں کے سامنے کی جگہیں بھر جاتی ہیں۔ روانڈا میں نوے (۹۰) فیصد ہوتو (Huto) نسل کے لوگ آباد ہیں جب کہ دس (۱۰) فیصد ٹتسی (Tutsi) جن کا قد کافی لمبا ہوتا ہے کئی صدیوں تک ٹتسی اکثریت پر غالب رہے۔ ۱۹۵۹ء میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ یکم جولائی ۱۹۶۲ء کو روانڈا آزاد ہو گیا۔ ۱۹۶۳ء میں جلاوطن ٹتسیوں نے ناکام حملہ کیا جس کے نتیجہ میں ٹتسی بڑی تعداد میں قتل ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں ٹتسی باغیوں اور حکومت میں امن معاہدہ ہوا جو اپریل ۱۹۹۴ء میں ٹوٹ گیا جس کے نتیجہ میں وسیع قتل عام ہوا۔ پانچ یا آٹھ لاکھ افراد مارے گئے اور بیس لاکھ سے زیادہ بے وطن اور بے گھر ہوئے۔ متاثرین میں زیادہ تعداد ٹتسیوں کی تھی۔

۱۹۸۲ء میں روانڈا کی آبادی قریباً ۵۵ لاکھ تھی جس میں عیسائی ۵۴ فیصد اور مسلمان ۷ فیصد تھے۔ مگر اس نسلی جنگ نے عیسائی عقائد کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس وقت روانڈا کی آبادی قریباً اسی (۸۰) لاکھ ہے اور اسلام معمول سے ہٹ کر ایک مقبول مذہب بن چکا ہے۔ بیس سالہ سلمہ انکبابر جس نے ۱۹۹۵ء میں اسلام قبول کیا تھا اور جس کے دو بھائی نسلی فسادات میں مارے گئے تھے، کا کہنا ہے کہ نسل کشی مہم میں جو کچھ ہم نے دیکھا اس نے ہمارے ذہنوں کو بدل دیا اور ہم نے مسلمانوں کو نہایت مہربان افراد کے طور پر پایا۔

دارالحکومت کیگالی کے پررونق بازاروں میں مسلمان خواتین سر پر سکارف اوڑھے جب کہ مرد لمبی قمیصیں (چوغے) اور سر پر منقش ٹوپی پہنے عام نظر آتے ہیں۔ مسجدوں اور سکولوں میں طلبہ و طالبات گنجائش سے زیادہ ہیں۔ آج روانڈا کے قریباً چودہ فیصد شہری اپنے آپ کو مسلمان شمار کرتے ہیں جب کہ نسل کشی سے پہلے یہ صرف سات فیصد تھے۔ ''ہم ہر جگہ ہیں'' یہ بات روانڈا مسلم کمیونٹی کے لیڈر شیخ صالح نے کہی۔ انہوں نے بتایا کہ قریباً تمام شہروں اور قصبوں میں مسجدیں موجود ہیں اگرچہ سوڈان، تنزانیہ، یوگنڈا اور کئی دیگر افریقی ممالک میں مسلمان بڑی اکثریت میں ہیں، مگر ۱۹۹۴ء کی نسل

کشی تک روانڈا میں اسلام مقبول نہ تھا۔ اپریل ۱۹۹۴ء سے جون ۱۹۹۴ء تک ہوٹو ملیشیا اور عوام نے لاکھوں ٹٹسیوں کو قتل کیا۔ چند ماہ کے دوران ۷۵ فیصد ٹٹسی ہلاک کر دیے گئے۔ زیادہ تر کو کدالوں، پھاوڑوں اور خنجروں سے قتل کیا گیا۔ اس دوران میں روانڈا کے مسلمانوں نے جو زندگی کی امید سے مایوس ہو چکے تھے، ہزاروں ٹٹسیوں کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیئے اور انہیں اپنے گھر میں چھپا لیا۔

یحییٰ کائیرنگا جو ایک ٹٹسی نوجوان ہے وہ نسل کشی ہوتے ہی اپنی ماں کو اپنے ساتھ لے کر کیگالی چلا گیا اور سنٹرل آف کیتا راما کے ایک مسلم گھرانے میں پناہ لے لی۔ اس کا باپ اور چچا جو پیچھے رہ گئے تھے، انہیں قتل کر دیا گیا۔ ''ہماری ان لوگوں نے مدد کی جنہیں ہم جانتے تک نہ تھے'' ایک ۲۷ سالہ نوجوان نے کہا: ''بدنام کیتھولک چرچ کی طرف واپسی بہت مشکل تھی، اس نے ۱۹۹۶ء میں اسلام قبول کر لیا۔'' اب یہ نوجوان منقش سنہری ٹوپی اور سفید لمبی قمیض پہنتا ہے۔ وہ روانڈا کی روایتی کیلا شراب بھی نہیں پیتا بلکہ مقامی مدرسہ میں قرآن اور عربی زبان پڑھ رہا ہے۔ وہ روزانہ صبح کی نماز میں شریک ہوتا ہے۔ شروع میں میں نے سوچا کہ اسلام تو ایک مشکل دین ہے، لیکن یہ خوف جلدی دور ہو گیا۔ بلاشبہ یہ شروع میں آسان نہیں ہے مگر آہستہ آہستہ اس کی عبادات اور تعلیمات معمولات زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔''

روانڈا کے مسلمان لیڈر ایک بڑی مشکل جدوجہد کر رہے ہیں کیونکہ ٹٹسی اور ہوٹو مسلمانوں کی تعداد برابر ہے۔ وہ رواداری اور معاف کر دینے کی اسلامی تعلیمات سے ان کی تربیت کر رہے ہیں۔ روانڈا میں صرف مساجد ہی نسل کشی سے محفوظ جگہیں ہیں۔ کائیرنگا کا کہنا ہے کہ ''اسلام میں ہوٹو اور ٹٹسی ایک ہی مقام رکھتے ہیں۔ اسلام ہمیں اخوت و بھائی چارے کی تعلیم دیتا ہے۔'' مسلم لیڈر شیخ صالح کہتے ہیں: ''اپنے جانی تحفظ اور عزت و ناموس کے لیے ٹٹسیوں کا بڑا حصہ اسلام قبول کر چکا ہے تو ہوٹو بھی اپنے گناہ گار ماضی سے جان چھڑانے کے لیے اسلام میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں پر خون محسوس کرتے ہیں

اور اپنے آپ کو پاک کرنے اور گناہ بخشوانے کے لیے اسلام قبول کر رہے ہیں۔

جنوبی کوریا میں قبولِ اسلام:

ورلڈ اسمبلی آف مسلم یوتھ (WAMY) کے دعوتی پروگراموں کے نتیجے میں جنوبی کوریا میں بائیس (۲۲) افراد نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ سیئول میں وامی کے نمائندے شیخ عبدالرحمٰن نے بتایا کہ نومسلموں میں اٹھارہ عورتیں ہیں۔ ان عورتوں میں ایک روسی اور ایک تائیوانی ہے۔ وہ مسلمانوں کے طرز زندگی اور حسن سلوک سے بہت متاثر ہوئیں۔

حجاب سے متاثر ہو کر ہندو خاتون کا قبولِ اسلام:

برطانیہ میں ایک ہندو خاتون نے پردے کے تصور سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرلیا ہے۔ اس کا نیا نام نور رکھا گیا ہے۔ لندن میں ثناء نیوز سے بات چیت کے دوران میں نور نے دین اسلام کی قبولیت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ جب وہ دین اسلام کی طرف سے عورتوں کو دیئے گئے حقوق سے واقف ہوئیں تو انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو عورتوں کو دیگر مذاہب کے مقابلہ میں سب سے زیادہ حقوق دیتا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے دین اسلام قبول کیا ہے۔

برطانوی خاتون صحافی کا قبولِ اسلام:

بی بی سی کے مطابق ''سنڈے ایکسپریس'' کے لیے کام کرنے والی برطانوی خاتون صحافی ''ریون ریڈلی'' نے قرآن پاک اور دیگر اسلامی کتب کے مطالعے کے بعد اسلام قبول کرلیا ہے۔ یاد رہے، طالبان دور حکومت میں قید رہنے والی ریڈلی نے رہائی کے بعد اپنی گرفتاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ طالبان نے اس کی رہائی اسلام قبول کرنے سے مشروط کر دی تھی تاہم انہوں نے طالبان کا مطالبہ یہ کہہ کر مسترد کر دیا تھا کہ وہ اسلام کے مطالعہ کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن پاک کے مطالعے کے بعد یہ تسلیم کیا ہے کہ نجات دینے والا مذہب اسلام ہے۔''

(بشکریہ نقیب ختم نبوت نومبر ۲۰۰۲ء)

Marfat.com

یورپ اور اسلام:

امریکہ اور یورپ میں اگرچہ اسلام روز بروز ترقی کر رہا ہے لیکن امریکہ اور یورپ کے عیسائی بھی بیکار نہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اسلام کے خلاف دلوں میں نفرت پیدا کرنے اور عیسائیت کی تبلیغ میں پیش پیش ہیں۔ مشہور دشمن اسلام پادری ودیمر نے ۱۹۱۰ء میں امریکہ سے ایک رسالہ جاری کیا جو قریباً سو سال سے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کے خلاف نفرت کی تخم ریزی کر رہا ہے۔ اس رسالہ میں اسلام پر، اسلام کے حق میں، اسلام کی تفہیم میں اور عیسائیت کی فضیلت اور برتری میں مقالات شائع ہو رہے ہیں۔

The Muslim World

(A Quarterly Journal of Islamic Study and of Christian interpretatiog among Muslims)

گویا کہ اسلامک اسٹڈیز پر رسالہ ہے اور یہ کہ عیسائی اسلام کو کیسا سمجھانا چاہتے ہیں۔ اس رسالہ کا مواد سب کا سب بظاہر اسلام کے حق میں لیکن حقیقت میں اسلام کے خلاف ہوتا ہے۔ اس رسالہ کی ساری کوششیں اس بات پر مرکوز ہیں کہ کس طریقہ سے لوگوں کو اسلام سے دور ہٹایا جائے۔

یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں جہاں کہیں "اسلامک اسٹڈیز" کی کرسی قائم کی جاتی ہے تو اس کا پس منظر بھی یہی ہوتا ہے جو اس رسالہ نے پیدا کر رکھا ہے۔ ہر یونیورسٹی میں انہیں تراجم و تشریحات کو مدار علیہ بنایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جتنی بھی یورپی مستشرقین کی کتابیں دستیاب ہیں وہ اسی کے مضمون نگاروں کی ہیں۔ ان لوگوں کو اسلام پر تحقیقاتی مقالات لکھنے کا لے دے کر اگر کوئی فائدہ ہوسکتا ہے تو یہی کہ اسلام کو بگاڑ کر ایسا کر دیا جائے کہ کسی وقت بھی کوئی مسیحی اسلام قبول کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھے، یا فرنگیت مآب، مغرب زدہ اور مسیحیت زدہ مسلمان زیادہ دیر تک اسلام میں مارک ٹائم نہ کرتے رہیں، اور جلد اسلام کو چھوڑ کر مسیحیت کو قبول کر لیں۔

مسیحیت کے علاوہ مغربیت کا فتنہ ہے جو ہزاروں "بے دینی اثرات" اپنے دامن

Marfat.com

میں لیے ہوئے ہے۔ ہمارا مغرب زدہ اور فرنگیت مآب طبقہ جس کے نظریات و افکار یورپ کی بے تابی، برق تابی اور سیماب وشی کی نظر ہو چکے ہیں، مذہب کو ماضی کے ایک قصہ پارنیہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔ مغرب جس نے بہیمیت کی تمام صفات کو انسان کی فطرت اور اس کا خاصہ ثابت کر دکھایا ہے، انہوں نے ہمارے نوجوانوں کے اندر ضمیر کا وہ کانٹا نکال دیا ہے جو معصیت کے ارتکاب پر خلش پیدا کرتا ہے اور ہر گناہ کے لیے ان کا دل اس طرح کھول دیتا ہے جیسے وہ کوئی ثواب اور نیکی کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔

مغرب نے تہذیب و تمدن کا کچھ ایسا نقشہ بنا دیا ہے جس کے ایک ایک نشان سے عیاشی اور صنفی خواہشات ٹپکتی ہیں تاکہ اگر کوئی دیکھے تو مناظر عیش و عشرت کو دیکھے، اس کے کان آشنا ہوں تو نغمات طرب و کیف سے اور فکر و دماغ کی قوتیں صرف ہوں تو تکمیل خواہشات کی راہ میں۔ عورت اور مرد کا آزادانہ اختلاط، فحش لٹریچر، اخلاق فروش تعلیمات، عریاں تصاویر، نشہ آور مشروبات، گندے سینما، شہوت انگیز گانے، شہوانی مہک کے عطر اور صابن غرضیکہ شہوانیت اور جنسی خواہش کو بھڑکانے والا وہ کون سا ذریعہ ہے جسے ہماری قوم کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے مغرب کی نقالی میں اختیار نہ کیا ہو۔

شراب خوری، جوابازی، جنسی جرائم، زنا بالجبر، اغوا، قتل وغیرہ مغرب کی برکت سے اس قدر زوروں پر ہیں کہ اب ان کو کوئی جرم ہی تصور نہیں کیا جا رہا اور مغربی تہذیب کی گود میں پلا ہوا انسان حیوانوں کی طرح مذہبی حدود و قیود کو توڑ کر اس کا مرتکب ہو رہا ہے۔ یہ طبقہ مذہب سے یک قلم بیگانہ اور الحاد اور بے دینی کے گہرے غاروں کے کناروں پر کھڑا ہے۔ اس کے دل میں اسلام کی بات اتارنے اور اس کی ذہنی پیاس بجھانے اور اس کے قلب و نظر کو مطمئن کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ نسل جدید کے دماغوں کی تسکین، عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل اور اسلام کی طرف سے غیر مطمئن، متشکک اور متذبذب ذہنوں کے اطمینان کے ساتھ ساتھ اسلام پر جارحانہ حملے کرنے والے "ازموں" اور گمراہ فرقوں

کے اعتراضات کے جوابات دینے کی بھی اشد ضرورت ہے۔

دنیا اتنی ترقی کرنے کے باوجود آج بھی اسلام کے آب حیات کی پیاسی ہے۔ آدمی آدمی کا دشمن ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کو نگل جانا چاہتی ہے۔ نفس پرستی اور مردم پرستی نے خدا پرستی کی جگہ لے لی ہے۔ ہر قسم کے جرائم اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ سائنس سے بجائے تعمیری کام لینے کے تخریبی کام لیا جا رہا ہے۔ کمزور پر ظلم و ستم کرنا طاقتور کا محبوب مشغلہ ہے اور ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کا اصول دنیا کے کونے کونے میں عام ہو چکا ہے۔ اور دنیا والوں کی نظریں اب اسلام کے داعیوں کی طرف اٹھی ہوئی ہیں، اور ظلم و تشدد میں دم توڑتی ہوئی انسانیت اسلام کے چشمہ فیض عام سے اپنے علاج اور درمان کی متلاشی ہے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی نے اپنی کتاب ''من روائع حضارتنا'' میں لکھا ہے کہ ایک صاحب جو دعوت کا خاصہ جذبہ رکھتے تھے، فرانس میں مقیم تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے کچھ غیر مسلموں کو خطاب کیا اور اسلام کے نظام حیات کی خصوصیات پر روشنی ڈالی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اسلام نے مادی طاقت کو بھی بہت اہمیت دی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے: ''واعدوا لهم ما استطعتم من قوة'' لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم جدید سامان جنگ کی طرف بھی توجہ دیں۔ اس جملہ کو سن کر ان لوگوں نے جواب دیا: ''آپ مادی ترقیات، ٹینک اور ہوائی جہاز وغیرہ کے نام ہمارے سامنے نہ لیں۔ اس مشینی دنیا سے تو بیزار ہو کر ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔ ان مشینوں سے ہمارا دل بھر چکا ہے۔ آپ ہمیں صرف یہ بتائیے کہ انسانیت، اخلاق اور روحانی قدروں کے میدان میں اسلام ہمیں کیا دے سکتا ہے۔''

ڈاکٹر الیکسس کیرل (Alexis Carrel) اپنی کتاب (Man The Unknown) میں لکھتے ہیں کہ ''مشینی ایجادات میں اضافہ کر دینے سے حالات کو کچھ بھی بہتر نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی طرح اس معاملہ میں طبیعات، فلکیات اور کیمیا کے

Marfat.com

اکتشافات کو بھی اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ آدمی کو اب توجہ خود اپنے اوپر اور اپنی ذہنی اور اخلاقی نااہلیت پر منعطف کرنی چاہیے۔ اپنے تمدن میں لذت، تعیش، جمالیت، وسعت اور پیچیدگیاں بڑھاتے چلے جانے سے کیا حاصل جب کہ اس تمدن کو اپنے حقیقی مفاد کے رخ پر لے جانے میں خود ہماری اپنی کمزوریاں مانع ہو رہی ہیں، درحقیقت یہ کوئی مفید صورت نہیں ہے کہ ایک ایسے طریق زندگی کے بنانے پر دیدہ ریزیاں کی جائیں جو اخلاقی زوال کا اور عظیم نسلوں کے صالح ترین عناصر کے خاتمہ کا موجب ہو رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ رفتار کے بحری جہاز، زیادہ آرام دہ گاڑیاں، سستے ریڈیو اور بعید تر سحابیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے دوربینیں بناتے چلے جانے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنے اوپر زیادہ توجہ صرف کریں۔" (ص ۵۲)

ان اقتباسات سے یہ پتہ چلا کہ دنیا میں اس وقت اسلام ناآشنائی کا وہ ناسور ہے جو گھن کی طرح انسانیت کے جسم کو کھائے جا رہا ہے۔ اور یہ اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کا خاطر خواہ علاج نہ کیا جائے۔ صرف آہیں بھرنا، اسلام کی دگرگوں حالت پر آنسو بہانا یا وعظوں اور مجلسوں میں اس کی ویرانی کو بیان کر دینا اصلی مرض کا کوئی علاج نہیں بلکہ اس کا اصل علاج دعوت ہے جس سے آج ہم سب قریباً غافل ہو چکے ہیں۔ جب تک اس کو پھر سے جاری نہیں کریں گے، ہماری حالت درست نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اسلام دنیا میں پھیل سکتا ہے۔ اس کے بغیر اسلام کے چشمۂ فیض عام کی پیاسی دنیا تڑپتی رہے گی۔

Marfat.com

تبلیغی جماعت

یہ جماعت تبلیغی تو کم ہے البتہ تذکیری جماعت ضرور ہے، لیکن اس گئے گزرے دور میں جب کہ انسان اپنے ماحول اور مشاغل میں اس قدر مصروف اور منہمک ہو گیا ہے کہ وہ دینی تعلیم اور دینی اعمال کو یک قلم بھول گیا ہے اور اس مادی دنیا ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھا ہے، اس جماعت کا وجود نہایت غنیمت ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اس خدا فراموش معاشرہ میں اس جماعت نے لوگوں کو خدا آشنائی کا سبق دیا ہے۔
چنانچہ اس کی مثال میوات کا وہ علاقہ ہے جہاں سے مولانا محمد الیاس صاحب کاندہلوی قدس سرہ نے اس کی بنیاد رکھی۔ میوات کا علاقہ دہلی کے جنوب میں انگریزی رقبہ اور متعدد ہندو ریاستوں کے حدود کے اندر پھیلا ہوا ہے اس زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ ۳۰-۴۰ لاکھ تھا۔ معلوم نہیں کس زمانے میں یہاں کی ہندو راجپوت قوم نے اسلام قبول کیا لیکن دہلی کے دارالسلطنت سے اس قرب کے باوجود یہ علاقہ دینی اعتبار سے کس مپرسی اور بے توجہی کے عالم میں پڑا رہا۔ جہالت اور بے تربیتی کی وجہ سے غارت گری، کشت وخون اور ڈاکہ زنی اور رہزنی اس کے قومی خصائل میں داخل ہو گئی۔ اور اس علاقہ کا شمار برصغیر پاک و ہند کے جرائم پیشہ علاقے اور اس کی جرائم پیشہ اقوام میں ہونے لگا۔ علماء اور دینی طبقہ کی بے توجہی کے باعث یہ بہادر راجپوت قوم جو مہمان نواز اور باحمیت تھی اس کی تمام صلاحیتیں ضائع ہو رہی تھیں۔ دینی تعلیم کے فقدان کے

باعث اس کو رفتہ رفتہ اسلام سے صرف اتنا تعلق رہ گیا تھا کہ وہ ابھی اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کرتی تھی۔ ان کے نام تک غیر مسلموں کے سے تھے، مشرکانہ عقائد و اعمال اور ہندوانہ رسوم و عادات زندگی کا جزو بن گئے تھے۔ ہر ہر قبیلہ کا ایک روحانی محافظ و نگران تھا جسے کھیڑا دیوت (یعنی قبیلہ کا الٰہ) کہتے تھے۔ ضروریات دین سے آشنا اور واقف کوسوں تک ڈھونڈنے سے نہیں ملتا تھا یہاں تک کہ یہ لوگ کلمہ تک سے ناواقف اور نماز کی شکل تک سے ناآشنا اور بیگانہ تھے۔ غرضیکہ یہ قوم ہر لحاظ سے دینی ارکان اور اعمال سے نہ صرف غیر عامل بلکہ ناآشنا تھی۔ کچھ لوگوں کے نام ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ناموں کو ملا کر رکھے گئے تھے جیسے محمد موہن اور ان میں سے کچھ لوگ مردوں کو جلاتے اور کچھ دفن کرتے تھے۔ گویا کہ ایک عجیب بے دینی کا عالم تھا۔

اس قوم کی تعلیم و تربیت اور اس وسیع اور پس ماندہ علاقے میں عمومی انقلاب کا کیا طریقہ تھا؟ پہلا خیال یہی ہوگا کہ اس علاقہ میں دینی مدارس قائم کیے جائیں اور ان میں اس قوم کے لوگوں کو تعلیم و تربیت سے مرصع کیا جائے۔ کیونکہ تعلیم ہی سے انسان صحیح معنوں میں انسان اور مسلمان بنتا ہے۔ لیکن اس میں کئی دشواریاں تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اتنے بڑے منصوبے کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا؟ اور اگر سرمایہ فراہم بھی ہو جائے تو ان لوگوں کو جو مساجد میں نہیں آتے ان کو مدارس میں کیسے لایا جائے گا؟ اور اگر اس تاریک اور غریب خطہ میں اتنی بڑی تعداد میں مدارس اور مکاتب قائم کر بھی دیئے جائیں تو کیا یہ مدارس و مکاتب ایک ایسی قوم میں اسلامی انقلاب اور اسلامی ذہن پیدا کر سکتے تھے جس کو اپنے مشاغل زراعت و تجارت سے اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ تعلیم حاصل کرے اور نہ ہی اس کو علم کی اتنی طلب اور قدر تھی کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے ضروری کاموں سے چھڑا کر مدرسوں میں تعلیم دلوائے۔ اور اگر یہ سب کچھ ہو بھی جائے تو اس طریقہ سے اس قوم میں کتنی مدت میں اصلاح و انقلاب کی امید کی جا سکتی ہے۔ پھر اس بات کا تجربہ کیا بھی گیا۔ میوات میں مختلف جگہوں پر مکاتب و مدارس قائم کیے گئے لیکن

Marfat.com

اول تو خود ان کے فارغ شدہ طالب علم اسلامی سیرت و اخلاق کے نمونہ نہ تھے اور ان سے اسلامی انقلاب کے بارہ میں کوئی حوصلہ افزائی نہ ہوتی تھی۔ دوسرے وہ اس تاریک اور غیر دینی ماحول میں جا کر ایسے کھوئے جاتے تھے کہ خود ان کا کوئی نشان نہ ملتا تھا۔ جہالت و غفلت اور خدا فراموشی سمندر میں چند افراد کا پڑھ لکھ جانا کیا حرکت اور ارتعاش پیدا کر سکتا تھا۔ فضا کی تبدیلی، عمومی احساس اور دین کی عزت و احترام کے بغیر چند انفرادی تغیرات کچھ موثر اور مفید ثابت نہیں ہوتے۔

چنانچہ اس وقت اس قوم کی اصلاح اور ان میں اسلامی انقلاب اور ان کے ذہن و قلب کو اسلامی بنانے کا وہی طریقہ اختیار کیا گیا جو ابتدائے اسلام میں اختیار کیا گیا تھا یعنی اس قوم میں باہر سے کوئی کوشش اور جدوجہد کرنے کے بجائے اس قوم کے اندر سے کام لیا گیا اور محدود کتابی اور درسی تعلیم کے بجائے عام دائرہ میں تعلیم کو جاری کیا گیا۔ ان کو اپنے مسلمان ہونے کا اقرار تو تھا ہی، اسی اقرار سے فائدہ اٹھایا گیا اور خود ان کے پاس جا کر انہیں بتایا گیا کہ دین سیکھنے کی ضرورت ہے بلکہ زندگی کی ہر ضرورت سے بڑھ کر ضرورت ہے۔ اور دین اس کے بغیر آ ہی نہیں سکتا کہ وہ اس کے طالب بنیں۔ اپنے مشاغل زندگی سے وقت نکالیں اور جہاں علم دین ہے وہاں ایک زمانہ کے لیے جماعتیں بنا کر جائیں اور صحبت و رفاقت اور خدمت اور جدوجہد سے دین کا علم حاصل کریں۔ اس حقیقت کا ادراک کر لیا گیا کہ اپنے ماحول اور اپنے دائمی مشاغل میں کوئی دینی تغیر اور ترقی نہیں کی جا سکتی، لہٰذا ان کو وقتی اور عارضی طور پر اس ماحول اور ان مشاغل سے دور رہ کر ایک مقصد کے لیے سرگرداں بنا دیا گیا۔ چنانچہ ان کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ ہر ہفتہ کچھ وقت کے لیے اپنے ماحول میں ضروریات دین (کلمہ اور نماز) کی تلقین کریں اور باقاعدہ جماعت بنا کر ایک امیر کی ماتحتی میں اپنے قرب و جوار میں گشت کریں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اس تبلیغ میں خود ان کی دینی پختگی اور تربیت ہوئی اور اس پورے علاقہ میں نہایت آسانی اور سہولت کے ساتھ اس طرح کلمہ اور نماز کی تبلیغ و تعلیم ہو گئی جو بڑے

Marfat.com

سے بڑے تبلیغی عملہ سے کئی سالوں میں ممکن نہ تھی۔

جب یہ عمل کارگر ثابت ہوا اور ہونا بھی چاہیے تھا تو اب دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ کم از کم چار ماہ کے لیے دین سیکھنے کے لیے اپنے گھر سے نکلیں اور ان جگہوں پر جائیں جہاں دین اور علم دین ان کے یہاں سے زیادہ ہے۔ پھر اس وقت کو کام میں لانے کے لیے ان کے لیے تعلیم و تعلّم کا ایک نظام بنا دیا گیا۔ وہ یہ تھا کہ وہ ایک خاص وقت میں تبلیغ کے لیے نکلتے اور جتنا جانتے دوسروں کو بتلاتے۔ اس میں اس سے زائد فائدہ تھا جو اپنے ماحول میں رہ کر تبلیغ کرنے کا تھا۔ اس طریقہ سے دین آشنائی، اور دین کی محبت اور کلمہ اور نماز کی بڑے پیمانے پر اشاعت ہوئی۔ اور جس علاقہ میں وہ گئے وہاں کے مقامی لوگوں کو ان کے اتنے دور سے آنے کی وجہ سے دین کا احساس اور اس کی اہمیت پیدا ہوئی کہ دین اتنی اہم شی ہے کہ اس کو سیکھنے کے لیے یہ اللہ کے بندے اتنی دور دراز جگہوں سے تکالیف و مصائب اٹھا کر آئے ہیں۔ آخر دین کی کچھ اہمیت ہے تبھی تو انہوں نے ایسا کیا ہے اور ایک ہم ہیں کہ یہاں اپنے گھر میں رہ کر بھی ہمیں دین کا کوئی احساس نہیں اور نہ ہمارے ذہنوں میں اس کی کچھ اہمیت ہے۔ اس سے ان مقامی لوگوں کو اپنے نقائص اور دین سے جہالت اور غفلت کا بھی احساس ہوا۔ بس احساس زیاں سب سے بڑی دولت ہے۔ اس احساس نے خود ان کی پختگی اور تربیت کا سامان مہیا کر دیا۔

اس تبلیغی محدود وقت کے علاوہ ان کے لیے تعلیم و تعلّم کا پورا پورا انتظام کیا گیا۔ ہر جماعت جو میوات کے کسی علاقہ میں بھی جاتی اس میں ایک معلم یا متعدد معلم ہوتے جو ان لوگوں کو قرآن حکیم پڑھاتے، نماز کے مسائل بتاتے، کلمہ درست کرواتے، ارکان اسلام سے انہیں روشناس کراتے اور قرآن حکیم کے الفاظ اور حروف کے مخارج بتاتے تاکہ قرآن حکیم کو صحت سے پڑھنے میں آسانی ہو۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ صحابہ کرامؓ کے ایمان افروز، سبق آموز اور جان بخش واقعات کتابوں سے پڑھ کر سناتے جس سے اسلامی جذبات کو نشو و نما ملتی ہے۔

Marfat.com

اندازہ فرمائیں کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے اپنی اس کوشش سے میوات کے اس علاقہ کے خدا فراموش اور خدا نا آشنا لوگوں کو جن کی تعداد لاکھوں میں تھی، تھوڑے سے عرصہ میں نہ صرف خدا آشنا بنا دیا بلکہ وہ خود دوسروں کے لیے داعی اور مبلغ بن گئے اور پورے ہندوستان میں وہ اب خود دین کی دعوت دینے والے بن گئے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک ایسی قوم میں ہوئی جو بالکل ناخواندہ، ان پڑھ اور خدا نا آشنا قوم تھی۔ اسی وجہ سے قرآن حکیم نے انہیں ''اُمیین'' کا لقب دیا ہے اور پھر یہ بھی کہ وہ ضلالت، جہالت اور گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے بلکہ ایک آیت میں بتایا کہ وہ آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حرف ناشناس اور خدا نا آشنا قوم کو کتابی تعلیم نہ دی بلکہ کتاب و سنت کا عملی علم بخشا۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی کتاب زندگی کا عملی باب ایک ایسا باب ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس عملی تعلیم سے وہ قوم متمدن و مہذب، پاکیزہ سیرت، فرشتہ خصلت اور ساری دنیا کی معلم اور ہادی بن گئی۔ اتنی بڑی قوم میں انقلاب برپا کرنے کے لیے (ایسی حالت میں جب کہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی کوئی رغبت نہیں رکھتی تھی بلکہ ہدایت کا ایک لفظ بھی سننے کے لیے تیار نہ تھی) کوئی درس گاہ قائم نہ کی کیونکہ کوئی بڑی سے بڑی درس گاہ بھی ان کے لیے کافی نہ تھی۔ پھر اگر ایک ایسی تعلیم گاہ یا متعدد تعلیم گاہیں اور مدارس قائم بھی ہو جاتے تو ان کا فائدہ محدود ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمومی اسلامی انقلاب کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت جو طریقہ اختیار فرمایا وہ یہ تھا کہ آپ نے سب سے پہلے ان میں دین کی طلب اور علم دین کی ضرورت کا احساس پیدا کیا اور حق تعالیٰ شانہ پر یقین کرنا سکھایا۔ چنانچہ ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے:

تعلمنا الایمان ثم تعلمنا القرآن

ہم نے پہلے اللہ تعالیٰ کی باتوں پر یقین کرنا سیکھا، پھر قرآن حکیم کا علم حاصل کرنا

Marfat.com

ایمان کی اسی قوت اور طلب کی اسی صداقت کی وجہ سے انہوں نے گھر بار چھوڑا، مشقتیں برداشت کیں کیونکہ ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ نجات و ہدایت کے لیے ضروری علم حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہر انسان کے لیے لازمی ہے، لہٰذا ضروری علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا، اس کے سفر کو عبادت، اس کی مشقت اور جدوجہد کو جہاد اور اس راہ کی موت کو شہادت تصور کرتا۔ پھر جو کچھ وہ اس طرح سے سیکھتا وہ دوسروں کو بھی سکھاتا۔ چنانچہ حق تعالیٰ شانہ کی ہدایت کے تحت اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم وتعلم کی اس ساخت کو ابتداء ہی سے ایسا رکھا کہ علم کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ علم، تعلیم کے ساتھ تعلم اور تعلم کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ چلتا رہتا۔ اس طرح سے پورا اسلامی معاشرہ ایک متحرک اور وسیع عملی درس گاہ بن گیا جس میں ہر شخص اپنے لیے طالب علم اور دوسرے کے لیے معلّم تھا۔ اس علم کے سبق تنہائیوں اور خلوتوں میں یاد نہیں کیے جاتے تھے بلکہ لوگوں کو یاد کرانے میں، دین کی دعوت کو پھیلانے میں اور اس کی راہ میں مصائب و تکالیف کو خوشی سے گوارا کرنے میں اس کے نقوش دل پر ثبت کیے جاتے تھے۔ تعلیم و اصلاح کا کام لوگوں سے ملنے جلنے، معاملہ کرنے اور عملی زندگی ہی میں انجام کو پہنچتا تھا۔ جس شخص نے کلمہ سیکھ لیا اور خدا اور اس کے رسول کو برحق مان لیا وہ اب رزق طلبی کے بجائے خدا طلبی میں لگ گیا اور اس نے غرض پروری کے بجائے دین پروری میں اپنی جان کو بے قیمت کر دیا۔ مختصر یہ کہ وہ اسلام لانے کے ساتھ آزمائشوں کی بھٹی میں پڑ گیا اور پھر تھوڑی مدت میں خالص سونا بن کر نکلا۔

یہ تعلیم عملی تھی جس کا ذریعہ کتابوں کے جامد نقوش نہ تھے بلکہ چلتے پھرتے نفوس تھے۔ اور یہ درس گاہوں اور مکاتب میں نہیں دی جاتی تھی بلکہ یہ جہاد کے میدانوں، کاروباری مشغولیتوں، خانگی زندگی کے جھمیلوں اور سفر کی منزلوں میں ہوتی تھی۔ ان نفوس قدسیہ کی صحبت ورفاقت میں رہ کر دین کے صرف نظریات ومسائل ہی معلوم نہ ہوتے تھے بلکہ اس کا سلیقہ اور ملکہ بھی پیدا ہوتا تھا۔ صحبت واختلاط سے دین اور علم دین سکھانا، کتابوں

Marfat.com

کے نقوش کے بجائے انسانی نفوس کے ذریعہ تعلیم دینا انبیاء کرام علیہم السلام کا امتیاز اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا طرز خاص ہے۔ آپ صاحب عرش سے لیتے اور قلوب خلق پر لکھتے تھے پھران کے ذریعہ دوسروں کو تعلیم دیتے تھے۔ اس طرز سے کسی ساز وسامان کے بغیر لاکھوں کروڑوں انسان بہت تھوڑے وقت میں ضروری علم حاصل کر سکتے ہیں اور اس تعلیم میں بے عملی اور بے اثری کے وہ نقائص بھی نہیں ہیں جو محض لفظی تعلیم میں پائے جاتے ہیں۔ تعلیم کے بارہ میں تبلیغی جماعت کا یہ اصول ہے۔

دوسرا اصول تبلیغی جماعت کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو ضروری علم دین حاصل کرنے کے لیے اپنے ماحول سے نکلنا چاہیے اور ان مشاغل کو عارضی طور پر چھوڑنا چاہیے جس میں وہ منہمک اور مشغول ہیں اور جن کی موجودگی میں وہ علم کے لیے یکسو اور فارغ البال نہیں ہو سکتے کیونکہ اس ماحول اور اپنے مخصوص حالات میں وہ اپنی زندگی میں کوئی عملی تبدیلی اور موثر انقلاب پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ ہی ایک ایسا مرکز تھا جس میں پورا اسلامی ماحول پایا جاتا تھا اور دین کو متحرک شکل میں دیکھا جا سکتا تھا، اس لیے عرب کے تمام نومسلموں کو اپنے اپنے مقامات سے اس اسلامی ماحول میں آنے اور دین سیکھ کر جانے کی دعوت دی گئی۔ اس جماعت کے نزدیک دین اور علم دین کے حصول کے لیے جانی و مالی ایثار، عملی جدوجہد، اور جسمانی محنت ومشقت بھی ضروری ہے۔ دین کی محبت اور طلب صادق کا امتحان یہ ہے کہ انسان اس کی خاطر اپنے مالوفات (جن چیزوں سے اسے انس اور محبت ہے) چھوڑ دینے کے لیے تیار ہو جائے۔ انسان کے لیے سب سے بڑا جہاد ترک مالوفات اور نفس کی مخالفت ہے۔ یہ بات ترک وطن میں آسانی سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی کا نام قرآن وحدیث میں ہجرت ہے۔ اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ دین اور علم دین سیکھنے کے لیے ایک چلّہ یا چار مہینے یا ایک سال تاکہ اس طرح سے تم یکسو ہو کر دین اور علم دین کے صحیح ثمرات حاصل کر سکو۔ چنانچہ مولانا الیاس صاحبؒ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

Marfat.com

''الاجر علیٰ قدر النصب'' (اجر بقدر مشقت) عادت خداوندی عموماً دین میں اپنی جدوجہد کی مقدار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آدمی کسی مقصد کے لیے، جتنا اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے اور تکالیف کو جھیلنے کے ذریعہ اپنے حالات، جوارح، قلب اور قوتوں کی شکستگی اور تعب و انکسار کو پہنچتا ہے اتنا ہی حق تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا سبب ہوتا ہے۔ ''انا عند المنکسرة قلوبهم، والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا۔'' کسی راہ کی ذلت کو اٹھائے بغیر اس کی عزت کو پہنچنا عادۃً ہوتا نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

یہ عام غلط فہمی جو لوگوں کے دلوں میں پنپ رہی ہے کہ ہم کسب معاش کے ساتھ دین کا علم حاصل نہیں کر سکتے اور علم نہ ہونے کی وجہ سے دین کی خدمت انجام دینے کے اہل نہیں۔ اگر ہم واقعی علم دین حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ذاتی مشاغل کو یک قلم خیرباد کہہ دینا چاہیے اور ہمہ تن اور ہمہ وقت اسی کام کے لیے وقف ہو جانا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہ قربانی اور یہ اہم اقدام بہت تھوڑے اہل ہمت کر سکتے ہیں۔ تبلیغی جماعت اس غلط فہمی کا ازالہ اس طرح کرتی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے دنیا بالکل چھوڑ نہیں دی تھی اور نہ ہی اسلام کا مقصد دنیا بالکل چھڑانا ہے۔ صحابہ کرامؓ خدمت دین کے علاوہ اپنے معاشی مشاغل بھی رکھتے تھے۔ ان میں بکثرت تاجر بھی تھے، مزارع بھی تھے، اہل صنعت وحرفت بھی تھے لیکن نہ انہوں نے طلب علم چھوڑا اور نہ ہی خدمت دین سے مستثنیٰ ہوئے۔ ان میں جو لوگ قراء، طالب علم اور عالم کہلاتے تھے وہ بھی دن کو مزدوری یا تجارت کرتے تھے اور رات کو پڑھتے تھے۔ چنانچہ سیدنا انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ کیا میں تمہیں اپنے ان بھائیوں کے بارہ میں خبر نہ دوں جن کو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قراء کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ وہ تعداد میں ستر (۷۰) تھے۔ رات کو وہ مدینہ میں اپنے استاد کے پاس جاتے اور رات کو صبح تک پڑھتے رہتے۔ صبح کو ان میں سے جو طاقتور ہوتے وہ میٹھا پانی بھر

Marfat.com

کر لاتے اور مزدوری کرتے یا لکڑی کاٹ کر لاتے اور پھر اسے فروخت کرتے۔ جن کو گنجائش ہوتی وہ جمع ہو کر بکری خرید لیتے، پھر اس کو بناتے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجروں کے پاس لٹکی رہتی۔" (مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۱۳۷)

اس طلب علم کا ان کو اس قدر اہتمام تھا کہ اگر بعض لوگ روزانہ بارگاہ رسالتؐ میں حاضر نہ ہو سکتے تو باری باری سے ایک دن حاضر ہوتے اور جو کچھ اس مجلس میں سنتے یا پیش آتا اس کی اپنے دوست اور رفیق کے ذریعہ اطلاع حاصل کرتے۔ جس روز وہ حاضر نہ ہو سکتے اس روز ان کو ایک اضطراب اور بے کلی سی رہتی۔ گویا سارا دن دل میں کھٹکا لگا رہتا کہ معلوم نہیں وہاں کیا ہو رہا ہے، جیسا کہ سیدنا عمرؓ کا واقعہ بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں آتا ہے۔

ان حضرات کا کہنا ہے کہ آج یہ امت کی ایک بڑی ضرورت ہے کہ دین سیکھنے کا نبوی طریقہ اور فطری طریقہ جو مدتوں سے مردہ ہو چکا ہے، دوبارہ زندہ کیا جائے۔ کتابی نقوش کے ساتھ زندہ نفوس سے استفادہ کو ضم کیا جائے۔ دینی اداروں اور اسلامی درسگاہوں کے ماتحت کچھ چلتی پھرتی درسگاہیں، جیتی جاگتی خانقاہیں اور بولتے چالتے صحیفے ہوں جو علوم دینیہ کے ان سمندروں (دینی مدارس و مکاتب) سے مشکیں بھر بھر کر عام زندگی کی کشت زاروں میں تاجروں کی تجارتوں، مزارعین کی زراعتوں اور اہل صنعت کی صنعتوں میں دین کا آب حیات پہنچائیں۔

تبلیغی جماعت کا اصول یہ ہے کہ دین کی تعلیم وتعلم اور دین کی خدمت و سعی کو مسلمانوں کی زندگی کا جزو لاینفک بنانے کی کوشش کی جائے اور ہر خاص و عام کو اس بات کی دعوت دی جائے کہ وہ اپنے مشاغل حیات اور فکر معاش کو دین کے ماتحت کر دیں۔ اصل یہی زندگی ہے۔ آدمی ایک کماؤ مشین نہ بن جائے کہ وہ جینے کے لیے کمائے اور کمانے کے لیے جیئے۔ مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ البتہ اس سے جو وقت بچے وہ حصول معاش میں صرف کیا جائے۔ کیونکہ

Marfat.com

''ان اللہ یحب المؤمن المحترف '' یعنی اللہ تعالیٰ کمانے والے مومن کو دوست رکھتا ہے۔ اور جو لوگ گھر کے ماحول میں رہ کر اور اپنے مشاغل و معمولات میں پھنس کر دین حاصل کرنے کے لیے وقت نہیں نکال سکتے، نہ اس کی طرف پوری توجہ دے سکتے ہیں اور نہ اس کے پورے اثرات قبول کر سکتے ہیں۔ اس لیے ان کو عارضی ترک وطن اور ترک ماحول اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے جس میں وہ کچھ مدت کے لیے فارغ البال اور یکسو ہو کر دین حاصل کر سکیں اور اہل دین کی صحبت، رفاقت اور خدمت سے استفادہ کر سکیں۔ ایک شرعی نظام اور ایک دینی زندگی میں رہنے کی ان کو عادت پڑ سکے۔ ان کا باہر نکلنا خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے مفید و مبارک اور سبق آموز اور انقلاب انگیز ہے۔

یہ ہیں وہ اصول و مقاصد جن کے تحت حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ مسلمانوں کے ہر طبقہ کو دین کے تعلیم و تعلّم کے لیے گھر سے باہر نکلنے، ترک وطن کرنے اور ایک خاص نظام کے تحت سفر اور نقل و حرکت کرنے کی دعوت و ترغیب دیتے ہیں۔

مولانا اپنے ایک گرامی نامہ میں اسی مقصد کی وضاحت فرماتے ہیں:

''ہم نے جماعتیں بنا کر دین کی باتوں کے لیے نکلنا چھوڑ دیا حالانکہ یہی بنیادی اصل تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود پھرا کرتے تھے اور جس نے ہاتھ میں ہاتھ دیا وہ بھی مجنونانہ پھرا کرتا تھا۔ مکہ کے زمانہ میں مسلمانوں کی مقدار افراد کے درجہ میں تھی، تو ہر فرد مسلم ہونے کے بعد بطور فردیت و شخصیت کے منفرداً دوسروں پر حق پیش کرنے کے لیے کوشش کرتا رہا۔ مدینہ میں اجتماعی اور متمدن زندگی تھی، وہاں پہنچتے ہی آپ نے چہار طرف جماعتیں روانہ کرنی شروع کر دیں اور جو بڑھتے گئے وہ عسکریت کی طرف بڑھتے گئے۔ سکونی زندگی صرف انہی کو حاصل تھی جو پھرنے والوں کے لیے (فئۃ) مرجع اور پھراتے رہنے کا ذریعہ بن سکیں۔ غرض پھرنا اور دین کے لیے جدوجہد اور نقل و حرکت میں رہنا اصل تھا۔ جب یہ چھوٹ گیا جب ہی خلافت ختم ہو گئی۔''

نکلنے کی حالت میں کیا ہوگا؟ کیا دعوت دی جائے گی؟ اس کے بارہ میں مولانا الیاسؒ فرماتے ہیں:

''اصل تبلیغ دو امر کی ہے، باقی اس کی صورت گری اور تشکیل ہے۔ ان دو چیزوں میں ایک مادی ہے اور ایک روحانی۔ مادی سے مراد جوارح سے تعلق رکھنے والی۔ سو وہ تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی باتوں کو پھیلانے کے لیے ملک بہ ملک اور اقلیم باقلیم جماعتیں بنا کر پھرنے کی سنت کو زندہ کر کے فروغ دینا اور پائدار کرنا ہے۔ روحانی سے مراد جذبات کی تبلیغ یعنی حق تعالیٰ کے حکم پر جان دینے کا رواج ڈالنا جس کو اس آیت میں ارشاد فرمایا: ''فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم، ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً، وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔'' یعنی اللہ کی باتوں اور اوامر خداوندی میں جان کا بے قیمت اور نفس کا ذلیل ہو جانا۔

۱- نکلنے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی چیزوں میں جو چیز جتنی زیادہ اہم ہے، اس میں اسی کی حیثیت سے کوشش کرنا، اس وقت بدقسمتی سے ہم کلمہ تک سے ناآشنا ہو رہے ہیں، اس لیے سب سے پہلے اسی کلمہ طیبہ کی تبلیغ ہے جو کہ خدا کی خدائی کا اقرار نامہ ہے یعنی اللہ کے حکم پر جان دینے کے علاوہ درحقیقت ہمارا کوئی مشغلہ نہیں ہوگا۔

۲- کلمہ کے لفظوں کی تصحیح کرنے کے بعد نماز کے اندر کی چیزوں کی تصحیح کرنے اور نمازوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی نماز بنانے کی کوشش میں لگا رہنا۔

۳- تین وقتوں کو (صبح وشام اور کچھ شب کا حصہ) اپنی حیثیت کے مناسب تحصیل علم وذکر میں مشغول رکھنا۔

۴- ان چیزوں کو پھیلانے کے لیے اصل فریضہ محمدی سمجھ کر نکلنا یعنی ملک بملک رواج دینا۔

۵- اس پھرنے میں خلق کی مشق کرنے کی نیت رکھنا، اپنے فرائض کی ادائیگی کی سرگرمی، خواہ خالق کے ساتھ متعلق ہوں یا خلق کے ساتھ کیونکہ ہر شخص سے اپنے ہی متعلق سوال ہوگا۔

٦- ہر عمل کے بارہ میں اللہ نے جو وعدے وعید فرمائے ہیں، ان کے موافق اس امر کی تعمیل کے ذریعہ اللہ کی رضا اور موت کے بعد والی زندگی کی درستی کی کوشش کرنا۔

دین سیکھنے کے لیے اور اللہ و رسول کی باتیں دوسرے لوگوں تک پہنچانے اور پھیلانے کے لیے یہ نقل و حرکت، یہ سفر اور عارضی غربت، چند مرغوبات و مالوفات کی یہ عارضی مفارقت، معمولات و عادات کی خفیف سی تبدیلی دین کے لیے جدوجہد اور قربانی کا ادنیٰ درجہ ہے جس کے بغیر دین کے برکات و ثمرات کا حصول مشکل ہے، اور جو اس نعمت عظمیٰ (اسلام) کی شکرگزاری کا سہل ترین طریق ہے۔ کیونکہ

''جس مذہب کے لیے ہزارہا جانوں کا طیب خاطر سے پیش کر دینا، اس کی قیمت کے لیے کافی نہیں ہوسکتا، اور جس مذہب کی اصل قیمت سوزش جگر اور خون دیدہ بہانا تھی، اس کے لیے ہمارا یہ برائے نام قدموں کا اٹھانا اور اس قدر ضعیف اور کم مقدار اپنی محنتوں کا وابستہ رکھنا اصلی فریضہ سے کچھ نسبت نہیں رکھتا، لیکن خدائے پاک کی ذرہ نوازی اور مراحم خسروانہ اور اخیر زمانہ والوں کے لیے ان کی مساعی پر صحابہ کے پچاس کے برابر اجر و ثواب کے ملنے کی خوش خبریاں اور سچے وعدے اور ''لایکلف اللہ نفساً الاّ وسعھا'' کی جیسی بشارتیں ہماری ان مساعی کے بارہ میں بڑی امیدیں دلا رہی ہیں۔'' (مکتوب مولانا محمد الیاس صاحبؒ)

قرون اولیٰ میں تعلیم و تبلیغ میں ایک عظیم تغیر و تبدل یہ ہوا کہ تعلیم کا دائرہ طالبین کے لیے محدود ہو کر رہ گیا یعنی اہل طلب کے لیے تعلیم و اصلاح کا پورا پورا اہتمام تھا لیکن جو طلب سے خالی تھے ان کی طرف سے توجہ بالکل ہٹ گئی حالانکہ ان میں طلب کی تبلیغ کی ضرورت تھی۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کے وقت پوری دنیا سود و زیاں

سے مستغنی اور بے پرواہوتی ہے یہ حضرات ان میں طلب پیدا کرتے ہیں اوار پھر ان میں سے کام کے آدمی حاصل کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ بے طلبوں اور بے حسوں میں طلب واحساس پیدا کرنے کا نام ہی تبلیغ ہے۔ لہٰذا اس زمانہ میں سب سے ضروری تبلیغ طلب کی تبلیغ ہے۔ مسلمانوں میں اپنے مسلمان ہونے کا احساس پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور دوسری شی یہ کہ دین سیکھے بغیر نہیں آتا اور دنیوی ہنر سے زیادہ اس کے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ احساس اور یہ طلب اگر پیدا ہوگئی تو باقی مراحل ومنازل خود طے ہو جائیں گے۔ اس وقت کے مسلمانوں کا عمومی مرض بے حسی اور بے طلبی ہے۔ لوگوں نے غلط فہمی سے سمجھ لیا کہ ایمان تو موجود ہے اس لیے ایمان کے بعد جن چیزوں کا درجہ ہے ان میں مشغول ہو گئے۔ حالانکہ سرے سے ایمان پیدا کرنے ہی کی ضرورت باقی ہے۔

صحابہ کرامؓ کی کوششوں سے جو دینی طلب اور احساس پیدا ہوا تھا گذشتہ صدیوں کی دینی رونق اور اسلام کی ترقی وفروغ اسی کی برکت تھی۔ اس زمانہ میں بھی جو کچھ رہی سہی اسلامیت، دینداری، اسلامی ادارے اور دینی مظاہرے نظر آتے ہیں، تمام تر اسی احساس و طلب کا نتیجہ ہیں جو مسلمانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت وکوشش، صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے جہاد وقربانی اور تبلیغ وتلقین سے پیدا ہوئی تھی۔ صدیوں سے یہ سرمایہ خرچ ہو رہا ہے اور مدتوں سے اس میں اضافہ ہونا موقوف ہو گیا ہے۔ اندیشہ ہے کہ اگر یہ سرمایہ بغیر اضافہ وآمد کے خرچ ہوتا رہا تو ایک روز بالکل ختم ہو جائے گا اور مسلمانوں کا جسم بے روح ہو کر رہ جائے گا۔ دینی مدارس کو طالب علم اور مسجدوں کو نمازی اس لیے مل رہے ہیں کہ مسلمانوں میں ابھی اپنے مسلمان ہونے کا احساس باقی ہے اور دین کی کچھ طلب بھی ہے۔ جس روز یہ دونوں چیزیں (احساس اور طلب) ختم ہوگئیں یا رہی سہی طلب اور بچا کھچا احساس جاتا رہا تو پھر مدارس بھی سونے ہوں گے، خانقاہوں میں بھی سناٹا ہوگا اور مسجدیں بھی (خدانخواستہ) ویران نظر آئیں گی۔ تبلیغی جماعت کا کہنا ہے کہ ہماری جماعت امت میں یہی دو چیزیں پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس کام کے لیے وہ انتہائی کوشاں ہیں۔

Marfat.com

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے زمانہ میں یہ کام صرف میوات یا کچھ اور علاقوں تک محدود رہا لیکن حضرت مولانا محمد یوسف صاحب قدس سرہ کے زمانہ میں تبلیغ کا یہ کام پوری دنیا تک عالم میں پھیل گیا۔ مسلمانوں کی عملی زندگی میں اچھا خاصہ تغیر پیدا ہوا۔ لوگوں میں دین کا احساس اور علم کی طلب کافی حد تک بڑھی اور الحمدللہ ابھی تک تو یہ کام روز بروز ترقی پذیر ہے۔ اللہ کرے اس میں مزید ترقی ہو، لیکن اس جماعت نے اب مولانا الیاس صاحبؒ اور مولانا یوسف صاحبؒ کے بتائے اصولوں کو چھوڑ دیا ہے یا چھوڑ رہی ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ بہرحال اب پوری دنیا میں اس جماعت سے بڑی اور کوئی تبلیغی جماعت نہیں جس کا نہ کوئی ممبر ہے اور نہ کوئی دفتر لیکن پھر بھی پوری دنیا میں اس کا چرچا ہے۔

الحمدللہ علیٰ ذالک

اسلام کی دعوتی قوت

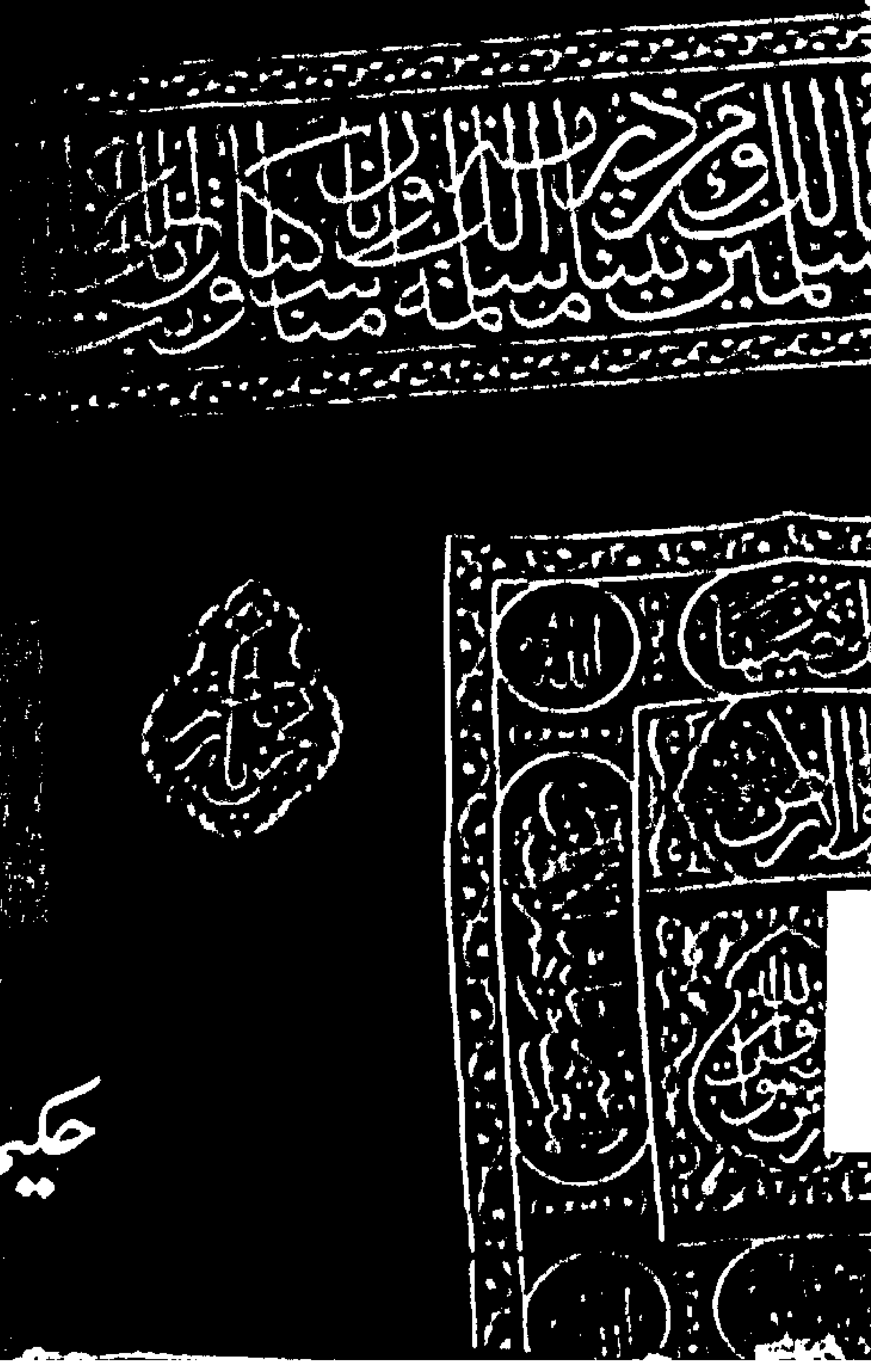

حکیم محمود احمد ظفر

Marfat.com